رنگارنگ کہانیوں سے آراستہ دلچسپ جریدہ
ماہنامہ
نئے افق
کراچی
پاک سوسائٹی
ڈاٹ کام
www.paksociety.com

ابتدائیہ

سچی کہانیاں

پبلشر مشتاق احمد قریشی پرنٹر جمیل حسن مطبوعہ ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی
دفتر کا پتا: 7 فرید چیمبرز عبداللہ ہارون روڈ کراچی

مغرب سے انتخاب

ناول

مستقل سلسلے

خط وکتابت کا پتا: ماہنامہ نئے افق پوسٹ بکس نمبر 874 کراچی 74200 فون نمبرز 021-35620771/2
فیکس 021-35620773 یکے از مطبوعات نئے افق پبلی کیشنز ای میل info@aanchal.com.pk

مسئلہ

مشتاق احمد قریشی

درحقیقت انسان بڑے خسارے میں ہے......!!

کراچی خصوصاً اور پورا ملک عموماً دہشت گردی کی لپیٹ میں ہے۔ کئی اقسام کی دہشت گردی سے دوچار ہے کہیں بھتہ مافیا سرگرم عمل ہے کہیں فرقے کے نام پر قتل کیا جارہا ہے ہر کسی کے پاس اپنی لوٹ مار اور دہشت گردی کا کوئی نہ کوئی جواز ہے۔ گزشتہ دنوں سینٹرل جیل میں ایک عادی چور سے ملاقات ہوئی بقول اس کے کہ وہ اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر رزق حلال کماتا ہے کیونکہ چوٹی کا پسینہ ایڑی تک بہہ جاتا ہے۔ ایسے ہی کہیں ظالمانہ بھتہ مافیا ہے کہیں سیاسی بھتہ مافیا ہے ہر ایک اپنی قوت وزور آوری کے لیے اپنی دہشت قائم کرنے میں لگا ہوا ہے اور بلاسوچے سمجھے معصوم بے گناہوں کا خون بہایا جارہا ہے اور کوئی پرسان حال نہیں۔ مرنے والوں کے لواحقین اپنے پیاروں کا خون کس کے ہاتھوں پر تلاش کریں۔ کہنے والے یہ بھی کہہ رہے ہیں کہ مرنے والوں کو تو اسی وقت مرنا تھا کیونکہ اللہ کی طرف سے ہر کسی کی موت کا ایک وقت مقرر ہے۔ انسان کو تو پتا بھی نہیں کہ اسے کب کہاں اور کس طرح مرنا ہے۔ موت آ کر رہتی ہے۔ چاہے کتنی بھی احتیاط اور بندوبست کرلیا جائے کبھی کوئی شخص یا کوئی بھی جاندار اپنے وقت سے ایک لمحہ قبل نہیں مرسکتا۔

قرآن حکیم میں اللہ ربّ کائنات نے سب کچھ کھول کھول کر بیان فرمادیا ہے ”انسان درحقیقت بڑے خسارے میں ہے“ اور یہ کلام مبارک اللہ تبارک وتعالیٰ نے زمانے کی قسم کھا کر ارشاد فرمایا ہے۔ انسان یقیناً بڑے خسارے میں ہے اس خسارے سے صرف وہی لوگ بچ سکتے ہیں جن میں یہ چار صفات پائی جائیں گی۔ (۱) ایمان کامل ہو (۲) اعمال صالح ہو (۳) دوسرے لوگوں کو حق وسچ کی نصیحت کرتا ہو (۴) اور صبر کرتا ہو اور دوسروں کو صبر کی تلقین کرتا ہو۔

قرآن مجید میں خسارے کا لفظ لغت کے اعتبار سے نفع کی ضد کے لیے اور تجارت میں استعمال کیا ہے۔ قرآن کا تصور فلاح محض دینوی خوش حالی نہیں ہے بلکہ دنیا سے لے کر آخرت کی حقیقی کامیابی پر حاوی ہے۔ اسی طرح قرآن کا تصور خسران محض دنیا کی ناکامی یا خستہ حالی کا نام نہیں ہے بلکہ دنیا سے لے کر آخرت تک حقیقی مرادی پر محیط ہے۔ قرآن کریم انسان کو اس کی اصل حقیقت سے اور دنیا میں اس کے مختصر قیام کے بارے میں کھل کر بتارہا ہے کہ یہ دنیا درحقیقت اس کے لیے ایک امتحان گاہ ہے اور جس طرح دنیا میں امتحان کا عرصہ ایک مختصر عرصہ ہوتا ہے ایسے ہی انسان کی دنیا کی یہ زندگی اس کی آنے والی نئی اور دائمی زندگی کے مقابلے میں ایک بالکل مختصر ترین زندگی ہے۔ اس لیے یہ دنیا انسان کی اور انسان کے لیے دنیا کی اصل حقیقت، درختوں، جانوروں کی طرح نہیں ہے کہ اس کا مقصدِ تخلیق یہیں اسی دنیا میں پورا ہوجائے اور قانونِ فطرت کے مطابق ایک مدت تک اپنے حصے کا کام کرکے یہیں مر کر فنا ہوجائے۔ یہ دنیا انسانوں کے لیے نہ تو دارالعذاب ہے اور نہ ہی دارالجزا نہ کوئی تفریح گاہ۔ یہ دنیا انسان کے لیے ایک امتحان گاہ ہے اور زندگی حقیقت میں وہ وقفہ ہے جو

اسے امتحان کے لیے دیا گیا ہے اور دنیا میں اسے جو قوتیں اور صلاحیتیں دی گئی ہیں درحقیقت وہ اسی امتحان کے لیے دی گئی ہیں۔ امتحان کے بے شمار پرچے ہیں جو اس کی زندگی کی آخری سانس تک جاری رہتے ہیں۔ اس امتحان کا نتیجہ دنیا میں نہیں نکلتا بلکہ آخرت میں ان تمام پرچوں کی جانچ ہوکر فیصلہ صادر کردیا جائے گا اس ہی نتیجہ سے اس کی دائمی اور آخرت کی زندگی جڑی ہوئی ہے۔

اگر انسان اس امتحان گاہ یعنی دنیا کی زندگی میں احکام الٰہی سے انحراف کرے گا اور لوگوں کو اپنے ظلم وجبر کا شکار بنائے گا انہیں طرح طرح سے بوئے گا، قتل کرے گا اور آخرت کی جواب دہی کو اہمیت نہیں دے گا تو وہ اس امتحان گاہ کی زندگی کا غلط استعمال کرے گا بظاہر تو دنیا میں مال ودولت کے انبار جمع کرے گا لیکن اس کا کارنامہ زندگی سارا کا سارا غلط ہوجائے گا اور اگر وہ خود کو ایک مسلمان سمجھتا ہے اور احکام الٰہی پر عمل کرتا ہے یعنی اعمال صالح کرتا ہے لوگوں کے حقوق ادا کرتا ہے اور اللہ کے دیئے ہوئے رزقِ حلال پر صبر شکر ادا کرتا ہو، دوسروں کی بہتری اور بھلائی چاہتا ہو یعنی ناجائز طریقوں سے دنیا کی دولتوں، مال واسباب کی لوٹ کھسوٹ میں مبتلا نہ ہو اور دنیا میں جو کاروبار حیات انجام دے رہا ہو وہ دیانت داری سے ادا کررہا ہو وہ یقیناً اس دارالامتحان سے کامیاب وکامران ہوکر نکلے گا اور جوان بھتہ خور مافیاؤں قاتلوں لوٹ کھسوٹ کرنے والے لوگوں کی طرح صرف دنیا کے چند ٹکوں کی خاطر اپنے دین سے اپنے خالق ومالک کے احکام وہدایات سے آنکھیں پھیرے گا وہ اس طرح یقیناً دنیا کے مال واسباب تو دنیا میں جمع کرے گا لیکن جب دنیا سے رخصت ہوگا تو خالی ہاتھ اپنے ربّ کی طرف اپنی حقیقی آرام گاہ کی طرف لوٹے گا اور یہ بھی ہوسکتا ہے جیسا کہ قرآن حکیم میں ارشاد الٰہی جگہ جگہ ہورہا ہے کہ وہ اپنی بداعمالی بے ایمانی چوری لوٹ مار کے باعث اس دنیا کی دولت کو سانپ بچھوؤں کی شکل میں اپنے ساتھ لے جائے گا۔ یہی انسان کا اصل خسارہ ہے۔

یہ قانون فطرت وقدرت ہے کہ انسان جیسا بوئے گا ویسی ہی اسے فصل ملے گی، ویسا ہی پھل پائے گا اگر انسان نیکی اور اعمال صالح سے زندگی گزارے گا تو اس کی آل واولاد نیک وصالح ہوگی اس کی موت کے بعد اس کی وراثت پاکے اس کے حق میں دعا گو رہے گی اور لوٹ کھسوٹ چوری بے ایمانی کرکے لوگوں کو اپنی جعل سازی سے قتل کرکے جمع کرنے والی دولت سے جب اپنی اولاد کی پرورش کرے گا تو یقیناً اس کی اولاد اس کی ہی طرح کی ہوگی وہ حرام کمائی سے پل کر بڑھے گی، وہ اپنے ماں باپ کو بوجھ سمجھے گی اور ان کی موت کے بعد ملنے والی وراثت پر آپس میں لڑے گی، جھگڑے گی۔ اگر انسان حق کو سمجھ لے اور اللہ کی رسّی کو مضبوطی سے پکڑے تو یقیناً اس کی دنیا کی عارضی اور آخرت کی دائمی زندگی کامیابی وکامرانی سے گزرے گی جن لوگوں نے قتل وغارت لوٹ مار کے ذریعہ دولت سمیٹنے کی گھناؤنی کوشش کی ہوگی اللہ کے یہاں ان کی آخرت تو خراب ہوگی ہی لیکن اللہ تعالیٰ کی گرفت میں وہ اس دنیا میں بھی نہیں بچ سکیں گے، بدنامی رسوائی ان کا مقدر ٹھہرے گی۔ اللہ تعالیٰ اہل پاکستان کو ایمان حق سچ کی دولت سے سرفراز کرے اور چوروں لٹیروں، قاتلوں جعل سازوں اور بے ایمانی سے بچائے اور اپنی پناہ نصیب فرمائے، آمین۔

گفتگو

عمران احمد

> حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جب تم میں سے کوئی لوگوں کو نماز پڑھائے تو ہلکی نماز ادا کرے اس لیے کہ مقتدیوں میں کمزور اور بوڑھے (ایک روایت میں ہے) اور ضرورت مند لوگ بھی ہیں اور جب تم میں سے کوئی خود (تنہا) نماز پڑھے تو جتنا چاہے اسے لمبا کردے۔" (بخاری و مسلم)

عزیز ان محترم...... سلامت باشد!

جب آپ یہ سطور پڑھ رہے ہوں گے، سردی کا زور قدرے کم ہو چکا ہوگا۔ پنجاب، خیبر پختونخواہ، بلوچستان اور شمالی علاقہ جات میں تو سردی کا ساٹھ سالہ ریکارڈ ٹوٹ چکا ہے۔ دوسرے لفظوں میں انسانوں کی قلفی جم رہی ہوگی۔ جس کا بھی قلفی کھانے کو دل چاہے، اپنی انگلیاں چوس لے۔ سردی کے ساتھ گیس بجلی کا بحران بھی لوگوں کے لیے اذیت ناک بن چکا ہے، اب تو گندم میں خود کفالت کے باوجود حکمرانوں نے آٹے کی قلت کا مژدہ سنا کر مزید خون خشک کر دیا ہے۔ لوگ نوکریوں پر جانے کے بجائے سی این جی اور اب آٹے کی لائنوں میں نظر آتے ہیں، ہماری کرنیوں نے پوری قوم کو لائن پر کھڑا کر دیا ہے، ہر شخص آسمان کی طرف دیکھ رہا ہے کہ شاید اللہ تعالیٰ کو کچھ رحم آجائے وہی کچھ مدد فرمادے۔ مگر مشکل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ بھی صرف انہی کی مدد کرتا ہے جو اپنی مدد آپ کرنے کی کوشش کرتے ہیں، ہماری مثال تو بنی اسرائیل کی اس نسل جیسی ہوگئی ہے، جو ہمہ وقت من و سلویٰ کے انتظار میں آسمانوں کو تکا کرتے تھے۔ خیر چھوڑیئے ان باتوں کو، ہم لکھتے رہیں گے آپ پڑھتے رہیں گے اور معاملات حسب معمول چلتے رہیں گے آیئے آپ کے اپنے خطوط کی طرف سے:۔

ناز سلوش ذشے...... میر پور آزاد کشمیر۔ بعد از سلام محترم جناب عمران بھیا امید ہے مزاج برہم نہ ہوں گے۔ پچھلے ماہ مصروفیات کی وجہ سے خط نہ لکھ سکی۔ گو مصروفیات آج بھی اتنی ہی ہیں لیکن 28 دسمبر کے اس ابر آلود، بارش زدہ اور سرد ہواؤں سے بھرپور دن میں، میں سوائے لکھنے پڑھنے کے اور کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ سو قلم تھاما اور اپنے قارئین کے لیے لکھنے بیٹھ گئی کہ ان کی محبتوں کا قرض بھی تو اتارنا ہی ہے۔ جنوری 2013ء کا رسالہ مجھے سرپرائز کے طور پر ملا۔ میں چائنیز میڈیسن کمپنی سے ٹریننگ لے کر جو گھر آئی تو معلوم ہوا نئے افق ایک دن قبل سے میری چھوٹی سی بک ریک میں پڑا میرا انتظار کر رہا ہے سو حجاب اور عبایا اتارنے کا خیال دل سے نکال کر میں رسالہ پکڑ کر بیٹھ گئی۔ حسب معمول میں نے سب سے پہلے فہرست پڑھی اور اپنا گمشدہ ناول دیکھنے کے بعد مہینوں کی گلے میں اٹکی سانس بے ساختہ آزاد ہوئی۔ "شہر آزار" میرا اب تک کا پسندیدہ ناول ہے اور جس دن ہم نے اسے بلش ہوا پڑھا اس دن 25 دسمبر تھا اور اس میں لکھے خط بھی 25 دسمبر کے تھے۔ یعنی ٹھیک 54 سال بعد وہ خط آزاد کشمیر تو کیا پاکستان کے چپے چپے میں پڑھے گئے کتنی عجیب بات تھی کیا 54 سال قبل اس لڑکی کو علم ہوگا کہ نصف صدی بعد یہ خط کہاں ہوں گے؟ ویسے عمران بھیا آپ کی بہت بہت مہربانی کہ اس ناول کو جیسا لکھا تھا ویسے شائع کرنے کی گو کہ یہ نئے افق کا مزاج تو نہیں، مگر مجھے یقین ہے میرے قارئین کو میرا لکھنے کا یہ انداز بہت پسند آیا ہوگا۔ کہانیوں پر تبصرہ کیا کروں، بہت زیادہ سچائی سے اعتراف کروں گی کہ گھر میں 4,5 رسالے ماہانہ لگوا رکھے ہیں لیکن پڑھنے کا وقت نہیں ملتا ہاں، کبھی موڈ بن جائے تو سب پڑھ لیتی ہوں لیکن تب تک تبصرے کا وقت گزر چکا ہوتا ہے۔ گفتگو میں اس دفعہ صدارتی کرسی شہناز

ماما کے پاس تھی گریٹ، اس بار آپ بازی لے گئیں۔ کیسی ہیں آپ؟ ناراض مت ہوئیے گا بہت دن ہوئے آپ سے بات نہیں ہوئی۔ وہی میری نمبر تبدیل کرنے کی پرانی عادت......! اوہو آپ نے میرا نام چھپایا تھا۔ خیر ہے اب تو ظاہر ہو گیا لیکن آپ کے آنے شرط اب بھی قائم ہے آپ آئیں گی تو شادی...... ورنہ آزادی......! ابن مقبول انکل سلام قبول کیجیے گا۔ لیجیے اس ماہ "شہر آزار" حاضر ہے پڑھیے اور سچی داستان پر سچا تبصرہ لکھ بھیجیں۔ عبدالحکیم ساجد یاد رکھنے کا شکریہ۔ ارے میں کشمیری نہیں پنجابی ہوں اور آپ سے کس نے کہا کہ میں نرم و ہمدرد دل ہوں، ارے مجھ سے بڑا سخت دل کوئی نہیں، بس رب مجھے ہدایت دے آمین۔ مجاہد بھائی مزاج تو ٹھیک ہیں مگر موسم خراب ہے باقی کزن کی ڈیتھ کا افسوس تو سبھی کو ہے وہ گروہ پکڑا تو گیا ہے مگر لاتعداد مائیں اپنے بچوں سے محروم ہوگئی ہیں اور جس طرح کزن کو مارا گیا...... اتنے ماہ گزر گئے میں اپنے اندر ہمت جمع ہی نہیں کر پائی کہ آنٹی کو تسلی کے دو الفاظ کہوں، کوئی حرف ندامت، تسلی، تشفی......! ریاض حسین قمر! خدا آپ کی دعا میں برکت دے میری تو ایک خواہش ہے کہ کسی بھی طرح اپنی صلاحیتوں کو اس ملک و قوم کے لیے استعمال کروں۔ اسی مقصد کو سامنے رکھتے ہوئے میں نے ایک چائنیز کمپنی کو جوائن کیا ہے یعنی دنیا کی دوسری بڑی نیٹ ورک انڈسٹری میں شامل ہوگئی ہوں۔ اگر آپ بھی میرے نیٹ ورک سرکل میں شامل ہونا چاہیں تو نئے افق کے ذریعے خط لکھ کر مجھ سے معلومات لے لیجیے گا مجھے خوشی ہوگی۔ ریاض بٹ سنایئے کیسی طبیعت ہے آپ کی؟ آپ سب کی دعاؤں کا ثمر تھا کہ کہانی شامل اشاعت ہے۔ باقی رہا آپ کی بیماری کا حل تو وہ بھی مجھے مل گیا ہے۔ میں کوشش کروں گی کہ آپ سے کسی طرح رابطہ ہو جائے۔ سید عبداللہ شاہد صدارتی کرسی کا مزہ ہی اپنا ہوتا ہے لیکن یہ اسی کو ملتی ہے جو خط لکھنے اور بھجوانے میں پہل کرتا ہے میری نظم پسند کرنے کا شکریہ۔ شہنی کو کیا سمجھانا...... میں تو خود ان سے مشورہ لیتی ہوں۔ بات آپ دونوں کی ٹھیک تھی مجھے لکھنا نہیں آتا مگر آپ لوگوں کی محبت نے یہ ہنر بھی سکھا دیا۔ باقی رہی بات فارمولا اوپن کرنے کی تو اگر میرے اس فارمولے کو اپنا کر چند لوگ رائٹر بننے کی کوشش کریں گے بھی تو نقصان کس کا ہے۔ میری ارض وطن کو، نئے افق کو، ہم سب کو کچھ نیا پڑھنے کو ملے گا اور آپ کا تجزیہ مجھے اچھا لگا۔ "کم عقل مگر حد سے زیادہ پراعتماد لڑکی" یقین جانیے میں ایسی ہی ہوں خدا آپ کو خوش رکھے آمین۔

ریاض بٹ...... حسن ابدال۔ السلام علیکم! نئے سال 2013ء کا پہلا شمارہ نگاہوں کے سامنے ہے سرورق سے نظر ہٹانے کو جی نہیں چاہ رہا کیا دیدہ زیب اور سندر سندر سرورق ہے۔ یقین کریں بک اسٹال پر یہ سب سے منفرد نظر آرہا تھا۔ اشتہارات کو دل کی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے آگے بڑھے۔ فہرست میں اس بار پھر اس بندہ ناچیز کی کہانی موجود ہے شکریہ، مہربانی اور نوازش، عمران بھائی جس طرح آپ نے اور قارئین نے میری حوصلہ افزائی کی ہے اس کے لیے دل سے دعائیں نکلتی ہیں۔ دستک حسب معمول سوچ کے در وا کر رہی ہے۔ مشتاق احمد قریشی صاحب ہمارے سوئے ہوئے حکمرانوں کو جگانے کی سعی کر رہے ہیں لیکن لگتا ہے وہ چکنے گھڑے ہیں۔ گفتگو کے آغاز میں عمران صاحب یہ بتا رہے ہیں کہ گزرے سال میں ہم نے کھویا ہی ہے پایا کچھ نہیں یہ بات اپنی جگہ حقیقت پر مبنی ہے کہ ہم نے خود ہی انہیں منتخب کر کے اپنے اوپر مسلط کیا ہے۔ اب بات ہو جائے خطوط کی شہناز بانو بہن آپ کی والدہ ماجدہ کی وفات کے متعلق پڑھ کر بہت دکھ ہوا۔ خدا بزرگ و برتر مرحومہ کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے اور آپ کو اور باقی لواحقین کو صبر جمیل عطا فرمائے آمین ثم آمین۔ آپ بہت خوش نصیب ہیں کہ اپنے ہاتھوں سے اپنی پیاری ماں کو اگلے سفر پر روانہ کیا اور خود حج بیت اللہ کے لیے چلی گئیں۔ یہ خلا کبھی پر نہیں ہوتا میری آنکھوں میں بھی آنسو ہیں مجھے اپنی ماں یاد آگئی ہیں۔ انجم فاروق ساحلی صاحب یاد آوری کا شکریہ آپ اچھا لکھتے ہیں۔ بلکہ بہت اچھا لکھتے ہیں، ابن مقبول جاوید احمد صدیقی صاحب اس بار بھی آپ کو میری کہانی پسند آئی شکریہ۔ جلد ہی آپ سے ملاقات ہوگی اور یقین

جانیں آپ کی حوصلہ افزائی سے کافی ڈھارس ملتی ہے۔ عبدالحکیم ساجد آپ کی سوچیں اور باتیں بالکل سچ ہیں لیکن ہمارے حکمرانوں کو کون سمجھائے۔ لوگ تاریکی میں بیٹھے ہیں۔ چولہے ٹھنڈے ہیں ہر طرف خون اور بارود پھیلا ہے مگر......! میری کہانی دیرآید پسند کرنے کا شکریہ۔ عصمت اقبال عین بہن آپ نے بھی خوب لکھا اور میری کہانی کو پسندیدگی کی سند دی مہربانی۔ اللہ آپ کو خوش رکھے۔ مجاہد ناز عباسی ذوق آگہی میں میرا انتخاب آپ کو اچھا لگا یہ آپ کا حسن نظر اور اعلیٰ ظرف ہے۔ ریاض حسین قمر یاد آوری اور حوصلہ بڑھانے پر مشکور ہوں۔ فقیر محمد بخش لنگاہ صاحب میری بھی دعا ہے کہ ہمیشہ خوش و خرم رہیں اور آپ کی فیملی پر آپ کا سایہ سدا قائم رہے مجھ ناچیز کو اچھے لفظوں میں یاد کرنے اور رکھنے کا بے حد شکریہ اور کہانی کو پسند کرنے کا علیحدہ شکریہ۔ سید عبداللہ شاہد آف حیدرآباد کیسے ہو بھئی۔ ذوق آگہی میں میرا انتخاب آپ کو پسند آیا آپ کی بھی مہربانی اور عنایت اب کچھ بات ہوجائے کہانیوں کی گردش کی قسط حسب سابق کافی خوب صورت ہے۔ ہر موڑ پر تجسس اور تیزی نے بہت لطف دیا۔ مغربی ادب سے ترجمہ کہانیاں پسند آئیں۔ اس بار چار کہانیاں تھیں۔ ہمت نسواں' قربانی کا بکرا' جوابی حملہ اور چوٹ۔ چاروں لاجواب تھیں۔ سچ بیانیوں میں یوں تو سب ہی ایک سے بڑھ کر ایک تھیں لیکن انسانی فرض (صداقت حسین ساجد)' گڑھا (سلمٰی غزل) بدلہ (انجم فاروق ساحلی) خوب تر کہی جاسکتی ہیں۔ ناز سلوش ذشے بہن کا ناول شہر آزار آخر ملا بھی اور شائع بھی ہوگیا۔ زبردست ناول ہے اور لفظ لفظ محبت میں رچا ہوا ہے اور انجام کے کیا کہنے ویل ڈن بہن۔ اب پتا چلا کہ آپ اپنے اس ناول کے لیے اتنا پریشان اور مضطرب کیوں تھیں۔ آخر میں چلتے چلتے بات ہوجائے خوش بوئے سخن اور ذوق آگہی کی "سال نو" ریحانہ سعیدہ کا اچھا لگا۔ گیت بھی سید عبداللہ شاہد کا اپنا رنگ جما رہا ہے۔ باقی انتخاب میں عصمت اقبال عین' میثم علی آغا' محمد اسلم جاوید' قدیر رانا چھائے ہوئے ہیں۔ باقی کلام بھی اچھا ہے۔ ذوق آگہی میں بشیر احمد بھٹی' مرزا توصیف بیگ' مجاہد ناز عباسی' ریحانہ جاوید اور نیاز احمد کے انتخاب کے کیا کہنے۔ اب اجازت یار زندہ صحبت باقی۔

ریاض حسین قمر...... منگا ٹیم۔ محترم و مکرم جناب عمران احمد صاحب السلام علیکم! امید ہے مزاج گرامی بخیر ہوں گے آپ اور آپ کے ساتھی ماہ فروری کے نئے افق کی نوک پلک درست کرنے میں مصروف ہوں گے۔ ماہ جنوری کے نئے افق کا ٹائٹل بہت خوب صورت ہے۔ آپ کی اور مصور صاحب کی کاوشوں سے ٹائٹل دن بدن خوب صورت ہوتا جارہا ہے۔ دستک میں اس بار بھی محترم و مکرم جناب مشتاق احمد قریشی صاحب نے ارباب اختیار کو بہت کچھ سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ ان کو کوئی بات شاید اس وقت سمجھ آئے جب فرشتہ اجل ان کی پائنتی نمودار ہوجائے گا مگر اس وقت کچھ کرنے کا وقت گزر چکا ہوگا۔ ان کے دور حکومت میں مہنگائی کے جن نے بوتل سے نکل کر جس طرح بڑھکیں ماری ہیں اور دھما چوکڑی مچائی ہے۔ کسی آمر کے دور میں بھی ایسا نہیں ہوا ہوگا۔ ہمارے ہاں گیس کا سلنڈر دس بارہ دن چلتا ہے ایک بار سلنڈر لینے گیا تو قیمت بڑھ کر ساڑھے سولہ سو روپے ہوچکی تھی۔ دوسری بار لینے گیا تو دکاندار نے مژدہ سنایا کہ سلنڈر اب اٹھارہ سو روپے کا ہوگیا ہے ابھی جو سلنڈر لایا ہوں وہ انیس سو روپے کا ملا ہے۔ کسی ذلیل سے ذلیل ملک میں بھی چیزوں کے ریٹ اتنی تیزی سے نہیں بڑھتے ہوں گے آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا؟ ادھر چیزیں دن بدن مہنگی ہو رہی ہیں اور انسانی جان روز بروز سستی ہو رہی ہے ایک کنبے کے واحد کفیل بارہ سالہ غبارہ فروش بچے کو اس لیے گولی مار کر موت کی نیند سلا دیا گیا کہ اس نے خریدے گئے غبارے کی قیمت کے پانچ روپے خریدار سے مانگ لیے تھے۔ اس سے بڑھ کر انسانی جان کی ارزانی اور کیا ہوسکتی ہے۔ جہاں آلو' ٹماٹر' پیاز مہنگے دام بکتے ہیں۔ وہیں انسان کی ارزانیوں کا رقص جاری ہے۔ خداوند کریم ہمارے حال پر رحم فرمائے اور ہمیں اپنی حفظ و امان میں رکھے آمین۔ گفتگو میں محترمہ شہناز بانو صاحبہ کرسی صدارت پر براجمان تھیں۔ مگر ان کا خط مجھے بہت دکھی کر گیا۔ ان کی والدہ محترمہ کی وفات کا سانحہ ارتحال ان

کے مبارک سفر پر جانے سے پہلے پیش آیا یہی نظام قدرت ہے ایک گلی میں شہنائیاں بج رہی ہوتی ہے تو دوسری گلی میں ماتم بپا ہوتا ہے۔ شہناز آپی اپنے دلی دکھ کو لفظوں میں بیان نہیں کرسکتا۔ بس اتنا ہی کہہ سکتا ہوں کہ خدا آپ کی والدہ کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے اور آپ کو صبر جمیل عطا فرمائے آمین۔ انجم فاروق ساحلی صاحب نہایت مختصر خط کے ساتھ تشریف لائے مگر اچھی باتیں کیں۔ اس دفعہ ابن مقبول جاوید احمد صدیقی صاحب خلاف توقع مختصر خط کے ساتھ تشریف لائے ورنہ ان کا تبصرہ بڑا بھرپور ہوتا ہے۔ جناب عبدالحکیم ساجد صاحب آپ کی تشریف آوری کا شکریہ۔ اب باقاعدگی سے آتے رہیے گا۔ محترمہ عصمت اقبال عین صاحبہ ایک اچھے خط کے ساتھ گفتگو میں شامل ہوئیں۔ عین صاحبہ غزل پسند فرمانے کا شکریہ۔ کوشش کرتا ہوں کہ شاعری میں مقصدیت ہو۔ مجاہد ناز عباسی کا تبصرہ مختصر مگر جامع تھا۔ مجاہد بھائی غزل پسند فرمانے کا شکریہ۔ بزرگوار جناب فقیر محمد بخش صابر لنگاہ صاحب اپنے مخصوص انداز میں تبصرہ لے کر حاضر ہوئے اور انہوں نے سب ساتھیوں کی خیر خیریت دریافت فرمائی۔ محترم یاد فرمائی کے لیے بے حد شکر گزار ہوں۔ کسی قاری نے کیا خوب لکھا ہے کہ آپ اپنے نام کے ساتھ فقیر کا لفظ لکھتے ہیں۔ حالانکہ آپ ہمارے بادشاہ ہیں یہ انہوں نے گویا ہر قاری کے دل کی بات لکھی ہے سید عبداللہ شاہد صاحب بھی حسب سابق بھرپور تبصرے کے ساتھ تشریف لائے۔ شاہد بھائی غزل پسند فرمانے کا بہت بہت شکریہ۔ خوشبوئے سخن میں اس بار پروفیسر واجد نگینوی' رانا حنیف عاطر' قدیر رانا' میثم علی آغا کی غزلیں بہت اچھی تھیں نظموں میں محترمہ عصمت اقبال عین صاحبہ کا خیال مصور' ریحانہ سعیدہ صاحبہ کا نیا سال مبارک۔ سید عبداللہ شاہد کا گیت اور تنزیلہ ہاشمی کا نیا سال خوب رہیں۔ باقی جناب سمیع جمال' مجاہد ناز عباسی' صلاح الدین سحاب اور محمد اسلم جاوید کا کلام بھی قابل ستائش ہے۔ ذوق آگہی میں پورے کا پورا انتخاب لاجواب تھا۔ قسط وار سلسلے ایک سے بڑھ کر ایک ہیں اور باقی کہانیوں کا انتخاب بھی لاجواب ہے۔ جناب طاہر احمد قریشی صاحب نے احادیث کی روشنی میں ایمان کو تازگی بخشی اللہ تعالیٰ انہیں جزائے خیر عطا فرمائے آمین ثم آمین۔

مجاہد ناز عباسی...... سنجر پور۔ محترم جناب مشتاق احمد قریشی صاحب السلام علیکم! امید ہے کہ آپ صحت و ایمان کی بہترین کیفیت میں ہوں گے۔ مزاج و حالات بخیر و عافیت ہوں گے۔ میں نے کراچی کے حالات پر ایک دو آرٹیکل لکھے ہیں لیکن آج پتا چلا ہے کہ پورے پاکستان کا ایک ہی حال ہے پاکستان کے ہر بڑے شہر میں لوٹ مار' کرپشن' قتل و غارت گری' خودکش حملے' مسجدوں میں بم دھماکے شروع ہوگئے ہیں۔ دہشت گردی سے ملکی سیاحت کا بیڑہ غرق ہوگیا ہے پاکستان کو اگر بین الاقوامی سیاحتی نقشے پر دیکھنا ہے تو علاقائی سیاحت کو ترقی دینا ہوگی۔ پاکستان میں دنیا کی بلند ترین سر بکف چوٹیوں سر سبز و شاداب وادیوں' لہلہاتے کھیتوں' بل کھاتی ندیوں' جھاگ اڑاتے دریاؤں' گنگناتے جھرنوں' چمکتے دمکتے ریگزاروں' کشمیر جنت نظیر' موہن جو دڑو سے لے کر بدھ مت ادوار کی قدیم تہذیبوں' مغلیہ سکھ اور انگریزوں سمیت مختلف ادوار کی تاریخی عمارات' قلعوں اور عبادت گاہوں' چاروں موسموں' پھلوں اور رنگا رنگ ثقافت کے رنگوں کے باوجود اس شعبے کی مناسب سرپرستی نہ ہونے کی وجہ سے ہم نہ صرف اربوں ڈالرز کے زرمبادلہ سے محروم ہو رہے ہیں بلکہ ہمارے دشمن پاکستان کے خلاف جھوٹا پروپیگنڈہ کرکے اس کو بدنام کر رہے ہیں۔ خیر اب آتا ہوں رسالے کی طرف مشتاق انکل جب گاڑی کا انجن خراب ہو تو باقی کے پرزوں کا ٹھیک ہونا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ شہناز آپی بہت دکھ ہوا آپ کی والدہ محترمہ کا سن کر اللہ پاک آپ کی امی کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔ انجم فاروق ساحلی آپ کا تبصرہ کافی شارٹ تھا کیوں بھائی؟ محمد جاوید اسلم کیسے مزاج ہیں آپ کے۔ ابن مقبول جاوید احمد صدیقی کو محفل میں پاکر بہت اچھا لگا بھائی میں فروری کے شروع میں ان شاءاللہ آپ کے شہر آؤں گا ایک پیارے دوست کی شادی میں تو بھائی سے ضرور ملاقات کروں گا ویسے میرے پاس آپ کا نمبر نہیں ہے لیکن کسی

افق کے قاری سے لے کر آپ سے رابطہ کروں گا۔ اگلا نمبر عبدالحکیم ساجد بھائی کا تھا۔ بھائی آپ کو ابھی بھی مجھ سے شکایت ہے میں آپ سے کئی بار سوری تو کر چکا ہوں اگر اب بھی ناراضگی ہے تو پھر آپ جو سزا دینا چاہیں مجھے قبول ہے اور نظم پسند کرنے کا شکریہ۔ عصمت اقبال عین صاحبہ آپ کی باتیں ہمیں بہت گہری سوچ میں مبتلا کر دیتی ہیں۔ بس اپ اللہ سے دعا کیا کریں کہ ہمارے پاکستان کے حالات بہتر ہو جائیں اور بڑی خوشی ہوئی کہ آپ نے میرے مشورے کو سیریس لیں اور نظم پسند کرنے کا شکریہ۔ ریاض حسین قمر آپ نے ٹھیک کہا کہ حالات کے ساتھ سمجھوتا کرنے میں کیا ہماری بہتری ہے اور آپ نے کہا کہ ہماری شاعری میں وزن نہیں تھا در اصل میں شاعری صرف اپنے دل سے کرتا ہوں اب میں پوری کوشش میں ہوں کہ ایک نام ور شاعر سے اصلاح لوں۔ ریاض بٹ اللہ آپ کو اپنے حفظ و امان میں رکھے اور آپ یاد رکھتے ہیں بہت شکریہ۔ بابا جی بہت خوشی ہوئی کہ آپ نے اس ناچیز کو اپنا بچہ کہا اور آپ کا بہت مشکور ہوں آپ مجھے اتنی عزت دیتے ہیں جتنی دعائیں آپ مجھے دیتے ہیں شاید کوئی اپنی اولاد کو بھی نہ دیتا ہو۔ باقی باتیں تو آپ سے فون پر ہوتی رہتی ہیں۔ آپ کے لیے صرف اتنا ہی کہوں گا کہ اللہ پاک ہمارا ساتھ زندگی بھر قائم رکھے۔ سید عبداللہ شاہد دیکھا ہم نے ثابت کر دیا کہ ہم بھی کسی سے کم نہیں۔ آپ کو نظم ”بنا تیرے جینا“ پسند آئی اچھا لگا۔ اقراء میں جناب طاہر قریشی صاحب نے ہمیں بہت ہی قیمتی اسلامی تعلیم دی۔ خوش بوئے سخن میں ریحانہ سعیدہ، سید عبداللہ شاہد کی نظمیں اور عصمت اقبال عین، میثم علی آغا، قدیر رانا اور پروفیسر واجد نگینوی کی غزلیں بہت اچھی تھیں۔ ذوق آگہی میں ریاض بٹ، بشیر احمد بھٹی، ریحانہ جاوید اور توصیف بیگ کی تحریریں لاجواب تھیں۔ سچی کہانیوں میں انتقام قدرت (خلیل جبار) گڑھا (سلمٰی غزل) اور بدلہ (انجم فاروق ساحلی) کی کہانیاں بہت اچھی تھیں۔ شہناز آپی کی گردش ہمیشہ کی طرح اچھی لگی اور اب تو ابو جان بھی گردش کو باقاعدگی سے پڑھتے ہیں اور پھر میری طرح اگلی قسط کا بے صبری سے انتظار بھی کرتے ہیں۔ مغرب سے انتخاب، ناول اور گنگا کا پجاری ابھی زیر مطالعہ ہے۔

ابن مقبول جاوید احمد صدیقی...... راولپنڈی۔ اچھے عمران جی السلام علیکم! نئے سال کا خوب صورت اور بلند و بالا پہاڑوں کی طرح ارادوں کو آسمانوں تک پہنچانے کا خواب دینے والا ٹائٹل دل کو تو واقعی بھا گیا۔ دستک زبردست رہا۔ گفتگو میں آپ کا ایڈیٹوریل بھی سوچ کی لہر دے گیا۔ اللہ تعالیٰ ہمارے ملک پر رحم فرمائے اور عوام کے گناہ معاف فرمائے آمین۔ خطوط میں محترمہ شہناز بانو کا خط پڑھا حج کی مبارک باد کے ساتھ ساتھ والدہ محترمہ کی عظیم جدائی کے غم میں نڈھال ہم آپ کے غم میں برابر کے شریک ہیں۔ خدا تعالیٰ آپ کو صبر جمیل عطا فرمائے آمین۔ عمران جی نے شکایت کا ازالہ کر دیا اور معذرت بھی ہوگئی۔ میری جیسی ہستی کے لیے عرفات کے میدان میں آپ کی دعائیں ضرور قبول ہوں گی۔ میرا بڑا بیٹا اللہ کے فضل سے سیمنس (سعودی عرب) میں آرام کو میں انجینئر نگ منیجر ہو گیا ہے اور عمرہ کر کے دعائیں مانگ کر آج ہفتہ عشرہ سے ہمارے دلوں میں ٹھنڈک دینے کے لیے دو بیٹوں اور ایک بیٹی اور ہماری بہو رانی کے ساتھ تین چار ہفتہ کی رخصت پر آیا ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ سب کو نیک اولاد دے جو صدقہ جاریہ ہوا کرتی ہے۔ دونوں بہت اچھے بخیریت ہوں گے۔ سعد کا پنڈی کا ٹور نہیں لگا۔ موبائل نمبر آپ کو محترم عمران جی سے مل جائے گا بخدا بہن جی عبداللہ کی تحریروں پر تنقید غیر جانبدار ہو کر جو میں تمام لکھنے والوں کے لیے کرتا رہتا ہوں۔ انجم فاروق ساحلی جی انتہائی شاندار اور منفرد جاسوسی نما کہانی لا کر میرا تو دل آپ نے موہ لیا ہے۔ بہت مبارک لیں۔ عبدالحکیم ساجد یار شکر ہے کہ منچن آباد سے گمشدہ لوگ آنے شروع ہو گئے اور باقی غائب لکھاریوں (منچن آباد کے) کا انتظار ہے۔ ویسے تبصرہ میں آپ اس ناچیز کو بھول گئے؟ عصمت اقبال عین آپ کی شاعری سے تو مستفیض ہوتے رہتے ہیں اور مصوری کا کوئی شاہکار کیا ہمارے میگزین میں جلوہ گر ہو سکتا ہے۔ ہمیں نہ یاد کرنے کا شکریہ۔ مجاہد ناز عباسی یاد کرنے کا شکریہ۔

لٹنے کے بعد تو ”ہاہاہا“ اچھا لگا مگر آخر میں سردیا مبارک کے بعد ”ہاہاہا“ نہیں۔ بلکہ سی سی اور اف اف لکھنا چاہیے تھا۔ ہمارے ریاض حسین قمر جی غزل بہترین رہی اور ہمارے لیے الفاظ لکھے جن کا بے حد شکریہ آپ کا بڑا گہرا سنجیدہ اور پروقار تبصرہ ہم کو اچھا لگا آتے رہیے گا۔ اب محترم جناب عالی ریاض بٹ صاحب کو جھک کر سلام و آداب میرے لیے جو خیالات آپ نے ظاہر کیے ان کے لیے بے حد شکریہ۔ بھئی اس دفعہ کی کہانی بھی سب سے پہلے پڑھی اور زبردست تعریف کے جذبات پیدا ہوئے زبردست اور منفرد، ہر ماہ آیا کریں۔ محترم جناب فقیر محمد بخش صابر لنگاہ آپ لائق صد احترام ہیں اور یہ پرخلوص اور سچی فطرت رکھنے والے ہی کر سکتے ہیں۔ ملمع چڑھے چہرے منافقت جیسی تحریریں معرض وجود میں لاتے ہیں۔ صحت و درازی عمر کے لیے بے حد دعائیں۔ محمد اسلم جاوید شاعری تو پڑھتے ہیں تبصرہ اچھا تھا۔ باقی یہ شہنی ارشاد بہن اور دوسرے کہاں ہیں؟ آپ کی کہانی کا منتظر ہوں۔ ذرا عبداللہ شاہد کے مزاج پوچھ لیں۔ لوگوں کو کہانی نویسی اور اسٹوری رائٹنگ میں کیریئر بنانے کا جنون بھی ہوتا ہے مگر تحمل مزاجی، بردباری اور سوچ بچار اس کے لیے ترقی کے زینے ہیں۔ بڑے بڑے کامیاب لوگ، بڑے بڑے دماغ، بڑے بڑے ادیب و شاعر کبھی بھی تنقید اور لوگوں کی رائے پر تیخ پا ہوتے تھے اور نہ ہوتے ہیں۔ بدیسی کہانیوں میں سب سے اچھی ”چوٹ“ (اسرار احمد) کی رہی۔ یادگار کہانی ”جوابی حملہ“ راحیلہ تاج کا انجام صحیح معنوں میں دھما کا تھا وری گڈ۔ قربانی کا بکرا (نسیم سحر) خوب تھا اور طاہر قریشی صاحب کی بھی ہمت نسواں بڑی معاشرتی اور اس معاشرے کے عکس لیے کہانی تھی۔ سچی کہانیوں میں پہلے انتقام قدرت ایک روایتی اور بالکل عام واقعات پر مبنی کہانی تھی۔ تاثر نہ چھوڑا۔ سب سے زبردست اور بہترین کہانی رہی بہت اچھی تحریر اور کہانی کا ٹریٹمنٹ زبردست تھا۔ ہاں ساجد صاحب بے چارے وکیل صاحب کو 50 لاکھ منی آرڈر کروانے کے لیے 500 منی آرڈر چاہیے ہوں گے۔ (کیونکہ دس ہزار سے زائد ایک منی آرڈر نہیں جا سکتا) ویسے ضرور آیا کریں آپ کی تحریر قاری کو اپنے حصار میں لینے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ خالی ہاتھ تو اچھی کہانی رہی یعنی جیسے کو تیسا۔ مختصر مگر انتہائی زبردست اور انجام کتنا غیر متوقع رہا غیاث صاحب ہر ماہ آیا کریں۔ بدلہ کی تعریف خطوط کے جواب میں انجم جی کو دے چکا ہوں۔ انوکھی پلاننگ اور صبر آزما انتقام بھی منفرد قسم کا تھا اور آستین میں سانپ پالنے والی بات ہے۔ مگر یہاں ہر فرعون کے لیے ایک موسیٰ ضرور مقرر ہوا کرتا ہے۔ سلمٰی غزل کی کہانی گڑھا اچھی رہی اندھا دھند انتقام پر سوچے سمجھے بغیر عمل کرنے کی کہانی ثابت ہوئی۔ ہاں زیب داستاں کے لیے عدالت بھی خاص تھی۔ انجام کے متعلق خطوط میں لکھ چکا ہوں۔ ہاں اسی مخبر (گاؤں والی) نے ندیم کو بتایا ہوگا عرصہ دراز سے وارداتیں ہو رہی تھیں تو وہ گاؤں والی کے علم میں کس طرح سے آ گیا ہوگا اور ندیم بھی تمام معلومات اسی سے لے کر آیا تھا۔ باقی ریاض بھائی آپ جانیں اور آپ کا قلم۔ اب آیئے ناولٹ بائی ناز سلوش ذشے کی کہانی کی طرف۔ ہمیشہ کی طرح ناز کی یہ تحریر غم میں ڈوبی، تھوڑی تھوڑی کنفیوژن کا شکار ہیرو کا Hesitation جو غیر فطری عمل ہے تقریباً کہانی اسی طرح گھومتی ہے تاثرات سے بھرپور، خطوط میں فلسفہ محبت کی لامحدود فلسفیانہ تشریح اور مایوسی جو کسی بھی طریقہ سے ہمارے ہیرو کو متاثر نہ کر سکی۔ پھر صفحہ 244 سے یہ ماورائی واقعات کا سہارا کیوں لیا گیا۔ آم کہاں سے آئے کیا روبی کا کوئی اسٹور تھا اور وہ ماورائی شخصیت کون تھی جو چارپائی پر تھا اور کھڑکی کے باہر بھی موجود رہتا تھا۔ کیوں ان کرداروں کو زبردستی کہانی میں لایا گیا اور یہ داور (ص 245) یکدم کیسے ختم ہو گئے اتنی سی عمر میں؟ ہاں جب داور صاحب شادی سے کوسوں دور بھاگتے تھے یا اور 10,20 سال شادی کے لیے چاہتے تھے پھر باہر جا کر یکدم شادی پر آمادہ ہو گیا اور 8 سال میں بیوی بچوں والا ہو گیا کیوں روبی کے ساتھ ہچکچاہٹ کیا تھی اور آخری خط میں محبت کا اعتراف بھی کر لیا۔ یہ بے وفائی کی انتہا ہے۔ آخر میں ایک نظم اور دو طویل آزاد نظموں سے تین چار صفحے اور بڑھ گئے۔ ایسے بے وفا، منافق اور بے ایمان شخص داور کے لیے یہ

تمام مصرعے تازیانہ ہیں۔ ہاں اس کا ذرا واضح کردیں کہ (ص 225) چار بھائی اور دو بہنیں تھی پھر تین بڑی بہنیں اور دو بڑے بھائی شادی شدہ تھے (یہ تین اور دو پانچ ہوئے) پھر داور بھائی تھے پھر میں اور آخر میں عمر عزیزی۔ (یہ تین ہوئے) اس کا مطلب آٹھ بہن بھائی ہوئے پھر چھ کیسے ہوگئے؟ ایک چیز لکھوں گا کہ کاوش زبردست تھی اور ناولٹ لکھنے کی کوشش بھی کی گئی ہے آپ حوصلہ رکھیں اور اپنی نگارشات اسی طرح بھیجتی رہیں کیونکہ پھر بھی ایک کہانی پڑھنے کو مل جاتی ہے۔ میں تہہ دل سے مبارک باد بھی دیتا ہوں ہاں دونوں سلسلے زیر مطالعہ اور خاص طور پر گردش ان شاء اللہ اگلے ماہ ان پر تبصرہ ہوگا جی ہاں۔ اقراء میں توکل اور رضا بالقضا پر ایمان افروز احادیث ایمان کو تازہ کر گئیں طاہر قریشی صاحب کو اللہ جزا دے آمین۔ روحانی علاج خوب خدمت کررہا ہے اس دفعہ 19 خطوط صنف نازک اور صرف تین خطوط بے چارے صنف جاں فزا کے تھے کیوں جی؟ خوش بوئے سخن میں ریحانہ سعیدہ اور تنزیلہ ہاشمی چھا گئیں اور آزاد نظم کے حوالے سے گیت زبردست تھا۔ شاہد کو مبارک باد۔ غزل میں میثم علی آغا، ریاض حسین قمر اور عصمت اقبال عین ٹاپ پر رہی باقی بے حد اچھی رہیں۔ صفحہ 117 پر صدف ہمشی اور صفحہ 49 پر سلیم احمد بخاری بھی زبردست نظمیں لائے تھے اور ذوق آگہی میں سب اور ہر ایک اچھے ذوق کے مطابق اقتباسات اور تحریریں تھیں۔ عفان احمد کی کاوش سراہنے کے قابل ہے۔ معیار بھی بے حد اچھا ہوگیا ہے۔ سلام اور دعاؤں کے ساتھ۔

انجم فاروق ساطی...... لاہور۔ امید ہے آپ اور ادارہ کے دیگر احباب بخیر و عافیت ہوں گے۔ کل کراچی کینٹ اسٹیشن کے پاس ایک بس میں دھماکہ سے کافی جانی مالی نقصان ہوا اس کا احوال دیکھ کر دکھ ہوا نا معلوم کتنے منفی گروپ ملک کے در پے ہیں۔ نئے افق ایک عرب علاقے کے منظر کے ساتھ جلوہ گر ہوا۔ اقبال جرم کے بعد بدلہ شائع کرنے کا شکریہ۔ اس بار فہرست کا ڈیزائن خوشنما اور جاذب نظر تھا۔ پہلا خط حج سے واپسی پر باجی شہناز بانو صاحبہ کا تھا۔ ان کی دعاؤں کا شکریہ۔ ابن مقبول جاوید احمد صدیقی و دیگر تمام قارئین کا مشکور ہوں جنہوں نے اقبال جرم کو سراہا۔ محمد بخش صابر لنگاہ اور سید عبداللہ شاہد صاحب طویل خط ایک بھرپور اور جامع کاوش تھی۔ تذکرہ قلم بند کرنے کا بے حد شکریہ۔ ہمت نسواں، قربانی کا بکرا، جوابی حملہ، چوٹ، انجام گردش، شہر آزار بھی تحریریں اچھی تھیں۔ نئے افق کا کاغذ کئی جرائد سے کم قیمت ہونے کے باوجود بہتر تھا اس سلسلے میں عمران صاحب کی جرأت قابل داد ہے۔ اس ماہ اداریہ گفتگو قابل غور تھی۔

سید عبداللہ شاہد...... حیدر آباد۔ محترم جناب من عمران احمد صاحب السلام علیکم ورحمہ۔ خدائے مطلق سے امید ہے کہ آپ خیریت سے ہوں گے اور ہمارے رسالے "نئے افق" کی تمام وحدتوں، وسعتوں اور جہتوں کی زرخیزی اور ترقی کے لیے رسائل و جرائد کی دنیا میں مصروف عمل ہوں گے۔ ابتدائے تحریر آپ کو اور احباب مجلس کو نئے سال کی آمد پر نیک اور پرخلوص خواہشات اور تمنائیں پیش کرتا ہوں اور مدیر معاون اقبال بھٹی، محترم حسن اختر پریم، برادر عفان احمد، محترم طاہر قریشی اور محمد اسرار کی خدمت میں اور دیگر دوست و احباب کے لیے سلام عرج کرتا ہوں۔ ساتھ ہی قبلہ و کعبہ محترم مشتاق احمد قریشی کے گوش گزار یہ غم ناک اطلاع دے رہا ہوں کہ 24 دسمبر بروز پیر صبح کے وقت میرے ہم رکاب و دم ساز اور ہر دل عزیز شخصیت کے مالک میرے پیارے بہنوئی شوقین شاہ رضائے الٰہی سے انتقال فرما گئے ان کی اچانک موت سے جو دکھ و صدمے کی حالت میں دل گرفتگی محسوس کرتا ہوں اسے لفظوں میں بیان نہیں کرسکتا۔ آپ سے خواستگار ہوں کہ میرے مرحوم بہنوئی کی مغفرت اور بخشش کے لیے دعا فرمائیے کہ خداوند پاک ان کو اپنے جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے اور ان کے پسماندگان کو صبر کاملہ و عاجلہ عطا فرمائے آمین۔ نیا سال 2013ء کا پہلا پرچہ اپنے حسین و جاذب نگاہ سرورق کے ساتھ 19 دسمبر کو مل گیا تھا بہت۔ بہت شکریہ بھائی عمران احمد۔ گزشتہ خط میں اسٹوری رائٹنگ کی بابت کچھ گلہ شکوہ کیا تھا اور یکبارگی جرأت رندانہ کا مرتکب ہوا تھا۔ شاید اسی وجہ سے

حکم حاکم کے تقاضوں کو پورا کرنے کی سعی اب تک جاری ہے اعزازیہ کی ترسیل ایک سے ڈیڑھ ماہ کا فرق بیان کررہی ہے۔ مرے کو سو درے مارو کے مصداق گزشتہ سال گزارا ہے اور نئے سال کی شروعات پر احسان ہو رہا ہے کہ طرح طرح کی صعوبتوں کا یہ جاں گداز سلسلہ جاری رہے گا۔ بہنوئی کی بے وقت فوتگی میرے دل و ذہن پر پہلا چرکا ہے اور غم روزگار کے سارے ولدر تو مرتے دم تک مجھ کو جلانے کا تہیہ کر بیٹھے ہیں میں اپنے بھائی عمران احمد کے توسط سے نئے افق کے قارئین اور لکھاری بہن اور بھائیوں، دوستوں اور ساتھیوں سے دعاؤں کی درخواست کرتا ہوں کہ آپ سب میرے لیے دعا کریں کہ خدائے مطلق مصائب کے ان لمحات میں مجھے ثابت قدم رکھے اور مرحوم کے لواحقین کی ذمہ داریوں کو پورا کرنے میں مدد فرمائے آمین۔ اب تازہ شمارے کی ان چیدہ چیدہ تحریروں کے بارے میں رائے زنی کرتا چلوں جنہیں محدود وقت میں پڑھ سکا ہوں پہلے گرین کلر ٹائٹل پر بہتی چٹانی آبشار پر اور اس کی خوش منظری سے محظوظ ہوا اور پھر خوب صورت فہرست پر دوست احباب کی سچ بیانیوں کا جائزہ لیا اس مرتبہ خلیل جبار کے ساتھ مشاق قلم کے حامل صداقت حسین ساجد کی تحریر "انسانی فرض" کو شامل اشاعت کیا گیا تھا اور پھر کچھ وقفے کے بعد سلمٰی غزل کی تحریر "گڑھا" بھی موجود تھی۔ گزشتہ برس رسالے میں نئے مصنفوں کو متعارف کرانے کا سلسلہ امید افزا نہیں تھا لیکن 2013ء کی شروعات میں خلیل جبار، نوشاد عادل اور ان کے بعد صداقت حسین ساجد کی اسٹوری کو سچی کہانیوں کے سلسلے میں پیش کیا گیا ہے اس لحاظ سے مختلف اسلوب اور متنوع انداز تحریر رکھنے والے لکھاریوں کی رسالے میں شمولیت اچھے اور معیاری ادب کی طرف خوش آئند قدم ہے امید ہے اس سال مزید کچھ اور ادیبوں کو متعارف کرایا جائے گا۔ اس دفعہ کی "دستک" کا عنوان خاصا پر معنی تھا۔ بابا مشتاق قریشی ایوان بالا کے غافل حاکموں کو بیدار کرنے کے لیے ٹھیک ٹھاک چوٹ کرتے ہیں۔ اس مرتبہ اقراء کے روشن صفحات میں محترم طاہر قریشی گزشتہ سے پیوستہ موضوع "توکل" اور رضا بالقضا کو احادیث 245 اور 246 کی عام فہم اور سہل لفظوں میں تشریح بیان کررہے تھے۔ ان کے مواعظ کو غور و فکر سے سمجھنے کی سعی کی جس سے کسی مسلمان کے یقین کی حقیقت سے علم و آگہی ہوئی۔ قریشی صاحب ایک الجھن آمیز بات ظن و تخمین میں بے قراری پیدا کردیتی ہے اور وہ یہ کہ عام مشاہدے کی بات ہے مال و اسباب کی موجودگی اور زیادتی ہمارے یقین کی حالتوں کو یوں دوغلا دیتی ہے کہ ہم اچھی اور بری تقدیر کے خود دعوے دار اور مطلق العنان بن جاتے ہیں اور سارے جہانوں کے خالق و مالک اللہ کی ذات محض رسماً نام کی گردان بن کر رہ جاتی ہے۔ دوم ہم یقین کے راستے پر چلنے کے بجائے مال و اسباب سے بنانے کے یقین پر عمل پیرا ہونے کو عملاً قولاً ترجیح دیتے ہیں صرف اس گمراہ کن سوچ کے تحت کہ ہمیں اللہ کی قدرت سے بڑھ کر اپنی قدرت و اختیار کا جنون اور نشہ مرغوب ہوتا ہے (معاذ اللہ)۔ بجیا شہناز بانو مسند اول پر براجمان محفل کی صدارت فرما رہی تھیں اور فریضہ حج کی روداد کو نم آلود لہجے میں بیان کررہی تھیں۔ بجیا، خوشی اور سعادت مندی کے احساس میں یکبارگی غم اور صدمہ آ ملے تو انسان کا دل محض جذبات کا محور و مرکز رہ جاتا ہے۔ اس کی عمر بھر کی مشقت و ریاضت ہاتف اجل کے ہاتھوں کھلونا بن جاتی ہے کہ وہ کیسے اور کب اس کھلونے سے اپنی مرضی سے کھیل کھیلتا ہے آپ کو حج کی سعادت بہت بہت مبارک ہو۔ آپ نے میرے لیے خانہ کعبہ اور مدینہ منورہ میں ڈھیروں دعائیں کیں یہ پڑھ کر میں دل پر گرتے آنسوؤں کو محسوس کررہا تھا کہ کوئی سگا اور اپنا بھی اس خلوص کا روادار نہیں ملتا جس کا اظہار آپ کے لفظوں سے ہو رہا تھا۔ میری محبوب بجیا ساتھ ہی آپ کی والدہ کی رحلت سے اس تفخر آمیز خوشی میں دکھ اور غم کی کیفیت نے حالت سکر سے دوچار کردیا یہاں گزشتہ ہفتے میرے بہنوئی بھی چل بسے ہیں اس لیے دل و ذہن پر حزن و ملال اور افسردگی کا احساس پھیلا ہوا ہے آپ کا اور میرا دکھ ایک ہوگئے ہیں۔ اشکوں میں بھیگے اس ماحول میں کس کا کیسے پرسا کریں۔ کچھ سجھائی نہیں دیتا بہر طور اللہ تعالیٰ آپ کی والدہ کی مغفرت

فرمائے اور آپ کو صبر عین عطا فرمائے آمین۔ مزید یہ کہ آپ ابن مقبول صدیقی صاحب کے تند و تیز تبصرے ملاحظہ کر رہی ہیں لیکن میں مسلسل صبر و ضبط سے کام لے رہا ہوں۔ محض آپ کی تاکید کی وجہ سے لیکن صدیقی صاحب کی گوشمالی کا سلسلہ نہ رکا تو کیا مجھے ان کی تنقید برائے تنقید کا جواب نہیں دینا چاہیے؟ خیر چھوڑیں' مجھے صاحب متمول کے امتیازی اور متعصبانہ تبصروں کی پروا نہیں ہے' محض آپ کی پر خلوص اپنائیت اور خاطر طبع پر جی لوں گا بجیا۔ میری طرف سے بھائی صاحب اور شہاب واسد کو بھی حج کی بہت بہت مبارک باد دیجیے گا۔ انجم فاروق ساحلی وحشی کو پسند کرنے کا شکریہ۔ لنگاہ صاحب تو اپنی بزرگانہ شان کی وجہ سے دوست واحباب میں بادشاہ تو ہیں بلا تردد کے لیکن تم اس وقت ''نئے افق'' میں متواتر چھپنے کی وجہ سے کسی پر تمکنت شہزادے سے کم نہیں لگ رہے ہو' پانچوں انگلیاں گھی اور سر کڑاہی میں ہے تمہارا۔ ہفت اقلیم کے منتخب شہزادے کو یکے بعد دیگرے کہانیوں کی اشاعت پر مبارک باد لیکن میری طرف سے انہیں دوستانہ مشورہ ہے کہ انہیں تیز رفتاری کی بجائے معتدل رویے سے کام لینا چاہیے اور سنجیدگی اور بردباری سے رائے زنی کرنا چاہیے کیونکہ شہزادوں کو بے جا تحکم مزاجی اور نزاکت سے موقع پرست درباری لوگ فائدہ اٹھالیتے ہیں۔ محمد اسلم جاوید اور عبدالحکیم ساجد' جاندار و بے مثال تبصرے کے ساتھ محفل میں شریک ہوئے تھے۔ گزشتہ سال اور حالات حاضرہ پر دونوں نے اپنے تئیں فکر و تدبر کا اظہار کیا۔ ''وحشی'' کو پسند کرنے اور اس پر رائے دینے کا شکریہ۔ ساجد میاں گفتگو میں عرصے بعد آئے ہو اور محفل میں باقاعدگی سے شریک نہیں ہوتے کیوں میاں؟ برادر ریاض حسین قمر کیا بات ہے آپ کی اپنے بھرپور تبصرے میں دوست احباب سے بہت کچھ کہہ گئے لیکن مجھ ناچیز کو سلام تک نہیں لکھا۔ شاید ہماری تعلقات داری کو بدخواہوں کی نظر لگ گئی ہے اس دفعہ کی غزل میں ڈاکٹر علامہ اقبال کی ضرب کلیم کے زیر و بم اشعار میں گونجتے محسوس ہوئے۔ آپ کی غزلیں صوفیانہ مزاج کی حامل ہوتی ہیں اس لیے لاجواب ہوجاتا ہوں۔ محترم ریاض بٹ آپ کے تو مزے آگئے ہیں یار من! تبصرہ کرتے وقت آپ کے لفظ لفظ میں وفور جذبات کی خوشی محسوس ہورہی تھی اور جملے چہکتے مہکتے سنائی دے رہے تھے۔ محترم اس مرتبہ بھی ''انجام'' کے عنوان سے اسٹوری کو انوسٹی گیٹ کیا ہے اور مزید باور کرا رہے ہیں کہ سیریز کی پانچ کہانیاں مدیر کی میز پر پہنچادی ہیں۔ بہت شاندار پرفارمنس ہے آپ کی بٹ صاحب بقول میڈم نور جہاں کے ابھی تو میں جوان ہوں...... ٹھی ٹھی ٹھی۔ ذوق آگہی میں ''طاقت'' اچھا اقتباس ہے اب جبکہ کہانیوں کا اسٹاک دے چکے تو شاعری میں بھی طبع آزمائی کیجیے جناب آپ کی غزلیں اور نظمیں پڑھے ہوئے عرصہ ہوچلا ہے؟ اس بار میرے گیت اور میری کہانی کو پسندیدگی کی سند سے نوازنے کا بہت شکریہ بٹ صاحب۔ عصمت اقبال عین تم نے خلاف معمول میری عدم موجودگی کو محسوس کیا اس پر خلوص یاد آوری سے میرا دل بڑا ہوگیا ورنہ فی زمانہ سیل فش ہوکر ہم صنانیت اختیار کرلیتے ہیں کوئی بغیر حرص و ہوس کے دوسرے کو یاد نہیں کرتا۔ وحشی اور گیت کو پسند کرنے پر تہہ دل سے مشکور ہوں۔ اس بار کی تمہاری غزل بھی معیاری اور بے حد شاندار ہے۔ الوہی جذبوں کا نپے تلے لفظوں میں خوب صورت اظہار ہے۔ تم شاید ترقی پسند شعرا کرام کو پڑھتی رہی ہو اس لیے شعری نشستوں میں آہنگ اور پختگی کا امتزاج پڑھتے ہوئے دل موہ لے لیتا ہے۔ مجاہد ناز عباسی' محفل میں اچھا تبصرہ لے کر آئے تم۔ وحشی کو پسند کرنے کا شکریہ' تمہارے خط سے لگتا ہے کہ بڑی فرصت میں رہتے ہو پہلے کراچی سیر سپاٹے کی غرض سے نکل گئے اب منچن آباد میں احمد علی کیف سے دوست داری بڑھاتے نظر آرہے ہو۔ دوستوں سے میل جول اچھی بات ضرور ہے لیکن ایسے دوستوں سے جو مخلص اور دم ساز ہوں ورنہ وقت کا زیاں ہے۔ تمہاری غزل میں نو آموزی کا احساس ہوتا ہے۔ ابن مقبول صدیقی! میری کہانی وحشی پر تنقید نہیں کررہے تھے بلکہ موصوف میرا دل جلا رہے تھے۔ فقیر محمد بخش لنگاہ صاحب بڑی ہمتوں اور جراتوں سے عمران احمد سے گلے شکوے کررہے ہیں اولڈ ایج ہونے کے باوجود آپ کی ہمتوں

کو سلام کرتا ہوں۔ بزرگوار میری کہانی وحشی پر رائے زنی کا شکریہ۔ آپ کی صحت و سلامتی کے لیے دعا گو ہوں۔ ان دوست واحباب کے علاوہ بہت سے شرکائے محفل اپنی کمی کا احساس دلا رہے تھے۔ شہنی ارشاد تمہارے کچھ ڈیوز میرے ذمہ باقی ہیں لیکن تم قل لڑائی کے موڈ سے اچانک فل سائی لنٹ ہوگئیں۔ تمہاری اسٹوری بھی پڑھنے کو نہیں مل رہی ہے اور شاعری بھی نہیں ہے اس بار؟ عالیہ انعام الٰہی بھی گاہے بگاہے خلوت نشین ہوجاتی ہیں۔ وہ بہت اچھی تبصرہ نگار اور نقاد ہیں اس لیے انہیں محفل میں حاضری دینا چاہیے۔ عبدالمالک کیف اور محمد فہد بھی غیر حاضر ہیں۔ ناز سلوش ذشے کا معرکتہ الآرا ناول ''شہر آزار'' شامل اشاعت ہے اس لیے ذشے کی عدم موجودی کی تلافی ہوجاتی ہے۔ باقی نئے افق ابھی نصف پڑھنا باقی ہے وقت کی سرعت کا بھی اندیشہ رہتا ہے۔ اس لیے بھائی عمران احمد پرچے کے باقی ڈیوز اگلے ماہ پر رکھ رہا ہوں۔ اللہ آپ کو حفظ وامان میں رکھے آمین۔ والسلام

فقیر محمد بخش صابر لنگاہ...... خانیوال۔ ہم سب لوگ ممبران نئے افق ڈائجسٹ کنبائے لنگاہ مع بزرگوار فقیر محمد بخش صابر لنگاہ کے خداوند کریم کے فضل و کرم سے خوش باش اور خیر و خیریت سے ہیں اور آپ سب دوستوں عزیزوں قارئین' بہن بھائیوں اور ادارہ نئے افق کی خیر خیریت کی صدق دل سے دعا کرتے ہیں۔ پیارا ماہنامہ نئے افق 2012-12-20 کو پا کر دلی خوشی ہوئی۔ محترمہ شہناز بانو کی والدہ کا پڑھ کر دلی افسوس ہوا۔ اللہ تبارک وتعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ مرحومہ کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام نصیب فرمائے اور لواحقین کو صبر جمیل عطا فرمائے اور شہناز بانو اور دیگر احباب کو حج کو بہت بہت مبارک ہو۔ شہناز بانو صاحبہ کی ''گردش'' کا مطالعہ کیا۔ گردش کو جس طرح بانو صاحبہ نے سجاوٹ و روانی' تیزی و میلان' قانون ولاقانونیت' سیاسی ہتھکنڈے اور کبھی خوشی کبھی غم کی طرح روانی بخشی ہوئی تھی اور ہے نے دن میں خواب کا سماں سا باندھ دیا۔ محترم ساحلی صاحب فقیر کو فقیر ہی رہنے دو۔ باقی جو آپ نے عزت دی ہے اس کے لیے دلی طور پر شکر گزار ہوں اور دعا گو ہوں کہ اللہ پاک آپ کو دن دگنی رات چوگنی ترقی عطا فرمائے۔ محترم وعزیز برادر جناب ابن مقبول جاوید احمد صدیقی صاحب آپ کی یاد آوری پر دلی شکریہ آپ کے قلم اور زور بیان میں آج کل مختصر پڑھنے کو مل رہا ہے خیریت ہے صحت تو ٹھیک ہے نا آپ کے لیے دعا گو ہوں۔ ریاض حسین قمر صاحب جو خود محبت کرنے والا ہو وہ دوسروں کو بھی محبت کرنے والا سمجھتا ہے آپ کی پیار بھری یاد اور دل سے نکلی ہوئی دعاؤں کا میں تہہ دل سے شکر گزار ہوں۔ آپ کے محبت نامے نے دل خوش کردیا۔ ریاض بٹ صاحب اچھی تحریر کو اچھا ہی کہا جائے گا اور اس دفعہ کی آپ کی تحریر ایک سبق آموز تحریر تھی پسند آئی۔ اقراء طاہر قریشی صاحب کے دینی سبق نے دل کو روشنی سے منور کردیا۔ اگلے سبق کا انتظار رہے گا۔ بلاوا (محترم خورشید پیرزادہ) اور گنگا کا پجاری (اے حمید) مبارک باد قبول کیجیے۔ سحر رنگ جادوئی انداز تیزی و میلان میں برقراری اور خواب سی تحریریں کہ جاگیں گے تو سب کچھ ختم زندہ کے لیے دعائیں اور سلام اور مرحوم کے لیے بخشش کی دعا اور ادارہ کے لیے کامیابی و کامرانی کی دعا۔ محترمہ ریحانہ سعیدہ صاحبہ نظم سال نو پر مبارک باد اور ذوق آگہی میں صدارتی کرسی اللہ تعالیٰ کی فرماں برداری اقتباس مرزا توصیف بیگ نے پیش کرکے حاصل کی مبارک باد پیش خدمت ہے قبول کرو اور دعائیں باقی شامل سب کو بھی سلام محبت۔ باقی اس ماہ کی گفتگو خوش بو سخن' ذوق آگہی' تراش خراش اور سچ بیانیوں میں کافی بہن بھائیوں کی غیر حاضری تھی یا غیر حاضری کروادی گئی کو دل سے محسوس کیا گیا۔ ہم سب کی طرف سے دلی سلام اور دعائیں۔ والسلام

اقراء

ترتیب: طاہر قریشی

توکل اور رضا بالقضا:۔

اس تمہید کے ذریعے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے مخاطبین کے ذہنوں کو بیدار اور متوجہ کیا اور اس کے بعد وہ خاص بات ارشاد فرمائی جس کا حاصل یہی ہے کہ ہر شخص کا رزق مکرب اور مقدر ہو چکا ہے وہ مرنے سے پہلے پہلے اس کو مل کر رہے گا اور جب معاملہ یہ ہے تو آدمی کو چاہئے کہ اگر روزی میں کچھ تنگی اور تاخیر بھی ہو جب بھی وہ اس کے حاصل کرنے کے لیے کوئی ایسا قدم نہ اٹھائے جو اللہ تعالیٰ کی مرضی کے خلاف ہو اور جس میں اس کی نافرمانی ہوتی ہو بلکہ اللہ تعالیٰ کی رزاقیت پر یقین رکھتے ہوئے صرف حلال اور مشروع طریقوں ہی سے اس کے حاصل کرنے کی کوشش کرے، کیونکہ اللہ کا فضل و انعام اس کی فرمانبرداری اور اطاعت شعاری ہی کے راستہ سے حاصل کیا جاسکتا ہے۔

اس کو ایک جزوی مثال کے انداز میں آسانی سے یوں سمجھا جاسکتا ہے کہ فرض کیجئے اللہ کا کوئی بندہ تنگ دستی میں مبتلا ہے اور اس کو اپنا پیٹ بھرنے کے لیے کچھ پیسوں کی ضرورت ہے، اس موقع پر وہ ایک شخص کو دیکھتا ہے کہ وہ سو رہا ہے، شیطان اس کے دل میں وسوسہ ڈالتا ہے کہ اس سونے والے شخص کی کوئی چیز اٹھالے اور ابھی ہاتھ کے ہاتھ بیچ کر روزی حاصل کرلے، ایسے وقت کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ تعلیم ہے کہ یقین رکھو جو روزی تم کو پہنچنے والی ہے وہ پہنچ کر رہے گی پھر کیوں چوری کر کے اپنے اللہ کو ناراض، اپنے ضمیر اور اپنی روح کو ناپاک اور اپنی عاقبت کو خراب کرتے ہو، بجائے چوری کرنے کے کسی حلال اور جائز ذریعہ سے روزی حاصل کرنے کی کوشش کرو، حلال کا میدان ہرگز تنگ نہیں ہے۔

(۲۴۷)

(ترجمہ) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، بیان کرتے ہیں کہ:۔ (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں) اللہ کا ایک بندہ اپنے اہل و عیال کے پاس پہنچا جب اس نے ان کو فقر و فاقہ کی حالت میں دیکھا تو (الحاح کے ساتھ اللہ سے دعا کرنے کے لیے) جنگل کی طرف چل دیا، جب اس کی نیک بی بی نے دیکھا (کہ شوہر اللہ تعالیٰ سے مانگنے کے لیے گئے، تو اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم پر بھروسہ کر کے اس نے تیاری شروع کر دی) وہ اٹھ کر چکی کے پاس آئی اور اس کو تیار کیا (تاکہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے کہیں سے کچھ غلہ آئے تو جلدی سے اس کو پیسا جاسکے) پھر وہ تنور کے پاس گئی اور اس کو گرم کیا (تاکہ آٹا پس جانے کے بعد پھر روٹی پکانے میں دیر نہ لگے) پھر اس نے خود بھی دعا کی اور اللہ تعالیٰ سے عرض کیا کہ اے مالک! ہمیں رزق دے:۔ اب اس کے بعد اس نے دیکھا کہ چکی کے گرداگرد آٹے کے لیے جو جگہ بنی ہوئی ہے (جس کو چکی کا گرانڈ اور کہیں کہیں چکی کی پھر کی کہتے ہیں) وہ آٹے سے بھری ہوئی ہے پھر وہ تنور کے پاس گئی تو دیکھا کہ تنور بھی روٹیوں سے بھرا ہوا ہے (اور جتنی روٹیاں اس میں لگ سکتی ہیں، لگی ہوئی ہیں) اس کے بعد اس کا شوہر واپس آیا اور بیوی سے پوچھا کہ میرے جانے کے بعد تم نے کچھ پایا؟ بیوی نے بتایا کہ ہاں! ہمیں اپنے پروردگار کی طرف سے ملا ہے (یعنی براہ راست خزانہ غیب سے اس طرح ملا ہے) یہ سن کر یہ بھی چکی کے پاس گئے (اور اس کو اٹھا کر دیکھا یعنی تعجب اور شوق میں غالباً

اس کا پاٹ اٹھا کر دیکھا) پھر جب یہ ماجرا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ذکر کیا گیا تو آپ نے ارشاد فرمایا کہ معلوم ہونا چاہئے کہ اگر یہ اس کو اٹھا کر نہ دیکھتے تو چکی قیامت تک یونہی چلتی رہتی اور اس سے ہمیشہ آٹا نکلتا رہتا۔

(مسند احمد)

(تشریح) اس روایت میں جو واقعہ نقل کیا گیا ہے وہ خوارق کے قبیل سے ہے، اس دنیا میں عام طور سے اللہ تعالیٰ کی عطائیں اسباب ہی کے سلسلہ سے ملتی ہیں لیکن کبھی کبھی اللہ کی قدرت کا یہ تماشا بھی ظہور میں آتا ہے کہ عالم اسباب کے عام دستور کے خلاف براہ رست اللہ کی قدرت سے ایسے واقعات ظاہر ہوتے ہیں ...... بیشک اللہ تعالیٰ جو زمین و آسمان کا پیدا کرنے والا ہے، اس کے لیے یہ کچھ بھی مشکل نہیں...... پھر اس قسم کے واقعات اگر اللہ کے کسی پیغمبر کے ہاتھ پہ ظاہر ہوں تو ان کو معجزہ کہا جاتا ہے اور اگر ان کے کسی متبع امتی کے ہاتھ پہ ایسے واقعہ کا ظہور ہو تو اس کو کرامت کہا جاتا ہے۔

ان دونوں میاں بیوی نے اللہ تعالیٰ پر پوری طرح یقین کر کے اس سے روزی مانگی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا کو اس طرح قبول کیا کہ خارق عادت طریقہ سے ان کے لیے روزی کا سامان بھیجا، غیب سے چکی میں آٹا آ گیا اور تنور میں روٹیاں لگ گئیں۔

جو لوگ یقین اور توکل کی دولت سے محروم اور اللہ کی قدرت کی وسعتوں سے ناآشنا ہیں ان کے دلوں میں شاید اس قسم کی روایات پر شبہات اور وساوس پیدا ہوتے ہوں لیکن اللہ کے جن بندوں کو یقین و توکل اور اللہ تعالیٰ کی صفات کی معرفت کا کچھ حصہ ملا ہے ان کے لیے تو ایسے واقعات میں کوئی اچنبھے کی بات نہیں...... اللہ تعالیٰ کا اعلان ہے۔ ''.........'' (سورہ طلاق) اور جو کوئی اللہ پر توکل کرے (جیسا کہ توکل کا حق ہے) تو اللہ اس کے لیے اور اس کے کام بنانے کے لیے کافی ہے۔

(۲۴۸)

(ترجمہ) حضرت سعد رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ:۔ آدمی کی نیک بختی اور خوش نصیبی میں سے یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے لیے جو فیصلہ ہو وہ اس پر راضی رہے اور آدمی کی بدبختی اور بدنصیبی میں سے یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے اپنے لیے خیر اور بھلائی کا طالب نہ ہو اور اس کی بدنصیبی اور بدبختی یہ بھی ہے کہ وہ اپنے بارے میں اللہ تعالیٰ کے فیصلہ سے ناخوش ہو۔

(مسند احمد، جامع ترمذی)

(بشکریہ معارف الحدیث از مولانا محمد منظور نعمانیؒ)

بلاوا

خورشید پیرزادہ

مافوق الفطرت واقعات' قصے کہانیاں اوران پر بنائی جانے والی فلمیں تاریخ کے ہر دور میں انسانی ذہنوں پر اثر انداز ہوتی رہی ہیں۔ زیر نظر کہانی ایک خواب سے شروع ہوتی ہے جو آگے چل کر کئی نئے موڑ لے کر آپ کو حیران کردے گی۔

نئے افق کے تجسس پسند قارئین کے لیے بطور خاص ایک سنسنی خیز ناول

دربان بدحواس سا بھاگتا ہوا راج محل میں آیا اور مہارانی کے سامنے سر جھکا کر کھڑا ہوگیا۔

''مہارانی۔ سیناپتی دیو۔ مہاراج کے ساتھ راج محل میں تشریف لا رہے ہیں۔ مہاراج ہوش میں نہیں ہیں۔ سیناپتی بھی ان کے ساتھ اندر آنے کی اجازت چاہتے ہیں آپ نے حکم دیا تھا کہ انہیں محل کے اندر نہ آنے دیا جائے ہم الجھن میں ہیں۔ مہاراج کی حالت وہی آپ کو ٹھیک طرح سے بتا سکتے ہیں۔ ہمارے لیے کیا حکم ہے۔''

''جلدی سے انہیں اندر لے کر آؤ۔'' مہارانی' مہاراج کے بے ہوش ہونے کی خبر سن کر اتنی بوکھلا گئیں کہ انہیں دیو کے اندر آنے سے پہلے پریا کو وہاں سے دور بھیج دینے کی بات سوجھی ہی نہیں۔

کچھ ہی دیر بعد دیو مہاراج کو ساتھ لیے مہارانی کے سامنے موجود تھا۔ دیو کے بدن پر کئی جگہ زخموں کے نشان تھے اور بدن پسینے سے تربتر تھا۔ اس کی پیٹھ کا گھاؤ تو بہت ہی گہرا تھا اور جان لیوا محسوس ہو رہا تھا۔ اس کی کمر سے خون رس رہا تھا۔ مگر مہارانی نے اس کے گھاؤ پر کوئی توجہ نہیں دی۔

''کیا ہوا ہے انہیں؟'' مہارانی نے بدحواسی میں پوچھا۔ اور تخت پر لیٹے ہوئے مہاراج کے سینے پر آنسو بہانے لگیں۔

دیو کی آواز میں جلد بازی جھلک رہی تھی۔ لیکن اس میں گھبراہٹ یا ہڑبڑاہٹ کا شائبہ نہ تھا۔

''مہارانی جی۔ گھبرائیے مت۔ یہ گھائل ہوگئے ہیں اور خون زیادہ بہہ جانے کی وجہ سے بے ہوشی کی سرحد کو چھو رہے ہیں۔ مگر فکر کرنے کی کوئی بات نہیں ہے۔ مجھے واپس جانا پڑے گا آپ جلد سے جلد وید جی کو بلوائیے۔'' دیو کی آواز سنتے ہی راجکماری بے تاب ہوکر دوڑی دوڑی ان کے سامنے آئی۔

مگر دیو کا زخموں سے چور بدن اور اس کی حالت دیکھ کر اس کی چیخ نکل گئی۔ ''کیا ہوا' کیا ہوا دیو یہ کیا ہوگیا آپ کو؟'' روتے بلکتے ہوئے راجکماری دیو سے لپٹ گئی۔

مہارانی ان کی طرف دیکھ کر خون کا گھونٹ پی کر رہ گئی۔ انہوں نے فوراً ہی وید جی کو بلانے کا حکم دیا۔

''اپنے آپ کو سنبھالو پریا۔ کچھ نہیں ہوا ہے مجھے یہ تو بہت معمولی زخم ہیں میدان جنگ تک واپس جاتے جاتے بھر جائیں گے آپ فکر نہ کریں۔'' دیو نے پریا کو دلاسہ دیتے ہوئے کہا۔

''کیا......؟ آپ واپس جا رہے ہیں نہیں' ہم آپ کو اس حالت میں جانے نہیں دیں گے اپنی حالت دیکھیں ذرا۔'' راجکماری یہ کہنے کے بعد دیو کے سینے پر دل کے پاس لگے زخم کو دیکھ کر پھوٹ

پھوٹ کر رونے لگی۔

''میرا وشواس کرو دیوی مجھے کچھ نہیں ہوا ہے۔ آپ پر بری نظر ڈالنے والے ابھے کا سر میں نے اس کے دھڑ سے الگ کردیا ہے۔ اب بس ایک آخری لڑائی بچی ہے۔ مجھے جانے دیجیے۔'' دیو نے بڑے پیار سے نازک سی راجکماری کو اپنے بدن سے الگ کرتے ہوئے کہا۔

''آپ کو کچھ ہوگیا تو ہم زندہ نہیں رہ پائیں گے۔ وعدہ کیجیے آپ جلد سے جلد واپس آئیں گے۔'' پریا درشنی دیو کو پیاسی نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔

دیو واپس جانے کے لیے مڑا پھر واپس پلٹ کر راجکماری کے پاس آیا۔ کچھ دیر تک اس طرح راجکماری کو دیکھتا رہا جیسے آخری بار اس چاند سے چہرے کو اپنی آنکھوں میں بسا لینا چاہتا ہو۔ پھر اس کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرایا اور اپنے گلے میں پہنا ہوا لاکٹ اتار کر راجکماری کو پہنا دیا۔ راجکماری دیو کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے آنسو بہاتی رہی۔

''اب کوئی آپ کو مجھ سے الگ نہیں کرسکتا پریا اس جنم میں تم میری زندگی بھر کا حاصل ہو اور اب جنم جنم کے لیے۔'' دیو نے راجکماری کا ماتھا چوما اور پلٹ گیا۔

راجکماری پکارتی رہ گئی۔ ''وعدہ تو کر کے جاؤ دیو۔''

......☆☆☆......

اگلے دن لتا راجکماری کے پاس آئی۔ اس کا چہرہ ایسے پھیکا پڑا تھا جیسے اس کے چہرے سے مسکراہٹ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے غائب ہوگئی ہو۔

''تم ایسے کیا دیکھ رہی ہو لتا۔ بتاؤ نا کیا خبر لے کر آئی ہے ہمارے دیو کی۔'' راجکماری بے چین ہوکر بولی۔

لتا نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بس اس کی آنکھوں سے آنسو لڑھک کر پریا کی ہتھیلی پر جا گرے۔

''ہمیں ڈرانا چاہتی ہو نا دیو آنے والا ہے نا دیکھو......دیکھو......تم جلدی سے بول دو۔ ورنہ میں مہاراج سے تمہاری شکایت کردوں گی ہم دیو کو بھی بتا دیں گے۔ لتا......اا......تم بولتی کیوں نہیں ہو کیا ہوگیا ہے تمہیں؟'' پریادرشنی اچانک چلا اٹھی۔

''اب اب بولنے کو رہ ہی کیا گیا ہے راجکماری مہاراج نہیں رہے راجکمار نہیں رہے کمار ڈکشت کا پتہ نہیں چل رہا۔ مہارانی نے آتم ہتیا کرلی۔'' لتا کے آنسو تھمنے کا نام ہی نہیں لے رہے تھے۔ وہ بیچ بیچ میں سسکیاں سی لے کر بول رہی تھی۔ ''دیو۔''

''نہیں نہیں۔ دیو کے بارے میں ہم تمہاری کوئی بکواس نہیں سنیں گے۔ دیو کو کوئی نہیں ہرا سکتا۔ دیو کو ہم سے کوئی نہیں چھین سکتا دیو صرف ہمارا ہے پتا شری نہیں رہے تو کیا ہوا اب دیو ہی اس راجیہ کا راجا ہے آنے دو دیو کو ہم تمہاری شکایت ضرور کریں گے۔'' بولتے بولتے راجکماری تھک گئی اور کچھ رک کر پھر بولنے لگی۔ ''بتا دے نا سکھی......تم ہمیں کیوں تڑپا رہی ہو......ابھی تو تم ہمارے دیو کے کارناموں کے بارے میں سنا رہی تھیں تم بتا رہی تھیں نا کہ میدان جنگ میں اس طرح چھایا ہوا تھا جیسے جیسے دشمن کی ساری فوج کو اکیلے ہی ختم کردے گا۔ تم ہی بتا رہی تھیں نا کہ کیسے دشمن دیش کا راجا ان کے سامنے آنے سے کترا رہا تھا اور دیو کے سامنے آتے ہی بھاگ کھڑا ہوا تھا تم نے تو بتایا تھا کہ دشٹ ابھے کا سر کس طرح ہمارے دیو کے ایک ہی وار میں کئی گز دور جا کر گرا تھا دیو تو فاتح ہے نا سکھی تم ہی تو کل بتا رہی تھیں کہ ان کا کوئی کیسے سامنا کرسکتا ہے ان کو کوئی کیسے مار سکتا ہے۔''

......☆☆☆......

نہیں......نہیں۔'' بیڈروم سے آتی اس تیز چیخ کو سن کر روہن اور رویندر اچانک اچھل کر کھڑے

ہو گئے۔ روہن گھبرا کر سیدھا بیڈ روم کی طرف بھاگا۔ رویندر بھی اس کے پیچھے پیچھے تھا۔

بیڈ روم میں نیرو کی چیخ سن کر ریتو اٹھ بیٹھی تھی اور اب وہ نیرو کو جھنجوڑ کر اٹھانے کی کوشش کر رہی تھی۔ مگر نیرو اب تک نیند میں ہی لگ رہی تھی۔ اور اب بھی وہ کچھ بڑبڑا رہی تھی۔ نیرو کا چہرہ پسینے اور آنسوؤں سے تر تھا۔ جیسے ہی نیرو نے آنکھیں کھول کر سامنے کھڑے روہن کو دیکھا۔ وہ تیزی سے اٹھی اور بھاگ کر روہن سے لپٹ گئی۔

''دیو......''

سب حیران پریشان تھے کہ آخر نیرو کو اچانک کیا ہو گیا ہے؟ نیرو کافی دیر تک روہن سے لپٹی کھڑی رہی روہن بھونچکا سا سیدھا کھڑا رہ کر کبھی ریتو اور کبھی رویندر کو دیکھنے لگا۔ کسی کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ اچانک جیسے ابھی ابھی حقیقت کی دنیا میں واپس آئی نیرو خود کو روہن سے اس طرح سختی سے لپٹا ہوا پا کر حیران رہ گئی۔

وہ کچھ دیر شرمائی ہوئی یونہی کھڑی رہی۔ پھر دھیرے دھیرے روہن کے گلے سے اپنی بانہیں نکالیں اور سر جھکائے بھاگ کر کمبل میں گھس گئی۔

روہن اور رویندر کی نظریں ایک دوسرے سے ملیں اور دونوں مسکرا دیئے۔ ریتو نے اس کے چہرے سے کمبل اٹھا کر اندر جھانکا۔

''کیا ہو گیا ہے تمہیں شینو؟''

''سوری۔ خواب تھا۔'' نیرو نے کہا اور ریتو کی طرف دیکھتے ہوئے شرما کر کمبل واپس کھینچ لیا۔

......☆☆☆......

''چلو آ جاؤ۔ وہ دونوں چائے پر ہمارا انتظار کر رہے ہیں۔'' صبح ریتو نیرو کو بیڈ روم سے باہر نکالنے کی کوشش کر رہی تھی۔

''نہیں۔ مجھے نہیں چلنا ہے باہر یہیں منگوا لو چائے۔'' نیرو کا چہرہ روہن کے سامنے جانے کے نام سے گلابی ہو گیا۔

''چلو نا' اب ایسے نخرے مت دکھاؤ چلو کھڑی ہو جاؤ۔'' ریتو نے اس کا بازو پکڑ کر کھینچ لیا۔

''نخرے نہیں دکھا رہی ہوں میں؟'' نیرو نے غصے سے کہا اور پھر شرما سی گئی۔ ''مجھے شرم آ رہی ہے جانے کیا سوچ رہے ہوں گے وہ میرے بارے میں۔''

ریتو نیرو کو کھینچتے ہوئے باہر لے ہی آئی۔ نظریں جھکائے نیرو روہن کے سامنے جا کر بیٹھ گئی۔ اور چائے کا کپ اٹھا لیا۔

''شینو۔ بتاؤ نا ایسا کون سا خواب دیکھ لیا تم نے رات کو؟'' ریتو نے چائے کی چسکی لیتے ہوئے پوچھا۔

روہن اور رویندر چپ چاپ بیٹھے تھے۔ روہن رہ رہ کر ترچھی نظروں سے نیرو کو دیکھ لیتا تھا۔

نیرو نے رات کی بات کا ذکر کرنے پر ریتو کو گھور کر دیکھا اور پھر نظریں جھکا لیں۔ ریتو نے اگلی بار اور بھی زور دے کر پوچھا۔ ''ارے بتاؤ نا یار' ہم سب جاننے کے لیے بیقرار ہیں کہیں تمہیں روہن کی طرح ہی تو کوئی خواب نہیں آیا تھا۔ تمہارے خواب میں دیو آیا تھا کیا؟''

''پتا نہیں۔ اب تو مجھے کچھ یاد بھی نہیں ہے مگر ہاں کوئی خواب ضرور آیا تھا مجھے۔'' نیرو نے آخر روہن کے سامنے زبان کھول ہی دی۔

''مگر آپ نے ہم سب کے سامنے روہن کو دیو کہا تھا۔ ہم سب کو اچھی طرح یاد ہے۔'' رویندر نے سنجیدگی سے کہا۔

''کب؟'' نیرو نے یاد کرتے ہوئے پوچھا۔

تب' جب آپ بھاگ کر اس سے لپٹ گئی تھیں۔ مجھے تو فلم دیوداس یاد آ گئی تھی اس وقت میں تو بس رونے ہی والا تھا۔'' رویندر نے اپنے چہرے پر ہاتھ رکھ کر اپنی ہنسی چھپانے کی کوشش کی لیکن چھپا نہیں سکا۔ کچھ دیر بعد ہی اس کے منہ سے زوردار قہقہہ بلند ہوا۔ ''ہاہاہا۔''

اچانک نیرو کے چہرے پر شرم کی لالی جھلکنے لگی۔ رویندر کی بات پر ناراض ہونے کا دکھاوا کرتے ہوئے اس نے اٹھ کر بھاگنے کی کوشش کی مگر ریتو نے اس کا ہاتھ پکڑ کر واپس بٹھا لیا۔

روہن نے پیار سے رویندر کے سر پر ہلکی سی چپت لگائی۔ ''صبح صبح اٹھتے ہی شروع ہو جاتے ہو۔ موقع محل بھی دیکھ لیا کرو۔''

''تم ایسا کیوں کر رہی ہو شینو؟ کچھ تو بتاؤ کچھ تو یاد ہو گا تمہیں خواب کے بارے میں۔'' ریتو نے پیار سے پوچھا۔

مجھے تو بس اتنا ہی یاد ہے کہ خواب میں کوئی راجکماری پاگل سی ہو کر رو رہی تھی۔'' نیرو کو جتنا یاد آیا اس نے بتا دیا۔

''اور دیو نہیں تھا پریا کے ساتھ۔'' روہن نے متجسس ہو کر پوچھا۔

''نہیں' ہاں' یاد آیا راجکماری کا نام شاید پریا ہی تھا۔ وہ ایک دوسری لڑکی سے بار بار دیو کے بارے میں ہی پوچھ رہی تھی اور بری طرح سے رو رہی تھی۔'' نیرو کو مزید خواب یاد آ گیا۔

''کیا اب بھی آپ کو روہن کی کہانی پر یقین نہیں ہے؟ کیا اب بھی آپ واپس جانے کی ضد پر اڑی رہیں گی؟ آپ کو ایسا خواب آنا پھر روہن کو دیکھتے ہی نیند میں سے اٹھ کر اس کی طرف بھاگنا اس کو دیو کہنا۔ میں بھی تو اس کے ساتھ ہی کھڑا تھا۔ آپ نے مجھے دیو کیوں نہیں کہا؟ مجھے تو اس وقت کو یاد کر کے لگتا ہے کہ اس وقت آپ' آپ نہیں پریا تھیں' آپ رو بھی رہی تھیں اور روہن کو دیو سمجھ کر اس کی طرف بھاگی بھی تھیں۔ اب یقین نہ کرنے کو بچا ہی کیا ہے؟'' رویندر اب ایکدم سنجیدگی سے اپنی بات کہہ رہا تھا۔

''ایک منٹ۔ فون دینا۔'' نیرو نے روہن سے فون کیا اور اپنے ابو کا نمبر ملایا۔

''ابو میں شینو۔'' نیرو نے کہا۔ ابو شاید آفس کے لیے نکل چکے تھے۔

''ہاں بولو بیٹی۔''

''آپ اب تک مجھ سے ناراض ہیں کیا۔'' نیرو نے اپنے باپ کی روکھی آواز سن کر کہا۔

''ارے بیٹی۔ چھوڑو اب ان باتوں کو۔ واپس کب آ رہی ہو۔ دو ہفتے بعد ریتو کی شادی بھی ہے۔ تیاریاں بھی تو کرنی ہوں گی اس کو۔'' ابو نے کہا۔

''ہاں' ابو' ہم آ جائیں گے۔ آپ سے ایک بات پوچھنی ہے۔'' نیرو بولی۔

''ہاں ہاں پوچھو۔''

''وہ۔ آپ نے میرا نام بدلنے کی وجہ بتائی تھی نا؟''

نیرو کی بات کو ابو نے بیچ میں ہی کاٹ دیا۔ ''اب صبح صبح یہ کیا باتیں لے بیٹھی ہو۔''

''نہیں ابو بس ایک بات پوچھنی ہے۔ وہ آپ کہہ رہے تھے نا کہ میں اسکول میں کوئی نام لے کر بے ہوش ہو گئی تھی۔ نام یاد ہے آپ کو؟'' نیرو نے ڈرتے ہوئے پوچھا۔

''اب نام کہاں سے یاد رہے گا۔ پندرہ سال ہو گئے ہیں اس بات کو۔'' ابو نے کہا۔

''وہ میں یہی پوچھ رہی تھی۔ کہیں میں نے ''دیو'' تو نہیں کہا تھا؟'' نیرو نے رک رک کر کہا۔

''دیو! ارے ہاں۔ یہی تو بتایا تھا مجھے تمہاری [illegible] نے [illegible] تم دیو کہہ کہ بے ہوش ہوئی تھیں۔ مگر

تمہیں کیسے یاد ہے؟'' ابو نے چونک کر گاڑی کو بریک لگادی۔

''یاد نہیں ہے ابو۔ آج رات پھر مجھے عجیب سا خواب آیا تھا۔ اور آج پھر میں یہی نام لے کر چلا رہی تھی۔'' نیرو حیرت سے روہن کی آنکھوں میں دیکھنے لگی۔

''اوہ مائی گاڈ' اس عامل نے صحیح کہا تھا پرانے نام کو ہمیشہ کے لیے بھول جانے کو تم نے پھر وہ نام یاد کرلیا بیٹی کیوں کیا تم نے ایسا؟ بار بار اس نام کے بارے میں سوچنے پر تمہیں ایسا خواب آیا ہوگا مجھے فکر ہو رہی ہے بیٹی۔ تم گھر آجاؤ جلدی سے۔'' ابو کی آواز میں ناراضگی جھلک رہی تھی۔

''نہیں ابو ایسی کوئی بات نہیں ہے میں بالکل ٹھیک ہوں میں شام کو فون کرتی ہوں۔'' نیرو نے کہا اور ابو کے او کے کہنے پر فون کاٹ دیا۔

......☆☆☆......

''کوئی پریشانی تو نہیں ہوئی نا بیٹی؟'' روہن کے پاپا صبح آتے ہی سب سے پہلے نیرو اور ریتو سے مخاطب ہوئے۔

''جی۔ نہیں۔ پاپا جی۔'' نیرو نے جلدی سے کہا۔

''تم مجھے کچھ پریشان سی لگ رہی ہو کیوں فکر کرتی ہو میں ہوں نا' سب ٹھیک کرلوں گا۔'' پاپا نے پیار سے نیرو کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ ''لاؤ مجھے اپنے ابو کا نمبر دو۔''

نیرو پاپا کی بات سنتے ہی ہڑبڑا گئی۔

''جی۔ مگر کیوں؟''

''ارے بیٹی ایسے کیوں گھبرا رہی ہو۔ میں نے کہا نا کہ پیار کرنے والے کبھی ڈرتے نہیں۔ جو ڈرتے ہیں وہ پیار کرتے نہیں تم روہن سے پیار کرتی ہو نا؟''

بیچاری نیرو ان کی باتیں سن سن کر پریشان ہو رہی تھی اور کچھ بول بھی نہیں پا رہی تھی۔ اس موقع پر روہن آگے بڑھا۔

''پاپا۔ وہ۔''

''تم کچھ مت بولو۔ یہ باپ بیٹی کی آپس کی بات ہے۔ بتاؤ بیٹی پیار کرتی ہو نا میرے روہن سے۔'' پاپا نے روہن کو بیچ میں بولنے پر ڈانٹ سا دیا۔

نیرو سے کوئی جواب دیتے نہیں بن رہا تھا۔ اس نے اپنا سر جھکا لیا۔

''میں سمجھ گیا۔ لاؤ اب جلدی سے اپنے ابو کا نمبر دو۔'' پاپا نے پیار سے نیرو کو کہا۔

مرتی کیا نہ کرتی۔ نیرو کی کچھ سمجھ میں ہی نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کرے اس نے اسی ادھیڑ بن میں نمبر دے دیا۔

''یہ ہوئی نا بات' نام کیا ہے ان کا؟''

''جی' رنجیت کمار۔'' اب نام چھپانے کا کوئی فائدہ بھی نہیں تھا۔ نیرو کو بتانا ہی پڑا۔

''گڈ۔ اب دیکھنا میں کیا جادو کرتا ہوں۔ سب چپ رہنا۔'' پاپا نے خاص طور پر روہن کی طرف گھور کر چپ رہنے کا اشارہ کیا۔ اور نیرو کے بتائے ہوئے نمبر پر ڈائل کیا۔

''ہیلو۔'' دوسری طرف سے نیرو کے ابو کی آواز آئی۔

''ہاں۔ رنجیت کمار جی۔ کیا حال ہیں۔'' روہن کے پاپا نے اس طرح بے تکلفی سے کہا جیسے وہ ان کو برسوں سے جانتے ہوں۔

''کون بول رہا ہے سوری میں نے آپ کو پہچانا نہیں۔'' نیرو کے ابو کی آواز میں حیرانی تھی۔

''ا جی۔ دنیا اتنی چھوٹی بھی نہیں ہے کہ ہر کوئی ایک دوسرے کو پہچان جائے۔ یہ کیا کم بڑی بات ہے کہ میں آپ کو جانتا ہوں۔'' پاپا نے ہنستے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے بھائی صاحب۔ بٹ سیریسلی میں نے آپ کو نہیں پہچانا' بتائیں تو سہی کہ آپ ہیں کون؟'' ادھر سے اسی لہجے میں پوچھا گیا۔

''بھائی صاحب میں روہن اسٹیٹ سے کشن کمار بول رہا ہوں۔ دراصل میں نے بھی آپ کو ابھی ابھی ہی جانا ہے۔'' پاپا نے سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا۔

''اس وقت میں تھوڑا سا پریشان ہوں۔ آپ سے بعد میں بات کرتا ہوں۔'' نیرو کے ابو کی آواز میں ہلکی سی جھنجلاہٹ تھی۔

''کوئی بات نہیں جناب۔ اب تو باتیں ہوتی ہی رہیں گی۔'' پاپا نے روہن کی طرف دیکھ کر ایک آنکھ دبائی' ایک لمحے کے لیے مسکرائے اور پھر سنجیدگی سے بولے۔ ''میں نے تو بس اس لیے فون کیا تھا کہ آپ بالکل بھی فکر نہ کریں۔ آپ کی بیٹی میرے لیے روہن سے بڑھ کر ہے۔''

''وہاٹ؟ تت تم کون ہو؟ میری بیٹی کہاں ہے۔'' نیرو کے ابو چونک کر بولے۔ ''کون روہن؟''

''اوہ! تو آپ کو کچھ پتہ نہیں ہے کیا؟ میں سمجھا کہ میرا بیٹا پہلے وہیں محبت کے باغی جھنڈے گاڑ کر آیا ہوگا خیر کوئی بات نہیں۔ میں ان سے پوری تفصیل لے کر پھر فون کرتا ہوں۔'' کہہ کر روہن کے پاپا نے جلدی سے فون کاٹ دیا۔

''یہ کیا ہے یار پوری بات تو بتا دیتے پہلے۔''

''آپ سنیں گے تبھی تو یہاں آنے کے بعد آپ نے ہمیں بولنے ہی کب دیا۔'' روہن برا سا منہ بنا کر بولا۔

نیرو تو جیسے رونے ہی والی تھی۔

......☆☆☆......

''ادھر حیران پریشان نیرو کے پتا نے فوراً آنند کا فون ملایا۔

''پرنام چاچا۔''

''پرنام بیٹا! کہاں تھانے میں ہی ہو کیا۔'' ابو نے ہچکچاتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں چاچا۔ میں تو لمبی چھٹی پر ہوں۔ کوئی کام ہے کیا؟''

''نہیں۔ کچھ خاص نہیں۔ تھانے کا نمبر دینا۔'' ابو نے کہا۔

''کوئی پریشانی ہے کیا چاچا؟'' آنند نے پوچھا۔

''نہیں بیٹا۔ بس یونہی ایک چھوٹا سا کام ہے۔ تم مجھے تھانے کا نمبر دے دو۔'' ابو نے آنند سے نیرو کے بارے میں دوبارہ بات کرنا مناسب نہیں سمجھا۔

''لکھ لیں چاچا تھانے میں نئے انسپکٹر آئے ہیں۔ گلاب سنگھ۔ تھوڑے سے موڈی ٹائپ کے ہیں۔ میں ان کو فون کردوں گا آپ بھی میرا نام لے لیجئے گا۔'' آنند نے نمبر نوٹ کروایا اور بائے کر کے فون کاٹ دیا۔

......☆☆☆......

''ہوں تو یہ بات ہے۔ تم لوگ ان بیچاریوں کو بہلا پھسلا کر لائے ہو۔'' پاپا نے گھور کر روہن اور رویندر کی طرف دیکھا۔

''نہیں پاپا۔ بہلا پھسلا کر نہیں آپ تو بس ایسے ہی' آپ خود پوچھ لیں ان سے۔'' روہن نے مرا سا منہ بنا کر کہا۔

''تم چپ کر کے بیٹھو اور مجھے میری بچیوں سے پوچھنے دو۔ ہاں بیٹی۔ تم بولو۔ سچ کیا ہے؟'' پاپا نے نیرو کی طرف دیکھتے ہوئے پیار سے پوچھا۔

روہن کی شکل دیکھ کر نیرو کی اس سچوئشن میں بھی ہنسی چھوٹ گئی۔ بیچارے پر کتنا گمبھیر الزام لگا دیا تھا اس کے پاپا نے۔

''نہیں پاپا...... وہ...... میں ہی ان کو مطلب ہم دونوں اپنی مرضی سے ان کے ساتھ آئے ہیں۔''

کہہ کر نیرو نے نظریں جھکالیں۔

"مطلب یہ کہ تم اس الو کی دم سے شادی کرنا چاہتی ہو۔" پاپا نے پھر پیار سے ہی پوچھا۔

نیرو نے سر جھکائے ہوئے ہی اپنے ہاتھوں کی انگلیوں کو باندھ لیا۔ وہ کچھ بول نہیں پائی۔

"بولو بیٹا! تم فکر مت کرو۔ اگر تم نہیں چاہتیں تو میں تمہارے ابو سے اپنے بیٹے کے کرتوت کے لیے معافی مانگ کر ابھی تمہیں واپس چھوڑنے چل پڑوں گا۔"

"ہاں...... مطلب...... نہیں۔ اس میں ان کی کوئی غلطی نہیں ہے۔ پاپا، مگر میں کچھ فیصلہ نہیں کر پا رہی ہوں۔ مجھے یہ پچھلے جنم کی باتیں سچ لگ رہی ہیں۔" نیرو سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ بات کو کس طرح واضح کرے۔ وہ خود کو پریشانی کی حالت میں محسوس کر رہی تھی۔

"چھوڑو نا بیٹی۔ پچھلے جنم کی باتوں کو سب سے پہلے تو آج کے بارے میں سوچو آخر تمہیں ہی تو یہ جیون گزارنا ہے ناسب سے پہلے تو یہ سوچو کہ اس جنم میں یہ تمہارے لائق ہے یا نہیں۔" پاپا اچانک سنجیدہ ہو گئے۔

"جی۔ وہی میں سوچ رہی ہوں۔ مگر فیصلہ نہیں کر پا رہی ہوں۔ مجھے تھوڑا وقت چاہیے۔" نیرو الجھتے ہوئے بولی۔

"کوئی اور پسند ہے تمہیں۔" پاپا نے پوچھا۔

نیرو نے فوراً ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال لیں۔ کم سے کم اس بات کا جواب تو اس نے پورے یقین سے دیا۔ "نہیں پاپا۔ میں نے تو آج تک اس بارے میں کبھی سوچا تک نہیں شاید یہ میرے پاس نہ آتے تو میں کبھی شادی کرتی ہی نہیں۔"

"ہوں، مطلب یہ تمہیں پسند تو ہے ہی۔" پاپا نے مسکراتے ہوئے اس کو دیکھا۔

نیرو کے دل میں اسی پل اپنی ایک الگ سی ہستی کوند گئی۔ اس نے فوراً روہن کی آنکھوں میں جھانکا۔ جانے انجانے میں ہی اس کو روہن کی آنکھوں میں پریا کا دیو دکھائی دیا۔ وہ زیادہ دیر تک روہن سے نظریں نہیں ملا پائی۔ مگر ان چند لمحوں کے لیے آنکھیں چار ہونے سے پاپا کو ان کی بات کا جواب مل گیا۔

"دیکھو بیٹی۔ تم دل اور دماغ دونوں سے فیصلہ کرو۔ اس کی باتوں میں مت آنا یہ تو بچپن سے ایسا ہی ہے۔ کھویا کھویا سا۔ ہمیشہ مجھے اس کی آنکھوں میں دیکھ کر محسوس ہوتا تھا جیسے اس کا کچھ کھو گیا ہے اور اس کو ہی ہر وقت، ہر S جگہ تلاش کرتا رہتا تھا مگر یہ کیا تلاش کر رہا ہے۔ اس نے کبھی کسی کو بتایا ہی نہیں۔ شاید اس کو خود بھی معلوم نہیں تھا۔ مگر کل پہلی بار اس کو دیکھ کر مجھے لگا کہ اس کو اپنی منزل مل گئی ہے۔ اگر خوابوں کی بات پر بھروسہ کریں تو اب تو یہی لگتا ہے کہ تم ہی اس کی زندگی سے کبھی اچانک غائب ہو گئی تھیں۔ یہ شاید تمہیں ہی تلاش کر رہا تھا۔" بولتے ہوئے پاپا کی آنکھوں سے آنسو چھلک اٹھے۔ "مگر تم اس کی پرواہ مت کرنا بیٹی۔ پہلے اپنے بارے میں سوچنا کبھی شاید یہ بھی پوری طرح سے خوش رہ پائے گا۔ دوسروں کو دکھی دیکھنا بھی اس کے بس کی بات نہیں ہے اور تمہیں تو یہ کبھی دکھی دیکھ ہی نہیں پائے گا۔ ایسا لگتا ہے۔" پاپا بولتے ہی جا رہے تھے کہ اچانک ان کے فون پر آنے والی کال سے ان کا دھیان بٹ گیا۔ انہوں نے نمبر پہچان لیا۔ کال نیرو کے ابو کی تھی۔

"ہاں جی رنجیت کمار جی۔"

"دیکھئے۔ مجھے آپ ایک سمجھدار انسان لگ رہے ہیں۔ اس لیے میں نے پہلے آپ کو فون کرنے کا سوچا۔ ورنہ میں تو سیدھا پولیس میں رپورٹ کروانے جا رہا تھا۔ اب آپ بتائیے یہ کیا تماشہ ہے؟" نیرو کے ابو کی غصے سے بھری آواز سنائی دی۔

روہن کے پاپا اٹھ کر اپنے کیبن میں آ گئے۔

"دیکھیں رنجیت صاحب۔ یہاں کوئی تماشہ نہیں ہو رہا ہے۔ بچے اپنی زندگی کا سب سے اہم فیصلہ کرنا چاہ رہے ہیں اور انہیں اس بات کا پورا حق بھی ہے۔ ہم اور آپ بیچ میں پڑنے والے کون ہوتے ہیں بھلا؟"

"کیا بکواس ہے میں شینو کا باپ ہوں اور آپ پوچھ رہے ہیں کہ میں کون ہوتا ہوں بیچ میں پڑنے والا۔" نیرو کے ابو کا لہجہ گرم ہو گیا۔

روہن کے پاپا نے ہلکے سے مذاق کے ساتھ ماحول کو ٹھنڈا رکھنے کی کوشش کی۔ وہ ہنستے ہوئے بولے۔ "بھائی صاحب۔ میں روہن کا باپ ہوں۔ اور میرے پاس اس بات کا سرٹیفکیٹ بھی ہے۔ ہاہاہا۔"

مگر اس مذاق سے نیرو کے ابو کے تناؤ میں کوئی فرق نہیں آیا۔ "آپ بات کو مذاق میں نہ اڑائیں۔ میری بیٹی کو آپ اس طرح کیسے اپنے پاس رکھ سکتے ہیں؟ یہ...... یہ تو اغوا ہے۔ سمجھے آپ؟"

"اغوا...... آپ تھوڑا ٹھنڈے ہو جائیں۔ آپ کو دراصل پوری بات کا پتہ نہیں ہے۔ میرا روہن اور آپ کی نیرو ایک دوسرے سے پیار کرتے ہیں۔ ایک دوسرے سے شادی کرنے کا سوچ رہے ہیں وہ۔ دونوں عاقل بالغ ہیں۔ اس میں اغوا کا ذکر بیچ میں کہاں سے آ گیا؟" روہن کے پاپا نے انہیں سمجھاتے ہوئے کہا۔

"میری بیٹی اور پیار؟ اچھا مذاق کر لیتے ہیں آپ؟ وہ کبھی اس طرح کی باتیں سوچتی تک نہیں مجھے اپنی بیٹی کے بارے میں پورا پتہ ہے۔" نیرو کے ابو جلدی سے بولے۔

"رنجیت صاحب۔ یہی وہ لمحے ہوتے ہیں جب ہم اپنے بچوں کے اوپر اپنی سوچ تھوپ کر انہیں اپنے آپ سے دور کر لیتے ہیں۔ یہ ہم طے نہیں کر سکتے کہ انہیں کب اور کس طرح جینا چاہیے خاص طور سے تب، جب وہ اپنی زندگی کا اہم ترین فیصلہ کرنے والے ہوں یہ پیار ہے رنجیت صاحب کوئی مذاق نہیں اگر یہاں ہم نے ان کے دل کی بات نہیں سنی تو نہ صرف ہم ہی انہیں کھو دیں گے بلکہ وہ بھی وہ خود بھی ساری عمر کچھ ڈھونڈتے رہ جائیں گے، جو انہیں دوبارہ کبھی نہیں مل سکتا آپ سمجھ رہے ہیں نا؟" روہن کے پاپا باتیں کرتے کرتے کھوتے چلے گئے۔

"میں سمجھ رہا ہوں بھائی صاحب مگر......"

جانے کون سی بات نیرو کے ابو کے دل میں چبھی کہ ان کا لہجہ ایک دم نرم پڑ گیا۔

"مگر کیا؟ ٹھنڈے دماغ سے سوچ کر دیکھیں یہاں نیرو بھی میری بیٹی کی طرح ہی ہے بلکہ اس سے بھی بڑھ کر، آپ بس ملنے کا وقت بتائیے میں آتا ہوں آپ کے پاس۔" پاپا نے بات کو مثبت انجام تک لے جانے کی کوشش کی

"بھائی صاحب۔ میں اپنی بیٹی کو اچھی طرح سے جانتا ہوں اس کے لیے پیار محبت کا کوئی مطلب ہی نہیں ہے وہ تو نہایت ہی شریف اور بھولی لڑکی ہے۔" نیرو کے ابو کا غصہ دم توڑ رہا تھا۔

"ہاں۔ شریف ہے تبھی تو میں اس کو اپنے گھر کی لکشمی کے روپ میں لانا چاہتا ہوں مگر شریف لوگ کیا پیار نہیں کرتے؟ ایک بات بتاؤں رنجیت صاحب میری ماں آخری دم تک یہی سوچتی رہی تھی کہ میں ایکدم بھولا ہوں۔ مجھے ان باتوں کے بارے میں کچھ نہیں پتہ جبکہ میرے تین بچے پیدا ہو چکے تھے۔ ہاہاہا۔" پاپا کی اس بات پر نیرو کے ابو بھی ہنسے بنا نہیں رہ سکے۔ شاید ان کی ماں بھی ایسا ہی سوچتی ہوں گی۔

"اوکے کشن صاحب۔ میں آپ سے ملنے کے بارے میں سوچتا ہوں مگر کیا آپ شینو سے میری بات کرادیں گے ایک بار؟" نیرو کے ابو نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"کیوں نہیں یار...... ایک منٹ...... نیرو بیٹی یہ لو اپنے ابو سے بات کرلو۔" باہر آ کر پاپا نے نیرو کو فون دیا۔

نیرو نے کانپتے ہاتھوں سے فون کان سے لگایا۔

"ہاں ابو...... وہ۔"

"تم خوش ہونا بیٹی۔" ابو نے پیار سے صرف اتنا ہی پوچھا۔

"ہاں...... وہ...... سوری ابو...... میں۔" نیرو اب بھی گھبرائی ہوئی تھی۔

"سوری کو مارو گولی تم آرام سے وہیں رہو۔ تمہارے ہونے والے سسر جی بہت پیارے انسان ہیں۔ فکر مت کرنا۔ میں آ رہا ہوں ایک دو دن میں، اور کوئی بات ہے تو بولو؟"

"تھینک یو پاپا۔" نیرو کے ان تین لفظوں نے ہی اس کے ابو کی آنکھوں کو آنسوؤں سے تر کر دیا۔

"آئی لو یو بیٹا۔ فکر مت کرنا میں تمہارے ساتھ ہوں۔"

......☆☆☆......

تم سوچ کیا رہی ہو شینو۔ کم سے کم مجھے تو کھل کر بتا دو۔" پریشان سی ریتو نے اکیلے ہوتے ہی نیرو سے پوچھ لیا۔

"اے ریتو! مجھے شینو مت کہو۔" نیرو نے تھوڑی دیر رک کر کہا۔

"ہائے بھگوان! میں تمہیں اور کیا کہوں، اب یہ نام بھی چینج کرو گی کیا۔" ریتو نے اپنے ماتھے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

"ہاں۔ واپس وہی پرانا نام رکھوں گی۔ نیرو۔" نیرو نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

"تم میرا دماغ خراب مت کرو یار، پہلے صحیح صحیح بتاؤ کہ تم نے روہن کے بارے میں سوچا کیا ہے۔" ریتو نے زور دے کر پوچھا۔

"پتہ نہیں۔" نیرو بیڈ روم کی چھت کی طرف دیکھنے لگی۔

"پتہ نہیں، مطلب؟ تمہیں نہیں پتہ تو اور کس کو پتہ ہوگا۔ یہ نام پھر سے کیوں بدل رہی ہو تم؟" ریتو کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ نیرو آخر سوچ کیا رہی ہے۔

"یار۔" نیرو نے بیچ میں ایک لمبی سانس لی۔ "آج صبح سے ہی پتہ نہیں کیسا کیسا احساس ہو رہا ہے۔ رات کو میں نے جو خواب دیکھا تھا۔ وہ ٹکڑوں میں رہ رہ کر اس طرح یاد آ رہا ہے جیسے جیسے میرے ساتھ آج کل میں ہی کچھ ہوا ہو بہت برا۔ کبھی میرے دل میں آتا ہے کہ جیسے کچھ پتہ نہیں کہ کیا مل گیا۔ اچانک ہی لگتا ہے جیسے میرا کچھ کھو گیا ہے۔ بہت پیارا۔ رہ رہ کر دل میں جانے کیسی لہریں سی اٹھ رہی ہیں۔ میں نے خواب میں راجکماری کا رونا دیکھا تھا۔ صبح سے لے کر اب تک مجھے کئی بار ایسا لگا جیسے وہ راجکماری اب بھی میرے اندر رو رہی ہے کسی کو پکار رہی ہے کبھی لگتا ہے کہ دیو، راجکماری سے وعدہ کر کے گیا ہے۔ لوٹ کر آنے کا خیال آتا ہے جیسے اس نے یہ وعدہ راجکماری سے نہیں مجھ سے کیا ہو بڑا عجیب سا محسوس ہو رہا ہے یار ایسا لگتا ہے جیسے وہ راجکماری میں ہوں۔ پتہ نہیں کیوں؟ مگر دل ہی دل میں جیسے میں اب بھی دیو کو پکار رہی ہوں، کوئی تو بات ہے ریتو کوئی تو بات ہے۔"

"وہی تو میں بھی کہہ رہی ہوں کہ کوئی تو بات ہے۔ مگر تم نے سوچا کیا ہے۔ یہ تو بتا دو میری اماں۔"

ریتو نے اس کو بولتے ہوئے ٹوک دیا۔

"میں نے سوچا ہے کہ جو ہوتا ہے ہونے دوں زیادہ سے زیادہ کیا ہوگا، سوچ سوچ کر پاگل ہو جاؤں گی نا، مگر وہ بھی یوں بیچ بھنور میں پھنسے رہنے سے تو بہتر ہی ہوگا میں جاننا چاہتی ہوں دیو کو کس نے مار دیا؟ میں جاننا چاہتی ہوں کہ راجکماری کے ساتھ پھر کیا ہوا؟ ایک بات اور جس لاکٹ کے بارے میں روہن نے ذکر کیا تھا کہ میرا دل اس میں اٹکا ہوا ہے مجھے یہ بھی یاد آ رہا ہے کہ آخری بار جاتے ہوئے دیو نے راجکماری کو ایک لاکٹ دیا تھا۔ مگر پوری بات کا پتہ نہیں چلا تو میں تو سوچ سوچ کر سچ مچ پاگل ہو جاؤں گی۔ پتہ نہیں کیا ہو رہا ہے مجھے۔" نیرو بول کر رک گئی۔

ریتو پوری کہانی جاننے کے لیے بے چین سی ہو گئی۔

"سپنے میں تم نے جو کچھ دیکھا ہے وہ کتنا یاد آ گیا ہے؟"

"ہوں، راجکماری نے دیو کو پہلی بار کہاں دیکھا، یہ یاد آ رہا ہے۔ دیو کی شکل یاد آ رہی ہے۔ راجکماری بھیس بدل کر دیو کے گھر گئی تھی، وہاں کھانا کھایا تھا، پھر...... ایک منٹ...... سوچنے دے مجھے۔" نیرو نے آنکھیں بند کر لیں۔

"دیو۔ دیکھنے میں کیسا تھا۔" ریتو سے رہا نہیں گیا۔

"تم اپنے آنند کے بارے میں سوچو۔ میرے دیو کے بارے میں کیوں پوچھ رہی ہو۔" نیرو ہنسنے لگی۔

"اوہ ہو! بڑی آئی راجکماری۔" ریتو بھی نیرو کے ساتھ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ پھر سنجیدہ ہوتے ہوئے بولی۔ "تم ٹھیک طرح سے پورا خواب یاد کر لو۔ پھر تفصیل سے سنانا میں ان کو بلا لاؤں نا؟"

"ٹھیک ہے دس پندرہ منٹ بعد بلا لینا۔ تب تک چپ بیٹھ جاؤ اور مجھے یاد کرنے دو۔" نیرو آنکھیں بند کرتی ہوئی لیٹ گئی۔

......☆☆☆......

"بلا لاؤں اب؟ بیس منٹ ہو گئے ہیں۔" ریتو بیس منٹ چپ چاپ بیٹھی رہی تھی۔

"شش۔" نیرو نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر ریتو کو چپ رہنے کا اشارہ کیا۔ اس کے چہرے کے تاثرات سے ایسا لگ رہا تھا جیسے اس کو خواب یاد آ رہا ہے یا پھر خواب سے بھی آگے کچھ، ریتو خاموشی سے اس کے پاس بیٹھی اس کو دیکھتی رہی۔ نیرو کے چہرے کے تاثرات پل پل بدلنے لگے۔ ریتو چپ چاپ اٹھی اور روہن اور روبندر کو بیڈ روم میں بلا لائی۔

......☆☆☆......

"سنو...... سنو...... سنو...... راجیہ کے سبھی باسیوں کو آگاہ کیا جاتا ہے کہ مہاراج ویدرات کی جانب سے رشتے کی پیش کش کو ٹھکرانے والے دونوں راجیوں کی جنتا کو یدھ کی آگ میں جھونکنے والے اور راجکمار ابھے سمیت ہزاروں سپاہیوں کے قتل کے دوشی ہونے کی وجہ سے، موت کی سزا کا یقین ہونے پر راجا ویر پرتاب آتما ہتیا کر چکے ہیں اور مہارانی بھی خودکشی کر چکی ہیں راجکمار میدان جنگ میں مارے جا چکے ہیں آج سے اس راجیہ کی باگ ڈور مہاراج ویدرات کے آشیرباد سے سیناپتی کنور پال کے ہاتھوں میں ہے کل مہاراج ویدرات ان کی تاجپوشی کے لیے اس راجیہ میں پدھار رہے ہیں سنو...... سنو۔" اعلانچی گلی گلی اعلان کرتا جا رہا تھا اور بیچاری عوام اس اعلان کو سننے کے علاوہ اور کر بھی کیا سکتی تھی۔

......☆☆☆......

لتا بدحواسی کے عالم میں بھاگی بھاگی راج محل

پہنچی تو دربانوں نے اس کو روک لیا۔
''رکو...... کسی کو اندر جانے کی اجازت نہیں ہے۔''
''مگر...... مگر میرا راجکماری سے ملنا بہت ضروری ہے۔ ابھی اور اسی وقت۔'' لتا کے چہرے پر خوف کی پرچھائیاں صاف دیکھی جا سکتی تھیں۔
''راجا کنور پال کے حکم کے مطابق اب راجکماری پریا درشنی راج محل میں قیدی کی حیثیت سے رہ رہی ہیں اور ان کے حکم کے مطابق کسی کو راجکماری سے ملنے کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔'' دربان نے اپنی بات دوہرائی۔
اچانک سابقہ سیناپتی اور اب یہاں کے راجا کنور پال جو وہاں ٹہل رہے تھے۔ ان کا قہقہہ محل کی دیواروں میں گونجنے لگا۔ ''راجکماری کی سکھی' اس کو اندر آنے دو شاید اسی کی بات پر یقین کر کے راجکماری حقیقت کی دنیا میں واپس آ جائیں وہ بے وقوف اب بھی دیو کا انتظار کر رہی ہے۔ جاؤ اور جا کر اس کو سچائی سے آگاہ کرو بتا دو اس کہ دیو کو ہم نے اس دنیا سے مٹا دیا ہے اب وہ اپنا پاگل پن چھوڑ دیں اور خود کو مہاراج ویدرات کی ملکہ بننے کے لیے لائق تیار کر لیں مہاراج اس کو پلکوں پر بٹھا کر رکھیں گے۔ آخر وہ پھکڑ دیو اس کو دے ہی کیا سکتا تھا جو مہاراج نہیں دے سکتے۔''
دربانوں نے لتا کو اندر جانے کا اشارہ کیا۔ بھاگتی ہوئی لتا اندر داخل ہو گئی اور کنور پال سے کچھ آگے جا کر رک گئی۔ ''راجکماری کہاں ہیں؟''
''ابھی تک تو وہ اپنے اسی کمرے میں ہی ہیں دھیان رہے محل میں چپے چپے پر ہمارے جاسوس نگاہ رکھے ہوئے ہیں۔ تھوڑی سی بھی چالاکی کرنے کی کوشش کی تو اس کا انعام تمہیں سزائے موت کی صورت میں ملے گا' جاؤ' جا کر سمجھا دو اس کو پاگل پن ایک حد تک ہی برداشت کیا جا سکتا ہے' جو جا چکا ہے' رہ رہ کر اس کا ڈھول پیٹنے سے وہ واپس نہیں آ جائے گا۔'' راجا کنور پال کے لہجے میں غرور صاف جھلک رہا تھا۔
لتا نے نظریں جھکا لیں اور پھر راجکماری کے کمرے کی طرف دوڑ پڑی کمرے کے باہر کھڑے پہریداروں نے ایک بار پھر اس کا راستہ روک لیا۔
''اندر جانے کی اجازت کسی کو نہیں ہے۔''
''مم...... مجھے...... را...... راجا کنور پال نے راجکماری کے پاس جانے کی اجازت دی ہے۔'' لتا نے جواب دیا۔
پہریداروں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور اس کو اندر جانے دیا۔
''لتا۔'' بے چین سی بیٹھی راجکماری نے جیسے ہی لتا کو دیکھا تو اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی دھار امڈ پڑی۔ ''تم کہاں تھیں اب تک؟ ہم کب سے تمہارا انتظار کر رہے ہیں دیکھو نا' ہمیں ہمارے دیو سے دور رکھنے کے لیے پتا شری کیسی کیسی چال چل رہے ہیں میں جانتی ہوں کہ اب تک فتح کی دیوی ہمارے دیو کے قدم چوم چکی ہو گی مگر ہمیں جانے کیا کیا بتایا جا رہا ہے پتا شری اور ماتا شری ہمارے سامنے نہیں آ رہے وہ کنور کہتا ہے کہ...... کہ...... دیو...... میرا دیو! تم بتاؤ نا' پوری بات' ہمیں باہر بھی نہیں نکلنے دیا جا رہا' بتاؤ نا سکھی' میرا دیو ہمیں درشن دینے سے پہلے اور کتنا انتظار کروائے گا؟ اور کتنا تڑپائے گا ہمیں۔''
لتا کی نظریں جھک گئیں' ایک لمبی سی آہ ٹیس بن کر اس کے لبوں سے نکلی' راجکماری کی حالت دیکھ کر وہ رو بھی نہیں پائی۔
''آپ یہاں سے نکل جائیں راجکماری اپنے کپڑے مجھے دیں۔''
''نہیں' ہمیں تمہارے منہ سے پوری بات سنے بغیر چین نہیں آئے گا اور دیو کے آئے بغیر ہم یہاں سے جانے والے نہیں ہیں انہوں نے ہمیں انتظار کرنے کا کہا تھا تم پوری بات بتاؤ نا' جتنی خوب صورتی سے تم ان کی بہادری کے واقعات بیان کرتی تھیں اور کوئی نہیں کر سکتا تم جلدی سے ہمیں سب کچھ سچ سچ بتا دو اگر پتا شری کو پتہ چل گیا کہ تم آئی ہو تو وہ تمہیں یہاں نہیں رہنے دیں گے۔''
لتا کے چہرے پر موت سے بھی گہرا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ ''راجکماری جی یدھ میں دیو کو شکست دینا شاید خود دیو کے بس میں بھی نہیں ہوتا دیو یدھ دیوتا۔'' لتا کو راجکماری نے بیچ میں ہی بولنے سے روک دیا۔
ملتجی نگاہوں سے وہ لتا کو دیکھتی ہوئی اس کے پاس سرک کر بولی۔ ''اے سکھی میرا دیو بول کے بتا نا ہمیں بڑا پیارا لگتا ہے جب تم ایسا بولتی ہو۔''
لتا کی آنکھوں سے آنسو تھمنے کا نام ہی نہیں لے رہے تھے۔ مگر پیار میں اندھی پریا درشنی ان آنسوؤں کا مطلب نہیں سمجھ پا رہی تھی۔
''ہاں راجکماری جی آپ کا دیو پوری رن بھومی میں ایسے چھایا ہوا تھا جیسے جیسے وہ اکیلا بہادر دشمن کی پوری فوج کو تہس نہس کر کے رکھ دے گا آسمان پر ایک سورج کی مانند اکیلا دیو دشمن فوج کا سینہ چیرتا ہوا آگے بڑھتا چلا جا رہا تھا کسی میں اس کا سامنا کرنے کی ہمت نہیں تھی اپنی سینا میں پھیلی بھگدڑ کو دیکھ کر کر مورکھ راجکمار ابھے بلبلاتا ہوا دیو کے سامنے آ گیا۔
''کیوں رے۔ ایک کھیل میں تم کیا جیتے کہ تم نے تو بڑے بڑے خواب دیکھنے شروع کر دیئے یدھ میں آ کر راجکمار ابھے کو للکارنے والا تم جیسا کوئی مورکھ ہی ہو سکتا ہے ہماری سینا کو تتر بتر کر کے تم یہ مت سمجھنا کہ تم یدھا ہو گئے ہو' یدھ میں تو تم ہمارے سامنے نادان بچے جیسے ہی ہو مورکھ سمجھ کر میں تمہیں [illegible] ہوں کہ میری لڑائی تمہارے راجا کے خلاف نہیں ہے ہمارا مقصد صرف راجکماری کو حاصل کرنا ہے اور اگر تم ہمارے راستے ہٹ کر اپنی جان بچانا چاہتے ہو تو ہم تم سے اس کا وعدہ کرتے ہیں۔ جاؤ...... چلے جاؤ......'' آپ کے دیو کے چہرے پر یقین سے بھری مسکراہٹ تیر اٹھی۔ ''میری طرف سے دی گئی یہ آخری چتاونی سمجھنا راجکمار' میں بھی اپنا راجیہ جیتنے نہیں اپنے راجیہ کی آن جیتنے کے لیے یہاں آیا ہوں میری تم سے یا جنگ میں ہمارے خلاف لڑ رہے کسی سپاہی سے کوئی دشمنی نہیں ہے' تمہاری فوج بھاگ رہی ہے' اور تم دیکھ رہے ہو کہ ہماری سینا کسی کی پیٹھ پر وار نہیں کر رہی۔ تمہارے پاس بھی موقع ہے' تم ابھی بھی واپس جا سکتے ہو۔'' اپنی ہار کو سامنے دیکھ کر بوکھلایا ہوا ابھے' دیو کی طرف لپکا اور پلک جھپکتے ہی دیو کی سنسناتی ہوئی تلوار ہوا میں بجلی کی طرح لہرائی ابھے دم بخود رہ گیا پگلایا ہوا سا وہ اپنے آپ کو بے بس سا جان کر ہوا میں یونہی وار پہ وار کرنے لگا جیسے ہی وار دیو کے نزدیک آیا ان کی تلوار لہرائی اور ابھے کا سر ان کے دھڑ سے دور جا گرا۔'' اس کے بعد تو بچی کچھی فوج بھی میدان چھوڑ کر بھاگنے لگی اور میدان خالی ہونے کے ساتھ ہی مہاراج ویدرات کا سامنا آپ کے دیو سے ہو گیا مہاراج نے ایک بار دیو کی خون سے تر تلوار کی طرف دیکھا اور پھر دیو کے چہرے کو جو اس موت کے پیامبر کا روپ لیے ہوئے تھا۔ اچانک ان کی نظر نزدیک ہی ابھے کے سر کٹے دھڑ پر پڑی اور وہ خوف سے کانپنے سا لگا اگلے ہی پل وہ مخالف سمت بھاگ اٹھا۔ تبھی کسی نے دیو کو خبر دی کہ مہاراج ویر پرتاب گھائل ہو گئے ہیں۔ دیو سب کچھ چھوڑ کر فوراً مہاراج کے پاس پہنچا ہی تھا کہ سابقہ سیناپتی کنور پال ان کے [illegible] آ کر معافی کی بھیک مانگنے لگا۔ ''سیناپتی دیو

ہمیں اچھی طرح معلوم ہے کہ ہماری غداری کا گناہ کسی صورت بھی سزائے موت سے کم نہیں ہے' پھر بھی میں آپ کے قدموں میں گر کر اپنی جان کی امان مانگتا ہوں مجھے امان دیں۔" اس نے اپنے گھوڑے سے اتر کر دیو کے پاؤں پکڑ لیے آپ کے دیو نے کہا معافی تمہیں راجیہ سے مانگنی چاہئے کنور پال۔" "میں تو مہاراج کی فوج کا ایک ادنیٰ سا سپاہی ہوں اور اپنے راجیہ کا ایک محبت وطن شہری تم وطن دشمن ہو راجیہ ہی تمہارے بارے میں فیصلہ کرے گا۔" دیو نے بے ہوش پڑے مہاراج کو اٹھانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "تب بھی میں یہیں کفارہ ادا کرنا چاہتا ہوں سیناپتی! مجھے حکم دیجئے۔" کنور پال' دیو کے قدموں میں خاک ہوا جا رہا تھا۔ "ہوں آپ خود فوج کے سپہ سالار رہ چکے ہیں کنور پال! آپ کو آ گیا لینے کی کیا ضرورت ہے؟ دشمن کی فوج بھاگ رہی ہے۔ تعداد میں اب وہ مشکل سے آدھے ہی بچے ہوں گے۔ آپ جا کر سینا کو سنبھالیئے۔ میں مہاراج کو راج محل چھوڑ کر آتا ہوں۔" کہہ کر آپ کے دیو جیسے ہی مہاراج کو سنبھالنے کے لیے مڑے تو بزدل کنور پال نے آپ کے دیو کی پیٹھ میں خنجر گھونپ دیا۔

"آہ۔" ایسا لگا جیسے وہ خنجر دیو کی نہیں خود ان کی پیٹھ میں گھونپا گیا ہو۔ "ہاں۔ ہم نے دیکھا تھا ان کا گھاؤ۔"

"پھر کیا ہوا لتا؟" راجکماری بے چین سی ہو کر تڑپ اٹھی۔

"وہ معمولی گھاؤ نہیں تھا راجکماری' خنجر ان کے بدن کے آر پار ہو گیا تھا شاید ان کو اسی وقت احساس ہو گیا تھا کہ۔" لتا آگے نہ بول سکی۔

"کیا بکواس کر رہی ہو تم کیا احساس ہو گیا تھا ان کو؟ مجھے تم سے یہ امید نہیں تھی تم بھی پتا شری کے دیئے گئے لالچ میں آخر آ ہی گئیں نا میں نے کبھی نہ سوچا تھا کہ سونے چاندی کے لالچ میں تم بھی مجھ سے ایسا سلوک کرو گی میرے دیو سے مجھے دور کرنے کے لیے۔" راجکماری نے غصے سے کہا۔

لتا کچھ نہیں بولی۔ بس اس کی آنکھوں سے آنسو لڑھک کر پریا کی ہتھیلی پر جا گرے۔

"ہمیں ڈراؤ مت لتا ہم ڈرنے والے نہیں ہیں۔" "تم بس ہمیں ہمارے دیو کے بارے میں بتاتی رہو۔" راجکماری ابھی بھی حقیقت کو سمجھنے کی کوشش سے بہت دور تھی۔ "لتا تم بولو نا کہاں ہے ہمارا دیو کیا ہو گیا ہے تمہیں۔" راجکماری چلا کر بولی۔

"اب...... اب بولنے کو رہ ہی کیا گیا ہے راجکماری دیو اب اس دنیا میں نہیں رہے۔"

"نہیں۔" راجکماری چیخ اٹھی وہ اب بھی یقین نہیں کرنا چاہ رہی تھی اور بے تحاشہ رونے لگی۔

"اپنے آپ کو سنبھالیں راجکماری اور سب سے پہلے تو آپ یہاں سے نکلیں وہ دشٹ ویدرات آپ کو اپنی رانی بنانے کے بارے میں سوچ رہا ہے۔ آپ یہاں سے جلدی نکل جائیں۔" لتا بھی اس کے ساتھ رو رہی تھی۔

"ہمارا وِواہ تو ہو چکا ہے لتا' جنم جنم کے لیے ہمارے دیو کے ساتھ سنا ہے کہ اس جیون کے اس پار بھی جیون ہوتا ہے اگر ایسا سچ ہے تو دیو وہاں ہمارا انتظار کر رہا ہو گا میرا تو سب کچھ ان کا ہو چکا ہے لتا اگر وہ اب اس دنیا میں نہیں ہیں تو میری آتما ابھی تک میرے شریر میں کیسے ہے' نہیں...... نہیں...... تم جھوٹ بول رہی ہو وہ ابھی یہیں ہیں' یہ دیکھو انہوں نے خود کو ہمارے حوالے کر دیا تھا۔" پریا اپنے گلے سے دیو کا دیا ہوا لاکٹ نکالتے ہوئے بولی۔ "یہ دیکھو یہ رہا میرا دیو' دیو نے بھگوان کو اپنا سب کچھ دے کر

ہمیں مانگ لیا تھا۔ بھگوان اتنے سنگدل کیسے ہو سکتے ہیں لتا بھگوان ہمیں الگ الگ کیسے کر سکتے ہیں۔ کہہ دو کہ سب جھوٹ ہے کہہ دو نا سکھی۔" پریا کی تڑپ سے راج محل کی دیواریں بھی جیسے سسکنے سی لگی تھیں۔

تبھی راجا کنور پال تالی بجاتا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔ "واہ' واہ' کیا پریم ہے۔ موت جیسے سچ کو تسلیم کرنے سے انکار کر رہا ہے پیار' واہ...... تو یہ ہے تمہارا دیو۔" کنور پال نے پاس آ کر پریا کے ہاتھوں سے لاکٹ چھین لیا۔

"اس کو اپنے پاپی ہاتھوں سے چھونے کی کوشش مت کرو درندے۔ ورنہ اس کے تیج کی اگنی سے تجھے بھسم ہوتے دیر نہیں لگے گی' میرا دیو مجھے واپس کر دو' میرا دیو مجھے لوٹا دو۔" کنور پال سے لاکٹ چھیننے کے لیے راجکماری جیسے ہی پلنگ سے اٹھی' زمین پر گر گئی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے اس کے بدن میں جان بچی ہی نہ ہو۔ صرف چند آہیں بچی تھیں۔ جو رہ رہ کر اپنے دیو کو پکار رہی تھیں۔

"اچھا! ذرا دیکھیں تو تمہارے دیو کے تیج کی اگنی کو' دیکھیں تو اس کی اگنی کتنی تپش برداشت کر پاتی ہے۔" ٹھٹھا مار کر کنور پال شاہی رسوئی گھر کی طرف گیا جہاں بھوجن کے لیے چولہے جل رہے تھے۔ پریا گرتے پڑتے اس کے پیچھے پیچھے آ رہی تھی۔

"یہ لو تمہارا دیو' آگ کو آگ میں ڈال دیا ہم نے اب تو یہ مجھے بھسم نہیں کرے گا نا۔ ہاہاہا۔" کنور پال نے لاکٹ کو چولہے میں پھینک دیا۔

مگر پریا کو تو جیسے اس کی باتوں سے کوئی سروکار ہی نہیں تھا۔ اس کی منزل تو صرف اس کا دیو تھا۔ دیو کے علاوہ اس کو کچھ دکھائی ہی نہیں دے رہا تھا۔ اب اس کو بھی دیو تک جانے کا راستہ مل گیا تھا۔ اب اس کے قدموں کی لڑکھڑاہٹ ختم ہو چکی تھی۔ ڈگمگاہٹ ختم ہو چکی تھی۔ اسکے چہرے پر فیصلہ کن چمک تھی۔

وہ دوڑتی ہوئی بھٹی نما چولہے میں جا گری۔ اور بھٹی سے آگ کی لپٹیں اٹھنے لگیں جنہوں نے دیکھتے ہی دیکھتے پورے رسوئی گھر کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

......☆☆☆......

نیرو کے پل پل رنگ بدل رہے چہرے پر اب اچانک عجیب سا سکون چھا گیا تھا۔ رسوئی گھر کی آگ ٹھنڈی ہونے پر اس کو چولہے کے پاس بھسم ہو چکی ایک لاش دکھائی دی۔ راجا کنور پال کی لاش۔

کچھ دیر یونہی پڑے رہنے کے بعد نیرو نے آنکھیں کھول دیں۔ سامنے بیٹھا روہن کب سے اس کے آنکھیں کھولنے کا منتظر تھا' اس کی حیرت کا ٹھکانہ نہ رہا جب نیرو آنکھیں کھولنے کے بعد نم آنکھوں سے مسلسل اسے دیکھتی رہی۔ دردناک خواب سے لوٹ کر آئی اس کی گیلی آنکھوں میں اتنا کرب نہیں تھا۔ جتنا راجکماری پریا کے روپ میں کچھ دیر پہلے اس نے محسوس کیا تھا۔ آخر کار پریا کا دیو لوٹ آیا تھا۔ بھگوان کو ان کے انوکھے پیار کی خاطر جھکنا ہی پڑا اور اب اس جنم میں ان کے ملن میں کوئی بڑی رکاوٹ نہیں رہی تھی' شاید۔

"ایسے کیا دیکھ رہی ہو نیرو؟ ہم ایک گھنٹے سے تمہارے جاگنے کا انتظار کر رہے ہیں۔ کچھ یاد آیا کہ نہیں؟" ریتو نے اس کو پکڑ کر ہلا دیا۔

"مجھے ٹیلے پر جانا ہے۔" نیرو اٹھ بیٹھی۔ مگر اب بھی اس کی نظریں روہن پر ہی جمی ہوئی تھیں۔

"ہاں' چل...... ہم نے کب منع کیا ہے؟" رویندر خوش ہو کر بولا۔

"نہیں۔ ہم دونوں اکیلے جائیں گے۔ تم لوگ یہیں رہنا پلیز۔" نیرو نے رویندر کو دیکھ کر کہا۔

"میں نہیں جاؤں گی' تمہارے ساتھ اکیلے اس

ٹیلے پر مجھے تو روہن کے منہ سے وہاں کی کہانی سنتے ہوئے ہی ڈر لگ رہا تھا ہم دونوں لڑکیاں ہیں یار۔" ریتو نے تنک کر کہا۔

"میں تمہیں نہیں بول رہی ہوں ریتو میں اور دیو...... سس سوری...... روہن وہاں جائیں گے۔ صرف ہم دونوں۔" روہن کو دیو کہنے کی بھول کرنے پر نیرو جھجک سی گئی اور باقی کی باتیں اس نے نظریں جھکا کر پوری کیں۔

نیرو کے دیو کہتے ہی وہاں بیٹھے تینوں کی نظریں آپس میں مل کر چمک اٹھیں۔

ریتو نے خوش ہو کر نیرو کو اپنی بانہوں میں بھر لیا۔

نیرو نزاکت سے مسکرائی اور شرما کر چہرہ دوسری طرف کر لیا۔

"مبارک ہو دیو صاحب آخر آپ کو بھابھی جی مل ہی گئیں۔" رویندر نے روہن کو چھیڑتے ہوئے اس کا گال پکڑ کر کھینچ لیا۔

"کیا ہے یار؟" روہن بناوٹی غصے سے بولا اور پھر ہنسنے لگا۔ وہ اپنے دل کو ملنے والے اس بے پناہ سکون کو بھلا کب تک چھپاتا۔

"کیا ہے یار تمہارا بیاہ ہے اب تو اور کیا رہ گیا ہے اب؟" رویندر خوش ہو کر بولا۔

نیرو سے زیادہ دیر تک روہن سے نظریں ملائے بنا نہیں رہا گیا وہ پھر سے سیدھی ہو کر رہ رہ کر روہن کو دیکھنے لگی۔

"لیکن بھا...... بھ...... سوری۔" رویندر اپنی بات ادھوری چھوڑ کر نیرو کے جواب کا انتظار کرنے لگا۔

نیرو نے دو پل کے لیے اس کو گھور کر دیکھا اور پھر کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ اس کے ہنستے ہی جیسے فضا میں موتی سے بکھر گئے ہوں۔ سبھی رویندر کی طرف دیکھ کر ہنسنے لگے۔

"مطلب...... اب لائن کلیئر ہے اب تو بھابھی جی بول سکتا ہوں نا آپ کو؟" رویندر نے دانت نکالتے ہوئے کہا۔

"ہوں۔" نیرو نے اتنا ہی کہا اور نظروں کو شرارتی انداز میں سکوڑ کر روہن کی طرف دیکھنے لگی۔ "ان سے پوچھ لو۔"

"یہ تو کب سے آپ کے فراق میں دھکے کھا رہا ہے بھابھی جی اس سے کیا پوچھنا مگر اب ٹیلے پر جا کر کرنا کیا ہے؟ اور آپ اکیلے کیوں جاؤ گے میں بھی چلوں گا میں نہیں ماننے والا اس بار۔" رویندر نے پہلے نیرو کو اور پھر روہن کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"نہیں جانا تو پڑے گا ہی، روہن کے سپنے میں پریا نے کیا کہا ہے یاد نہیں کیا؟" نیرو نے سوال کیا۔

"ہاں یار، میری بہن کا دل تو وہیں پر ہے۔ یہی بات ہے نا؟" ریتو نے نیرو سے پوچھا۔

"او...... ہ ہاں...... مگر اکیلے کیوں؟ میں بھی ساتھ چلوں گا بس۔" رویندر نے کہا۔

"مگر پاپا کو اس بارے میں پتہ نہیں چلنا چاہیے کہ ہم ٹیلے پر جا رہے ہیں۔ وہ ہمیں وہاں نہیں جانے دیں گے اور اکیلے تو بالکل بھی نہیں میں خود ہی ان سے کوئی بہانہ کر دوں گا۔ تم سب دھیان رکھنا ان کو خبر نہیں ہونی چاہیے۔" روہن نے سب کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے یار۔ دیکھ لیں گے۔ مگر نیرو تم پوری کہانی سناؤ نا میں کب سے سننے کو بیقرار ہوں۔" ریتو مچل کر بولی۔

"ہاں ہاں بھابھی جی۔ جو کچھ آپ کو یاد آیا ہے۔ سب سناؤ۔" رویندر نے کہا۔

"سب کچھ یاد آ گیا ہے۔ بیچ میں مت بولنا۔" نیرو نے کہا اور سب خاموش ہو گئے۔ نیرو نے ان کو دیو کو پہلی بار دیکھنے سے لے کر کہانی سنانی شروع کر دی۔

......☆☆☆......

سپنے کی کہانی پوری ہونے کے بعد کافی دیر تک چاروں سن ہو کر بیٹھے رہے۔ کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا جواب دیں۔

روہن کو تو یقین ہی نہیں ہو رہا تھا کہ وہ کبھی دیو رہا ہو گا۔

"کب چلیں ٹیلے پر؟" رویندر، نیرو کے چپ ہونے کے بعد بولنے والوں میں سب سے پہلا تھا۔

"تم نہیں جا رہے ہو۔ صرف ہم دونوں جا رہے ہیں۔" نیرو نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے کہا۔

"مگر میں کیوں نہیں بھابھی جی؟ مجھے بھی چلنا ہے مجھے بھی دیکھنا ہے کہ آپ کو جب سب یاد آ جائے گا تو آپ کیا کریں گی؟" رویندر نے مچلتے ہوئے کہا تو روہن نے اس کی طرف گھور کر دیکھا۔ روہن نے شاید اس کی بات کا غلط مطلب نکال لیا تھا۔

"مگر کسی نہ کسی کو تو لے کر جانا ہی پڑے گا ویسے بھی وہاں رات کو جانا ہے ہمارا اکیلے چلنا ٹھیک نہیں ہے۔" اس بار روہن نے رویندر کی بات کی تائید کی۔

"ہاں۔ یہی تو میں کہہ رہا ہوں۔" رویندر نے پھر اپنی ٹانگ پھنسائی۔

"او کے۔ تو پھر چاروں چلتے ہیں مگر تم دونوں ٹیلے سے ذرا دور کھڑے ہو جانا ادھر تو ہم دونوں اکیلے ہی جائیں گے۔" نیرو نے ان کی بات مان ہی لی۔

"تو آج ہی چلیں کیا۔" رویندر نے خوش ہو کر کہا۔

"اور کیا چلنا ہے تو آج ہی چلو پھر ہمیں واپس بھی تو جانا ہے۔" ریتو نے بھی رویندر کی بات کی تائید کرتے ہوئے کہا۔

"ہوں، ٹھیک ہے۔ میں پاپا کو فون کر کے گاڑی منگوا لیتا ہوں۔ ان سے میں یہی بہانہ کروں گا کہ کسی دوست کے پاس جا رہے ہیں۔"

......☆☆☆......

"کیا ہوا تمہیں، ڈر لگ رہا ہے کیا ابھی تو گاؤں میں ہی ہیں یار! تم ایسا کرو گے تو ہمارا کیا حال ہو گا۔" رویندر نے روہن کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر پوچھا۔

روہن نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ اس وقت شروتی کے گھر کے سامنے سے گزرے تھے۔ گھر کا دروازہ بند دیکھ کر روہن کی آنکھیں نم ہو گئی تھیں۔ شروتی کا معصوم چہرہ اس کی آنکھوں کے سامنے گھوم گیا تھا، بیچاری۔

"کیا ہوا۔" رویندر کی بات سن کر پیچھے بیٹھی نیرو نے کہا۔

"کچھ نہیں، وہ۔" روہن نے رک کر ایک لمبی سانس لی۔ "پیچھے والا گھر شروتی کا تھا۔"

"کون سا؟" تینوں نے ایک ساتھ پلٹ کر پیچھے دیکھنے کی کوشش کی۔

"یہ جو ابھی گیا ہے اکیلا سا گھر۔" ریتو نے پوچھا۔

"ہاں۔"

"ہمیں چلنا چاہیے تھا وہاں۔" نیرو نے کہا۔

"دل تو میرا ابھی کر رہا ہے۔ مگر ہمت نہیں ہو رہی ہے۔" روہن نے جواب دیا۔

"تم تو پاگل ہو یار۔ جو بھی ہوا۔ اس میں تمہاری یا ہماری کیا غلطی ہے؟ پھر اس کے بابا سے مل کر آنا اس کی آتما کو اچھا ہی لگتا۔" رویندر نے کہا۔

"ہاں، ہاں، چلو ایک بار ہو آتے ہیں۔" ریتو بولی۔

"ابھی تو گیارہ بجنے والے ہیں۔ گاڑی آگے نہیں جائے گی۔ پیدل چلنے میں گھنٹہ بھر لگ جائے گا۔ بارہ بجے تک ہمیں وہاں پہنچنا ہے واپسی میں آتے ہوئے دیکھ لیں گے۔" روہن نے کہا اور گاڑی

چلاتا رہا۔

"کیا! اس سنسان راستے پر پیدل چلنا پڑے گا۔ وہ بھی اتنی رات گئے؟" ریتو لرزسی گئی۔ "مجھے تو تم وہیں اتار دیتے۔ شروتی کے گھر۔"

"ہا...... ہا...... اب کیا ہو گیا؟" رویندر نے مذاق کیا۔

"تمہیں کچھ کہا ہے میں نے اپنا منہ بند رکھو۔" ریتو خجل سی ہو کر بولی۔

"کم از کم یہاں تو مان جاؤ تمہاری تو کتے بلی جیسی دوستی ہے۔" نیرو نے بیچ بچاؤ کرانے کی کوشش کی۔

"ہی...... ہی رویندر کو کتا بولا۔" ریتو قہقہہ لگا کر ہنسنے لگی۔

"نہیں۔ نہیں۔ میری بات کا یہ مطلب نہیں تھا۔" نیرو ہڑبڑا کر صفائی دینے لگی۔

"کوئی بات نہیں بھابھی جی۔ یہاں سب چلتا ہے۔ مگر اس کو بلی کی جگہ کوئی بڑھیا سا نام دینا چاہئے تھا جیسے چھپکلی ہا...... ہا۔"

"لو گاڑی یہیں کھڑی کرنی پڑے گی۔ آگے پیدل ہی چلنا ہے۔ ٹارچ ساتھ لائے ہو نا؟" روہن نے گاڑی کو سائیڈ میں کھڑا کرتے ہوئے رویندر سے پوچھا۔

"ہاں لایا ہوں۔" رویندر نے کہا اور سب گاڑی سے اتر گئے۔

......☆☆☆......

راستہ پچھلی بار کی طرح ہی ڈراؤنا تھا۔ بے ڈھنگا اور سنسان سا مگر جانے کیوں روہن کو آج ڈر نہیں لگ رہا تھا۔ شاید وہ خود کو آج دیو کے روپ میں ہی دیکھنا اور دکھانا چاہ رہا تھا یا پھر نیرو کے ساتھ ہونے سے اس کو روحانی طاقت سی مل رہی تھی نیرو بھی اس کے پیچھے پیچھے دھیان سے چل رہی تھی۔

نیرو کے پیچھے ریتو اور سب سے آخر میں ٹارچ کو ہاتھ میں لیے رویندر تھا۔

"اتنی تیز مت چل یار میں پیچھے رہ جاتی ہوں۔" ریتو نے نیرو کی قمیص پکڑ کر کھینچ لی۔

"تو میں کیا کروں؟ یہی بھاگا جا رہا ہے۔" نیرو نے اس کے ساتھ ہو کر کہا۔

"ارے بھائی ذرا آرام سے چل لو۔ میں پیچھے رہ گیا تو واپس بھاگ جاؤں گا' پہلے بتا رہا ہوں۔" رویندر نے نیرو کی بات سن کر کہا۔

"بولو مت یار چپ چاپ چلتے رہو ہمیں بارہ بجے سے پہلے ہی پہنچ جانا چاہئے۔" روہن نے اپنی چال دھیمی نہیں کی۔

"کہتا ہے بولو مت یہاں میری جان سوکھی جا رہی ہے کسی نے پیچھے سے کھینچ لیا تو تم تو یہی سمجھو گے نا کہ میں واپس بھاگ گیا میں گم ہو جاؤں تو مجھے ڈھونڈ لینا بھائی' مجھے لگ رہا ہے کہ میرے پیچھے پیچھے کوئی چل رہا ہے۔" رویندر نے چلتے چلتے کہا۔

"اوئی۔" ریتو اچانک چیخ کر نیرو سے لپٹ گئی۔

سب چونک کر کھڑے ہو گئے۔

"کیا ہوا ریتو؟" نیرو نے اس کو سنبھالتے ہوئے پوچھا۔

"کچھ نہیں یہ خواہ مخواہ ڈرا کیوں رہا ہے مجھے۔" ریتو روہانسی ہو کر بولی۔

"لو آگے پیچھے میں ہی ملتا ہوں تمہیں کو سنے کو میں نے کیا کیا ہے؟" رویندر نے پوچھا۔

"یہ ایسے کیوں بول رہا ہے کہ اس کے پیچھے کوئی ہے۔ میری تو جان ہی نکل گئی تھی۔" ریتو نے رویندر کے سوال کا جواب نیرو کو دیا۔ اب کی بار اس نے نیرو کا ہاتھ نہیں چھوڑا تھا۔

"کیوں نہ بولوں' کسی نے کہا تھا کیا ساتھ آنے کو مجھے تو ایسے بھی لگ رہا ہے جیسے کوئی میرا کالر پکڑ کر کھینچ رہا ہو اور جھاڑیوں میں سے بڑی بڑی آنکھیں بھی چمکتی ہوئی دکھائی دے رہی ہیں تم تو گئیں آج۔" رویندر نے چٹخارے لے کر کہا۔

ریتو نے ایک بار پھر ڈر کر نیرو کو کس کر پکڑ لیا۔

"نہیں۔ مجھے نہیں چلنا ہے آگے۔ واپس چلو مجھے چھوڑ کر آ جانا۔" ریتو بری طرح سہم گئی تھی۔

"کیوں بکواس کر رہا ہے یار' اب تو پہنچ ہی گئے ہیں۔ وہ دیکھو لائٹ جل رہی ہے۔" روہن نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔

تبھی اچانک نیرو چکر کھا کر گرنے جیسی ہو گئی۔

"کک' کیا ہوا شینو! یہ شینو کو کیا ہو گیا ہے؟" نیرو کو اپنی بانہوں میں سنبھال کر ریتو ڈر کے مارے رونے لگی۔

"کچھ نہیں یونہی چکر سا آ گیا تھا۔" نیرو اپنے ماتھے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی۔ اور پھر سے کھڑی ہو کر روشنی کی طرف دیکھنے لگی۔

"تم دونوں یہیں رک جاؤ۔ آگے ہم اکیلے جائیں گے۔"

"نہیں' میں یہاں نہیں رہوں گی اس کے ساتھ تو بالکل بھی نہیں یہ تو مجھے ڈرا ڈرا کر ہی مار دے گا۔" ریتو نے رویندر کی طرف اندھیرے میں گھور کر کہا۔

"مگر یہ کیوں نہیں چل سکتے مجھے تو' چلو ٹھیک ہے رویندر بھائی۔ کیا کر رہے ہو یار یہ کوئی مذاق کا وقت ہے کیا؟" روہن' رویندر سے بولا۔

"چلو ٹھیک ہے۔ میں کچھ نہیں کہوں گا لیکن اگر یہاں پیچھے سے کوئی آ گیا تو۔" رویندر اب بھی باز نہیں آیا۔

"دیکھ لو' دیکھ لو اس کو میں اس کے پاس نہیں رہوں گی۔ اس سے تو اچھا ہے کہ اس کو بھی لے جاؤ اپنے ساتھ۔ میں اکیلی ہی رہ لوں گی۔"

"پلیز۔ رویندر مان جاؤ نا۔" نیرو نے پیار سے کہا تو رویندر نے فوراً اپنی دم سیدھی کر لی۔

"ٹھیک ہے بھابھی جی۔ آپ لوگ جاؤ۔ میں اس کی اپنی جان سے بھی بڑھ کر حفاظت کروں گا۔"

نیرو مسکرا دی اور پھر روہن کی طرف دیکھ کر بولی۔

"چلو۔"

رویندر اور ریتو کو وہاں چھوڑ کر وہ دونوں آگے بڑھ گئے۔

"کیا ہوا۔ آپ چپ چپ کیوں ہیں؟" نیرو نے چلتے چلتے روہن سے کہا۔

"آں...... نہیں تو...... کچھ نہیں' آگے کیچڑ ہے۔ اس لیے سنبھل کر چل رہا ہوں۔" روہن نے نیرو کی بات کا جواب دیا۔

یہ پہلی بار تھا جب وہ دونوں اکیلے تھے' اور کوئی نہیں تھا ان کے ساتھ۔

"آگے کیچڑ نہیں ہے۔ آپ آرام سے چلتے رہو۔" نیرو نے چہکتے ہوئے کہا۔

"تمہیں نہیں پتہ' پچھلی بار گھٹنوں تک ہماری پینٹ کیچڑ میں سن گئی تھی۔ ایک بات پوچھوں۔" روہن بولا۔

"ہوں' کچھ بھی پوچھو۔" نیرو اسی انداز میں بولی۔

"تمہیں سچ میں ڈر نہیں لگ رہا ہے یا تم اپنے ڈر کو چھپا رہی ہو؟" روہن نے سوال کیا۔

"نہیں ڈر نہیں لگ رہا' بھلا ہمیں ڈر کیوں لگے گا۔" نیرو بولی۔

"اتنی رات میں ہم یہاں سنسان راستے پر چل رہے ہیں۔ تم ویسے بھی لڑکی ہو ڈر لگنا تو [illegible] نے ارے کیچڑ بیچ میں نہیں ملا اور ہم تالاب کے پار پہنچ گئے ہیں۔" روہن نے حیرت سے کہا اور چونک کر

کچھ دھیان آیا۔ وہ فوراً پلٹ کر کھڑا ہوگیا۔
اس کے رکتے ہی نیرو بھی ایک دم وہیں کھڑی ہوگئی۔
"کک۔کون ہوتم؟" روہن اس کو غور سے دیکھتا ہوا ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔
نیرو مسکرانے لگی۔ "ہم نیرو ہیں، اور کون؟ اب چلو بھی۔"
"نہیں...... کک کونسی والی نیرو؟ سچ بتاؤ۔" روہن اس کے منہ سے دوبارا اپنے لیے ہم کا صیغہ سن چکا تھا۔ نیرو پہلے تو کبھی اس طرح نہیں بولتی تھی اور اس نے یہ بھی بتا دیا تھا کہ پیچھے نہیں ملے گا اسے احساس ہو رہا تھا کہ شاید وہ نیرو نہیں بلکہ پریا ہے۔
نیرو کچھ دیر یونہی کھڑی مسکراتی رہی۔ پھر وہ اچانک آگے بڑھ کر روہن سے لپٹ گئی۔
"ہم آپ کی نیرو ہیں جان، دیو کی پریا اور کون۔"
روہن، نیرو کی اس حرکت سے کچھ ہڑبڑا سا گیا۔ اور نیرو، روہن سے یونہی لپٹی کھڑی رہی۔ اس نے روہن کے سوال کا جواب کچھ یوں دیا۔
"آپ کیسے سمجھو گے، صدیوں بعد ملے ہو۔ ہم آپ کے لیے کتنا تڑپے ہیں، کیسے بتائیں؟ کیا کیا نہیں کیا...... کہاں کہاں نہیں ڈھونڈا آپ کو، اس دنیا کے بھی اصول توڑے اور اس دنیا کے بھی، مگر دیکھ لو جان، آخر کار ہم آپ کے ہو کر ہی رہے، ہر جنم، آپ کے سوا کسی کے بارے میں سوچا تک نہیں پیار کیا ہوتا؟ ہمارے شریر نے کبھی جانا تک نہیں ہمارا دل آپ کے لیے یہیں تڑپتا رہا یہاں اس تنہا ویرانے میں۔" بولتے ہوئے نیرو بلک بلک کر رونے لگی۔
روہن کی آنکھیں بھی بھر آئیں۔ اس نے جھجکتے ہوئے نیرو کو اپنی بانہوں میں بھر لیا۔
"آئی لو یو جان۔" اس نے نیرو کے بدن کے گرد اپنی بانہوں کا گھیرا اور تنگ کر دیا۔
"یہ سب تمہارے پیار کی وجہ سے ہی ہو پایا ہے مجھے تو کچھ یاد ہی نہیں تھا۔ ہاں سب کہتے تھے تم کھوئے کھوئے سے کیوں لگتے ہو مگر مجھے کبھی احساس نہیں تھا کہ میرا کیا گم ہوگیا ہے ہاں ایسا لگتا تھا کہ کچھ ڈھونڈ رہا ہے میرا من، آج جا کر من کو شانتی ملی ہے۔"
دونوں نہ جانے کتنی دیر یونہی کھڑے رہے خاموش اب صرف ان کے دل دھڑک رہے تھے۔ سانسیں بات کر رہی تھیں اور وقت جیسے وہیں ٹھہر سا گیا تھا۔
"اب کیا کریں؟" روہن نے کچھ دیر بعد خاموشی توڑی۔
"کچھ مت بولو ابھی ہمیں صدیوں بعد ایسا سکون ملا ہے اس لمحے کو اپنی سانسوں میں سمیٹ لینے دو۔"
نیرو یونہی روہن سے چپکی کھڑی رہی۔
کچھ دیر بعد وہ نظریں جھکائے اس سے دور ہٹ کر کھڑی ہوگئی۔ صرف تھوڑی سی دور۔
"واپس چلیں کیا؟" روہن نے پوچھا۔
"نہیں۔ وہ لاکٹ لانا ہے جو آپ مجھے پہنا کر گئے تھے اسی لیے تو آپ کو یہاں بلایا تھا۔" نیرو نے جواب دیا۔
"مگر تم تو...... مطلب نیرو نے سپنے میں دیکھا تھا کہ لاکٹ اس کنور پال نے بھٹی میں پھینک دیا تھا۔ وہ جلا نہیں کیا؟" روہن سوالیہ انداز میں اس کی طرف دیکھتا رہا۔
"نہیں، وہ جل جاتا تو ہم یہاں کس کے سہارے رہتے، وہ تو صدیوں سے یونہی آسمان کے ستارے کی طرح دمک رہا ہے، وہ دیکھو۔" نیرو نے روشنی کی طرف اشارہ کیا۔
"کیا...... وہ لاکٹ ہے؟ وہ تو کسی بلب کی طرح جل رہا ہے، اور وہ جگہ تو ہمیں کبھی ملی ہی نہیں، ہم نے اس دن کتنا ڈھونڈا تھا اس کو۔" روہن حیرت سے روشنی کی طرف دیکھتا ہوا بولا۔
"آج مل جائے گا، ہم آپ کے ساتھ ہیں نا، چلیں تو سہی۔" نیرو نے اس کا ہاتھ پکڑا اور آگے بڑھ گئی۔
انہی انجانی سی گلیوں سے آگے بڑھتے ہوئے وہ روشنی کی طرف کچھ قدم آگے بڑھے تھے کہ روہن کو وہی بچہ خوشی سے اچھلتا آتا دکھائی دیا۔
"دیدی مجھے لے چلو نا ساتھ۔" بچہ بولا اور پاس آ کر کھڑا ہوگیا۔ اس کے چہرے پر ویسی ہی معصومیت تھی ویسا ہی سونا پن۔
"یہ کمار ڈکشت تھا ہمارا چھوٹا بھائی آج اس کی مکتی کا وقت بھی آ گیا ہے اس کا ہاتھ پکڑ لو اور دوسرے ہاتھ سے میرا ہاتھ ہاتھ تھامے رہو۔" نیرو نے کہا۔
روہن نے حیرت سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے خوش ہو کر اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھا دیا۔
بچہ بھاگ کر آیا اور روہن سے بولا۔ "چلیں آپ بھی ہمارے ساتھ رہیں گے کیا؟" روہن مسکرا دیا۔ اس کو اب کسی بھی قسم کا ڈر محسوس نہیں ہو رہا تھا۔
"میرا ہاتھ پکڑ لو۔"
پیپل کے اس پیڑ تک پہنچنے میں آج ان کو اتنا ہی وقت لگا جتنا پرکاش کو دن میں اس کے پاس جانے میں لگا تھا۔
روہن حیرت سے پیپل کی اونچی شاخ پر کسی تارے کی طرح چمک رہے لاکٹ کو دیکھنے لگا کہ اچانک چونک پڑا۔
"وہ بچہ کہاں گیا؟ سوری تمہارا بھائی۔"
نیرو مسکرا کر بولی۔ "وہ چلا گیا، اس کو راستہ مل گیا ہے اس جہان سے رخصت ہونے کا کتنے سالوں سے بھٹک رہا تھا بیچارہ۔" نیرو آنکھوں سے آنسو پونچھتے ہوئے بولی۔ "جاؤ اب اس لاکٹ کو اتار کے لے آؤ۔"
"ابھی چڑھتا ہوں۔" روہن کا جوش دیکھنے کے قابل تھا۔ وہ لمحہ گنوائے بغیر پیڑ پر چڑھا اور لاکٹ کے پاس جا کر اس کو دیکھنے لگا۔ لاکٹ کسی ہیرے کی چمک دیکھ رہا تھا۔ روہن نے ٹہنیوں میں اٹکی ہوئی اس کی ڈور سلجھائی اور اس کو لے کر نیچے آ گیا۔
"میں اپنا لاکٹ لے آیا۔ اب اس کو پہن لوں کیا۔"
نیرو ہنستے ہوئے بولی۔ "یہ آپ ہمیں تحفے میں دے چکے ہیں یاد نہیں ہے کیا؟" نیرو نے کہا اور لاکٹ کو دیکھنے لگی۔
"تو کیا کروں اس کا۔" روہن نے پھر پوچھا۔
"ہمیں پہنا دیں اور کیا کریں گے۔" نیرو مسکرائی۔ پھر اپنا ہاتھ روہن کی طرف اٹھا دیا۔ "ہمیں یہاں سے لے چلنا کہیں یہاں چھوڑ کر نہ بھاگ جانا۔"
روہن اس کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرایا اور لاکٹ نیرو کے گلے میں پہنا دیا۔ لاکٹ پہنتے ہی نیرو اس کی بانہوں میں جھول گئی، روہن ایک پل کے لیے تو گھبرا ہی گیا۔ پھر اسے نیرو کی کہی ہوئی بات یاد آئی اور وہ نیرو کو بانہوں میں اٹھا کر واپس چل پڑا۔

......☆☆☆......

نیرو کو اپنے کندھے پر اٹھائے روہن جیسے ہی رویندر اور ریتو کو دکھائی دیا دونوں اور حیرت اور خوشی سے اچھل پڑے۔
"کیا ہوگیا؟" دونوں کے منہ سے ایک ساتھ نکلا۔
روہن کے قریب آنے پر جب انہوں نے اسے

مسکراتے ہوئے دیکھا تو ان جان میں جان آئی۔
"بھابھی جی کو کیا ہو گیا ہے؟" رویندر نے پوچھا۔
"کچھ نہیں۔ ٹھیک ہے۔ مگر اب تک تو ہوش آ جانا چاہئے تھا۔" روہن نے کہا۔
"نیرو...... نیرو! اے شینو۔" ریتو نے اس کے گالوں تھپتھپا کر دیکھا۔ "کیا ہو گیا ہے اس کو؟" ریتو ایک بار پھر گھبرا گئی۔
"کچھ نہیں ہوا، ٹھیک ہو جائے گی۔" روہن بولا۔ مگر اب اس کو بھی فکر ہونے لگی تھی۔ "چلو جلدی گاڑی میں چلو۔"
روہن اس کو دوبارہ اٹھا کر گاڑی کی طرف چل دیا۔

......☆☆☆......

گاڑی تک پہنچتے پہنچتے روہن کی سانس پھول گئی تھی۔
"ذرا اندر کی لائٹ آن کرو۔ میں اس کو پیچھے لٹاتا ہوں۔" روہن نے رویندر کی طرف چابی اچھال دی۔ اور دروازہ کھلتے ہی روہن نے نیرو کو اندر لٹا دیا۔ روہن نے فکر مند سا ہوتے ہوئے اس کے گال تھپتھپائے۔
نیرو کی ہنسی چھوٹ گئی اور اس نے بیٹھ کر اپنا چہرہ چھپا لیا۔
اس کے ہنستے ہی سب کے چہرے کھل اٹھے۔
ریتو بھی دوسری طرف سے دروازہ کھول کر اندر آ چکی تھی۔
"تم ٹھیک تو ہو نا۔"
نیرو کی ریشمی زلفیں روہن سے اس کا چہرہ چھپائے ہوئے تھیں۔ اس نے شرما کر ریتو کی طرف دیکھا۔
"ہاں، ٹھیک ہوں، مجھے کیا ہوا ہے؟"
"تمہیں نہیں پتہ تم بے ہوش ہو گئی تھیں۔ روہن تمہیں کندھے پر اٹھا کر یہاں تک لایا ہے۔ چار پانچ کلو میٹر کا فاصلہ تو ہو گا ہی۔" ریتو نے کہا۔
"ہاں پتہ ہے۔" نیرو نے جواب دیا۔
"کیا پتہ ہے؟" ریتو نے پھر پوچھا۔
نیرو نے اس کے کان میں سرگوشی کی۔ "یہی کہ یہ مجھے اتنی دور سے اٹھا کر لائے ہیں۔ مجھے وہیں ہوش آ گیا تھا۔" نیرو نے کہا اور کھلکھلا کر ہنس پڑی۔
"ہیں۔ پتہ تھا تو بولی کیوں نہیں۔ ہم کتنے ڈرے ہوئے تھے، پتہ ہے تمہیں اور روہن بیچارہ کتنی دور سے تمہیں لاد کر آیا ہے یہ پریشان نہیں ہوئے ہوں گے کیا۔" ریتو نے راز کی طرح سرگوشی میں کہی گئی بات کا کھلم کھلا ڈھونڈورا پیٹ دیا۔
نیرو نے پھر سے شرما کر اپنا چہرہ چھپا لیا۔ روہن سے۔
"لے بیٹا، اپنے بڑے صحیح کہہ کر گئے ہیں کہ آدمی شادی کے بعد گدھا بن جاتا ہے، تم تو شادی سے پہلے ہی بھابھی کو ڈھونے لگے۔" رویندر بھلا اس موقع سے فائدہ کیسے نہ اٹھاتا۔
مگر روہن تو دوسری ہی دنیا میں کھویا ہوا تھا۔ گاڑی چلاتے ہوئے وہ سوچ رہا تھا۔ "کاش گاڑی کچھ اور دور کھڑی ہوتی۔ کچھ دیر اور نیرو اس کی بانہوں میں ہوتی۔"
"تم بولی کیوں نہیں پہلے؟" ریتو بناوٹی غصہ دکھا کر ہنسنے لگی۔
"مجھے شرم آ رہی تھی۔ نیچے اتارنے کا کہتے ہوئے۔" نیرو نے یہ بات بھی اس کے کان میں کہی۔
"اب بتاؤ۔ کیا ہوا وہاں؟" رویندر نے پوچھا۔
"نہیں وہ سب بعد میں پوچھوں گی۔ شروتی کا گھر آ گیا ہے۔ پہلے اس کے گھر چلو۔"
"مگر اس وقت، رات کے ڈیڑھ بجے؟" رویندر

بولا۔
"ہاں ہاں، کیا پتہ ہمیں کل ہی واپس جانا پڑے۔ نیرو کے ابو آ رہے ہیں نا۔" ریتو نے وضاحت کی۔
روہن نے کچھ دیر سوچ کر گاڑی شروتی کے گھر کے باہر کھڑی کر دی۔
سب نیچے اترے اور دروازے پر جا کر کھڑے ہو گئے۔ روہن سب سے آگے تھا۔ اس نے دستک دی مگر کوئی جواب نہیں ملا، تین چار بار مزید کھٹکھٹانے پر اندر سے شروتی کے باپ کی آواز آئی۔
"آتا ہوں بھائی، کون ہے۔"
روہن کے منہ سے آواز ہی نہیں نکل پا رہی تھی۔
"نمستے انکل جی۔"
جیسے ہی ایک چرچراہٹ کے ساتھ دروازہ کھلا سب نے ادب سے کہا۔
"کون؟" شروتی کے باپ نے غور سے سب کو دیکھا اور روہن کو پہچان لیا۔
"ارے آؤ...... بیٹا آج پھر اتنی رات کو...... آؤ، اندر آ جاؤ۔"
روہن میں اب بھی کچھ کہنے کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی۔ اب وہ کہتا بھی تو کیا کہتا۔ پرانی بات کو پھر سے تازہ کر کے وہ شروتی کے باپ کے زخموں پر نمک چھڑکنا نہیں چاہتا تھا۔
"یہ بچیاں کون ہیں؟" انہوں نے پوچھا اور اندر جا کر کمرے کا دروازہ کھٹکھٹا کر بولے۔ "شروتی بیٹی ذرا باہر آنا۔"
"شروتی۔" سب کے منہ سے اچانک ایک ساتھ نکلا۔
"ہاں، میری بیٹی ہے۔"
شاید اس نے دھیان نہیں دیا کہ باقی سب شروتی کا نام سن کر کس قدر حیرت میں پڑے ہوئے ہیں۔

تبھی دروازہ کھلا اور بلا کی حسین شروتی انگڑائی سی لیتے ہوئے باہر نکلی۔ مگر دو لڑکوں کو اپنے سامنے دیکھ کر شرما گئی اور اپنے ہاتھ نیچے کر لیے۔ ان میں سے ایک کو تو وہ اچھی طرح جانتی تھی۔
روہن اور رویندر کو تو جیسے اپنی آنکھوں پر یقین ہی نہیں ہو رہا تھا۔
"یہ...... یہاں...... کیسے آئی؟" شروتی کے ساتھ ہی اس کے باپ نے بھی چونک کر رویندر کو دیکھا۔
"بیٹا، سپنا دیکھ رہے ہو کیا رات کو یہ اپنے گھر پر نہیں تو کہاں ہو گی۔ تم اندر بیٹھو بیٹا، میں آتا ہوں کچھ کھانا وغیرہ۔"
"جی بابا، ابھی بنا دیتی ہوں۔" شروتی یہ کہہ کر رسوئی کی طرف چل دی۔
ریتو اور نیرو بھی حیرت سے کچھ جاننے کا تجسس لیے اس کے ساتھ ہی چلی گئیں۔

نعت شریف

نگاہ و دل میں وہ خاکِ دیار ہے کہ نہیں
ہر ایک ذرہ طیبہ سے پیار ہے کہ نہیں
خدا کا نام ہے دل میں، نبی کا ہونٹوں پر
یہ بات باعث صد افتخار ہے کہ نہیں
رسا ہے اپنا مقدر کہ نارسا، دیکھو
شان کوئے نبی میں شمار ہے کہ نہیں
جنہیں ملی ہو سعادت، انہیں ذرا پوچھو
مدینہ دہر میں دارالقرار ہے کہ نہیں
بس ایک شام تمنا نبی کے روضے پر
ہجوم شوق کا یہ اختصار ہے کہ نہیں
جو یاد سرور عالم میں آنکھ سے ٹپکے
وہ ایک اشک فقیر صابر لنگاہ ہے کہ نہیں
(چوہدری نور الٰہی جٹ...... لاہور)

رویندر سے اندر بیٹھا نہیں جا رہا تھا۔ "ایک منٹ انکل جی میں ابھی آتا ہوں۔" وہ کمرے سے باہر نکلا اور لڑکیوں کی آواز سن کر رسوئی میں گھس گیا۔

اب تک کھلکھلا رہی شروتی رویندر کو دیکھ کر چپ ہوگئی۔ جبکہ ریتو اور نیرو رویندر کی طرف دیکھنے لگیں۔

"اگر اعتراض نہ ہو تو ذرا چھو کر دیکھ لوں کیا۔" رویندر بولا اور شروتی چونک کر اسے گھورنے لگی۔

وہ اس کی بات کا مطلب نہیں سمجھ پائی تھی' مگر رویندر بھلا اتنی دیر کہاں صبر کرنے والا تھا' اس نے انگلی سے شروتی کے ہاتھ کو چھوا اور حیرت سے بولا "تم تو عمر کوٹ؟" کہہ کر وہ چپ ہوگیا۔

"عمر کوٹ! کیا کہہ رہا ہے یہ؟" شروتی نے نیرو کی طرف دیکھ کر دھیرے سے پوچھا۔

"تم جاؤ۔ ہم بات کرلیں گے۔" ریتو نے کہا۔

"تمہاری شادی ہوچکی ہے کیا؟" اس نے ریتو کی بات پر دھیان نہیں دیا۔

"کیا بول رہے ہیں آپ۔" شروتی ہنس پڑی۔ "مجھے کچھ نہیں پتہ۔"

"نہیں۔ میں بھی کنوارہ ہوں۔ اس لیے۔" ابھی رویندر اپنی بات پوری بھی نہیں کر پایا تھا کہ ریتو نے دھکا دے کر اس کو رسوئی سے باہر نکال دیا۔

"وہ مجھے ہاتھ لگا کر کیوں دیکھ رہا تھا۔"

"وہ تو ہم نے بھی لگا کر دیکھا تھا تم نے دھیان نہیں دیا ہوگا۔" ریتو بولی۔ "بہت عجیب کہانی ہے۔ تمہیں یقین نہیں آئے گا۔"

"کیا ہوگیا؟ کچھ بتائیں تو۔" شروتی کے لہجے میں الجھن تھی۔

ریتو کو جتنی کہانی پتہ تھی اس نے شروتی کو بتادی اور پھر بولی۔ "وہ ضرور تمہاری کوئی ہم شکل ہوگی۔"

شروتی کی آنکھیں پرکاش کے ساتھ بتائی وہ رات یاد کر کے بھر آئیں۔

"ہاں۔ وہ کمینہ مجھے زبردستی عمر کوٹ لے جا رہا تھا۔ مگر خوش قسمتی سے جانے کیسے وہ مجھے نہیں لے گیا۔ اس نے جہاں مجھے بلایا تھا وہاں میں ایک گھنٹہ انتظار کر کے واپس آگئی۔ وہ نہیں آیا' میں تو تین چار دن تک ڈری ڈری کالج جاتی رہی کہ کہیں وہ حرامزادہ پھر نہ آجائے۔" شروتی نے اپنے آنسو پونچھے۔

"تو......تو...... پھر وہ کون تھی؟" نیرو اور ریتو کے منہ حیرت سے کھلے کے کھلے رہ گئے۔

......☆☆☆......

"انکل جی۔" صبح روہن نے ہچکچاتے ہوئے بات شروع کی۔

"ہاں بیٹا۔ بولو۔"

"آپ کہہ رہے تھے مجھے کہ اگر شروتی کے لیے کوئی اچھا رشتہ ملے تو بتاؤں۔" روہن نے رویندر کے مجبور کرنے پر بات کہہ ہی ڈالی۔

"ہاں۔ کوئی ہو تو ضرور بتانا بیٹا۔ اب تو شروتی بھی شادی کے لیے مان گئی ہے۔"

"میں ہوں۔" رویندر' روہن کے رک رک کر بولنے کا انتظار نہیں کر پایا۔

انکل جی کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اچانک داغے ہوئے اس گولے کا جواب کیسے دیں۔

"میں پوچھ کر بتاتا ہوں بیٹا۔" وہ کمرے سے باہر نکل گئے۔

انکل جی کے باہر جاتے ہی روہن نے رویندر کی گدی بجا ڈالی۔ "تمہیں یہ بھی نہیں پتہ کہ کون سی بات کب کرتے ہیں میری بھی انسلٹ کروادی۔ میں بات کر رہا تھا نا۔"

"اچھا! مطلب نکلتے ہی اپنے آپ کو پیار کا پی ایچ ڈی سمجھنے لگا ہے کل تک تو تمہاری آواز بھی نہیں

نکل رہی تھی' دیکھ لینا وہ جواب ہاں میں ہی دے گی۔" رویندر بتیسی نکال کر بولا۔

تھوڑی ہی دیر میں شروتی کا باپ دوبارہ واپس آگیا۔

"بیٹا ہم غریب لوگ ہیں۔ لینے دینے کو تو کچھ خاص ہوگا نہیں۔ سوائے میری بیٹی کے۔"

"یہ آپ کیسی بات کر رہے ہیں انکل جی میری تو زندگی بن جائے گی۔ جہیز کے تو میں ایک دم بالکل بلکہ پورا مخالف ہوں۔" رویندر چہک کر بولا۔

"ٹھیک ہے بیٹا۔ شروتی کو کوئی اعتراض نہیں ہے میں تمہارے گھر آجاتا ہوں رشتہ لے کر' وہ مان تو جائیں گے نا۔" انکل جی نے پوچھا۔

"آپ فکر نہ کریں انکل' ان کو تو میں آپ کے آنے سے پہلے ہی منا کر رکھوں گا۔ کہیں تو میں انہیں ہی لے کر آجاؤں۔" رویندر بھی رویندر ہی تھا۔

......☆☆☆......

"تمہیں گاڑی چلانی آتی ہے؟" نیرو نے رویندر سے پوچھا۔

"ہاں۔ آپ کے شہر میں ہی سیکھی ہے۔ امان بھائی سے' کیوں؟"

"تو تم کیوں نہیں ڈرائیو کرتے۔"

"ٹھیک ہے میں چلا لیتا ہوں نو پرابلم۔" رویندر نے روہن کے ہاتھ سے چابی چھین لی۔

"تمہیں اس کا پتہ نہیں ہے۔ یہ گاڑی چلاتے ہوئے بھی پیچھے دیکھتا رہے گا اور گاڑی کہیں گھسا دے گا۔" روہن نے نیرو کو خبردار کیا۔

"تم چپ چاپ بیٹھ جاؤ۔ بھابھی جی نے کیا کہا ہے۔ سنا نہیں کیا؟" رویندر نے کہا اور دروازہ کھول کر دھم سے ڈرائیونگ سیٹ پر جا بیٹھا۔

بیچارہ روہن ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ ریتو اور نیرو کے بیٹھتے ہی وہ شروتی اور انکل جی کو بائے کر کے نکل آئے۔

گاڑی ابھی تھوڑی ہی دور گئی تھی کہ روہن کو اپنی شرٹ کھنچتی ہوئی محسوس ہوئی۔ اس نے پیچھے دیکھا۔ نیرو اس کی شرٹ کھینچ رہی تھی۔

"ہوں۔" روہن نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پیار سے پوچھا۔

نیرو نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اسے کچھ اشارہ کیا۔

"سوری میں سمجھا نہیں۔" روہن نے جواب دیا۔

نیرو کے ہونٹ دھیرے سے ہلے۔ مگر وہ بات بھی روہن کے اوپر سے ہی گزر گئی۔

"پتہ نہیں کیا کہہ رہی ہو' زور سے کہونا۔" روہن تھوڑا تیز لہجے میں بولا۔

نیرو اپنی خفیہ سوچ کو سب پر کھلتا دیکھ کر غصے ہوگئی۔

"چپ چاپ پیچھے آجاؤ۔ ریتو آگے بیٹھ جائے گی۔"

رویندر نے گاڑی روکی۔ روہن اور ریتو نے سیٹ بدلی اور پھر دوبارہ گاڑی سڑک پر دوڑنے لگی۔ خوشیوں' چاہتوں اور محبتوں کو سمیٹ کر۔ کیونکہ محبت کا بلاوا صدیوں سے بچھڑے دو دلوں کو ملا چکا تھا۔

ختم شد

کانٹا

طاہر قریشی

شاعر نے کہا ہے کہ جو چپ رہے گی زبان خنجر' لہو پکارے گا آستین کا' مگر یہ ایک ایسا قتل تھا جہاں زبان خنجر بھی خاموش تھی اور آستین بھی بے زبان اور صاف تھی پھر بھی قانون اس کے دروازے تک آپہنچا تھا۔

ہالی ووڈ میں جنم لینے والی ایک مجرم کہانی جو آپ کو چونک جانے پر مجبور کردے گی

بارش پوری شدت سے جاری تھی۔ بارش نے اندھیرے کی چادر کو مزید گہرا کردیا تھا۔ بالکل اسی رات کی طرح جب وہ لڑکی غائب ہوئی تھی۔

وہ اب بھی وہیں کہیں تھی۔ گزشتہ چار ہفتے سے وہ وہیں تھی۔ اسی مقام پر جہاں اس کا شوہر اسے چھوڑ گیا تھا۔ اس کا جسم سرد پڑ چکا تھا۔ اس کے اندر سے زندگی کی حرارت رخصت ہوچکی تھی۔ وہ عارض جو کبھی سیب کی طرح سرخ ہوا کرتے تھے' اب قطعی بے رنگ تھے۔ اس کی آنکھیں زندگی کی چمک سے بے نیاز ہوچکی تھیں۔ وہ تاریک رات ایک ایسی سیاہ چادر ثابت ہوئی تھی جس نے اس کے قتل کو اپنے دامن میں چھپالیا تھا اور اس پر مستزاد وہ بارش تھی جس نے اس کے شوہر کو اس کی لاش چھپانے کے لیے آڑ فراہم کردی تھی۔

اسے قتل ہوئے چار ہفتے ہوچکے تھے۔ ڈیوس جانتا تھا کہ وہ قتل ہوئی ہے۔ وہ یہ بات اتنی اچھی طرح جانتا تھا اور اسے اس پر غور کرنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ وہ اس قتل کو ثابت کرنا چاہتا تھا۔ ہر قیمت پر۔ خواہ اس کے لیے اسے کچھ ہی کیوں نہ کرنا پڑتا۔ محکمہ پولیس کی چودہ سالہ ملازمت کے دوران کسی بھی قتل کو ثابت کرنے کی اتنی شدید خواہش اس کے اندر کبھی نہیں ابھری تھی۔

اس نے اپنی کار پارک کی اور بارش کی چادر کو چیرتا ہوا' تھیٹر کے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ بارش کا پانی اس کے فلیٹ ہیٹ کا حلیہ بگاڑ کر اس کے چہرے اور پرانے السٹر سے گزرتا ہوا اس کے جوتوں تک پہنچ رہا تھا۔ اس نے دروازے میں رک کر اپنے کپڑوں سے پانی کے قطرے جھٹکے اور ماسٹر سے ملاقات کی خواہش کا اظہار کردیا۔

ڈیوس نے ہیٹ اتار دیا۔ اس کے سر کے بال کسی قدر اڑ چکے تھے۔ اور بھورے سے سیاہ ہونے لگے تھے۔ وہ کوئی معمر آدمی تو نہیں تھا لیکن چہرے کے تاثرات کی وجہ سے وہ اپنی عمر سے کافی بڑا دکھائی دے رہا تھا۔ اس کا چہرہ کسی ایسے آدمی کا چہرہ لگ رہا تھا جو عرصے سے کوئی ناممکن کام سرانجام دینے کی کوشش کررہا ہو۔

گیٹ کیپر نے ڈریسنگ روم تک اس کی رہنمائی کی' جہاں ماسٹر خاموش بیٹھا تمباکو نوشی کررہا تھا۔ جبکہ اس کا نیگرو ڈریسر مصروف عمل تھا۔ ماسٹر کشادہ شانوں والا ایک قوی الجثہ آدمی تھا۔ اس کے بال سنہرے اور بڑے بڑے تھے

اور اس کی گہری نیلی آنکھیں مدمقابل کو گھورتے رہنے کی عادی معلوم ہوتی تھیں۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اس کی پلکوں نے جھپکنا سیکھا ہی نہ ہو۔ پلکیں جھپکائے بغیر مسلسل گھورتے رہنے کے تاثر سے مخاطب کا نروس ہوجانا یقینی امر تھا۔ اس کا ایکٹ شروع ہونے میں تقریباً ایک گھنٹہ باقی تھا۔ ڈیوس ایک کرسی کے کنارے پر ٹک گیا۔ بارش کا پانی' اس کے جوتوں سے رس کر فرش پر پھیل رہا تھا۔ ڈیوس نے بولنا شروع کردیا۔ وہ بڑی احتیاط سے الفاظ کا انتخاب کررہا تھا۔ کسی ایسے آدمی کی طرح جو نہیں چاہتا ہو کہ ایک لفظ بھی ادھر سے ادھر ہونے سے حقائق مسخ ہوجائیں۔

''مکمل قتل کے بارے میں بڑی بحثیں ہوتی رہی ہیں۔'' ڈیوس نے مضطربانہ انداز میں کہا۔ ''اگر ایسی کوئی چیز ممکن ہے تو یہ وہی ہے۔''

ماسٹر نے اپنے سر کو اثباتی جنبش دی' گویا اس کی سمجھ میں ہر وہ بات آگئی تھی جو ڈیوس نے نہیں کہی تھی۔ جیسے وہ جانتا تھا کہ ڈیوس اس سے مدد لینے آیا ہے۔

''ہمارا خیال ہے کہ وہ مرچکی ہے لیکن ہمیں یہ بات معلوم نہیں ہے۔'' ڈیوس نے اپنی بات جاری رکھی۔ ''ہمارا خیال ہے کہ اس نے اسے قتل کیا ہے لیکن ہم یہ ثابت نہیں کرسکتے۔ حتیٰ کہ ہم اس کی لاش بھی تلاش نہیں کرسکے۔ اگر لاش تلاش کر بھی لی جائے تو بھی ہم اسے قتل کیسے ثابت کریں گے۔ بالفرض ہم نے اس کی موت کو قتل ثابت کردیا تب بھی ہم یہ کیسے ثابت کریں گے کہ اس کا قاتل وہی ہے۔ ان تمام باتوں کے باوجود ہمیں یقین ہے کہ وہ مرچکی ہے بلکہ قتل ہوچکی ہے اور اس کا قاتل وہ ہے۔ یہ واحد وضاحت ہے جو حقائق کے خانوں میں فٹ بیٹھتی ہے۔''

ماسٹر نے دوبارہ اثبات میں سر ہلایا۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ ڈیوس کو یقین ہے کہ وہ قتل ہوئی ہے اور اسے یہ بھی یقین ہے کہ 'اس نے' وہ جو کوئی بھی تھا۔ اسے قتل کیا ہے۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر سگار بکس سے ایک سگار نکالا اور سراغ رساں کی طرف بڑھا دیا۔ ڈیوس نے سگار لے تو لیا مگر اسے سلگانے کی کوئی کوشش نہیں کی۔

''اس کی موت مکمل تاریکی کے دوران واقع ہوئی تھی۔'' ڈیوس نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ وہ اب بھی بڑی احتیاط سے الفاظ کا انتخاب کررہا تھا۔ ''وہ بدھ کا دن تھا اور مارچ کی دو تاریخ تھی۔ اس روز شہر سیلاب کی زد میں تھا۔ اسی وجہ سے آدھے گھنٹے کے لیے لائٹ چلی گئی تھی پورا شہر تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ سڑکوں پر صرف گاڑیوں کی ہیڈ لائٹس کی روشنی تھی جو تاریکی اور بارش کی دبیز تہ کا سینہ شق کرنے کی ناکام کوشش کررہی تھی۔

وہ بولتے بولتے رک گیا۔ یوں جیسے دفعتاً اسے احساس ہوا ہو کہ الفاظ اس کے منہ سے کچھ زیادہ تیزی سے برآمد ہورہے ہیں۔ لیکن ماسٹر کا سراب بھی تفہیمی انداز میں ہل رہا تھا' جیسے وہ اس کے جذبات سے بخوبی واقف ہو' جن کے تحت ڈیوس اس انداز میں گفتگو کررہا تھا۔ ڈیوس نے بغیر جلے سگار سے ایک گہرا کش لے کر اپنے خیالات مجتمع کیے اور پھر بولنا شروع کردیا۔

''وہ جوان تھی' خوب صورت تھی اور محبت کرنے والی تھی۔ بڑی ہنس مکھ تھی اور اس نے تین سال قبل شادی کی تھی۔ وہ اور اس کا شوہر دونوں ایک ڈرائیوان سینما میں خوانچہ فروش تھے۔ ان کی

وہیں ملاقات ہوئی اور دونوں نے شادی کرلی۔ شادی کے بعد وہ اچانک ہی فلم والوں کی نگاہ میں آ گیا اور یہیں سے اس کی ترقی شروع ہوگئی۔ وہ بہت دل پھینک آدمی تھا۔ وجیہہ اور خوب صورت بھی تھا۔ اس نے اپنی وجاہت سے فائدہ اٹھایا اور فلم ایکٹریسوں پر ڈورے ڈال کر فلموں میں کردار حاصل کرتا رہا پھر اس کی ملاقات فلمی دنیا کی ایک ایسی عورت سے ہوئی جو اگرچہ جوانی کی حدود سے نکل چکی تھی مگر فلمی حلقوں میں اب بھی کافی بااثر تھی۔ وہ اس کی باتوں میں نہیں آئی اور یہ شرط رکھ دی کہ پہلے وہ اپنی بیوی سے چھٹکارا حاصل کرکے اس سے شادی کرے پھر وہ اسے فلموں میں کام دلوائے گی۔''

ڈیوس بولتے بولتے رک کر سگار سلگانے لگا۔ اس کے ہاتھوں میں خفیف سی لرزش تھی۔

''لہٰذا تم سمجھ سکتے ہو کہ وہ اپنی بیوی سے چھٹکارا حاصل کرنے کی جدوجہد میں مصروف ہوگیا۔'' سگار سلگا کر ڈیوس نے مزید کہنا شروع کیا۔ ''وہ اپنی بیوی کو طلاق نہیں دے سکتا تھا اس لیے کہ اس کے پاس بیوی کو طلاق دینے کی کوئی وجہ نہیں تھی' تاہم وہ یہ محسوس کرتا تھا کہ اس کی بیوی اس کی ترقی کی راہ میں رکاوٹ بنی ہوئی ہے۔ جب تک وہ اس کی بیوی ہے' وہ مزید آگے نہیں جاسکتا۔ وہ اپنی بیوی سے محبت نہیں کرتا تھا۔ وہ اتنا خودغرض آدمی تھا کہ اسے اپنے علاوہ کسی سے بھی محبت نہیں تھی۔ چنانچہ وہ اپنی بیوی سے چھٹکارا پانے کی ترکیبوں پر غور کرنے لگا۔ حتیٰ کہ اس نے قتل کے امکانات تک پر غور کیا یا یہ کہ کم از کم کسی صورت سے وہ غائب ہوجائے...... اور پھر ایک ماہ قبل جب پورا شہر تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا' وہ غائب ہوگئی۔''

سراغ رساں ذرا دیر کو رکا۔ اس کی آواز میں گلوگرفتگی کا عنصر نمایاں ہو چلا تھا۔

''ان کی رہائش' ہالی وڈ بلیوارڈ کے اوپر واقع پہاڑی پر تھی۔ قدرے توقف کے بعد اس نے بولنا شروع کیا۔ ''وہ جگہ اس کے مطلوبہ معیار کے مطابق نہیں تھی' تاہم وہ اس کی حیثیت سے بڑھ کر تھی...... اس مقام پر رہنے میں ایک فائدہ اسے بہرحال ضرور تھا کہ اس کی بیوی اور اس کی ساس جو اس کے ساتھ ہی رہائش پزیر تھیں' اس کی بیرونی مصروفیات سے بے خبر تھیں' اس کی بیوی' اس کی عدم موجودگی میں گھر پر ہی رہا کرتی تھی اور وہ خود رات رات بھر گھر سے باہر گل چھرے اڑایا کرتا تھا۔ اس سے تعلق رکھنے والی بیشتر عورتیں اس حقیقت سے بے خبر تھیں کہ وہ شادی شدہ ہے۔ اس کی بیوی اتنی صابر عورت تھی کہ اس نے کبھی اپنے شوہر کے رویے کی شکایت نہیں کی۔ اسے تو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ اس کا شوہر' اس سے شادی کرکے ناخوش ہے۔'' ڈیوس ایک لمحے کو رکا پھر قدرے پرسکون لہجے میں بولا۔ ''اپنا غم غلط کرنے کے لیے یا تو وہ اکیلی سیر کو نکل جاتی تھی یا پھر کوئی فلم دیکھنے تنہا چلی جایا کرتی تھی اور وہ بدھ کی رات تھی جب وہ فلم دیکھنے کے لیے گھر سے نکلی۔ اس کی ماں برج پارٹی میں گئی ہوئی تھی اور شوہر بھی گھر پر موجود نہیں تھا۔ وہ آٹھ بجے کے قریب گھر پہنچا چند ہی لمحوں بعد اس کی بیوی نے اسے فون کیا۔ اس وقت بارش ہو رہی تھی جو گزشتہ کئی روز سے جاری تھی۔ فرعینڈو کی وادی میں سیلاب آ گیا تھا۔ لانگ بیچ کا ایک پل سیلاب اور بارش میں بہہ گیا تھا جس کے باعث ایک

درجن سے زائد افراد ڈوب گئے تھے لیکن ہالی وڈ میں فقط بارش ہو رہی تھی۔ وہاں تک سیلاب کا پانی نہیں پہنچ سکا تھا۔ اس کی بیوی نے اسے بتایا کہ بارش کے باعث اسے ٹیکسی نہیں مل رہی ہے لہٰذا وہ اسے آ کر لے جائے' وہ سینما کے سامنے اس کا انتظار کرے گی۔ اس کے شوہر نے جواب دیا کہ وہ اسے لینے پہنچ رہا ہے...... اور جیسا کہ میں نے تمہیں اس سے پہلے بتایا ہے' وہ اپنی بیوی کو قتل کرنے کے امکانات پر غور کرتا رہا تھا مگر اسے کوئی مناسب موقع نہیں مل رہا تھا۔ اس رات اسے وہ موقع مل گیا۔ گھر سے روانہ ہونے کے دس منٹ بعد ہی لائٹ چلی گئی اور پورا شہر تاریکی میں ڈوب گیا۔''

ڈیوس نے ایک طویل سانس لی۔ وہ آگے کی طرف جھکا اور اس نے ماسٹر کے گھٹنوں پر تھپکی دی۔

''شہر میں تاریکی چھا گئی۔ جب کبھی لائٹ چلی جاتی ہے تو آدمی عجیب سے احساسات کا شکار ہوجاتا ہے۔ جب روشنیاں بجھ جائیں' ریڈیو خاموش ہوں' کہیں کہیں جلنے والی موم بتیاں یا سگریٹ سلگانے کے لیے جلائی جانے والی دیا سلائی لمحاتی طور پر چمک کر اندھیرا کم کرنے کی بجائے تاریکی میں اور اضافہ کردیتی ہیں...... اس رات بھی یہی ہوا تھا

وہ بہت زیادہ دیر گھر سے باہر نہیں رہا۔ وہ صرف پینتالیس منٹ میں گھر لوٹ آیا۔ اس وقت تک لائٹ نہیں آئی تھی اور وہ تنہا گھر واپس پہنچا تھا۔ اس کی بیوی اس کے ساتھ نہیں تھی۔ اس نے بتایا کہ وہ اسے مل ہی نہیں سکی تھی۔ اس نے سینما کے سامنے کار پارک کی اور اس کا انتظار کرتا رہا۔ جب وہ اسے نہیں ملی تو اس نے سوچا کہ لائٹ جانے کی وجہ سے افراتفری پھیل جانے کے باعث ممکن ہے' اس کی بیوی نے ٹیکسی لے لی ہو اور گھر پہنچ چکی ہو یا ممکن ہے' وہ پیدل ہی گھر کی طرف چلی گئی ہو اور اس سے پہلے ہی گھر پہنچ چکی ہو۔ یہ سوچ کر وہ گھر کی طرف پلٹ آیا مگر وہ وہاں نہیں پہنچی تھی۔ چنانچہ اس نے ہمیں فون کیا اور یہ ساری داستان سنائی۔ ہم نے اس سے وعدہ کیا کہ اس کی بیوی کی تلاش میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھیں گے۔ اس رات بہت سے افراد لاپتا ہوئے تھے جن میں سے بعض اب تک غائب ہیں۔ ہم نے ان ہی خطوط پر کام کیا اور اس کی بیوی کو تلاش کرنے کی کوشش کی۔ اس وقت ہم اس کے شوہر کی طرف سے مشکوک نہیں تھے۔ چند ہی روز قبل جب ہماری مصروفیت ذرا کم ہوئی تو ہم نے اس طرف بھرپور توجہ دی اور ہمیں پتا چلا کہ یہ پورا معاملہ تو بے حد مشکوک ہے لیکن ہمیں بہت دیر ہوچکی تھی۔'' یہ کہہ کر اس نے سگار کا ایک گہرا کش لیا۔ ''اور یوں اس کی بیوی غائب ہوگئی' یہ خدا ہی بہتر جانتا ہے' ایک اندھیرے شہر کی تاریک سڑکوں پر کچھ بھی ہوسکتا ہے۔'' ڈیوس نے کہا۔

''آدھی رات کے قریب اس کا شوہر دوبارہ کار میں کہیں باہر گیا۔ وہ کئی گھنٹے باہر رہا۔ اس نے شدید بارش کی بھی پروا نہیں کی اور جب وہ گھر لوٹا تو تقریباً صبح ہوچکی تھی۔ جس وقت وہ گھر سے نکلا تھا لائٹ واپس آ چکی تھی۔ لیکن خراب موسم کی وجہ سے سڑکیں سنسان پڑی تھیں۔ ایک بھی ایسا آدمی نہیں مل سکا جس نے اسے یا اس کی کار کو اس رات کہیں دیکھا ہو...... وہ کہاں گیا تھا؟ اس نے کیا کیا تھا؟ اس کا کہنا ہے کہ وہ سڑکوں پر نیم

دیوانگی کے عالم میں ڈرائیونگ کرتا رہا تھا اس توقع پر کہ شاید اس کی بیوی اسے کہیں نظر آجائے۔ جانتے ہو، ہمارا کیا خیال ہے؟" اس نے ماسٹر کے گھٹنے پر دوبارہ تھپکی دی۔ "ہمارا خیال ہے کہ سینما کے سامنے وہ اسے مل گئی تھی۔ اندھیرے میں کوئی نہیں دیکھ سکا کہ کون سی کار آکر رکی اور کون اس میں بیٹھا۔ وہ گھر کی طرف روانہ ہوا اور راستے میں کسی اندھیری اور سنسان سڑک پر، اس نے اپنی بیوی کا گلا گھونٹ کر اسے ہلاک کر ڈالا۔ بارش کی وجہ سے کار کے شیشے چڑھے ہوئے تھے۔ لہٰذا کوئی آواز کار سے باہر آنے کا سوال ہی نہیں تھا۔ بیوی کو ہلاک کرکے، اس نے اس کی لاش کار کی ڈگی میں چھپادی اور جب وہ گھر پہنچا تو اس کی بیوی کی لاش کار کی ڈگی میں موجود تھی۔ ہم اس کے گھر سے واپس آئے، تب بھی لاش کار کی ڈکی میں تھی اور آدھی رات کے وقت جب وہ کار میں گھر سے نکلا، تب بھی لاش وہیں تھی لیکن جب وہ واپس آیا تو لاش سے چھٹکارا حاصل کر چکا تھا۔ اس نے لاش کسی ایسے مقام پر چھپادی تھی کہ اب اگر ہم چاہیں تب بھی لاش دریافت نہیں کر سکتے۔"

سراغ رساں ڈیوس کے لہجے میں ایسی تلخی گھلی ہوئی تھی جس کی وجہ سے ماسٹر کو اندازہ ہوا کہ یہ کوئی عام کیس نہیں ہے بلکہ اس سے ڈیوس کا کوئی ذاتی تعلق بھی ہے۔

"تم لاس اینجلس سے واقف ہو؟" ڈیوس نے پوچھا۔ ماسٹر نے نفی میں سر ہلا دیا۔ ڈیوس نے اسے لاس اینجلس کے بارے میں بتانا شروع کیا۔ "لاس اینجلس کوئی چھوٹی موٹی جگہ نہیں ہے۔ اس کاؤنٹی کی حدود میں واقع پہاڑیوں میں لاتعداد غار اور کھائیاں ہیں۔ ان کے علاوہ متروک مقامات، پارک، جھیلیں اور دریا بھی ہیں۔ فرض کرو، اس شخص نے پہلے سے کسی جگہ کا انتخاب کر رکھا تھا اور اس نے اس طے شدہ مقام پر لاش چھپادی۔ اب تم ہی بتاؤ کہ ایسے میں لاش دریافت کرنا ہمارے لیے کتنی بڑی دردسری ہے۔ گویا، اگر کوئی اتفاق پیش نہ آگیا تو ہمارے لیے لاش دریافت کرنا ناممکن ہے۔"

ڈیوس خاموش ہوگیا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے یہ کہانی سنا کر وہ بہت تھک گیا ہو۔

"فرض کرو، ہم اس کی لاش دریافت کر بھی لیں تو بھی ہم اس کے شوہر کے خلاف کچھ ثابت نہیں کرسکیں گے۔" ڈیوس ہذیانی انداز میں بولا۔ "یہ سب کچھ ایسے حالات میں ہوا ہے کہ اس کے خلاف کچھ ثابت کیا بھی تو نہیں جاسکتا اور میں ہر قیمت پر یہ کام کرنا چاہتا ہوں۔"

ماسٹر نے پہلی بار زبان کھولی۔ "میرا خیال ہے، ہم لاش دریافت کرلیں گے۔" اس نے کہا۔

"لیکن اس کا شوہر بچ نکلے گا۔" ڈیوس نے کہا اس کا لہجہ کسی جنونی شخص کے لہجے کی مانند تھا۔

ماسٹر نے دھیرے سے اپنے سر کو منفی جنبش دی۔ "شاید نہیں۔" اس نے پرسکون انداز میں جواب دیا۔ "تم عینی شاہد کو نظرانداز کررہے ہو۔"

"عینی شاہد۔" سراغ رساں نے استعجابیہ لہجے میں کہا۔ "اس واردات کا کوئی عینی شاہد نہیں ہے۔"

"ہر قتل کا ایک عینی شاہد ضرور ہوتا ہے۔" ماسٹر نے پہلے کے سے پرسکون انداز میں جواب دیا۔

"اگر ایسا ہوتا تو کوئی بھی قاتل تختہ دار سے بچ نہیں سکتا تھا۔" سراغ رساں بھڑک کر بولا۔ "شاید تمہارا اشارہ خدا کی طرف ہے لیکن افسوس، اس سلسلے میں وہ ہماری کوئی مدد نہیں کرسکتا۔"

"عینی شاہد ہمیشہ موجود ہوتا ہے۔" ماسٹر نے کہا۔ اس کے لہجے میں بے پناہ تیقن تھا۔ "یہ الگ بات ہے کہ بعض حالتوں میں اسے بولنے پر مجبور کرنا بہت مشکل ہوتا ہے۔" وہ اپنی کرسی سے اٹھ کر ایک لمحے کے لیے کمرے سے باہر گیا پھر واپس آکر دوبارہ گویا ہوا۔ "لیکن جو کچھ تم نے مجھے بتایا ہے، اسے مدنظر رکھتے ہوئے میرا خیال ہے آج رات ہم اس عینی شاہد کو زبان کھولنے پر آمادہ کرنے میں کامیاب ہوجائیں گے اور تمہیں قاتل کے خلاف کافی ثبوت بھی مل جائیں گے۔"

ڈیوس نے احتجاج کرنا چاہا لیکن پھر کچھ سوچ کر خاموش ہوگیا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ ماسٹر کا کیا مطلب تھا۔ خود ڈیوس تو اپنی ہر کوشش میں ناکام ہوچکا تھا اور اب اسے ماسٹر ہی پر انحصار کرنا تھا۔

"سب سے پہلے تو تم اس کے شوہر سے رابطہ قائم کرو اور اسے بتاؤ کہ آج رات تم اسے اس کی بیوی کی لاش تک لے جاؤ گے۔" ماسٹر نے ہدایت دی۔ "اس سے کہنا کہ ایک عینی شاہد اس بات سے واقف ہے کہ اس کی بیوی قتل کی گئی ہے۔ وہ اس مقام سے بھی واقف ہے۔ جہاں لاش چھپائی گئی ہے۔ اسے بتانا کہ عینی شاہد نے نہ صرف اس کی بیوی کو قتل ہوتے دیکھا تھا بلکہ اس نے لاش چھپائے جانے والے مقام تک قاتل کا تعاقب بھی کیا تھا...... بس، اس سے زیادہ اسے کچھ بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہمارے پہنچنے تک اسے غور و فکر میں ڈوبا رہنے دو...... اور اب مجھے ایک شو کرنا ہے۔ شو سے فارغ ہوکر میں تم سے ملوں گا۔"

ڈیوس نے ماسٹر کے کہنے پر عمل کیا۔ اس نے فون ہی پر ماسٹر کا ہدایت کردہ پیغام مقتولہ کے شوہر تک پہنچادیا اور پھر اس نے شو میں ماسٹر کی متحیر کن کارکردگی دیکھی۔ آدھی رات سے کچھ ہی قبل کا وقت تھا جب ماسٹر کپڑے تبدیل کرکے چلنے کے لیے تیار ہوگیا۔ وہ ڈیوس کی کار میں بیٹھے اور ہالی ووڈ کی سمت روانہ ہوگئے۔

✿......✿......✿

اس کا نام ہیرالڈ مرفی تھا۔ آدھی رات کے قریب ہالی وڈ کی پہاڑیوں پر واقع اپنے چھوٹے سے مکان کی نشست گاہ میں وہ انہیں تنہا اپنا منتظر ملا۔ نشست گاہ کی کھڑکی سے ہالی وڈ کے رنگین نیون سائن کی لال اور نیلی روشنیاں، برسات کی رات میں دھندلائی ہوئی نظر آرہی تھیں۔

وہ طویل القامت شخص تھا اور اس کے شانے کشادہ تھے۔ اس کی آنکھوں سے اس کے لہجے سے اور اس کے ہر انداز سے سختی جھلکتی تھی لیکن ڈیوس بھی سخت مزاج آدمی تھا۔ اس کا چہرہ بارش سے گیلا ہوجانے کے باعث چمک رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں بھی عجیب سی چمک تھی۔ نفرت اور امید کی ملی جلی چمک...... وہ مرفی کے خلاف جرم ثابت کرنا چاہتا تھا اور اس بات سے مرفی بھی بخوبی واقف تھا۔ یہ بات واضح تھی کہ ڈیوس اس کے خلاف کچھ بھی ثابت نہیں کرسکتا ہے، امکان تھا کہ مرفی اس سے جارحانہ انداز میں پیش آئے۔

"تم نے کہا تھا کہ تم نے میری بیوی کو تلاش کرلیا ہے؟" مرفی نے ڈیوس سے متعجبانہ انداز

میں پوچھا۔ اس کی نگاہ بار بار ڈیوس کے ساتھ موجود قوی ہیکل ماسٹر کے چہرے کی طرف اٹھ رہی تھی۔ ڈیوس نے اسے ماسٹر کے بارے میں کچھ بتانے کی زحمت نہیں کی تھی۔

''میں نے کہا تھا کہ ہم تمہیں اس تک لے چلیں گے۔'' ڈیوس نے مدافعانہ انداز میں کہا۔

مرفی نے اسے نیم وا آنکھوں سے گھورا۔

''کہاں......؟'' اس نے پوچھا۔

''وہیں' جہاں قاتل نے اس کی لاش چھپائی ہے۔''

''قاتل......'' مرفی نے کہا۔ اس کے لہجے سے حیرت ظاہر ہورہی تھی۔ اگر وہ قاتل تھا تو اس کا مطلب تھا کہ وہ بہت اچھا اداکار ہے۔ ''تمہیں یقین ہے کہ تمہیں غلط فہمی نہیں ہوئی ہے؟'' اس نے سرد لہجے میں پوچھا۔

ڈیوس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

''نہیں......'' مرفی بڑبڑایا۔ ''میرا خیال ہے کہ میرا اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ٹھیک ہے' تم کہتے ہو کہ تم نے اسے تلاش کرلیا ہے اور یہ کہ اسے قتل کیا گیا ہے' تو کیا تم نے اس کے قاتل کا پتا بھی چلالیا ہے؟''

''تمہیں اس کی لاش تک لے جانے کے فوراً بعد ہم قاتل کو بھی گرفتار کرلیں گے۔'' ڈیوس نے کہا۔ ''خوش قسمتی سے ایک عینی شاہد نے سب کچھ دیکھ لیا تھا۔''

مرفی نے ایک گہرا سانس لیا۔ ''یہ بات ناقابل یقین معلوم ہوتی ہے۔'' اس نے کہا۔ لہجے سے حیرت ظاہر ہورہی تھی۔ ''معاف کرنا' مجھے قطعی یقین نہیں ہے کہ تم نے میری بیوی کو تلاش کرلیا ہے۔ اسے قتل کیا گیا ہے اور یہ کہ اس کے قتل کا عینی شاہد بھی ہے۔ اگر ایسا کوئی عینی شاہد ہے تو اس نے پہلے کیوں گواہی نہیں دی۔''

''اس کی کچھ ذاتی وجوہات تھیں۔'' ڈیوس نے نرمی سے کہا پھر اس کے لہجے میں جارحیت پیدا ہوگئی۔ ''لیکن اب وہ سب کچھ بتائے گا اور میرا خیال ہے کہ مقتولہ کی شناخت اور قاتل کی گرفتاری میں مدد کرنے کے لیے تمہیں ہمارے ساتھ چلنے پر کوئی اعتراض نہ ہوگا۔''

مرفی کے انداز میں ایک لمحے کے لیے ہچکچاہٹ نظر آئی۔ اس کے چہرے کا رنگ پھیکا پڑ گیا تھا لیکن جب وہ بولا تو اس کی آواز سے پہلے ہی جیسا اطمینان اور یقین جھلک رہا تھا۔ ''یقیناً کیوں نہیں۔'' اس نے کہا۔ ''تمہیں تو معلوم ہے' میں تمہاری مدد کرنے کا کس شدت سے خواہاں ہوں۔''

اس پورے عرصے میں ماسٹر ایک لفظ بھی نہیں بولا تھا۔ وہ خاموش کھڑا رہا تھا اور پلکیں جھپکائے بغیر مرفی کو گھورے جا رہا تھا۔

مرفی نے بمشکل اپنی توجہ ماسٹر کی طرف سے ہٹائی جس کی گھورتی ہوئی آنکھیں اسے نروس کیے دے رہی تھیں۔ ''میں ذرا اپنا کوٹ پہن لوں۔'' اس نے کہا۔ ''میں چل تو رہا ہوں لیکن مجھے یقین ہے کہ اس کا نتیجہ کچھ بھی نہیں نکلے گا۔''

ڈیوس انہیں اپنی کار کی طرف لے چلا۔ ''میری کار کوپے ہے'' اس نے کہا۔ ''مجھے افسوس ہے کہ جگہ کم ہونے کے باعث ہمیں ٹھنس کر بیٹھنا ہوگا۔'' اس کے الفاظ تو بے شک معذرت خواہانہ تھے مگر اس کے لہجے سے تاسف کا اظہار نہیں ہورہا تھا۔ پھر اس نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ مرفی ایک لمحے کی ہچکچاہٹ کے بعد اس کے برابر

میں بیٹھ گیا۔ آخر میں ماسٹر کار میں داخل ہوا اور اس نے دروازہ بند کردیا۔ ڈیوس نے کار اسٹارٹ کرکے آگے بڑھادی' جگہ کی تنگی کے باعث وہ ایک دوسرے سے جڑے بیٹھے تھے لیکن ان میں سے کسی نے بھی اس بات پر تبصرہ نہیں کیا۔ ماسٹر اور ڈیوس' دونوں کی نظریں سامنے سڑک پر جمی ہوئی تھیں۔ مرفی نے یکے بعد دیگرے ان دونوں کی طرف دیکھا لیکن ان کے چہروں سے کچھ اندازہ لگانے سے قاصر رہا۔ وہ ان دونوں کے درمیان بری طرح سے پھنسا بیٹھا تھا۔

''ہم اسی راستے پر سفر کریں گے جو قاتل نے اختیار کیا تھا۔'' ڈیوس نے بیچ وڈ ڈرائیو کی ڈھلوان سڑک پر کار چلاتے ہوئے کہا۔ مرفی کے گھر سے یہ واحد راستہ تھا جس پر وہ سفر کرسکتے تھے۔

مرفی نے جواب دینا چاہا لیکن پھر یہ سوچ کر چپ رہ گیا کہ خاموشی زیادہ مناسب رہے گی...... لیکن اس نے قدرے بے چینی سے پہلو بدلنے کی کوشش کی' جب کار کا رخ فرینکلن ایونیو کی طرف ہوا اور اس وقت تو وہ اچھل ہی پڑا' تب ماسٹر نے پہلی بار زبان کھولی۔

''گاڑی موڑ لو۔'' اس نے اچانک ہی کہا۔ ''دائیں جانب۔''

ڈیوس نے بریک لگایا اور گاڑی سینک ڈرائیو پر موڑ دی۔ اس دوران میں مرفی کے چہرے پر لمحاتی حیرت کا تاثر ابھرا اور فوراً ہی معدوم بھی ہوگیا۔ اس نے اپنے ہونٹ سختی سے بھینچ لیے تھے۔ وہ اس وقت بھی کچھ نہیں بولا جب وہ گوور کے چوراہے سے گزر کر وسٹا ڈیل مار پر آئے جو پہاڑیوں کے درمیان بل کھاتی ایک پتلی سی سڑک تھی۔

''بائیں جانب۔'' دفعتاً ماسٹر کی آواز ابھری۔

گاڑی بائیں جانب موڑ دی گئی اور وسٹا ڈیل مار سے گزر کر وہ پھر فرینکلن پر نکل آئے۔ اربائل' وائن اور آئیوار سے ہوتے ہوئے وہ شوگان بلیوارڈ پر نکل آئے۔

''دائیں جانب۔ وہاں پہنچ کر ماسٹر نے کہا اور پھر ولاکس کے ٹریفک سگنل سے اس نے بائیں جانب مڑنے کو کہا پھر فوراً ہی دائیں جانب مڑنے کا آرڈر دیا اور وہ ایک بار پھر فرینکلن پر نکل آئے۔

مرفی وقتاً فوقتاً پہلو بدل رہا تھا۔ وہ دو آدمیوں کے درمیان پھنسا بیٹھا تھا اور بڑے تحمل سے یہ بے مقصد سفر برداشت کررہا تھا۔ آخر اس وقت اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوگیا جب وہ ہائی لینڈ ایونیو پر ٹریفک سگنل کے سامنے رکے اور ماسٹر نے بائیں جانب مڑنے کا حکم دیا۔

''اس بے مقصد ڈرائیونگ سے تمہارا مقصد کیا ہے؟'' بالآخر وہ پھٹ پڑا۔ ''تم میرے ساتھ کس قسم کا کھیل کھیل رہے ہو۔ اس سمت نہ تو کوئی پولیس اسٹیشن ہے اور نہ ہی کوئی اسپتال ہے۔ میں جاننا چاہتا ہوں' تم مجھے کہاں لے کر جارہے ہو؟''

''ہم اس راستے پر سفر کررہے ہیں جس پر قاتل نے سفر کیا تھا۔'' ماسٹر نے جواب دیا۔ ''قاتل نے پیچ در پیچ راستہ اختیار کیا تھا۔''

وہ بائیں طرف مڑ گئے اور پھر اگلے سگنل پر دائیں جانب اور اس کے بعد ناک کی سیدھ میں سفر کرتے رہے یہاں تک کہ ایک جگہ آگے

جانے کا راستہ ہی بند ہو گیا۔ اس مقام سے بائیں جانب مڑ کر وہ لابری اور ہالی وڈ کی کراسنگ والے مقام پر پہنچ گئے۔ یہ جگہ مرفی کے گھر سے زیادہ دور نہیں تھی لیکن انہوں نے وہاں تک پہنچنے کے لیے طویل اور پیچیدہ راستہ اختیار کیا تھا۔ یہ راستہ اختیار کرنے کی بظاہر کوئی معقول وجہ نظر نہیں آ رہی تھی۔ دفعتاً یوں محسوس ہوا جیسے مرفی کی قوت برداشت جواب دے گئی ہو۔

"مجھے کار سے اتار دو۔" اس نے جارحانہ لہجے میں کہا۔ "تم لوگوں نے کوئی جال بچھایا ہے ابھی تک نہ تو تم اسے تلاش کر سکے ہو اور نہ ہی تمہیں یہ معلوم ہے کہ وہ کہاں ہے۔ تم صرف مجھے دہلانے کی کوشش کر رہے ہو۔"

"ہم تمہیں وہ راستہ دکھا رہے ہیں جو قاتل نے اختیار کیا تھا۔" ماسٹر پرسکون انداز میں بولا۔ "اس نے اتنا پیچیدہ راستہ اس لیے اختیار کیا تھا کہ نہ تو کوئی اس کا تعاقب کر سکے اور نہ ہی اسے ایک سنسان رات میں سڑک نوردی کرتے دیکھ کر کوئی اس کی منزل کا اندازہ کر سکے۔"

مرفی کے تھوک نگلنے کی آواز انہوں نے صاف سنی۔ "یہ کیا بکواس ہے؟" وہ تقریباً چیخ کر بولا۔ "یہ ناممکن ہے اگر وہ قتل کی گئی ہے تو تمہیں قاتل کے راستے کا علم کیسے ہوا؟ نہیں تم جھوٹ بول رہے ہو۔ یہ قطعی ناممکن بات ہے۔" اس کی آواز میں ایک عجیب سا تاثر تھا جیسے دوسروں سے زیادہ وہ خود کو اس بات کا یقین دلانا چاہ رہا ہو۔

ڈیوس نے سر گھما کر مرفی کی طرف دیکھنے کی زحمت گوارا نہیں کی۔ اس کی بجائے اس نے لابری بلے وارڈ پر سفر جاری رکھا۔ تا آنکہ وہ سن سیٹ اور سانتا مونیکا سے بھی گزر گئے لیکن جب وہ ماسٹر کے کہنے پر میل روز سے دائیں جانب مڑے تو اچانک مرفی نے ہاتھ بڑھایا اور ہینڈل گھما کر کار کا دروازہ کھول دیا۔

"میں مطالبہ کرتا ہوں کہ مجھے کار سے اتر جانے دو۔" وہ تقریباً رو دینے والے انداز میں بولا۔ "تمہارے پاس مجھے روکے رکھنے کا کوئی قانونی جواز نہیں ہے۔"

ماسٹر نے کہنی سے ٹہوکا دے کر مرفی کو سیٹ پر بیٹھے رہنے کے لیے مجبور کر دیا۔ مرفی نے بے بسی کے عالم میں اپنا نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبالیا۔ وہ دوبارہ شمال کی طرف سفر کر رہے تھے۔ ونڈ اسکرین پر لگے ہوئے وائپر بارش کے پانی کو صاف کرنے کے لیے مسلسل مصروف عمل تھے۔ کار کی دھاتی چھت پر برستی ہوئی بارش کچھ زیادہ ہی پرشور معلوم ہو رہی تھی۔ ان کا پیچ در پیچ سفر جاری رہا اور پھر ماسٹر کے کہنے پر ان کا راستہ تبدیل ہو گیا۔ اب وہ ایک طویل ڈھلوان سڑک پر سفر کر رہے تھے جو انہیں ہالی وڈ کی بارش زدہ روشنیوں سے دور وادی کے اندھیروں کی طرف لے جا رہی تھی۔ مرفی ان دونوں افراد کے درمیان پھنسا بیٹھا تھا لیکن ماسٹر کی آواز نے اسے بری طرح چونکا دیا۔

"دائیں طرف۔" اس نے اچانک ہی گونج دار آواز میں کہا تھا۔ ڈیوس نے کار اس ویران اور تاریک سڑک پر موڑ دی۔ کسی گھر کی کوئی روشنی نظر نہیں آ رہی تھی۔ صرف مدھم اسٹریٹ لائٹس تھیں۔ اسٹریٹ لائٹس بھی طویل درمیانی فاصلوں سے نصب کی گئی تھیں۔ کار کی ہیڈ لائٹس میں اونچی خاردار باڑ اور کہیں کہیں آویزاں گیلے

سائن بورڈ نظر آ رہے تھے۔

"رک جاؤ۔" دفعتاً ماسٹر کی آواز گونجی۔ اس بار ڈیوس بھی اچھل پڑا۔ پھر اس نے سنبھل کر بریک لگائے اور گاڑی ہلکی سی غراہٹ کے ساتھ رک گئی۔ چند لمحوں تک کار میں سناٹا چھایا رہا۔ صرف بارش کے قطروں کی آوازیں آ رہی تھیں۔

"اپیکس پکچرز اسٹور ہاؤس۔" ڈیوس اونچی آواز میں بڑبڑایا۔ "یہاں فلموں کے استعمال شدہ سیٹ اور دیگر ناکارہ سامان رکھا جاتا ہے۔"

ماسٹر نے سر کو اثباتی انداز میں جنبش دی۔ "ہمیں یہیں اترنا ہے۔" اس نے کہا اور کار کا دروازہ کھول کر نیچے اتر گیا۔

کار سے اتر کر ماسٹر، مرفی کے باہر آنے کا انتظار کرتا رہا۔ مرفی کار سے اترتے ہوئے ہچکچا رہا تھا۔ حالانکہ کچھ ہی دیر قبل وہ کار سے اترنے کے لیے سخت بے چین تھا۔ چند لمحوں کی ہچکچاہٹ کے بعد مرفی، کار سے اتر آیا۔ اس نے جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکالا اور اس میں سے ایک سگریٹ نکال کر ہونٹوں میں دبالی لیکن وہ گیلی سگریٹ کو سلگانے میں ناکام رہا۔ اس نے بڑبڑاتے ہوئے سگریٹ ایک طرف اچھال دی۔ "مجھے نہیں معلوم کہ تم لوگ مجھے یہاں کیوں لائے ہو؟" اس نے جارحانہ انداز میں کہا۔ "لیکن اب میں گھر واپس جا رہا ہوں۔ تم سن رہے ہو، تم مجھے نہیں روک سکتے۔"

ماسٹر نے اس کے بازو میں اپنا بازو پھنسا کر اسے جکڑ لیا۔

"تم کس بات سے خوف زدہ ہو۔" ڈیوس مضحکانہ انداز میں بولا۔ "تم نے تو کچھ بھی نہیں کیا ہے۔ تم نے تو اسے قتل نہیں کیا۔ یا تم ہی قاتل ہو؟"

"نہیں ...... نہیں۔" مرفی چلایا۔ "تم اچھی طرح جانتے ہو کہ میں نے کچھ نہیں کیا ہے۔"

"تو ہمارے ساتھ آؤ۔" ڈیوس نے کہا۔ "اس سے قبل کہ ہم تمہارے بارے میں مختلف انداز میں سوچنے پر مجبور ہو جائیں۔"

"میرا خیال ہے کہ ہمیں اندر چلنا پڑے گا۔" ماسٹر نے کہا اور کپکپاتا ہوا مرفی زمین پر گر پڑا۔ ڈیوس نے آ کر اس کا دوسرا بازو بھی جکڑ لیا۔ وہ دونوں اسے جکڑے ہوئے اونچی خاردار باڑ کے ساتھ ساتھ چل پڑے۔ بارش مسلسل ہو رہی تھی اور وہاں ان تینوں کے علاوہ کسی متنفس کا دور دور تک کوئی وجود نہیں تھا۔ اگر وہ دونوں مرفی کو وہاں قتل بھی کر ڈالتے تو کسی کو کانوں تک خبر نہ ہوتی، تقریباً پچاس گز چلنے کے بعد انہیں ایک اونچا گیٹ نظر آیا۔ ماسٹر رک گیا۔

"گیٹ ......" ڈیوس نے کہا۔ "یہ تو مقفل ہے۔ میں اوزار لے کر آتا ہوں۔" ڈیوس انہیں وہیں چھوڑ کر کار کی طرف پلٹ گیا اور جب وہ واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں ٹارچ اور کچھ اوزار تھے۔ اس نے جلد ہی اوزار کی مدد سے تالا کھول ڈالا۔

"اب ہم اندر چلیں گے۔" ماسٹر گمبھیر لہجے میں بولا۔

"نہیں ......" مرفی چلایا اور اس نے خود کو ان دونوں کی گرفت سے چھڑانے کی جدوجہد کی مگر ناکام رہا۔ "میں تمہارے ساتھ اندر نہیں جاؤں گا۔ تم مجھے یہاں لانے کا کوئی حق نہیں رکھتے۔ بتاؤ تم مجھے یہاں کیوں لائے ہو؟"

"صرف اس لیے کہ تم اپنی بیوی کو شناخت

کرسکو۔'' ڈیوس نے پرسکون انداز میں جواب دیا۔ ''آؤ' ہم تقریباً اس مقام تک پہنچ چکے ہیں۔''

ٹارچ کی محدود روشنی میں وہ اندر داخل ہوگئے۔ ڈیوس نے ٹارچ کو ادھر ادھر گھمایا۔ انہیں پلاسٹر آف پیرس کی بنی ہوئی ایک مسجد' گتے اور کاغذ کی مدد سے بنایا گیا ایک قلعہ اور اہرام مصر کا ایک سیٹ نظر آیا۔ ماسٹر ان کی راہنمائی کر رہا تھا۔ وہ بہت آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ کسی بھی لمحے وہ رک جائے گا۔ وہاں طرح طرح کے سیٹ نظر آرہے تھے۔ ماسٹر ہر ایک کو بغور دیکھتا ہوا چل رہا تھا۔ پھر ایک جگہ راستہ گھوما اور وہ لوگ اس راستے پر گھومتے ہوئے پھر پہلے والے مقام پر واپس آگئے جہاں اہرام مصر کا ماڈل رکھا تھا۔ دفعتاً ماسٹر رک گیا۔

''اس پر روشنی ڈالو۔'' ماسٹر نے ڈیوس سے کہا۔ ڈیوس نے اس کے کہنے پر عمل کیا۔ ''لکڑی اور پلاسٹر آف پیرس سے بنا ہوا اہرام مصر کا سیٹ۔'' اس نے بلند آواز میں کہا۔ ''کسی لاش کو چھپانے کے لیے یہ ایک آئیڈیل جگہ ہے۔''

''نہیں......'' مرفی چیخ پڑا اور خود کو ان کی گرفت سے چھڑانے کے لیے جدوجہد کرنے لگا۔ ''وہ یہاں نہیں ہے' پاگل ہوگئے ہو' وہ یہاں کیسے ہوسکتی ہے۔ یہ تم لوگوں کی کوئی چال ہے۔''

دونوں نے اسے مضبوطی سے پکڑے رکھا۔ حتیٰ کہ اس کی جدوجہد دم توڑ گئی۔ جب وہ پرسکون ہوگیا تو ڈیوس اس کا بازو چھوڑ کر آگے بڑھا۔ ٹارچ کی روشنی میں اس نے دروازہ تلاش کیا اور ایک جھٹکے سے کھول دیا۔

وہ وہاں موجود تھی۔ اس کا ایک بازو اس کی آنکھوں پر یوں رکھا ہوا تھا جیسے روشنی سے اپنی آنکھوں کو بچا رہی ہو لیکن روشنی اس کی آنکھوں کو تکلیف نہیں پہنچا سکتی تھی' وہ وہاں ایک ماہ سے تھی اور اس کی لاش مسخ ہوچکی تھی۔

''وہ یہاں موجود ہے۔'' ڈیوس نے کہا۔ بارش کی تیز آواز میں اس کے الفاظ بمشکل سنے گئے۔

''مجھے معلوم ہے۔'' ماسٹر نے جواب دیا۔ ''ہمارے عینی شاہد نے ہمیں سچ بتایا ہے تم بھی ایک نظر دیکھ کر شناخت کرلو مرفی۔''

''نہیں......'' مرفی کراہا۔ ''تم جانتے تھے' تم سب کچھ جانتے تھے ورنہ تم مجھے اس راستے سے یہاں تک نہیں لاسکتے تھے جس پر میں نے سفر کیا تھا۔ اگر تم اس بات سے واقف نہیں تھے تو یقیناً وہ کوئی اور شخص ہے جس نے تمہیں معلومات فراہم کی ہیں لیکن اس نے مجھے کیسے دیکھا ہوگا؟ مجھے یقین ہے کہ مجھے کسی نے نہیں دیکھا تھا پھر یہ سب کچھ کیسے ہوگیا؟ اوہ میرے خدا!''

ڈیوس کے پاس ہتھکڑی کا جوڑا موجود تھا۔ اس نے مرفی کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈال دیں۔ مرفی بے جان سے انداز میں گھٹنوں کے بل زمین پر ٹک گیا تھا۔

دفعتاً مرفی اپنے پیروں پر کھڑا ہوگیا۔ ''میرا تعاقب کیا جانا ناممکن تھا۔'' وہ ہذیانی انداز میں بولا۔ ''اگر کوئی میرا تعاقب کرتا تو میرے علم میں ضرور ہوتا۔ اتنے چکر دار راستے پر وہ ضرور میری نظروں میں آجاتا۔ مجھے بتاؤ' تم نے کیسے معلوم کیا کہ میں کن راستوں پر سفر کرکے یہاں تک پہنچا تھا؟''

ماسٹر اس کے قریب آگیا۔ ''تم ہمیں یہاں تک لائے ہو......'' اس نے کہا۔ ''تمہارے

احساس جرم اور تمہارے ضمیر کے بوجھ نے ہماری رہنمائی کی ہے۔''

''نہیں' یہ غلط ہے میں نے تمہاری رہنمائی نہیں کی۔ میں نے کچھ نہیں کیا...... تم جھوٹ بول رہے ہو۔''

''تم ہی ہمیں یہاں لائے ہو۔ بالکل اسی طرح جیسے کوئی شخص اگر کوئی چیز چھپادے...... اور اسے دوسروں سے چھپائے رکھنا چاہتا ہو تو وہ چیز اس کے ذہن پر سوار ہوجاتی ہے۔ ایسا شخص لازماً پوشیدہ جگہ تک دوسرے کی رہنمائی کرسکتا ہے۔ بشرطیکہ دوسرا شخص ماہر ہو۔ میں نے تم سے کہا تھا کہ تمہارے احساس جرم نے میری رہنمائی کی ہے۔ جب ہم تمہیں لے کر روانہ ہوئے اور اس پہلے موڑ سے سیدھے گزر گئے جہاں سے ہمیں مڑنا چاہیے تھا تو تمہارے جسم نے اس موڑ کی طرف خفیف سا جھٹکا کھایا۔ اس لیے کہ تم نہیں چاہتے تھے کہ ہم اس طرف متوجہ ہوں۔ اس وقت میں تم سے جڑا بیٹھا تھا اور پھر میرے لیے تمہارے جسم کی وہ خفیف سی حرکت بھی بہت کافی تھی۔ یہ ایک آرٹ ہے' اور اس وقت خاص طور پر یہ بہت آسان ہوجاتا ہے جب مطلوبہ شخص نروس ہو۔''

''تم...... تم کون ہو؟'' مرفی نے خوف زدہ انداز میں سرگوشی کی۔ ''تم سراغ رساں تو نہیں ہو...... پھر......؟''

''اس کا نام ماسٹر ہے۔'' ڈیوس نے کہا۔ ''یہ ایک پیشہ ور فن کار ہے' افسوس' تم اس کے فن کا مظاہرہ نہیں دیکھ سکو گے۔ اس کا مظاہرہ لوگوں کو سانسیں تک روکنے پر مجبور کردیتا ہے۔ خاص طور پر اس وقت تو ان کی حیرت دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے جب یہ حاضرین میں سے کسی شخص کو کہتا ہے کہ وہ کوئی چیز چھپادے...... پھر ماسٹر اس چیز کو تلاش کرلیتا ہے۔ یہ کبھی ناکام نہیں ہوا۔''

''اور تم کون ہو؟'' مرفی نے ڈیوس سے پوچھا۔ ''تم بھی سراغ رساں نہیں ہو۔ کسی سراغ رساں کو مجھ پر شک نہیں ہوا۔ کسی نے اس بارے میں سوچا تک نہیں بتاؤ تم کون ہو؟''

''میں سراغ رساں ہوں۔'' ڈیوس تلخ لہجے میں بولا۔ ''لیکن میں وہ شخص بھی ہوں جس سے تمہاری بیوی شادی کرنے جارہی تھی کہ تم بیچ میں آکودے۔''

''تو تم نے مجھ سے جھوٹ بولا تھا۔ میرے خلاف کوئی شہادت نہیں تھی۔ تم مجھ پر جرم ثابت نہیں کرسکتے تھے۔''

''نہیں' میں نے تم سے کوئی جھوٹ نہیں بولا۔'' ڈیوس نے اطمینان بھرے انداز میں کہا۔ ''اس جرم کا ایک عینی شاہد موجود تھا۔ اسی نے یہاں تک ہماری رہنمائی کی اور ہمیں مطلوبہ شہادتیں بہم پہنچائیں۔ یاد رکھو' ہر جرم کا ایک عینی شاہد ضرور ہوتا ہے' وہ جو جرم اپنی آنکھوں سے ہوتے دیکھتا ہے' وہ جو اس میں ملوث ہوتا ہے...... اور اس کیس میں وہ شخص تم تھے' مرفی...... اور عینی شاہد سے ہماری مراد تم ہی تھے' کوئی اور نہیں۔''

⌘

شعبدہ باز

فیاض الرحمٰن

مرد خواہ کتنا بھی مضبوط ہو' چاہے وہ چاند اور ستارے بھی کیوں نہ سر کر لے اس کے اندر ایک ننھا سا معصوم ضدی اور حاسد بچہ چھپا ہوتا ہے' جسے اپنی چیز اپنے کھلونے چھن جانے کا خوف ستاتا رہتا ہے۔

ایک ایسے عاقل بالغ ذمہ دار بچے کی روداد' جسے اپنی محبت چھن جانے کا ڈر رہتا تھا

وہ آج یہ فیصلہ کر کے آیا تھا کہ پروفیسر بخاری سے ایسا انتقام لے گا کہ وہ زندگی بھر یاد رکھے گا۔

اسے پروفیسر پر شدید غصہ آ رہا تھا۔

پروفیسر بخاری ایک ماہر شعبدہ باز تھا اور جمیل کو یقین تھا کہ اس کی بیوی اس فرنچ کٹ داڑھی والے پروفیسر کو چاہتی ہے' وہ پروفیسر کے سامنے اسے نظر انداز کر دیتی تھی۔ اس وقت بھی یہی ہوا۔

جیسے ہی پروفیسر ہال میں داخل ہوا تو اس کی بیوی کے چہرے پر کئی رنگ بکھر گئے۔ ایسے رنگ اور ایسی خوشی تو اس نے اپنی بیوی کے چہرے پر اس دن بھی نہیں دیکھی تھی جب وہ ایک پاکیزہ بندھن میں بندھے تھے۔ جمیل کو اپنا دل ڈوبتا ہوا محسوس ہوا۔

وہ اس وقت ہال کی اگلی سیٹوں پر بیٹھے تھے۔ پروفیسر ہال میں داخل ہوا تھا تو اس کی بیوی کی طرف دیکھ مسکرایا تھا۔ اس نے اپنی بیوی کا ہاتھ تھامنا چاہا لیکن بیوی نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔

''کیا بات ہے' سیدھے بیٹھو۔'' بیوی نے سرد آواز میں کہا۔

اسے بیوی کی یہ بات بُری نہیں لگی بلکہ پروفیسر سے انتقام لینے کا جذبہ عود کر آیا تھا۔

جمیل بھی کچھ کچھ شعبدہ بازی سے واقف تھا لیکن اسے یقین تھا کہ وہ پروفیسر بخاری کی شعبدہ بازی کے سلسلے میں اس کی بیوی نے جو تعریف کی تھی اس سے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ ایک غیر معمولی شعبدہ باز ہے لیکن اگر وہ کوئی عظیم شعبدہ باز ہوتا تو اسے اس گھٹیا سے ہال میں اپنے فن کا مظاہرہ کرنے کی کیا ضرورت تھی؟

پھر وہ انتظار کرنے لگا کہ پروفیسر بخاری کب تماشائیوں میں سے کسی ایک کو اپنی مدد کے لیے دعوت دیتا ہے۔

''میرے اگلے شعبدے کے لیے مددگار چاہیے' آپ میں سے کوئی صاحب میری مدد کے لیے اسٹیج پر تشریف لے آئیں۔''

جمیل تیزی سے اٹھا اور اسٹیج کی طرف بڑھ گیا۔ اس کی بیوی اس کی اس حرکت پر حیران تھی۔

''شکریہ جناب!'' پروفیسر بخاری نے کہا پھر اپنی مددگار لڑکی کو اشارہ کیا کہ وہ جمیل کو اسٹیج پر لے آئے۔

اسی لڑکی نے جمیل کو پروفیسر سے متعارف بھی کرایا۔

''جمیل صاحب نے اپنی خدمات پیش کیں ہم ان کے شکر گزار ہیں۔'' پروفیسر نے تماشائیوں سے کہا۔

جمیل نے کینہ توز نگاہوں سے پروفیسر کی طرف دیکھا تو وہ حیرت کا اظہار کیے بغیر نہ رہ سکا۔

''میں اب جو کمال دکھانے والا ہوں وہ ٹیلی پیتھی کی جادوئی قوت کا مظاہرہ ہے۔'' پروفیسر نے کہا اور اس کے بعد جمیل کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی گئی پھر ایک چاک کا ٹکڑا دے کر اسے بلیک بورڈ پر لکھنے کی دعوت دی گئی۔ جمیل نے چاک کا ٹکڑا اپنی جیب میں پڑے ہوئے ٹکڑے سے بدل لیا اور بلیک بورڈ پر لکھا۔

''یہ شعبدہ ایک دھوکا ہے۔''

تماشائی یہ پڑھ کر خوب ہنسے۔

مددگار لڑکی نے جمیل کو ایک گیلا ڈسٹر دیا تو اس نے بلیک بورڈ صاف کر دیا۔ پروفیسر کی شعبدہ بازی ناکام ہو گئی تھی کیونکہ جس چاک کے ٹکڑے سے جمیل نے بورڈ پر لکھا تھا وہ تیل میں بھیگا ہوا نہیں تھا اگر تیل میں بھیگا ہوتا تو بلیک بورڈ سے لکھا ہوا مٹانے کے پر نہ مٹتا لیکن ایسا نہیں ہوا۔

پروفیسر کی مددگار لڑکی نے بڑھ کر اس کی آنکھوں سے پٹی کھول دی۔

پروفیسر کے چہرے کا رنگ بدلا ہوا تھا۔ وہ جمیل کی طرف جھک کر آہستہ سے بولا۔

''تم کون ہو اور کیا چاہتے ہو؟'' یہ کہہ کر وہ تماشائیوں سے مخاطب ہوا۔ ''اس شخص کی دماغی لہریں گڈمڈ سی ہیں شاید نشے میں ہے۔'' تماشائی ایک بار پھر ہنسنے لگے۔

''میرا نام جمیل ہے اور میں عاشی کا شوہر ہوں۔ سمجھ گئے نا؟'' اس نے پروفیسر سے کہا اور

تماشائیوں کی جانب مڑ گیا۔ ''میں نشے میں نہیں ہوں بلکہ پروفیسر بخاری نشے میں ہیں یا پھر یہ بالکل ناکارہ شعبدہ باز ہیں۔''

جب اسے یقین ہوگیا کہ تماشائی اس کی طرف متوجہ ہوگئے تو اس نے پروفیسر کے منہ سے رنگین کپڑے کی لاتعداد پٹیاں نکال کر کھینچنا شروع کردیں پھر اس نے ان پٹیوں کو سونگھا اور بولا۔

''ان میں سے شراب کی بُو آرہی ہے۔''

یہ سن کر تماشائی قہقہے لگانے لگے' وہ اسے بھی پروفیسر کے شعبدے کا ایک حصہ سمجھ رہے تھے۔

''دفع ہوجاؤ۔'' پروفیسر حقارت سے بولا۔ ''میں نہیں جانتا کہ تم کون ہو اور کیا چاہتے ہو؟ تم میرا کھیل تباہ کررہے ہو۔''

جمیل کی بیوی اپنی کرسی سے کھڑی ہوگئی' اس نے جمیل کو اسٹیج سے اترنے کا اشارہ کیا۔ اس بات پر جمیل کو مزید غصہ آگیا۔

''میں تمہیں ایسا سبق دوں گا کہ تم ساری زندگی یاد رکھوگے۔'' اس نے زہریلی آواز میں کہا لیکن لہجے کو دھیما ہی رکھا۔

پروفیسر لوگوں کو کھیل کی طرف متوجہ رکھنا چاہتا تھا۔ اس نے اشارہ کیا اور مددگار لڑکی ایک صندوق لے آئی' پروفیسر نے صندوق کھول کر لوگوں کو دکھایا پھر لڑکی کو اس میں لٹا کر صندوق کو بند کردیا اور جمیل کے ہاتھ میں ایک آری دیتے ہوئے بولا۔

''میرا خیال ہے تم اس صندوق کو آری سے دو حصوں میں تقسیم کرنا پسند کروگے۔''

''یقیناً۔'' جمیل نے مسکرا کر کہا۔ وہ اس شعبدے سے بھی واقف تھا۔

یہ صندوق اس طرح سے بنایا گیا تھا کہ اس کی ایک جانب سے عورت کا سر اور دوسری جانب سے پاؤں نکلے ہوئے نظر آتے تھے۔

جمیل دو منٹ تک آری چلاتا رہا اور پروفیسر منہ ہی منہ میں کچھ پڑھتا رہا۔ جمیل کے چہرے پر کامیابی کے تاثرات رقص کررہے تھے۔ لوگوں نے چیخ چیخ کر ہوٹنگ شروع کردی۔

''کیا تم مجھے برباد کرنا چاہتے ہو؟'' پروفیسر طیش میں آکر چیخ پڑا۔

''ہاں' ارادہ تو یہی ہے۔''

''ٹھیک ہے۔ میں دیکھتا ہوں کہ تم کتنے بڑے شعبدہ باز ہو' میں تمہیں یا تمہاری بیوی کو نہیں جانتا لیکن چیلنج ہمیشہ قبول کرلیتا ہوں۔'' یہ کہہ کر پروفیسر نے اپنا ہاتھ بلند کیا اور بولا۔

''اس شخص نے میری جادوئی عظمت کو للکارا ہے لہٰذا اب ہمارے درمیان مقابلہ ہوگا۔''

اسٹیج کے پچھلی جانب ایک سیاہ پردہ کھینچ دیا گیا۔ پروفیسر کی مددگار لڑکی ایک چھوٹا صندوق لے آئی جس میں پرانے زمانے کے دو پستول رکھے ہوئے تھے۔

''گولی پکڑنے کی شعبدہ بازی۔'' جمیل بڑبڑایا اور اس کی پیشانی پسینے سے بھیگ گئی۔ وہ اس شعبدے کے اصول سے تو واقف تھا لیکن اس میں اسے اتنی مہارت حاصل نہیں تھی۔

پروفیسر بخاری کی ہر حرکت سے شدید نفرت کا اظہار ہورہا تھا' وہ سنجیدہ ہوگیا تھا۔

پروفیسر نے دونوں پستول نکالے اور ایک کو اسٹیج کی جانب اچھال دیا۔

''میں اس پستول میں ایک ہی گولی ڈالوں گا

پھر میں اور جمیل سکہ اچھال کر یہ فیصلہ کریں گے کہ پہلے کون اور کس پر فائر کرتا ہے اگر یہ پہلے مجھ پر فائر کرے گا تو میں گولی اپنے دانتوں میں پکڑلوں گا لیکن اگر فائر پہلے میں نے کیا تو شاید جمیل ایسا نہ کرسکے۔''

پروفیسر نے پستول میں گولی ڈالی اور اپنی جیب سے ایک سکہ نکال کر جمیل کی طرف بڑھادیا۔

''مجھے تمہارے فریبی سکوں پر یقین نہیں۔'' جمیل نے سکہ زمین پر ڈال دیا اور اپنی جیب سے ایک سکہ نکالا۔ ''میں یہ سکہ اچھالوں گا اور تم گنتی کروگے۔'' جمیل نے کہا۔

''ٹھیک ہے' تم ہی اچھالو۔'' پروفیسر بولا۔ اس کے ہونٹوں پر مکارانہ مسکراہٹ تھی۔

سکہ فضا میں اچھلا' تماشائی خاموش بیٹھے تھے' سکہ اسٹیج کے فرش پر گرا۔

''ایک......دو......تین......''

جمیل کی آواز بلند ہوئی' اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔

''نہیں...... نہیں...... مجھے یہ شعبدہ نہیں آتا۔''

پروفیسر تیزی سے اس کے قریب آیا۔ ''تمہیں کیسے پتا چلا کہ یہ شعبدہ ہے؟'' یہ کہہ کر وہ تماشائیوں کی طرف متوجہ ہوا۔

''جمیل صاحب کا خیال ہے کہ وہ اس شعبدے میں حصہ نہیں لے سکتے۔''

لوگ ہنسنے لگے۔ اب وہ پروفیسر بخاری کا ساتھ دے رہے تھے۔

''اب گولی میں پکڑوں گا۔'' اس نے پستول جمیل کی جانب اچھال دیا۔

جمیل کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کرے شاید پروفیسر اس کی بیوی کو حاصل کرنے کے لیے یہ مظاہرہ کرنا چاہتا ہے۔ اس احساس نے جلتی پر تیل کا کام کیا اور جمیل نے پستول کا رخ پروفیسر کی طرف کیا تو پروفیسر کا چہرہ اس کو زرد نظر آیا۔

''نہیں! میں ایسا نہیں کرسکتا۔'' یہ کہہ کر جمیل نے پستول پروفیسر کی مددگار لڑکی کو دے دیا۔

لڑکی نے پستول لیا اور پروفیسر کی طرف کرکے فائر جھونک مارا۔ پروفیسر کا سر پیچھے لڑھک گیا۔

جمیل نے آنکھیں بند کرلیں۔ جب اس نے دوبارہ آنکھیں کھولیں تو پروفیسر سامنے کھڑا مسکرارہا تھا۔ اس نے گولی منہ سے نکال کر تماشائیوں کو دکھائی۔

لوگ دیوانہ وار تالیاں بجارہے تھے۔

پروفیسر جمیل کی جانب مڑا۔

''اچھا تو یہ شعبدہ ہی تھا۔'' جمیل نے کہا۔

''یقیناً! اس کھیل میں ہمت کے ساتھ ساتھ شعبدے میں مہارت کی بھی ضرورت ہوتی ہے اور اب تم اپنی بیوی کی جانب لوٹ جاؤ' وہ جو کوئی بھی ہے میں اسے نہیں جانتا۔ میرے سیکڑوں قدر دان ہیں' میں سب کی طرف دیکھ کر مجموعی طور پر مسکراتا ہوں۔ میری مسکراہٹ کسی ایک کے لیے مخصوص نہیں ہوتی۔ سمجھے؟ اور یہ بات اپنی بیوی کو بھی سمجھادینا۔''

❁

انہونی

راحیلہ تاج

کچھ واقعات ایسے بھی ہوتے ہیں جو آنکھوں کے سامنے وقوع پذیر ہوتے ہیں' مگر پھر بھی ذہن میں ان کی حقیقت پر یقین کرنے کو تیار نہیں ہوتا۔

صدیوں پرانی ایک منحوس مسہری کا قصہ' جس پر سونے والا کبھی نہیں جاگتا

میری عمر چالیس سال کے لگ بھگ ہے۔ ابھی تک غیر شادی شدہ ہوں۔ آمدنی کا ذریعہ میری کامیاب وکالت ہے لیکن اپنی مصروفیات کے باوجود عہد قدیم کا فرنیچر جمع کرنا میرا محبوب مشغلہ ہے اور ہیری کے ساتھ میری دوستی کی ابتدا بھی اسی مشغلے کی بدولت ہوئی تھی۔ میری طرح قدیم عہد کا فرنیچر جمع کرنا اس کا مشغلہ ہی نہیں بلکہ وہ اسے اپنی زندگی کا جزو سمجھتا ہے۔ آٹھ دس برس پیشتر' میری اور اس کی ملاقات 'وہائٹ روز جنکشن کے ایک نیلام کے موقعے پر ہوئی تھی جب ہم دونوں ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر بولی دے رہے تھے۔ نیلام کے بعد میں اور وہ اکٹھے ہی نیویارک واپس آئے تھے۔ اس کے بعد ہم ایک دوسرے کے قریب سے قریب تر ہوتے چلے گئے۔

ہر موسم بہار میں ہم دونوں اکٹھے پرانی چیزوں کی تلاش میں جنوبی انگلینڈ کی طرف نکل جاتے اور عام دنوں میں ہفتے میں ایک مرتبہ ضرور ہم ایک دوسرے کو اپنے گھر مدعو کرتے۔

یہ فروری کی ایک دھندلی اور اداس صبح تھی۔ وہ میرے دفتر میں آ گیا اور آتے ہی بولا۔ ''غالباً تمہیں میری وہ لکھنے کی میز تو یاد ہی ہوگی جسے تم بارہا دیکھ چکے ہو؟''

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ یقیناً مجھے یاد تھی کیونکہ وہ میز بہت قیمتی تھی اور ہیری کی جمع کردہ نادر اشیاء میں سے ایک...... ہیری کے خیال کے مطابق' وہ اس کے تمام نوادر پر فوقیت رکھتی تھی۔ وہ میز عموماً اس کی خواب گاہ میں رکھی رہتی تھی اور ہیری کی وصیت کے مطابق اس کی موت کے بعد' اس میز کو میٹرو پولیٹن میوزیم کے نوادر میں شامل کر دیا جانا تھا۔

''تمہیں معلوم ہے کہ وہ میز اکثر اس طرح کھڑکھڑاتی تھی جیسے اندر سے خالی ہو۔'' وہ مجھے خاموش پا کر بولا۔ ''مگر باوجود ہر ممکن کوشش کے ہم اس میں کوئی خانہ یا خفیہ دراز تلاش نہیں کر سکے تھے۔''

کچھ کہے بغیر میں نے اس مرتبہ بھی سر ہلا دیا۔

''کل رات میں اسی میز کے سامنے بیٹھا کچھ لکھ رہا تھا کہ میرا پیر' میز کے ایک کونے کے ساتھ اچانک ہی ٹکرا گیا۔'' ہیری نے جوشیلے لہجے میں مجھے بتایا۔ ''اور اسی لمحے میز کی نچلی سطح پر ایک چھوٹا سا خفیہ خانہ نمودار ہو گیا۔ اس خفیہ خانے کو دیکھ کر مجھے اپنی آنکھوں پر اعتبار نہیں آیا تھا۔ کتنی حیرت انگیز بات ہے بیس برس سے یہ میز' میرے پاس ہے اور اب بیس سال کے بعد اس میں یکا یک ہی ایک خفیہ خانہ نکل آیا تھا۔''

''وہ خفیہ خانہ خالی تھا؟'' میں نے پوچھا۔ میری آواز میں اشتیاق نمایاں تھا۔

ہیری نے نفی میں گردن جھٹکی۔ ''نہیں۔ خفیہ خانے کا انکشاف بذات خود ایک عجیب بات ہے لیکن اس سے بھی عجیب تر بات یہ ہے کہ اس میں ایک تصویر اور ایک خط بھی پڑا ہوا تھا۔''

میں ابھی تک یہی سمجھ رہا تھا کہ ہیری میرے ساتھ مذاق کر رہا ہے لیکن جب اس نے میری طرف وہ لفافہ بڑھایا جس میں تصویر اور خط دونوں چیزیں موجود تھیں تو مجھے اندازہ ہوا کہ وہ غلط بیانی نہیں کر رہا تھا۔ تصویر اٹھارویں صدی کے اوائل کی مصوری کا بہترین شاہکار تھی۔ اس تصویر میں ایک ایسے نوجوان لڑکے کو دکھایا گیا تھا...... جس کی عمر کسی طور بھی اٹھارہ سال سے زائد نہیں تھی۔

میں نے تصویر کو الٹ کر دیکھا دوسرے رخ پر کاغذ کا ایک ٹکڑا چسپاں تھا جس پر بے ڈھنگے حروف میں لکھا ہوا تھا۔

''لینا کس۔ تاریخ پیدائش ۱۸ جولائی ۱۶۹۴ء خودکشی کر لی ۱۰ اپریل ۱۷۱۲ء۔''

میں چند ثانیوں تک بے مقصد انداز میں اس تحریر کو گھورتا رہا۔ نوجوان کا چہرہ بے حد معصوم تھا۔ میں نے تصویر کو سیدھا کیا اور اس کے چہرے کے خدوخال کا جائزہ لینے لگا۔ اتنی چھوٹی عمر میں خودکشی! لیکن کیوں؟ میں نے ہیری کی طرف دیکھا۔ ''اور آخر یہ نوجوان ہے کون؟''

ہیری نے کچھ کہے بغیر خط میری طرف بڑھا دیا۔ ''کاش! میں جان سکتا کہ یہ کون ہے۔ بہرحال تم یہ خط پڑھو اور مجھے بتاؤ کہ تم اس سے کیا نتیجہ اخذ کرتے ہو؟''

میں نے خط کھولا۔ طرز تحریر تصویر کی پشت پر لکھی عبارت سے مشابہ تھی۔ یہ ایک نسوانی تحریر تھی۔ خط کا مضمون یہ تھا۔

''کرک وڈ! شکر ہے کہ لینا کس پر کسی طرح کا شبہ نہیں کیا گیا۔ مصیبت کے سائے ایک مرتبہ پھر چھٹ گئے ہیں۔ ہمارا ملازم بارٹن اسی ہفتے فورٹ لاٹور جا رہا ہے۔ میں نے اسے پچاس پونڈ کے علاوہ وہ پلنگ بھی دے دیا ہے جسے تم نے شیطانی مسہری کا نام دیا تھا...... تمہاری نیلسا۔''

میں نے یہ خط کھڑے کھڑے پڑھا تھا۔ ہیری میرے چہرے پر خط کا ردعمل تلاش کر رہا تھا۔

''میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔'' میں نے اسے بتایا۔ ''ہو سکتا ہے کہ یہ نوجوان جس کا نام لینا کس بتایا گیا ہے' اس سے شاید کوئی جرم سرزد ہو گیا ہو' کوئی بہت ہی خطرناک جرم' جس کی پاداش سے بچنے کے لیے اس نے خودکشی کر لی ہو لیکن خط کا دوسرا حصہ میری سمجھ سے بالاتر ہے۔ آخر اس ملازم کا اس واقعے سے کیا تعلق؟ ممکن ہے کہ وہ بھی اس جرم میں شریک ہو یا پھر جرم کا عینی شاہد ہو۔ شاید اسی لیے لینا کس کی ماں نے اسے پچاس پونڈ دے کر کسی دوسری جگہ چلے جانے کے لیے کہا تھا۔''

''بہت خوب!'' ہیری میری بات سن کر ہنس پڑا۔ ''مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں کہ لینا کس سے کون سا جرم سرزد ہوا تھا۔ اور اس نے خودکشی کیوں کر لی تھی۔ میری تمام تر دلچسپی تو اس مسہری سے وابستہ ہے' جسے خط میں شیطانی مسہری کا نام دیا گیا ہے۔ میں برسوں سے اس مسہری کی تلاش میں ہوں۔ جانتے ہو' یہ ہے کیا چیز؟'' اس نے مجھ سے پوچھا پھر مجھے بولنے کا موقع دیے بغیر خود ہی ڈرامائی انداز میں بولا۔ ''یہ مسہری' لکڑی کے کام

کا بہترین نمونہ ہے۔ اس پر مختلف اشکال کندہ ہیں اور بنانے والے نے ان اشکال پر اتنی محنت کی ہے کہ ہر شکل جان دار نظر آتی ہے۔ یہ خط اور تصویر' اس مسہری کی تلاش میں معاون ثابت ہوسکتی ہے۔ اب میں اس مسہری کو ڈھونڈ کر ہی دم لوں گا' اگر میری تلاش کامیاب رہی تو میری شہرت سارے امریکہ میں پھیل جائے گی۔'' اس کا چہرہ فرط جذبات سے تمتما رہا تھا۔

میں دم بخود ہیری کی طرف دیکھتا رہا۔ مجھے اس مسہری سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ میں تو اس نوجوان کے بارے میں سوچ رہا تھا جس نے اتنی چھوٹی سی عمر میں خودکشی کرلی تھی لیکن دو طویل صدیاں میرے ذہن پر تاریکی کا دبیز پردہ ڈال گئی تھیں۔

خط میں مسہری کا تذکرہ پڑھنے کے بعد' اس کے حصول کے لیے ہیری کی بے چینی حیرت انگیز نہیں تھی جس چیز کے لیے کوئی شخص برسوں سے سرگرداں ہو' اس کے بارے میں ہلکا سا اشارہ بھی غنیمت ہوتا ہے۔ ''کیا یہ ممکن ہے کہ ایک مسہری' جو دو صدی پیشتر بارٹن نامی آدمی' فورٹ لاٹور لے گیا تھا۔ وہ تمہیں اب بھی وہیں مل جائے۔ اس قدر طویل عرصے کے بعد؟'' میں نے پوچھا۔

''ناممکن بھی تو نہیں ہے۔'' اس نے جھٹ سے جواب دیا...... ''ایک منقش مسہری بہرحال قیمتی چیز ہوتی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ وہ مسہری اس کی اولاد میں سے کسی کے پاس اب بھی موجود ہو یا پھر نیو برینسک کے کسی کسان کے گھر میں' سونے کے کمرے میں پڑی ہو۔''

''نیو برینسک......'' میں زور سے چیخا۔ ''تمہارا مطلب ہے' وہ نیو برینسک' جو نیوجرسی میں واقع ہے؟''

''نہیں......'' ہیری نے جلدی سے نفی میں سر ہلایا۔ ''فورٹ لاٹور' کینیڈا میں فرانسیسیوں کی نوآبادی ہے اور سینٹ جان نیو برینسک اس نوآبادی کا ایک قصبہ ہے۔ میں وہاں ضرور جاؤں گا اور مسہری کو تلاش کرنے کی کوشش کروں گا۔''

میں ہیری کے اس دیوانے پن پر ہنس پڑا۔ ''کیا اسی وقت روانہ ہو رہے ہو؟'' میں نے مذاق میں کہا لیکن یہ جان کر میری حیرت کی انتہا نہ رہی' جب اس نے مجھے بتایا کہ وہ سفر کی ساری تیاری مکمل کرچکا ہے اور ایک گھنٹے بعد ہی روانہ ہوجائے گا۔

''تم بھی چلو نا میرے ساتھ۔'' اس نے مجھ سے کہا۔ ''زیادہ سے زیادہ دو ہفتے میں واپس آجائیں گے۔''

میں نے انکار کردیا۔ ان دنوں میرے پاس کام کی بہت زیادتی تھی۔ چند دن بھی فرصت کے نکالنے بے حد مشکل تھے۔ انکار کرتے ہوئے مجھے دکھ بھی ہوا تھا کیونکہ مسہری کے حصول سے اب مجھے بھی دلچسپی ہو چلی تھی۔

❁......❁......❁
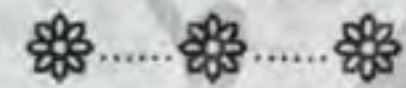
مارچ کے مہینے میں مجھے اس کے دو خط ملے تھے' جن میں اس نے اپنی ناکامی کا مختصر سا حال لکھا تھا۔ آخر میں مجھے' اس کا ایک خط اور ملا۔ اس نے لکھا تھا۔

''میں نے انہیں پالیا ہے لیکن بہت عجیب حالات میں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے' جیسے جرائم' اس خاندان کی گھٹی میں پڑے ہوئے ہیں۔ ایموس بارٹن جو کہ فورک بارٹن کی اولاد میں سے تھا' اسے ایک خاندان کے نو افراد کو موت کے گھاٹ اتار دینے کے الزام میں ۱۸۴۸ء میں پھانسی پر لٹکا دیا

گیا تھا۔ ایموس بارٹن کے آباء واجداد بھی اسی قسم کے انسان تھے۔ ہر نسل میں ان کے ہاتھ سے کوئی نہ کوئی سنگین جرم ضرور سرزد ہوا ہے۔ مجھے پرانے اخبارات کے ذریعے پتا چلا ہے کہ ایموس بارٹن' روتھ لے نامی قصبے میں ایک کسان کی حیثیت سے نہایت پرامن زندگی گزار رہا تھا ایک رات وہ اچانک ہی گھر سے نکلا اور اپنے ہمسائے کے گھر میں گھس کر تمام گھر والوں کو قتل کردیا۔ حالانکہ ان کے ساتھ اس کی کوئی دشمنی بھی نہیں تھی۔ جب اسے گرفتار کیا گیا تو اس نے اپنے بچاؤ کے لیے بالکل کوشش نہیں کی تھی۔ قتل کے ایک ہفتے بعد' اسے پھانسی پر لٹکا دیا گیا تھا۔ جہاں تک مجھے معلوم ہوا ہے' اس کے چھ بچے تھے۔ پانچ لڑکے اور ایک لڑکی۔ باپ کے پھانسی پاجانے کے بعد وہ سب بکھر گئے' مجھے لگتا ہے کہ انہوں نے شرم کی وجہ سے اپنے نام بھی بدل لیے تھے۔ تاہم میں اپنی کوشش میں لگا ہوا ہوں اور مجھے یقین ہے کہ میں جلد ہی ان میں سے کسی ایک کو ضرور تلاش کرلوں گا۔'' میں اس کا خط پڑھنے کے بعد ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔

دو مہینے کے بعد مجھے ہیری کی طرف سے ایک تار موصول ہوا۔ وہ' شیطانی مسہری کا سراغ لگانے میں کامیاب ہوگیا تھا۔ برقیے کا متن یہ تھا۔

''جلد پہنچو۔ تلاش کامیاب رہی۔ میں چاہتا ہوں کہ تم یہاں آکر اس مسہری کو ہیلڈسٹن پہنچانے میں میری مدد کرو۔ براہ کرم' میری اس کامیابی سے قومی عجائب گھر کے مسٹر ہینک کو بھی مطلع کردینا۔ تمہاری آمد کا منتظر' ہیری۔''

اب انکار کی گنجائش نہیں تھی۔ آخر اتنے گہرے دوست کی خواہش کو میں کب تک رد کرسکتا تھا۔ میں دوسرے دن ہی بوسٹن روانہ ہوگیا۔ ہیری مجھے سینٹ جان کے اسٹیشن پر ملا تھا اور بہت خوش نظر آرہا تھا۔

''بھئی! دیکھو گے تو حیران رہ جاؤ گے۔'' اس کا اولین جملہ یہی تھا جو اس نے مجھے دیکھتے ہی کہا تھا۔ ''مجھے اپنی خوش قسمتی پر یقین نہیں آرہا ہے۔ سچ کہتا ہوں' وہ بالکل صحیح حالت میں ہے۔ لکڑی پر اس قدر خوب صورت اور دلکش کام' میں نے اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا اور افسوس کی بات یہ ہے کہ اتنی نادر روزگار شے' غلّے کے گودام میں' برسوں کی دھول میں اٹی پڑی ہے۔'' یہ سب کچھ اس نے مجھے ہکلاتے ہوئے بتایا۔ وہ اپنے جذبات پر قابو پانے کی کوشش کررہا تھا لیکن ناکام رہا تھا۔

''قومی عجائب گھر والوں سے میں نے اس مسہری کا تذکرہ کیا تھا۔ وہ بے حد خوش ہوئے ہیں۔'' میں نے اسے بتایا۔ ''کیا تمہیں یقین ہے کہ مسہری کا مالک اسے بیچنے پر رضامند ہوجائے گا؟''

''ہاں' مجھے اس بات کا یقین ہے۔'' اس نے جلدی سے گردن جھٹکی۔ ''وہ اس مسہری کی قدر و قیمت نہیں جانتے' دراصل وہ اس سے نفرت کرتے ہیں' پتا نہیں کیوں۔''

ہمیں پتا بھی نہیں چلا اور باتیں کرتے ہوئے ہم' ہیری کے رہائشی ہوٹل میں جا پہنچے۔ دوسری صبح اس گاؤں کو روانہ ہونے کا پروگرام بنایا جہاں مسہری کے مالک مقیم تھے۔

کھانا کھانے کے بعد ہم کافی دیر تک باتیں کرتے رہے۔ ہیری مجھے اپنی تگ و دو کی تفصیل بتاتا رہا جو مسہری کی تلاش میں اسے پیش آئی تھی۔ اس کا یہ خیال درست ہی ثابت ہوا تھا کہ بارٹن کی

اولاد نے باپ کے پھانسی پا جانے کے بعد شرم کی وجہ سے اپنے نام تبدیل کر لیے تھے۔ اسے یقین تھا کہ بارٹن کی اولاد نے جگہ بھی تبدیل کر لی ہوگی لیکن اس کا یقین باطل نکلا۔ انہوں نے اپنا آبائی علاقہ خیر باد نہیں کہا تھا اور یہی بات اس کی کامیابی کا باعث بن گئی تھی۔

"اب یہ بتاؤ کہ تم ان لوگوں کا سراغ لگانے میں کس طرح کامیاب ہوئے؟" میں' ہیری کے خاموش ہوتے ہی بول پڑا۔

ہیری آرام کرسی پر نیم دراز ہو گیا اور کمرے کی چھت کو گھورتے ہوئے بولا۔ "مجھے شروع ہی سے یقین تھا کہ یہ مسہری' ایموس کی لڑکی کے پاس ہی ہو سکتی تھی کیوں کہ وہ عمر میں اپنے بھائیوں سے بڑی تھی۔" اس نے کہنا شروع کیا۔ "بڑی جستجو کے بعد مجھے پتا چلا کہ وہ اپنے باپ کے پھانسی چڑھائے جانے سے بہت پہلے ہی لیسٹون نامی آدمی سے بیاہی گئی تھی۔ اس کے خاوند کو جب اپنے سسر کے اس کارنامے کا علم ہوا کہ اس نے نو افراد کو بہیمانہ طور پر قتل کر دیا ہے تو وہ اپنی بیوی اور دو سالہ بچے کو چھوڑ کر بھاگ گیا۔ لڑکی کو روتھ لے چھوڑنا پڑا اور وہ اس گاؤں میں جہاں ہم کل جا رہے ہیں آ کر مقیم ہو گئی۔ اس نے ایک بوڑھے کسان اینجلز کے ہاں ملازمت کر لی۔ وہ اس مسہری کو بھی اپنے ساتھ ہی لے گئی تھی۔ اینجلز کی بیوی مر چکی تھی اور اس کی کوئی اولاد بھی نہیں تھی' اس لیے ان دونوں نے آپس میں شادی کر لی۔ ماں کی موت کے بعد' لائین کا بیٹا فینی بارٹن اس کا وارث بنا' فینی بارٹن نے بھی اپنا نام تبدیل کر لیا ہے اور اب وہ فینی اینجلز کے نام سے مشہور ہے۔ کل تم اس سے ملو گے۔ وہ اپنی پوتی کے ہمراہ رہتا ہے۔ دراصل اس کی پوتی نے ہی مجھے غلے کے گودام میں پڑی مسہری تک پہنچنے میں مدد دی تھی۔"

"ہیری! تمہیں تو سراغ رساں ہونا چاہیے تھا۔" میں' اس کے چہرے پر نظریں گاڑتے ہوئے مسکرایا۔ "پرانے فرنیچر کی تلاش میں تم اپنی صلاحیتوں کو ضائع کر رہے ہو۔" پھر ایک دم ہی میرے ذہن میں ایک خیال ابھرا اور میں نے وہ سوال ہیری سے پوچھ ہی لیا جسے وہ اتنے عرصے سے چھپانے کی کوشش کر رہا تھا۔

"ہیری' ایک بات تو بتاؤ۔" میں نے اس سے دریافت کیا۔ "یہ جو گزشتہ دو صدیوں میں قتل کی اتنی وارداتیں ہوئی ہیں کہیں ان کا کوئی تعلق اس شیطانی مسہری سے تو نہیں ہے؟"

ہیری نے پریشان نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔ شاید وہ کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن کہہ نہیں پا رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے بڑی آہستگی سے کہا۔ "محض اتفاقات...... اور کیا ہو سکتا ہے۔" پھر وہ میری طرف تیز نظر سے دیکھنے لگا۔ "آخر تم کہنا کیا چاہتے ہو؟ کیا مقصد ہے تمہارا...... اس سوال سے؟"

"اوہ...... کوئی خاص بات نہیں ہے۔ بس' ایسے ہی پوچھ لیا تھا۔" میں نے موضوع بدل دینا ہی بہتر سمجھا...... اور سونے کے لیے بستر پر جا لیٹا۔

❀......❀......❀

اگلی صبح ہم دونوں' فینی اینجلز کے گاؤں کی طرف روانہ ہو گئے۔ دوپہر کے وقت جب ہم اس کے گھر کے قریب پہنچے تو ایک بڑا سا خوفناک کتا بھونکتا ہوا ہماری بگھی کی طرف لپکا لیکن اسی وقت ایک جوان عورت گھر کے اندر سے نکل کر دروازے پر آ کھڑی ہوئی۔ اور کتے کو ڈانٹنے لگی۔

اس کے عقب میں ایک عمر رسیدہ شخص بھی کھڑا ہوا تھا اور حیرانی سے ہماری طرف دیکھ رہا تھا جیسے ہی بگھی رکی' وہ ہمارے پاس آ کر کھڑا ہو گیا اور میری طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھنے لگا۔

آخر ہیری نے ہمارا تعارف کرایا۔ وہ بوڑھے کو پہچانتا تھا۔

'اوہ' تو یہ ہے' فورک بارٹن اور ایموس بارٹن کا وارث...... فینی بارٹن...... ایک قاتل اور مجرم کا وارث۔' میں نے سوچا اور حیرانی سے بوڑھے کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے کے نقوش خاصے دلکش تھے اور قاتلوں جیسی خونخواری اس کے خدوخال سے مفقود تھی۔ فینی بارٹن سے نظر ہٹا کر میں نے اس کی پوتی کی طرف دیکھا۔ وہ بھی خاصی خوب صورت تھی۔ اسے دیکھ کر میرا دل عجیب سے انداز میں دھڑکنے لگا۔ اس کے گھر کی بیرونی حالت خاصی ناگفتہ بہ تھی لیکن گھر کے اندر پہنچتے ہی میری رائے بدل گئی۔ معمولی سی آرائش کی چیزیں تھیں لیکن ان کی ترتیب سے فینی کی پوتی' صوفیہ کی سلیقہ مندی ظاہر ہوتی تھی۔

مجھے فوری طور پر آرام کرنے کے لیے' سونے کے کمرے میں پہنچا دیا گیا میں ابھی بستر پر لیٹا بھی نہیں تھا کہ ہیری آ گیا اور کہنے لگا۔ "آؤ' تمہیں وہ عجوبہ دکھاؤں۔"

میں اس کے ساتھ ہو لیا۔ تھوڑی دیر بعد ہی ایک تنگ زینہ طے کرتے ہوئے ہم گودام میں پہنچ گئے۔ کھڑکی اور روشن دان نہ ہونے کی وجہ سے گودام میں مکمل تاریکی تھی' اس لیے میں اچھی طرح گودام کا جائزہ نہ لے سکا تھا۔

چند ثانیے بعد' جب میری آنکھیں اندھیرے میں دیکھنے کے قابل ہوئیں تو گودام کا اندرونی منظر پورے طور پر میرے سامنے آ گیا۔ جا بجا کھیتی باڑی کے پرانے آلات بکھرے ہوئے تھے۔ دیواروں کا پلستر بالکل اکھڑ چکا تھا اور فرش پر جمی مٹی کی وجہ سے اس کا رنگ پہچاننا مشکل تھا۔ لگتا تھا' برسوں سے اس گودام کو استعمال میں نہیں لایا گیا تھا۔ کمرے کے فرش اور دیواروں پر مکڑیوں کے جالے تنے ہوئے تھے اور ان پر مکڑیاں رینگ رہی تھیں۔ یکایک ہی ایک بڑی سی مکڑی نے چھلانگ لگائی اور میرے اوپر آ گری۔ میں نے جلدی سے اپنے کپڑے جھاڑے اور مکڑی کو نیچے گرا کر' اسے پیر سے کچل دیا۔ خوف کے باعث میرے جسم میں سنسنی پھیل گئی تھی لیکن میں نے جلد ہی اپنے خوف پر قابو پا لیا تھا۔

چند قدم کے فاصلے پر ہیری دھول سے اٹے ایک عجیب ساخت کے پلنگ کو کونے سے کھینچ کر کمرے کے وسط میں لانے کی کوشش کر رہا تھا۔ جب وہ اسے درمیان میں لے آیا تو میں اسے دیکھنے کے لیے آگے بڑھا۔ میری آنکھوں میں یکایک ہی حیرت اتر آئی تھی۔

میں چند لمحے' بے حس و حرکت پلکیں جھپکائے بغیر اس مسہری کو دیکھتا رہا اور اس کا بغور جائزہ لیتا رہا۔ واقعی یہ ایک انوکھی چیز تھی۔ اتنی شان دار کہ میں نے آج تک اس سے بہتر چیز نہیں دیکھی تھی۔ عہد قدیم کی تمام صناعی اس پر ختم تھی۔ اس پر کی گئی نقش کاری کی قدر' پرانے زمانے کے آرٹ سے واقف شخص ہی جان سکتا تھا۔ میں اس پر نظریں جمائے آگے بڑھا تو مسہری کے مل جانے کی خوشی' خوف میں ڈھل گئی۔

مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے مسہری میں سے خطرناک قسم کی غیر مرئی شعاعیں نکل کر میری

طرف بڑھ رہی ہوں...... اور میرے دل ودماغ پر چھائی جارہی ہوں۔ نقش کاری جو پہلی نظر میں بے حد بھلی لگی تھی' اب بے حد ڈراؤنی لگ رہی تھی۔ کئی سانپ تھے چھوٹے بڑے' آپس میں لپٹے ہوئے' اپنے چوڑے پھن کو اٹھائے ہوئے۔ لگتا تھا' وہ ابھی جھپٹ پڑیں گے اور مجھ سے لپٹ جائیں گے...... اور جب میری نگاہ مسہری کی پشت پر پڑی تو میں سراپا کانپ کر رہ گیا۔ وہ چند ہیبت ناک انسانی چہرے تھے جو دانت نکوسے ایک دوسرے کے پیچھے سے جھانکنے کی کوشش کررہے تھے۔

خوف کی شدت کے باعث میرے ماتھے سے پسینے کے قطرے ٹپک پڑے۔

''کیا خیال ہے تمہارا' اس کے متعلق؟'' ہیری کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ مسہری پر سے نگاہ ہٹاتے ہوئے مجھے احساس ہوا کہ جیسے میں نے ابھی ابھی کوئی خوفناک خواب دیکھا ہو۔

''بہت خوب...... واقعی عجیب چیز ہے' ہیری!'' میں نے کہا۔ ''تم خوش قسمت ہو کہ تم نے بالآخر ایسی نادر شے کو ڈھونڈ نکالا...... لیکن......'' میں جھجک سا گیا۔ ''سچ پوچھو تو مجھے اسے دیکھ کر مایوسی ہوئی ہے مجھے سوائے بھیانک پن کے اس مسہری میں اور کوئی خوبی نظر نہیں آئی۔''

یہ سنتے ہی ہیری کا چہرہ غصے سے تمتما اٹھا۔ اس نے میری طرف ایسی نگاہ سے دیکھا جیسے ابھی جھپٹ پڑے گا اور دونوں ہاتھوں سے میرا گلا دبوچ لے گا لیکن وہ آگے نہیں بڑھا۔ چند ثانیے کے توقف سے اس نے کہا۔ ''تم کچھ بھی کہو' میں اسے یہاں نہیں چھوڑ سکتا۔ شاید تم اس سے خوف زدہ ہوگئے ہو۔''

ہیری نے سچ ہی کہا تھا۔ میں واقعی بہت خوفزدہ تھا۔ مجھے اس منقش مسہری سے نفرت ہوگئی تھی۔ مجھے محسوس ہوا کہ ہیری بھی اس سے خوفزدہ ہے لیکن وہ اپنا خوف مجھ سے چھپا رہا تھا۔

''فضول بات مت کرو' ہیری۔'' میں نے جواب دیا۔ ''تم نے ایک نادر شے دو صدی بعد ڈھونڈ نکالی ہے۔ میوزیم والوں کے لیے یہ ایک بہترین تحفہ ہوگا۔ میرا مطلب تو صرف یہ تھا کہ اس پر جو عجیب اور دہشت ناک شکلیں بنائی گئی ہیں' مجھے ان سے نفرت ہے...... اگر کوئی ہزار ڈالر دے کر مجھ سے کہے کہ اس پر سو جاؤ تو شاید میں کبھی ایسا نہ کرسکوں۔''

''مگر میں نے تو تہیہ کرلیا ہے کہ آج رات میں اسی مسہری پر سوؤں گا۔'' ہیری نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ اس کے لہجے سے پختگی جھلک رہی تھی۔

میں نے حیرت سے ہیری کی طرف دیکھا۔ وہ ان لوگوں میں سے تھا جو ایک مرتبہ ارادہ کرلیں تو دنیا کی کوئی طاقت انہیں اس ارادے کی تکمیل سے باز نہیں رکھ سکتی تھی۔

میرے سمجھانے پر بھی وہ اپنی بات پر ڈٹا رہا۔ بڑی مشکل سے ہم دونوں نے اس مسہری کو گودام سے نکالا اور اس کمرے میں پہنچا دیا جو عارضی طور پر میری خواب گاہ میں تبدیل کردیا گیا تھا۔ کمرے میں موجود تمام سامان نکال دیا گیا۔ کیونکہ مسہری اتنی بڑی تھی کہ پورے کمرے میں سما گئی تھی اور اب اس کمرے میں کوئی اور چیز رکھنے کی گنجائش نہیں رہی تھی۔ بوڑھا فینی اور اس کی نوجوان پوتی صوفیہ نے ہمارے اس عمل کو حیرت سے دیکھا تھا لیکن وہ کچھ بولے نہیں تھے اور نہ ہی انہوں نے اس سلسلے میں ہماری مدد کی تھی۔ میں یہ محسوس کیے

بغیر نہ رہ سکا کہ وہ مسہری کے قریب آنے سے کترا رہے تھے۔

مسہری بے حد بھاری تھی۔ اسے اٹھانے' رکھنے میں میرا سانس بے ترتیب ہوگیا تھا۔ جب میرا سانس معمول پر آیا تو میں نے لالٹین کی روشنی میں مسہری کو غور سے دیکھنے کے لیے اس کے چاروں طرف چکر لگایا۔ روشنی میں مسہری پر نقش کی جانے والی شکلیں زیادہ خوفناک معلوم نہیں ہورہی تھیں۔

❀......❀......❀

ذرا دیر بعد ہی صوفیہ نے کھانے کے لیے ہمیں نیچے بلا لیا۔ کھانے کی میز باورچی خانے میں لگائی گئی تھی۔ کھانے کے دوران' ہم تینوں ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے۔ میں اب مسہری کو قطعاً فراموش کرچکا تھا۔ کھانے سے فراغت پاتے ہی ہیری نے بلند آواز میں اعلان کیا۔ ''آج رات میں اسی مسہری پر سوؤں گا۔''

صوفیہ نے جلدی سے مڑ کر ہیری کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ زرد پڑ گیا تھا۔ ''نہیں مسٹر ہیری۔'' وہ چلائی۔ ''شاید تم مذاق کررہے ہو؟''

''نہیں' یہ مذاق نہیں ہے۔'' ہیری نے زوردار قہقہہ لگایا' ''لیکن تم نے ایسی بات کیوں کہی؟ کیا تم بھی اس مسہری سے خوفزدہ ہو؟''

صوفیہ کچھ دیر اس کی طرف دیکھتی رہی پھر تیزی سے اس کی طرف بڑھی اور میز کے کنارے' دونوں ہتھیلیاں ٹکا کر کھڑی ہوگئی۔ میں ہی نہیں بلکہ تمام گھر والے اس سے ڈرتے ہیں اور اس پر بنی ہوئی تصویروں سے خوفزدہ ہیں۔ ایک دفعہ ایک فرانسیسی راہب نے اسے دیکھ کر کہا تھا۔ کہ یہ آسیب زدہ ہے اور جو بھی اس پر سوئے گا۔ بدروحوں کا شکار ہوجائے گا۔'' وہ کچھ دیر کے لیے خاموش ہوئی پھر دوبارہ بولی۔ ''مسٹر ہیری! میں آپ کو یہ مسہری خریدنے سے منع نہیں کرتی لیکن پلیز اس پر سونے کا ارادہ ترک کردیں۔ میرا دل گواہی دیتا ہے کہ اس پر سونا آپ کے لیے بہتر نہیں ہوگا۔''

مجھے صوفیہ کی باتیں سن کر یقین ہوگیا کہ ہیری کا ارادہ بدل جائے گا اور وہ مسہری پر سونے کا ارادہ ترک کردے گا لیکن میرا یہ یقین باطل ہی ثابت ہوا تھا۔

''تمہاری باتوں نے میرے ارادے کو اور مضبوط کردیا ہے۔'' ہیری نے کہا۔ ''میں آسیب وغیرہ پر بالکل یقین نہیں رکھتا۔ یہ سب پرانے زمانے کی باتیں ہیں۔ دیکھ لینا' میں تم لوگوں سے زیادہ آرام سے رات گزاروں گا۔''

صوفیہ نے مزید کچھ کہنا مناسب نہیں سمجھا۔ وہ خاموش ہوگئی تھی۔ رات کے ساڑھے نو بجے' تو ہم دونوں اوپری منزل پر چلے گئے۔ جہاں ہمارے لیے سونے کا بندوبست کیا گیا تھا۔ ہیری کی خوابگاہ کا دروازہ بند تھا' اس نے دروازہ کھولا اور اندر چلا گیا۔ میں بھی اپنے کمرے میں چلا آیا اور کپڑے بدل کر بستر پر لیٹ گیا۔ نیند نے فوراً ہی مجھ پر غلبہ پالیا تھا۔

❀......❀......❀

میری آنکھ یکایک ہی کھل گئی تھی۔ ایک عجیب خوفناک آواز تھی جو میری سماعت سے ٹکرائی تھی۔ میں کانپتا ہوا اٹھ کر چارپائی پر بیٹھ گیا۔ آواز ابھی تک آرہی تھی جیسے کوئی کراہ رہا ہو لیکن یہ کسی انسان کی آواز نہیں تھی۔ میں اپنی تمام قوت مجتمع کرکے چارپائی سے اٹھا۔ لالٹین جلائی اور ننگے پاؤں باہر نکل آیا اب کراہنے کی آواز بند ہوچکی

تھی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ ہیری کے کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور مسہری خالی پڑی تھی۔

میں لالٹین ہاتھ میں لیے زینے کی طرف بڑھا اور پھر فوراً ہی نیچے اتر گیا۔ چونکہ میں گھر کے راستوں سے اچھی طرح واقف نہیں تھا اس لیے مجھے اتنا بھی نہ معلوم ہوسکا کہ میں باورچی خانے کی طرف جارہا ہوں۔ اب کسی قسم کی آواز نہیں آرہی تھی ہر طرف مکمل تاریکی اور اعصاب شکن خاموشی مسلط تھی۔ لالٹین کی مدھم روشنی میں، میں صرف چند قدم تک دیکھ سکتا تھا۔ میرے کان کوئی آواز سننے سے معذور تھے لیکن میری چھٹی حس بتارہی تھی کہ نیچے تاریکی کے گہرے پردے میں کوئی دبے پاؤں چل رہا ہے۔

زینے سے اترتے ہی فرش سے میرے قدم ٹکرائے۔ میں نے ادھر ادھر دیکھا۔ سامنے ہی ایک کمرے کا بند دروازہ نظر آیا۔ میں نے آگے بڑھ کر اسے کھول دیا۔ لالٹین کی روشنی میں، میں نے اندر جھانکا۔ یہ باورچی خانہ تھا۔ سامنے ہی فرش پر صوفیہ کا کتا خون میں لت پت پڑا تھا۔ شاید اسی کی چیخ سے میری آنکھ کھل گئی تھی۔ یہ منظر میرے لیے قطعی غیر متوقع تھا۔ میرے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ اس سے بھی زیادہ خوفناک بات یہ تھی کہ اسی باورچی خانے کے ایک کونے میں ہیری کھڑا مجھے گھور رہا تھا۔ اس کے سیدھے ہاتھ میں ایک بڑا سا چاقو تھا جس سے خون کے قطرے ٹپک رہے تھے۔

ہیری کا چہرہ اس قدر خوفناک دکھائی دے رہا تھا کہ مجھے اپنے جسم میں دوڑتا خون منجمد ہوتا محسوس ہوا۔ اس کی آنکھیں پھیل گئی تھیں۔ بھنویں تنی ہوئی تھیں۔ ہونٹ نیچے کی طرف لٹکے ہوئے تھے اور نتھنوں سے عجیب طرح کی غیر مانوس آوازیں خارج ہورہی تھیں۔ ایک لمحے کے لیے ہماری نظریں متصادم ہوئیں اور وہ تیزی سے میری طرف لپکا۔ اس کی آنکھوں میں میرے لیے شناسائی کی کوئی رمق نہیں تھی، وہ غصے سے پاگل ہو رہا تھا اور مجھے قتل کردینا چاہتا تھا۔

میں نے لالٹین نیچے رکھ دی اور چاقو چھیننے کے لیے اس کی طرف جھپٹا۔

عام حالات میں ہیری کو قابو کرلینا میرے لیے مشکل نہیں تھا۔ وہ دبلا پتلا سا آدمی تھا مگر اس وقت اس کے جسم میں نہ جانے کہاں سے اس قدر طاقت آگئی تھی کہ مجھے، اسے سنبھالنا مشکل ہوگیا۔ اس نے ایک ہاتھ سے میرا گلا دبوچ لیا اور چاقو والا ہاتھ میرے حلقوم کی طرف بڑھایا۔ مجھے سانس لینا دوبھر ہوگیا تھا۔ موت سامنے کھڑی نظر آرہی تھی۔ مجھے مرنے کا دکھ نہیں تھا، افسوس صرف اس بات کا تھا کہ وہ میرے عزیز دوست ہیری کے روپ میں آئی تھی۔

دفعتاً سیڑھیوں پر کسی کے بھاگنے کی آواز آئی پھر کسی نے زور سے چیخ ماری۔ اس اثناء میں ہیری مجھ پر چاقو کا وار کرنے کے لیے ہاتھ بلند کرچکا تھا۔ قریب تھا کہ چاقو میرے نرخرے میں اتر جاتا، ایک دھماکا ہوا اور وہ تیورا کر فرش پر گر پڑا۔ بندوق کی گولی، اس کی پشت میں گھس کر دل کے اندر اتر گئی تھی۔

میں حیران ہوکر دروازے کی طرف پلٹا ۔صوفیہ ایک پرانی ساخت کی بندوق لیے دروازے میں کھڑی تھی اور اس کی نالی سے ابھی تک دھواں نکل رہا تھا۔

''میں نے اسے گولی ماردی ہے۔'' وہ ہیجانی انداز میں چیخی۔ اس کے سینے کا تموج بڑھ گیا تھا۔ ''میں نے اسے ماردیا ہے۔ اس کا مرجانا ہی بہتر تھا ورنہ یہ ہم سب کو مار ڈالتا۔''

میں بے تاب ہوکر، ہیری پر جھک گیا۔ وہ مرا نہیں تھا۔ لیکن مرنے والا تھا۔ اس نے اٹکتے لہجے اور خون تھوکتے انداز میں بتایا کہ مسہری پر سونے کے بعد اور گولی لگ کر فرش پر گرنے سے پہلے کا اسے کچھ علم نہیں...... جب میں نے اسے بتایا کہ اس نے صوفیہ کے کتے کو چاقو سے مار ڈالا ہے اور مجھ پر بھی قاتلانہ حملہ کیا تھا تو وہ حیران نظروں سے مجھے گھورنے لگا۔

''مجھے نہیں معلوم۔'' وہ جھنجلا اٹھا۔ ''وہ کون سی پراسرار طاقت تھی جو مجھے کھینچ کر باورچی خانے میں لے گئی تھی اور کس شیطانی قوت نے چاقو میرے ہاتھ میں دے دیا تھا؟'' یہ کہتے ہی ڈھیر سارا خون اس کے منہ سے نکل کر اس کی باچھوں کے گرد پھیل گیا۔ ہیری کو مرتے دیکھ کر میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اس نے میرے سامنے ہی دم توڑ دیا تھا۔

اسی وقت پولیس آگئی۔ صوفیہ حراست میں لے لی گئی...... اور ہیری کی لاش پوسٹ مارٹم کے لیے بھیج دی گئی۔ میرے ذہن میں لینا کس کا چہرہ ابھر آیا...... تو کیا وہ بھی ہیری کی طرح بے گناہ تھا؟ اور کیا بارٹن خاندان کے تمام افراد اسی طرح لاعلمی میں قتل جیسے سنگین جرم کے مرتکب ہوئے تھے؟ کیا وہ سب بے گناہ تھے؟ اس سے آگے میں کچھ نہ سوچ سکا۔ مجھے چکر آگئے تھے۔ میں لہرایا اور فرش پر گر کر بے ہوش ہوگیا۔

❀......❀......❀
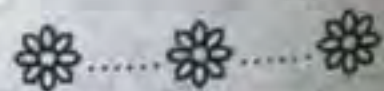
اب میرے لیے نیویارک لوٹنے سے پہلے صرف ایک ہی کام باقی رہ گیا تھا اور وہ تھا، شیطانی مسہری کو ٹھکانے لگانا۔ میں نے فینی کے ساتھ مل کر اسے کلہاڑی سے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا اور دوپہر کے وقت، کھلے میدان میں ان ٹکڑوں کو آگ کی نذر کردیا تاکہ وہ پھر کسی بے گناہ پر اپنا مہیب اثر نہ ڈال سکے۔

میں اور فینی بارٹن، دونوں خاموشی سے مسہری کے ٹکڑوں کو آگ میں جلتا دیکھ رہے تھے۔ زمین سے اوپر کی جانب اٹھتے، لپکتے شعلوں نے ان ٹکڑوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ جب میں نے بھیانک، شیطانی چہروں والے حصے کو آگ میں پھینکا تو میرے ہاتھ کانپ اٹھے۔ رقصاں شعلوں میں سے ابھی تک وہ خوفناک شکلیں مجھے گھور رہی تھیں۔ ان کی آنکھیں جیتے جاگتے انسانوں کی طرح نظر آرہی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ شعلوں سے بچ نکلنے کی کوشش کررہی ہوں۔ میری سماعت میں یکایک ہی ہولناک چیخیں بھر گئیں۔

جب میں نے پائنتی کے تختے کو پٹیوں سے الگ کیا تو مجھے اس تختے پر عجیب، بے ڈھنگے حروف ابھرے نظر آئے۔ میری نگاہ ان حروف پر جم گئی، لکھا تھا، ''جس شخص نے اس مسہری پر نقش ابھارے ہیں، اس کے ہاتھ تازہ انسانی خون سے لتھڑے ہوئے تھے اور جو کوئی بھی اس پر لیٹے گا وہ ایسے ہی حالات سے دوچار ہوگا۔'' میرے جسم میں دہشت کی لہر دوڑ گئی۔ میں نے گھبرا کر وہ تختہ بھی آگ میں پھینک دیا۔ چند لمحوں بعد، سوائے راکھ کے ڈھیر کے اور کچھ بھی نہیں بچا تھا۔

○

قسط نمبر 18

شہناز بانو

دنیا میں فساد کا محرک زن' زر' زمین رہی ہے۔ دنیا کا پہلا قتل بھی عورت ہی کی وجہ سے ہوا تھا۔ یہ نیا سلسلہ وار ناول ہمارے موجودہ دور کی کہانی ہے۔ اس کے بیشتر کردار ابھی تک بقید حیات ہیں۔ کچھ اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کرچکے ہیں۔ جب کہ بعض کے دامن میں صرف پچھتاوے باقی رہ گئے ہیں اور وہ چاہتے ہوئے بھی اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کرنے سے قاصر ہیں۔ وقت کی گرد نے ان کی شناخت تک گم کردی ہے۔

اس داستان میں محبت اور نفرت کے تمام رنگ اپنی پوری شدت کے ساتھ موجود ہیں۔ کہیں مجبوری' بے بسی اور مفلسی کی سسکیاں سنائی دیتی ہیں تو کہیں جابروں اور ظالموں کے سماعت شکن قہقہے گونجتے ہیں۔ کہیں قانون اپنے روایتی انداز میں مظلوموں کی عزت و جان سے کھیلتا نظر آتا ہے تو کہیں جابروں کی دہلیز پر ماتھا ٹیکتا دکھائی دیتا ہے۔

تحیر اور ایکشن پسند قارئین کے لئے نئے افق کی تحیر خیز سلسلے وار کہانی

خرم نے اپنی باتوں کے درمیان جس شخص کا نام لیا تھا اسے سن کر مجھے اپنے جسم سے چنگاریاں سی پھوٹتی ہوئی محسوس ہوئی تھیں میری اور رضوان کی نگاہیں ایک لمحے کو چار ہوگئیں اور ہم نے نگاہوں ہی نگاہوں میں ایک دوسرے کو پیغام دیا کہ ہمیں خرم کی یہ آفر قبول کرلینی چاہیے۔ ہم دل سے تسلیم کرچکے تھے کہ خرم کا گروہ واقعی بہت بڑا ہے۔

''تم سوچ رہے ہوگے شمروز کہ میں بھی کیا الجھی الجھی باتیں کررہی ہوں۔ تو اب میں تمہیں شروع سے بتاتی ہوں کہ خرم نے ہم سے کیا باتیں کیں۔''

اس نے بتایا۔

''میں نے تم لوگوں کے مطابق باس سے بات کی تھی تب باس نے تم لوگوں کا سارا بایوڈیٹا معلوم کروایا اور ہمیں تمہارے بارے میں سب کچھ پتا چل گیا۔

''میڈم روزی۔'' اس نے میری جانب رخ پھیرتے ہوئے کہا۔ ''تمہارا اصل نام رومانہ ہے۔ تم منظور کالونی میں ایک چھوٹے سے گھر میں ا... والدین اور پانچ چھوٹی بہنوں اور ایک بھائی ... ساتھ رہتی تھیں۔ تمہارے والد مظہر حسین اسٹیل ... میں کام کرتے تھے تم مسٹر ہمدانی کے بچوں کو ٹیو... پڑھانے جاتی تھیں پھر مسز ہمدانی ایک دن تمہیں ا... عیاش آدمی نواب سطوت کے حوالے کر... آگئیں۔ وہاں سے تم رضوان کے ہاتھ لگ گئیں... ابھی حال ہی میں ہمدانی کی بیٹی کے اغوا کے سلسلے ... بھی ہمیں تمہارا ہاتھ نظر آرہا ہے اور اس اغوا کے پیچ... صرف اور صرف تمہارا انتقام پوشیدہ ہے۔ کیونکہ... صرف ایک اغوا برائے تاوان نہیں تھا۔ اس بچی کا ... حشر تم نے کروایا ہے وہ کسی اندھے انتقام کو ظاہر کر... ہے۔ شاید تمہیں یہ ابھی معلوم نہیں ہوا ہے کہ ابھی ... دیر قبل اس بچی کی ڈیتھ ہوگئی ہے۔''

عریشہ کی موت کی خبر سن کر رضوان نے چونک ... میری جانب دیکھا تو میں نے بڑے سفاک ...

میں کہا۔

''یہ تو اچھا نہیں ہوا۔ اس کو زندہ رہنا چاہیے تھا تاکہ اس کو دیکھ دیکھ کران کا زخم تازہ رہتا۔ وہ مرگئی ہے تو کچھ دن بعد انہیں صبر بھی آجائے گا۔''

میری بات سن کر خرم نے بہت غور سے میری جانب دیکھا اور مسکراتے ہوئے بولا۔

''اگر ایک بہت طاقت ور شخص کا ساتھ مل جائے اور ساتھ ہی وہ نواب سطوت کا دشمن بھی ہو تب تمہارا فیصلہ کیا ہوگا؟''

اور نواب سطوت کا نام سنتے ہی میرے اور رضوان کے منہ سے ایک ساتھ نکلا تھا کہ ''ہمیں منظور ہے۔''

خرم نے مزید تفصیلات بتاتے ہوئے کہا۔

''میرے باس کا نام ''نواب جمشید لودھی'' ہے اور وہ نواب سطوت کے چچازاد بھائی ہیں اور وہ جمشید پور کے مالک ہیں۔ ان کی آپس کی دشمنی کی بہت سی وجوہات ہیں۔ بظاہر کوئی خاص دشمنی نہیں ہے لیکن در پردہ وہ ایک دوسرے کے جانی دشمن ہیں۔ باس نے جب تمہارے بارے میں سنا تو فوراً کہا کہ تمہیں بلوایا جائے اب بتاؤ کہ تم لوگ باس سے ملنے کے لیے کب چلو گے میرا خیال ہے کہ کل ہی چلتے ہیں۔''

خرم نے بتایا تو میں مزید ہزار جان سے تیار ہوگئی۔

خرم چلا گیا تو میں اور رضوان دیر تک آپس میں تبادلہ خیال کرتے رہے۔ میں نے رضوان کا تہہ دل سے شکریہ ادا کیا کہ وہ میری خاطر تیار ہوگیا۔ رضوان نے یہ بھی کہا کہ صرف تمہاری خاطر میں نے ان لوگوں میں شامل ہونے کا فیصلہ کیا ہے تاکہ تم نواب سے اپنے اوپر ہونے والے ظلم کا انتقام لے سو اور اس کام کی تکمیل کے لیے تمہیں نواب جمشید لودھی کے گروہ میں شامل ہوکر ہی بہترین مواقع مل سکتے ہیں۔

دوسرے دن وقت طے کرکے میں اور رضوان نواب جمشید کی کوٹھی پر اس سے ملنے کے لیے گئے یہ بھی کلفٹن کے علاقے میں ہی تھی۔ تین سال کے عرصے میں' میں نے اپنی شخصیت اور حلیے کو اتنا زیادہ تبدیل کرلیا تھا کہ اگر میری بہنیں اور بھائی مجھے دیکھتے تو وہ بھی میڈم روزی کو رومانہ کی حیثیت سے شناخت نہیں کرسکتے تھے۔ اپنے گھر سے اس رات چپ چاپ نکل آنے کے بعد سے میرا کسی سے رابطہ ہی نہیں ہوسکا تھا نہ میں نے کسی کی شکل دیکھی تھی اور نہ کسی نے میری۔ مجھے تو یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ وہ لوگ اب کہاں رہ رہے ہیں اور نہ میں نے یہ معلوم کرنے کی کوشش کی حالانکہ اگر میں چاہتی تو یہ کام میرے لیے کوئی مشکل نہیں تھا۔

لیکن میں نے ایسا اس لیے نہیں کیا کہ اگر مجھے معلوم ہوگیا کہ وہ لوگ کہاں رہ رہے ہیں تو میں اپنی محبت سے مجبور ہوکر کہیں پھر نہ اس گھر پہنچ جاؤں۔ بس کبھی کبھار جب رات کی تنہائی میں سب کی یاد بہت زیادہ ستاتی تو ان کے لیے دل سے دعائیں کیا کرتی۔

''تم یہ بات تو اچھی طرح سے جانتے ہی ہوگے شمروز کہ اپنوں کی محبت کبھی بھی دل سے جدا نہیں ہوتی۔''

''ہاں! یہ تو تم بالکل ٹھیک کہہ رہی ہو اس وقت بھی نہیں جب آپ کو یہ معلوم ہو کہ وہ سب اب اس دنیا میں نہیں رہے تب بھی۔'' میں نے ایک گہری سانس اپنے اندر اتارتے ہوئے کہا۔ ''اچھا یہ تو بتاؤ کہ لودھی سے تمہاری پہلی ملاقات کیسی رہی۔'' میں نے دوبارہ اس کی کہانی کی جانب آتے ہوئے کہا۔

''ہاں تو جب ہم نے لودھی سے ملاقات کی تو اس کی شکل وصورت میں مجھے نواب کی ایک جھلک دکھائی دی اور میری آنکھوں کے تاثرات بدلنے لگے۔ اسے دیکھ کر بہت سے دردناک لمحات مجھے یاد

آنے لگے۔

اس نے میری جانب دیکھا اور مسکراتے ہوئے بولا۔ "تمہیں سطوت کا خیال آیا ہے نا۔ یقیناً تمہاری بہت سی تلخ یادیں تازہ ہوگئی ہوں گی۔ دراصل ہمارا خون ایک ہی ہے اور ہم ایک دادا کی اولاد ہیں۔ اس لیے لازمی ہمارے اندر ایک دوسرے کی شباہت موجود ہے لیکن ایک بات تو طے ہے کہ وہ مجھ سے زیادہ ہینڈسم اور اسمارٹ ہے اور اسے اپنی لچھے دار گفتگو کے ذریعے لوگوں کو شیشے میں اتارنے کا فن خوب آتا ہے۔ تم بے فکر رہو میں تمہارے دکھ میں تمہارے ساتھ ہوں اور تمہیں انتقام لینے کا بھی پورا پورا موقع فراہم کروں گا۔ مجھے اپنے کام کے لیے تمہارے جیسی حسین اسمارٹ اور ذہین عورت کی ضرورت تھی۔ خرم نے تمہاری بہت تعریف کی ہے اور مجھے اس کی نگاہوں پر پورا بھروسا ہے اس کا انتخاب کبھی غلط نہیں ہوتا۔" لودھی کی باتیں سن کر میرے اندر کا تناؤ جو میرے چہرے پر بھی ظاہر ہوگیا تھا۔ کافی حد تک کم ہوگیا اس نے مجھ سے ایک بات اور کہی۔

"دیکھو روزی میں تمہیں ایک مشورہ دینا چاہتا ہوں تمہارے اندر بہت سی خوبیاں ہیں اور بھی مزید ہوں گی جن کا مجھے علم نہیں ہے لیکن ایک کمزوری ہے۔"

اس کی بات سن کر میں چونک پڑی کہ اس نے ذرا سی دیر میں میرے اندر کون سی کمی تلاش کرلی اس لیے پوچھا۔

"کون سی کمی۔"

"تمہیں اپنے چہرے کے تاثرات کو ہمیشہ کنٹرول میں رکھنا ہوگا۔ ہماری لائن میں یہ بہت ضروری ہے۔ تمہارے جذبات فوراً تمہارے چہرے پر ظاہر ہوجاتے ہیں جیسے کہ اس وقت مجھے دیکھ کر تمہیں سطوت کا خیال آ گیا اور تمہارے چہرے پر ناگواری کے تاثرات پوری طرح ابھر آئے۔ جو میں نے فوراً محسوس کرلیے۔ کبھی بھی اپنے دلی جذبات اپنے چہرے سے عیاں نہ کرو۔ انہیں اپنے کنٹرول میں رکھوگی تو میرا خیال ہے تم زیادہ کامیاب رہوگی۔ جلدی غصے میں مت آؤ چہرے پر ایک نرم مسکراہٹ رکھو۔" اتنا کہہ کر وہ مسکرانے لگا۔

"جی بہت بہتر آپ کا شکریہ کہ آپ نے میری خامی کی نشاندہی کی۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"گڈ۔" اس نے جواباً کہا۔

اور میں یوں لودھی کے گروہ میں شامل ہوگئی۔ رفتہ رفتہ مجھے اس کے تمام کاروبار کے بارے میں معلوم ہوتا چلا گیا۔ میرے اپنے گروہ کے بھی سارے بندے ہمارے ساتھ ادھر ہی شامل ہوگئے۔ ہمیں کام کرنے کے لیے ایک وسیع نیٹ ورک مل گیا۔

لودھی کے کاموں کے سلسلے میں میں دوسرے بہت سے ممالک میں بھی گی اب میری پوزیشن کافی اوپر تک آ گئی تھی۔

ایک بات جو میں نے محسوس کی کہ رضوان یہاں آ کر زیادہ خوش نہیں تھا کیونکہ خرم زیادہ تر اپنے ہر کام میں مجھے شامل رکھتا تھا اور رضوان کو یہ بات پسند نہیں تھی۔

ایک دن تو باتوں باتوں میں خرم نے مجھ سے راز اگلوا لیا کہ میں رضوان کو دل سے پسند کرتی ہوں اور یہی میری بہت بڑی غلطی تھی کہ میں نے اپنی محبت کا اعتراف خرم کے سامنے کردیا۔

اور پھر ایک واردات میں رضوان پولیس کی گولی کا نشانہ بن گیا۔ مجھے اس بات پر شدید حیرت تھی کہ رضوان پولیس کی گولی کا کیسے نشانہ بن گیا۔ اس کے سینے پر پورا برسٹ لگا تھا اور وہ موقع پر ہی ختم ہوگیا۔ مجھ سے کچھ کہا نہ سنا اور چپ چاپ جس طرح میری زندگی میں آیا تھا اسی طرح خاموشی سے نکل گیا۔

میں نے ہفتوں رضوان کی موت کا سوگ منایا۔ ان دنوں خرم نے میری بہت دل جوئی کی اس نے ایک عجیب سی بات کہہ کر مجھے چونکا دیا وہ بولا۔

"تم خوامخواہ اس کی موت کا سوگ منا رہی ہو وہ تمہاری محبت کے قابل تھا ہی کہاں اُسے تو کبھی نہ کبھی اسی طرح مر ہی جانا تھا۔"

"یہ تم کیسی باتیں کررہے ہو میں یہ بات اچھی طرح سے جانتی ہوں کہ "کام" سے پہلے ہماری ہمیشہ پولیس سے سیٹنگ ہوتی ہے۔ پولیس نے کبھی بھی مداخلت نہیں کی تو اس روز کیا ہوا تھا۔" میں نے اسے مشکوک نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "اور اس کام کی پلاننگ بھی تمہاری ہی تھی اور رضوان کو وہاں بھیجنے کا فیصلہ بھی تمہارا ہی تھا۔ کیا تم نے اس بات کا خیال نہیں رکھا تھا۔"

"کبھی کبھار سب الٹ بھی ہوجاتا ہے ہمارا واسطہ کچھ ان سر پھرے پولیس والوں سے بھی پڑ جاتا ہے جن کے پیٹ میں ایمانداری کے مروڑ اٹھتے ہیں۔ ایسا ہی کچھ اس روز بھی ہوا ہوگا۔" خرم نے بے پروائی سے کندھے اچکاتے ہوئے جواب دیا۔

اور اس رات خرم کے بارے میں یہ ساری باتیں سوچتے ہوئے میں اس نتیجے پر پہنچی کہ رضوان کی موت میں خرم کا درپردہ ہاتھ ہے۔

میں خرم سے کھنچی کھنچی رہنے لگی۔ تب ہی ایک دن خرم نے مجھے بتایا کہ ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ سطوت کو ایک کام کے سلسلے میں کہیں جانا ہے اور اس کی گاڑی جس گلی سے گزرے گی وہ علاقہ کافی سنسان ہے اور وہاں پرانی عمارت کے کھنڈر بھی ہیں۔ قریب ہی کچی آبادی بھی موجود ہے۔ میں نے اس جگہ کا جائزہ لیا ہے اگر تم چاہو تو اس موقع کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنا انتقام لے سکتی ہو۔"

"وہ کس طرح؟" میں نے سب پچھلی باتیں فی الحال بھلا کر دلچسپی سے پوچھا۔

"میں تمہیں آج ہی وہ جگہ دکھا کر لاؤں گا کہ جہاں سے تم بیٹھ کر نشانہ لے سکتی ہو۔ سب سے اچھی بات تو یہ ہے کہ سڑک آبادی سے فاصلے پر واقع ہے لیکن ہمارے پاس اس کے سارے انتظامات موجود ہیں۔ یہ بتاؤ تمہیں اپنے نشانے پر بھروسا ہے نا۔" اس نے جواب دیا۔

"خیر میں اپنے بارے میں یہ دعویٰ تو نہیں کرسکتی کہ میں نے نشانے بازی میں مہارت حاصل کررکھی ہے لیکن پھر بھی اگر میں اپنے دشمن کو سامنے دیکھوں گی تو میری تمام تر صلاحیتیں عروج پر ہوں گی۔ اتنا مجھے یقین ہے۔" میں نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے کہا۔

"میں بھی تمہارے ساتھ موجود رہوں گا۔ تم فکر نہ کرو۔" اس نے کہا۔

"نہیں۔" میں نے قطعی لہجے میں کہا۔ "اس ابن ابلیس کے لیے میں تنہا ہی یہ کام انجام دے لوں گی۔"

"جیسی تمہاری مرضی۔" اس نے کندھے اچکائے۔ "پھر کیا خیال ہے آج ہی چلیں۔"

"بالکل! اس کام کے لیے تو میں اینی ٹائم تمہیں تیار ملوں گی۔" اور یہ بات کہتے ہوئے میرا چہرہ سرخ اور آنکھیں خون رنگ ہوگئیں۔ ہاتھوں کی مٹھیاں اور جبڑے بھینچ گئے۔

"ریلیکس ڈیئر، تم اپنے آپ کو نارمل رکھوگی تب ہی آسانی سے اپنا ہدف پورا کرسکوگی۔" اس نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام کر مسلتے ہوئے کہا اور میں نے اس کی آنکھوں میں کوئی اور ہی رنگ دیکھتے ہوئے تیزی کے ساتھ اپنے ہاتھ کھینچ لیے اور وہ مسکرا دیا۔

پھر میں خرم کے ساتھ اس علاقے کے سروے

کے لیے گئی اور اس علاقے کے کئی چکر لگائے میں جانتی تھی کہ نواب سطوت کوئی معمولی آدمی نہیں ہے پولیس اسکواڈ اس کے ساتھ ساتھ چلتی ہے اور اس کے علاوہ اس کا محافظ دستہ الگ ہوتا ہے۔ اس کی جانب صرف ایک ہی فائر ہے وہ چوکنا ہو کر پورے علاقے میں پھیل جائے اور اس شخص کو ڈھونڈ نکالے۔

یہاں پر کچی آبادی تھی تنگ تنگ پتلی گلیاں تھیں جن میں دونوں طرف مکانات تھے۔ ہم ٹہلتے ہوئے ایک گلی میں جا نکلے۔ اس وقت ہم دونوں ہی نے اپنے حلیے تبدیل کر لیے تھے گلی میں ہمیں ایک بہت ہی خستہ حال دو منزلہ مکان نظر آیا۔ اس کے دروازے پر تالا پڑا ہوا تھا۔ خرم نے اشارے سے مجھے بتایا کہ یہی وہ مکان ہے جہاں بیٹھ کر تمہیں کارروائی کرنی ہے۔

"لیکن یہ تو آبادی میں ہے اور کام کے بعد یہاں سے نکلنا۔" میں نے ارد گرد دیکھتے ہوئے کہا تو اس نے میرا ہاتھ تسلی کے انداز میں دبایا اور سامنے دکھائی دینے والی ایک چھوٹی سی مٹھائی والے کی دکان تھی وہ اس کے پاس پہنچا اور بولا۔

"کیوں بھائی یہ جو کونے والا مکان ہے جس میں تالا لگا ہوا ہے کیا یہ کرائے کے لیے خالی ہے۔"

"نہیں بھائی صاحب۔" اس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ "یہ کرائے کے لیے نہیں ہے، بہت پہلے اس میں کرائے دار رہتے تھے مگر یہ مکان بہت پرانا ہے اور ٹوٹ پھوٹ بھی گیا ہے اور یہ بھی سنا تھا کہ اس مکان میں بھوت پریت نے قبضہ جما لیا ہے۔ اب تو کوئی دن میں بھی اس طرف نہیں آتا۔ کرائے دار اسی لیے یہاں سے ڈر کر بھاگ گئے اور مالک لوگ بھی اس کو اب کرائے پر نہیں اٹھائیں گے کیونکہ سب ہی لوگ اس مکان کی حقیقت سے واقف ہو چکے ہیں۔"

"اچھا۔" خرم نے چہرے پر شدید مایوسی کے تاثرات پیدا کرتے ہوئے کہا۔ "میں تو سمجھا تھا کہ کرائے کے لیے خالی ہوگا۔ خیر اگر کوئی اور مکان ہو تمہاری نگاہ میں تو ضرور بتانا۔ میں ادھر چکر لگاتا رہوں گا۔"

"ہاں مکان ہے نا ادھر دو گلی چھوڑ کر بنّن بھائی کا مکان ہے مشہور آدمی ہیں تم کسی سے بھی پوچھ لینا وہ تمہیں ان کا گھر بتا دیں گے۔ دو منزلہ مکان ہے اچھا بنا ہوا ہے۔ اوپر خود رہتے ہیں اور نیچے کی منزل کرائے پر چڑھانا چاہتے ہیں۔ آپ ان سے ضرور مل لو۔"

پھر مٹھائی والے نے مزید کئی خوبیاں اس مکان کی گنوا دیں۔ ایسا لگ رہا تھا کہ وہ مکان کرائے پر دلوانے والا کوئی کمیشن ایجنٹ ہے۔

"اچھی بات ہے بھائی، تمہارا بہت بہت شکریہ۔ میں ضرور وہاں جاؤں گا۔" خرم نے اس سے ہاتھ ملایا اور میں ذرا ہٹ کر کھڑی تھی۔ میرے پاس آیا اور بولا۔

"تم نے ساری گفتگو سن لی اب تمہارا کیا خیال ہے؟"

"ٹھیک ہے واپس چلو۔" میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

"تم نے سنا وہ مٹھائی والا کیا کہہ رہا تھا کہ اس مکان میں بھوت پریت۔"

"بھوت پریت مائی فٹ۔" میں نے سخت لہجے میں کہا۔ "میں نے بہت بڑے بڑے انسان نما بھوتوں کا سامنا کیا ہے تو یہ ان دیکھی مخلوق میرا کیا بگاڑے گی۔"

دوسرے دن خرم نے بتایا کہ اگلے دن علی الصبح جب سورج پوری طرح نہیں نکلا ہوگا نواب کی گاڑی اس روڈ سے گزرے گی وہ بہت چالاک اور شاطر

آدمی ہے کبھی بھی ایک ہی راستے سے نہیں گزرتا اس مرتبہ اس نے یہ روڈ منتخب کیا ہے۔

"ٹھیک ہے آج رات میں اپنے سامان کے ساتھ اس مکان میں قیام کروں گی اور اپنا کام مکمل کر کے ہی لوٹوں گی۔" میں نے جواب دیا۔

اور پھر آدھی رات کو اپنا بھیس بدل کر میں وہاں موجود تھی۔ گلی سنسان پڑی تھی اور ایک مریل سا بلب ایک بجلی کے پول سے لٹکا ہوا تھا۔ جس کی زرد اور پر اسرار روشنی میں یہ سارا ماحول ایک دہشت پیدا کر رہا تھا لیکن میرے دل میں نواب سطوت کو موت کے گھاٹ اتارنے کے علاوہ اور کوئی خیال تک نہیں تھا۔

اس ٹوٹے اور شکستہ مکان میں داخل ہونا میرے لیے کوئی مسئلہ ثابت نہیں ہوا۔ میں نے اس کے دروازے پر لگے تالے پر طبع آزمائی کی کوئی کوشش نہیں کی کیونکہ ایک جانب سے دیوار کا کچھ حصہ ٹوٹا ہوا تھا اور میں اپنے دبلے پتلے جسم کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے سامان سمیت اس کے اندر داخل ہو گئی۔ روشنی کے لیے میرے پاس ٹارچ موجود تھی۔

اندر داخل ہو کر میں نے مکان کا اچھی طرح سے جائزہ لیا جیسا کہ مٹھائی والے نے کہا تھا۔ مکان واقعی بہت ہی خستہ حالت میں تھا اور رہنے کے قابل نہیں تھا۔ یہ اسی قابل تھا کہ اسے گرا کر دوبارہ سے تعمیر کیا جائے۔

میں خستہ حال سیڑھیوں پر بہت آہستگی سے قدم رکھتی ہوئی اوپر کی منزل پر پہنچ گئی۔ اس منزل کی حالت نیچے سے بھی زیادہ خراب تھی۔

مکان کی نچلی منزل میں دو عقبی دروازے تھے۔ ایک دروازہ اندر صحن میں کھلتا تھا اور ایک گلی میں مکان کی پچھلی جانب بھی ایک پتلی سی گلی تھی۔ جسے عرف عام میں گندی گلی کہا جاتا ہے یہاں بھی ایک دروازہ تھا۔

اوپر کی منزل میں بھی دو کمرے تھے جو سامنے کے رخ پر تھے اور ان میں موجود کھڑکیاں سامنے والی گلی میں کھلتی تھیں۔ باقی کمروں کی کھڑکیاں گندی گلی کی سائیڈ میں کھل رہی تھیں۔ یہ میرے کام کی نہیں تھیں کیونکہ سڑک سامنے والے حصے پر تھی اور نواب کی گاڑی کو ادھر سے ہی گزرنا تھا۔

کھڑکیوں کی چوکھٹیں اور پٹ وغیرہ بھی ٹوٹے ہوئے تھے اور اس میں لگی لوہے کی گرل بھی زنگ آلود اور خراب ہو رہی تھی۔ ایک کھڑکی میں ایک پھٹا پرانا اور بوسیدہ پردہ بھی لٹکا ہوا تھا۔

میں نے اپنے منصوبے پر عمل کرنے کے لیے اس کھڑکی کو منتخب کیا۔ یہ بہترین جگہ تھی اور میں یہاں چھپ کر اپنا کام بہت عمدگی سے انجام دے سکتی تھی۔ بس مجھے افسوس اور ملال اس بات کا ہو رہا تھا کہ کمینے نواب کو مرنے سے پہلے اس بات کا علم نہیں ہو سکے گا کہ اس کے لیے موت کا پروانہ لے کر آنے والی وہ دبو اور ڈرپوک لڑکی ہے، جس کو اس نے اپنی ہوس اور بربریت کا نشانہ بنایا تھا۔ بس خاموشی سے میری چلائی ہوئی گولی کھا کر ہمیشہ کے لیے جہنم واصل ہو جائے گا۔

اچانک مجھے مکان کی چھت پر ہلکی سی آہٹ محسوس ہوئی۔ مجھے لگا جیسے چھت پر کوئی موجود ہے۔ میں چونک گئی کہ میرے علاوہ کسی اور کو اس کھنڈر نما مکان میں کیا دلچسپی ہو سکتی ہے۔ پھر مجھے خیال آیا کہ کہیں خرم نے تو میرے ساتھ کوئی چال نہیں چلی کسی بھی وجہ سے، جس طرح اس نے رضوان کو ہلاک کروایا وہ مجھے بھی اپنے راستے سے ہٹانا نہیں چاہتا۔ کیونکہ میں نواب جمشید لودھی کی نگاہیں اس سے زیادہ اہمیت حاصل کر چکی تھی اور شاید یہ بات

اسے ہضم نہیں ہو رہی اور اس جگہ بہانے سے بلا کر وہ مجھے اپنے راستے سے ہٹانا چاہتا ہو۔

میں پوری طرح الرٹ ہوگئی اور جھٹ پستول ہاتھ میں لے کر تیزی سے ایک ٹوٹے ہوئے دروازے کی اوٹ میں ہوگئی۔ تب ہی میرے کانوں میں دو بلیوں کی بڑی خوف ناک آوازیں آنی شروع ہوگئیں۔ وہ ایک دوسرے سے لڑ رہی تھیں اور چھت پر شور مچا رہی تھیں۔ ان کی خوف ناک غراہٹوں سے فضا گونج رہی تھی۔ اس خوف ناک آواز کے علاوہ باقی چاروں جانب سناٹا ہی تھا۔

تب میں ریلیکس ہوگئی اور اپنے تنے ہوئے اعصاب کو ڈھیلا کرلیا۔ بلیوں کے کودنے کی وجہ سے چھت پر پڑا ہوا کاٹھ کباڑ ادھر ادھر ہوا ہوگا جس سے آواز پیدا ہوئی اور میں نے اتنی دیر میں نہ جانے کیا کیا سمجھ لیا۔

میں نے اس کھڑکی کے پاس جا کر اپنی جگہ سنبھال لی اس خالی مکان میں بیٹھنے کے لیے کوئی چیز نہیں تھی۔ مگر میں نے بہت تلاش کے بعد ایک ٹوٹا ہوا مونڈھا حاصل کرلیا اور اب میں اس کھڑکی کے پاس اس ٹوٹے ہوئے مونڈھے پر بیٹھی تھی۔

اس خستہ حال پرانے پردے میں جو کھڑکی پر پڑا تھا بہت سوراخ تھے اور یہ میرے لیے بہت سود مند تھے کہ اس پردے کو ہٹائے بغیر ان سوراخوں سے آنکھ لگا کر میں باہر کا سارا منظر باآسانی دیکھ سکتی تھی جب کہ کوئی مجھے باہر سے نہیں دیکھ سکتا تھا۔

میرے پاس اس وقت ایک لمبی نال والی گن تھی جو تین حصوں میں منقسم تھی اور جب اس کے تینوں حصوں کو جوڑ دیا جاتا تو یہ پوری گن تیار ہو جاتی اور استعمال کے بعد پھر اس کے تینوں حصوں کو علیحدہ کر کے کسی بھی تھیلے میں باآسانی ڈالا جا سکتا تھا اور کسی دوسرے دیکھنے والے کو یہ شک بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ اس میں کوئی گن بھی ہو سکتی تھی۔

صبح ہونے میں ابھی ٹائم تھا۔ اس لیے میں نے تھیلے سے گن کے حصے نہیں نکالے اور اطمینان سے بیٹھی رہی بلیوں کی آوازیں اب بھی آ رہی تھیں مگر دور سے۔ شاید وہ لڑتی ہوئی کسی اور چھت پر چلی گئی تھیں۔ چاروں جانب پراسرار سناٹے کا راج تھا۔ تب ہی مجھے مٹھائی والے کی کہی ہوئی بات کا خیال آ گیا اور بھوت پریت کا تصور کر کے مجھے ہلکا سا خوف بھی محسوس ہوا لیکن جلد ہی اس خوف پر جذبہ انتقام غالب آ گیا اور میں مطمئن ہوگئی۔

یہ بات سوچ کر میرے اوپر ابھی سے سرور طاری ہونے لگا تھا کہ اس ابن ابلیس کی زندگی بس تھوڑی دیر کی باقی ہے۔

رفتہ رفتہ رات ڈھلتی جا رہی تھی فجر کا وقت ہونے ہی والا تھا میں نے گھڑی میں ٹائم دیکھا اور تھیلے سے گن نکال کر اسے جوڑ کر پوری گن تیار کرلی۔ اس گن کے ساتھ میرے پاس دو چیزیں اور بھی تھیں ایک سائلنسر اور ایک دوربین یہ دونوں کے ساتھ مل کر ایک شاندار اور انتہائی قابل اعتماد اور محفوظ ہتھیار کی شکل اختیار کر گئی تھی۔

ذرا ہی دیر میں فجر کی اذان سنائی دینے لگی۔ میں نے سچے دل سے دعا مانگی کہ یارب مجھے آج میرے مقصد میں کامیابی عطا فرما دے۔

فجر کی اذان کے ساتھ ہی سوئے ہوئے لوگ بے دار ہوگئے گھروں کے دروازے کھلنے لگے اور لوگ مسجد کی جانب جانے لگے کئی لوگوں کی گلی سے گزرنے اور باتیں کرنے کی آوازیں آنے لگیں۔

میں پوری طرح تیار تھی میں نے گن کی نال کو پردے کے ایک سوراخ سے باہر نکال دیا نال کا ذرا سا

حصہ ہی پردے کے باہر تھا اور میں مکمل طور پر پردے کے پیچھے بیٹھی بخوبی باہر کا نظارہ کر سکتی تھی۔

آخر کار وہ وقت بھی آ گیا جب میں نے دور ہی سے چند گاڑیوں کو اس روڈ پر اس جانب تیزی سے آتے ہوئے دیکھا۔

میرے اعصاب پوری طرح تن گئے فیصلہ کن لمحہ آن پہنچا۔ میں نے گن سنبھالی اور اپنا نشانہ درست کرنے کے بعد دوربین آنکھوں سے لگالی سارا منظر جیسے ایک لمحے کے لیے سکڑ اور سمٹ کر میرے بالکل قریب آ گیا اور لمحہ بہ لمحہ بڑھتی ہوئی گاڑیاں بالکل میرے سامنے آ گئیں۔

پہلے گارڈز کی گاڑی گزری پھر جیسے ہی نواب کی گاڑی سامنے آئی مجھے نواب کا منحوس چہرہ دکھائی دیا۔ میری انگلی نے ایک خفیف سی حرکت کی اور ٹریگر دبا دیا۔ ایک ہلکی سی ٹچ کی آواز کے سوا کوئی آواز سنائی نہیں دی اور پھر میں نے دیکھا کہ ساری گاڑیاں رک گئیں۔ میں فوری طور پر اپنی جگہ سے اٹھی اور آن واحد میں گن کو تین الگ الگ حصوں میں تقسیم کر کے اپنے میلے سے تھیلے میں ڈال دیا۔ دوربین اور سائلنسر بھی ڈال کر میں نے گلی میں آخر نگاہ ڈالی اور تیزی سے سیڑھیاں پھلانگتی ہوئی نیچے والی منزل پر آ کر گندی گلی کی جانب کھلنے والے دروازے کی کنڈی کھولی اور باہر جھانکا۔

گلی سنسان تھی اور کوئی آدمی نہیں تھا۔ یہاں کوڑے اور گندگی کے ڈھیر لگے ہوئے تھے اور آوارہ کتے اس کوڑے میں منہ ڈالے اپنا ناشتا تلاش کر رہے تھے۔

میں ایک چھپاکے سے باہر نکلی اور دروازہ بند کر دیا مجھے آگے جانے کے لیے ایک کوڑے کے ڈھیر کو کراس کرنا تھا میں نے کتوں کو ہش ہش کر کے وہاں سے بھگایا تو وہ خوف زدہ اور ناگوار نگاہوں سے مجھے دیکھتے ہوئے بھاگ گئے اور قدرے دور جا کر رک کر مجھے دیکھنے لگے انہیں لگا ہوگا میں ان کا ناشتا شیئر کرنا چاہتی تھی۔

اس گلی سے تیزی سے نکل میں دوسری اور صاف گلی میں آ گئی۔ جہاں آمنے سامنے مکان بنے ہوئے تھے۔

اس گلی میں اس وقت کچھ لوگ چل پھر رہے تھے لیکن ان لوگوں نے ایک کمر جھکی سفید بالوں والی اس بوڑھی فقیرنی پر کوئی توجہ نہیں دی جو ایک میلا پرانا کپڑے کا تھیلا ہاتھ میں لیے کھانستی اور زمین پر تھوکتی ہوئی جا رہی تھی۔

گلی سے نکل آنے کی دیر تھی کہ اس بوڑھی فقیرنی کی چال میں ایک دم سے تیزی آ گئی اور پھر سڑک پر لوگوں کے بڑھتے ہوئے ہجوم میں وہ بوڑھی عورت غائب ہوگئی جاتے جاتے اس نے صرف یہ دیکھا کہ لوگ اس گاڑی کے گرد جمع ہو رہے ہیں اور گاڑی میں سے تیزی سے خون بہہ کر نیچے سڑک پر ایک پتلی سی دھار کے ساتھ بہہ رہا ہے اور پولیس اور نواب کے ذاتی گارڈز تیزی سے چاروں جانب پھیل رہے ہیں۔

میں نے قریب ہی ایک محفوظ جگہ پر جا کر اپنا حلیہ درست کیا اور جھاڑیوں میں چھپی ایک کار میں بیٹھ کر اطمینان سے روانہ ہوگئی۔

میں سیدھی اپنے فلیٹ پر پہنچی اور خوشی خوشی لمبی تان کر سوگئی جو اطمینان اور سرور مجھے اس وقت حاصل ہو رہا تھا وہ آج سے پہلے کبھی نہیں ملا تھا۔

میں نے بالآخر اپنے دشمن کو ہلاک کر ہی ڈالا۔ یہ پرمسرت احساس لیے میری آنکھیں نیند سے بوجھل ہونے لگیں اور ذرا ہی دیر میں میں گہری نیند میں چلی گئی۔

ابھی مجھے سوئے ہوئے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ میرے فون کی گھنٹی نے میری نیند میں شدید دخل اندازی کی اور نا چاہتے ہوئے بھی مجھے آنکھیں کھولنا پڑیں۔ میری آنکھوں میں اس وقت ان گنت راتوں کے رت جگے تھے۔ میں وہ ساری نیند بھی آج ہی پوری کر لینا چاہتی تھی اور اتنے بڑے کام کو انجام دینے میں مدد دینے پر میں خرم کو اس کا منہ چاہا ''انعام'' بھی دینے والی تھی۔

میں نے بہ مشکل اپنی نیند سے بوجھل آنکھیں کھولیں اور فون کان سے لگا کر بھاری آواز میں کہا۔

''ہوں' کون ہے؟''

''تم سو رہی ہو' ذرا ٹی وی تو آن کرو' تمہارے لیے ایک حیرت انگیز نیوز ہے۔'' مجھے خرم کی آواز سنائی دی۔

''ہوں' مجھے معلوم ہے کیا نیوز ہوگی۔ اس کا جشن تو میں شام کو مناؤں گی فی الحال مجھے سونے دو۔ ڈونٹ ڈسٹرب می اگین' پلیز۔'' میں نے ہلکی سی جمائی لیتے ہوئے کہا اور فون رکھ ہی رہی تھی کہ خرم کی آواز دوبارہ سنائی دی۔

''تمہیں معلوم ہی تو نہیں ہے کہ کیا نیوز ہے اس لیے کہہ رہا ہوں کہ ٹی وی آن کر کے دیکھو' تمہاری ساری نیند لمحہ بھر میں غائب ہو جائے گی۔''

''ہیں' کیا مطلب ہے تمہارا۔ کیسی نیوز؟'' میں پوری طرح ہوش میں آ گئی اور ساتھ ہی اٹھ کر بیٹھ گئی۔

''ٹی وی آن کرو' بے بی......!'' خرم نے طنزیہ لہجے میں کہا اور فون بند کر دیا۔

میں نے فون ایک طرف پھینکا اور تیزی سے ٹی وی کھولنے کے لیے اٹھی اور ریموٹ کی تلاش میں اِدھر اُدھر نگاہ دوڑائی۔ تب وہ مجھے بیڈ پر ہی پڑا دکھائی دے گیا۔

میں نے جھٹ ٹی وی آن کیا اور نیوز چینل لگایا اور جو خبر میں نے دیکھی اور سنی ان سے نے میرا بلڈ پریشر خطرناک حد تک بڑھا دیا اور میں نے نواب سطوت کو ایک خالص مردانہ اور فحش گالی دیتے ہوئے ریموٹ ٹی وی اسکرین پر دے مارا۔

ٹی وی کی اسکرین چیخ گئی اور خاموش ہوگئی۔ میرا دماغ جیسے غصے کی شدت سے اپنے حواس کھو بیٹھا۔

میں نے ساری چیزیں اٹھا اٹھا کر پھینکنا شروع کر دیں۔ میں نواب سطوت کو بری بری گالیاں دے رہی تھی۔ چیخ رہی تھی اور پھر میں نے زور زور سے رونا شروع کر دیا غصے میں میرا دل چاہ رہا تھا کہ اپنے آپ ہی کو گولی مار دوں۔

میں نے ٹی وی پر جب نیوز چینل لگایا تو بریکنگ نیوز یہ چل رہی تھی کہ ''مشہور روحانی پیشوا نواب سطوت السلام قاتلانہ حملے میں بال بال بچ گئے کسی نے بہت دور سے سائلنسر لگی گن سے ان کی گاڑی کو نشانہ بنایا مگر یہ عین ان کی خوش قسمتی تھی کہ جس وقت فائر ہوا وہ اپنے پیچھے بیٹھے گن مین سے کچھ کہنے کے لیے مڑے اور قاتل کے نشانے سے ہٹ گئے اور ان کے ساتھ بیٹھے ان کے عزیز دوست رحمان سعید اس ناگہانی گولی کا شکار ہوگئے۔ گولی اس کے سر میں لگی اور سر کو کوئی حصوں میں تقسیم کر گئی۔

نواب سطوت کا کہنا ہے کہ جس طرح اس کے لا تعداد چاہنے اور پیار کرنے والے اس دنیا میں موجود ہیں اسی طرح چند ایک حاسد اور دشمن بھی ہیں لیکن جب تک ان کے اوپر اللہ کی رحمتوں کا سایہ ہے کوئی دشمن ان کا بال بھی بیکا نہیں کر سکتا۔ اس نامعلوم قاتل کے لیے ان کا یہ پیغام ہے کہ ''تم کہاں اپنے آپ کو میری نفرت میں جھلسا رہے ہو' جب تک میری زندگی ہے کوئی مجھے مار نہیں سکتا کیونکہ لاکھوں مریدین کی

دعائیں میرا احاطہ کیے ہوئے ہیں۔''

''تجھ جیسے ابن ابلیس پر کیسے اللہ کی رحمتوں کا سایہ ہو سکتا ہے۔ کیسے معصوم لوگ کی دعائیں تیرا احاطہ کر سکتی ہیں۔ تو شیطان ہے اور تیرا مددگار بھی شیطان ہی ہے۔ مردود' کمینے......!'' چیخ چیخ کر روتے روتے اپنی ناکامی اور نامرادی کے احساس کے ساتھ میں بے دم سی ہو کر بے ہوش ہوگئی۔

نجانے کب مجھے ہوش آیا تو میں اپنے چاروں جانب بکھری ہوئی چیزوں کو حیرت سے دیکھنے لگی پھر مجھے سب کچھ یاد آ گیا۔ میری آنکھوں میں ایک بار پھر بے بسی کے آنسو آنے لگے۔

لیکن میں نے انہیں رگڑ کر تیزی سے صاف کر ڈالا اور خود کو سنبھالا۔ ''تم اس طرح کی حرکتیں کر کے کیا ثابت کرنا چاہتی ہو کہ تم ناکام ہوگئیں۔ یہ بالکل ٹھیک بات ہے کہ جب تک اس کی زندگی ہے اسے کوئی نہیں مار سکتا۔ کیونکہ موت تو خود زندگی کی حفاظت کرتی ہے ابھی اس کی موت کا وقت ہی نہیں آیا تھا اس لیے وہ بچ گیا اور جب وقت پورا ہو جائے گا تو اسے کوئی نہیں بچا پائے گا۔ موت اسی طرح اسے آن دبوچے گی کہ اس کے گارڈ اور پولیس اسکواڈ' کوئی بھی نہیں بچا پائے گا۔ ہاں ابھی اس کی زندگی باقی ہے۔

میری سوچوں میں ایک بار پھر فون کی بیل نے رخنہ اندازی کی میں سمجھ گئی کہ خرم کی کال ہوگی۔

''ہاں بولو۔'' میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

''تم فون کیوں ریسیو نہیں کر رہی تھیں میں کتنی دیر سے مسلسل تمہیں فون کر رہا تھا اب آخری بار یہ سوچ کر نمبر ملایا کہ شاید اس بار اٹھا لو ورنہ اب میں تمہاری ہی جانب آ رہا تھا۔'' خرم نے کہا۔

''تو پھر آ جاؤ۔'' میں نے کہا اور فون بند کر دیا۔

فون بند کر کے میں کمرہ سمیٹنے لگی اتنے میں بیل بجی میں نے دروازے پر دیکھا تو کام کرنے والی ملازمہ تھی۔

''کہاں مر گئی تھیں اتنی دیر سے کیوں آئی ہو؟'' میں اس کی شکل دیکھتے ہی دہاڑی۔

''کیا ہو گیا ہے آپ کو دیر سے کہاں آئی ہوں اپنے ٹائم پر ہی تو آئی ہوں۔'' اس نے ڈرے سہمے ہوئے لہجے میں کہا۔

''اچھا زیادہ دماغ مت خراب کرو پہلے مجھے اچھی سی ایک کپ چائے بنا کر پلاؤ' میرا دماغ پھٹ رہا ہے۔'' میں نے اس سے کہا تو وہ بجائے کچن میں جانے کے کمرے کی جانب دیکھتے ہوئے بولی۔

''اچھا' اب سمجھی کسی بات پر باجی کو بہت زیادہ غصہ آ رہا ہے چیزوں پر غصہ نکال رہی تھیں اوپر سے میں کم بخت ماری چلی آئی اور باجی کے غصے کی لپیٹ میں آ گئی۔''

''سکینہ۔'' اس کی خیال آرائی مجھے مزید چڑا گئی میں دوبارہ زور سے چیخی تو وہ بھاگ کر کچن میں چلی گئی۔

سکینہ کے ہاتھ کی گرم چائے پی کر میرے ہوش کچھ ٹھکانے آئے اور موڈ بھی قدرے بہتر ہوا تو میں نے کچن میں جا کر اس سے سوری کہا۔ سکینہ جیسی عورت مجھے کوئی دوسری نہیں مل سکتی تھی وہ میری عادت اور مزاج سے اچھی طرح واقف تھی اور کبھی بھی میرے ڈانٹنے اور ناراض ہونے پر برا نہیں مناتی تھی۔ وہ خدمت گزار بھی بہت تھی۔ اس لیے اگر میری جانب سے بلاوجہ کی زیادتی ہو بھی جاتی تو غصہ ٹھنڈا ہونے پر میں اس سے سوری بھی کر لیتی اور وہ جیسے کھل اٹھتی تھی۔ ایک مرتبہ اس نے ڈرتے ڈرتے اپنی جانب سے مجھے ایک مشورے سے نوازا وہ رضوان کو میرا شوہر سمجھتی تھی اور خرم کو رضوان کا دوست

اس نے جب بعد میں بھی خرم کو میرے فلیٹ میں آتے جاتے دیکھا تو بولی۔

''خرم صاحب بہت اچھے ہیں اور رضوان صاحب کے بعد آپ کا اتنا خیال بھی رکھتے ہیں تو آپ ان سے شادی کیوں نہیں کر لیتیں۔''

اور جواب میں، میں نے جن کڑی نگاہوں سے گھورا تو وہ سہم کر خاموش ہوگئی اور اس کے بعد اس نے مجھ سے کبھی اس قسم کی کوئی بات نہیں کی۔

خرم آیا اور بیٹھ کر مجھے دیکھتے ہوئے مسکراتا رہا اور اس کی اس مسکراہٹ نے میرے تن بدن میں شدید آگ لگا دی۔ اس نے، میں نے پھاڑ کھانے والے انداز میں کہا۔

''اپنے چہرے پر مسلسل کھلنے والی مسکراہٹ کا سبب بتانا پسند کریں گے خرم صاحب۔'' تو وہ بولا۔

''میں نے تم سے اسی لیے کہا تھا کہ میں بھی تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔ لیکن تمہیں اپنے اوپر ضرورت سے کچھ زیادہ ہی بھروسا تھا یہ بہت اچھا موقع تھا جو تم نے گنوا دیا اور اب اس حملے کے بعد تو تم نے اس کو مزید الرٹ کر دیا وہ اپنی سیکیورٹی مزید بہتر بنا لے گا۔''

''تم میرے ساتھ ہوتے تو کیا کر لیتے کیا اس کی گاڑی کے آگے کھڑے ہو کر اس کی گاڑی کو روک لیتے اور مجھ سے کہتے کہ جاؤ نواب کتے کو گولیوں بھون ڈالو۔'' میں نے جلے تپے لہجے میں کہا۔

''میں ایسا کچھ بھی نہیں کرتا۔ بس میں اور تم مل کر ایک ساتھ فائرنگ کرتے کوئی نہ کوئی گولی تو اس کے بھیجے کو چومتی۔'' اس نے اطمینان بھرے لہجے میں کہا۔

''اس کی ابھی زندگی باقی ہے۔ اس لیے اگر تم کیا اور بھی بہت سے لوگ مل کر فائرنگ کرتے تب بھی وہ ضرور بچ جاتا۔'' میں نے ایک گہرا سانس لیتے ہوئے کہا۔

اور پھر جیسا کہ خرم نے کہا تھا وہی ہوا اس نے بلٹ پروف گاڑی میں سفر کرنا شروع کر دیا اور یہ بات کسی کے علم میں بھی نہیں ہوتی کہ وہ کب کہاں جا رہا ہے اور کن راستوں سے سفر کرے گا۔ ہم نے بعد میں بھی بہت سے پلان بنائے مگر اس کا کچھ نہیں بگاڑ پائے۔

''اچھا ایک بات تو بتاؤ روزی۔'' میں نے بے چینی سے پہلو بدلتے ہوئے کہا تو وہ میری جانب سوالیہ نگاہوں سے دیکھنے لگی۔

''تمہیں میرے بارے میں کیسے پتا چلا اور نہ صرف پتا چلا بلکہ میرے بارے میں تمہاری ایک ایک معلومات بالکل صحیح تھیں ایسا کون ہے جو مجھے اچھی طرح جانتا اور پہچانتا ہے۔''

میری بات سن کر وہ خاموش رہی۔ اس کے چہرے پر مجھے ایک کشمکش کے آثار دکھائی دے رہے تھے۔

''کیا بات ہے روزی، تم نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔ کیا تم اس شخص کو مجھ سے چھپانا چاہتی ہو اور اس کا نام نہیں بتانا چاہتیں۔'' میں نے ہلکے سے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''تم نے تو مجھے اپنا دوست کہہ کر کچھ بھی نہ چھپانے کا وعدہ کیا تھا۔''

''بات دراصل یہ ہے شمروز کہ جس نے مجھے تمہارے بارے میں بتایا ہے اس نے سختی کے ساتھ مجھے منع کیا تھا کہ میں کبھی بھی اس کا نام تمہارے سامنے نہ لوں۔'' روزی نے ذرا سے تردد کے بعد کہا۔

''وجہ۔'' میں نے تیوریوں پر بل ڈال کر پوچھا۔

''وجہ'' وہ چند لمحے سوچتی رہی پھر بولی۔ ''شاید وہ تمہارا بہت قریبی ہے۔'' اس نے چہرہ دوسری جانب گھما کر جواب دیا اس کا لہجہ دھیما تھا۔

''میرا قریبی تھا۔ میرا ایسا قریبی تمہارے پاس

کہاں سے آیا میرا نہیں خیال کہ میرا کوئی قریبی دوست رشتہ دار یا پھر جاننے والا تمہارے گینگ میں ہوسکتا ہے۔ کیا نواب کے بندوں میں سے کوئی بندہ تم لوگوں سے آن ملا ہے۔" کیونکہ جس وقت میں ان لوگوں کے پاس آیا تھا کہ میں نے اپنے بارے میں انہیں سب کچھ بتادیا تھا اور کلیم اور کنیز وغیرہ کو میرے بارے میں سب کچھ معلوم تھا وہی لوگ ہوسکتے ہیں۔

"نہیں نواب کے بندوں میں سے کوئی بندہ ہمارے ساتھ ملا ہے بلکہ وہ ہمارا ہی بندہ ہے اور کافی عرصے سے ہمارے ساتھ ہے۔" روزی نے جواب دیا تو میں الجھن میں پڑ گیا۔

"اگر اس نے تمہیں منع بھی کیا ہے تو تم پلیز مجھے اس کا نام بتادو۔ بس وعدہ کرتا ہوں کہ اس کو یہ بات کبھی نہیں بتاؤں گا کہ تم نے مجھے اس کے بارے میں بتایا ہے۔"

"گولی استاد۔" روزی نے میرے تاثرات کا جائزہ لینے کے لیے اپنی آنکھیں میرے چہرے پر گاڑتے ہوئے کہا۔

"کیا' گولی استاد...... تمہارا بندہ ہے۔" مجھ پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے میں اس کے بارے میں یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔

"ہاں گولی استاد۔" روزی میرے قریب آکر صوفے پر اطمینان سے بیٹھتے ہوئے بولی۔ "اس نے جب تمہیں اپنے گھر سے روانہ کیا تھا تو اس نے تمہیں میرے آدمیوں کے پاس بھیجا تھا لیکن ٹرین حادثہ کی وجہ سے تم ان تک نہیں پہنچ سکے پھر اس نے تمہیں تلاش کیا تو تمہاری ناقابل شناخت چہرے والی لاش ملی مگر تمہارے شناختی کارڈ اور پرس سے اس نے تمہیں شناخت کیا اور وہ جو کسی اور کی ڈیڈ باڈی تھی تمہاری سمجھ کر دفنادی۔

کافی عرصہ تک گولی استاد یہی سمجھتا رہا کہ اس کا دوست ڈاکٹر شاہ زمان اب اس دنیا میں نہیں ہے۔ پھر نتھیا گلی سے اپنا ورکشاپ ختم کرکے وہ کراچی آگیا۔ ایسا باس کا حکم تھا۔ یہاں اس نے تمہیں ایک بار کار میں ٹریفک سگنل پر دیکھا تھا وہ تمہیں دیکھ کر چونک گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ بالکل ایک جیسی شکل کے دو افراد کیسے ہوسکتے ہیں لیکن پھر اس نے کسی کو تمہارے تعاقب میں بھیجا تو پتا چلا کہ تم نواب سطوت کی کوٹھی میں گئے ہو۔

بعد میں بہت سوچ بچار کے بعد یہ بات اس کی سمجھ میں آئی کہ تم نے اپنی شناخت مٹانے کے لیے ٹرین کے حادثے میں کسی اور مردہ شخص کی جیب میں اپنا پرس اور شناختی کارڈ رکھ دیا تم حقیقت میں مرے نہیں بلکہ زندہ ہو۔

اور پھر اس بات کا یقین ہوجانے کے بعد اس نے یہ بات مجھے بتائی اور میں نے تم سے رابطہ کیا۔" روزی اپنی بات ختم کرکے خاموش ہوئی تو میں بے قراری سے اٹھ کھڑا ہوا اور کہا۔

"روزی مجھے گولی استاد سے ملنا ہے مجھے حیرت ہے کہ خود مجھ سے کیوں نہیں ملا اور نہ صرف وہ مجھ سے ملا نہیں بلکہ اس نے تمہیں بھی سختی کے ساتھ منع کردیا کہ تم مجھے اس کے بارے میں کچھ بھی نہ بتاؤ۔" اس نے ایسا کیوں کیا؟"

"اب یہ بات میں نہیں جانتی کہ اس نے ایسا کیوں کیا۔" روزی نے کندھے اچکا کر جواب دیا۔

"روزی کیا تم ابھی اور اسی وقت گولی استاد کو اپنے فلیٹ میں بلا سکتی ہو بس تم اسے یہ مت بتانا کہ میں یہاں موجود ہوں۔" میں نے کہا۔

"میں بلا تو سکتی ہوں اور وہ آ بھی جائے گا لیکن مجھے یہ نہیں معلوم کہ وہ اس وقت کہاں ہے۔ اگر

مصروف ہوا تو اس وقت نہیں آسکے گا۔ اگر فارغ ہوا تو آجائے گا اچھا ایک منٹ ٹھہرو میں ٹرائی کرتی ہوں۔" روزی نے اپنا موبائل فون ہاتھ میں اٹھایا اور گولی استاد کا نمبر پش کرنے لگی۔ چند لمحوں کے توقف کے بعد وہ بولی۔

"ہاں گولی میں بات کررہی ہوں' کیا کررہے ہو؟"

پھر خاموش رہ کر اس نے دوسری جانب سے سنا پھر بولی۔ "اوہو چلو یہ تو بہت اچھی بات ہے کیا تم اس وقت میرے پاس آسکتے ہو۔ ہاں میں فلیٹ پر ہی ہوں۔ نہیں' نہیں کوئی خاص کام نہیں ہے' اچھا چلو آؤ گے تو بتاؤں گی' نہیں اسے اپنے ساتھ لانے کی ضرورت نہیں تم تنہا ہی آؤ' اوکے۔ میں تمہارا انتظار کررہی ہوں' صرف دس منٹ ہاں۔" پھر اس نے مسکراتے ہوئے فون بند کردیا اور بولی۔ "وہ آرہا ہے یہاں سے قریب ہی موجود تھا۔ وہ حیران ہورہا تھا کہ میں اسے اپنے فلیٹ پر کیوں بلا رہی ہوں اور وہ بھی تنہا۔ کیونکہ آج سے پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا میرے فلیٹ پر صرف خرم آتا ہے اور کوئی نہیں۔"

پھر دس منٹ سے بھی کم وقت میں فلیٹ کی کال بیل بجنے لگی۔

"شاید وہ آگیا میں دیکھتی ہوں۔" روزی نے کہا اور دروازے کی جانب چلی گئی۔ اس نے دروازے کے قریب جاکر اوپر لگے ہوئے چھوٹے سے مانیٹر میں دیکھا گولی استاد کھڑا تھا۔ اس نے بلا کھٹکے لاک کھول دیا۔ میں فوراً دروازے کے پیچھے ہوگیا۔ وہ گولی استاد کو ڈرائنگ روم میں لیے چلی آئی۔

"خیریت ہے میڈم آپ نے اتنی ایمرجنسی میں مجھے یہاں بلایا۔" روزی کے اشارے پر وہ صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

"تم بیٹھو میں ابھی آتی ہوں۔" روزی یہ کہہ کر کمرے سے نکل گئی تو گولی استاد سر جھکائے کسی سوچ میں گم ہوگیا اور میں آہستہ سے دروازے کے پیچھے سے نکل کر اس کے سامنے آکر کھڑا ہوگیا۔ آہٹ پر گولی استاد نے سر اٹھا کر مجھے دیکھا اور حیرت سے مجھے دیکھتے ہوئے اپنی جگہ سے کھڑا ہوگیا۔

"شاہ زمان تم' یہاں۔" اس نے کہا اور پھر دروازے کی جانب دیکھا جہاں سے ابھی روزی باہر نکلی تھی۔

"تم مجھے دیکھ کر اس طرح حیران ہورہے ہو جیسے تمہیں ابھی ابھی پتا چلا ہے کہ میں زندہ ہوں۔" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"نہیں...... وہ...... میں...... دراصل۔" اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کہے۔ وہ ایک لفظ کہتا اور سر جھٹکتا۔

"تم روزی سے اس بارے میں کوئی بات مت کرنا کہ اس نے مجھے تمہارے بارے میں کیوں بتایا اسے میں نے مجبور کیا تھا۔" میں نے کہا۔

"شاہ زمان میرے دوست' سارے گلے شکوے بعد میں کرلینا پہلے ایک بار میرے گلے تو لگ جا۔" وہ اپنے دونوں ہاتھ پھیلا کر میری جانب بڑھا تو میں نے اپنا ایک ہاتھ تیزی سے آگے کرکے اسے آگے بڑھنے سے روک دیا اور کہا۔

"یہ منافقت کی محبت مجھے مت دکھاؤ گولی استاد' تم تو مجھ سے ملنا ہی نہیں چاہتے تھے حد یہ کہ میرے بارے میں روزی کو ساری انفارمیشن دینے کے بعد تم نے اسے سختی سے منع کردیا کہ وہ کبھی بھی مجھے تمہارے بارے میں نہ بتائے تم نے ایسا کیوں کیا پہلے میرے اس سوال کا جواب دو۔" میرا سوال سن کر گولی استاد کا چہرہ اتر گیا۔ ایک تاریکی سی اس کے چہرے پر چھا گئی

اور وہ خاموش ہوگیا۔

''بولو گولی استاد۔ تم خاموش کیوں ہوگئے۔ تم نے جب پہلی بار مجھے دیکھا تھا تو تم اس وقت کیوں نہیں مجھ سے آ کر ملے میں نے ایسا کیا قصور کیا تھا۔'' میرے لہجے میں خود بخود ڈھیر سارا دکھ اتر آیا۔

''تم جاننا ہی چاہتے ہو تو سنو اس کی دو وجوہات ہیں۔'' اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا اور بولا۔

''آؤ اطمینان سے ادھر آ کر بیٹھو۔'' اس نے خود بیٹھ کر اپنے برابر میں صوفے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا تو میں صوفے پر بیٹھ گیا اور اس کی جانب متوجہ ہوگیا۔ وہ بولا۔

''ایک شکایت تم نے مجھ سے ابھی کی ہے کہ جب میں نے تمہیں پہلی بار دفعہ دیکھا تو تم سے آ کر کیوں نہیں ملا۔ تو ایسی ہی شکایت مجھے تم سے بھی ہے کہ تم نے مجھ سے یہ بات کیوں چھپائی کہ تم ٹرین ایکسیڈنٹ میں مرے نہیں بلکہ زندہ ہو اور جس شخص کو ڈھیروں آنسوؤں کے ساتھ اپنے ہاتھوں میں نے قبر میں اتارا وہ میرا یار شاہ زمان نہیں بلکہ کوئی اور ہے۔ تمہیں اندازہ بھی نہیں ہے کہ تمہاری اس جھوٹی جواں مرگی کا مجھے کتنا صدمہ ہوا ہے کتنے ہی دن میں نے تمہارا سوگ منایا ہے اور جب کئی سالوں کے بعد کراچی آ کر مجھے یہ علم ہوا کہ تم نہ صرف زندہ ہو بلکہ ایک بہت بڑے گینگ کے ساتھ مل کر کام کر رہے ہو اب تم ڈاکٹر شاہ زمان نہیں رہے بلکہ شمروز بن چکے ہو تو مجھے کتنا شاک لگا۔ تم نے اپنے زندہ ہونے کی خبر کو مجھ سے کیوں چھپایا۔'' اس کے ہر ہر لفظ میں شکوہ تھا۔

''اور دوسری وجہ؟'' میں نے اطمینان بھرے لہجے میں پوچھا۔

''دوسری وجہ یہ تھی کہ میں نہیں چاہتا تھا کہ تمہیں میرے بارے میں یہ علم ہو کہ میرا تعلق بھی جرائم پیشہ افراد کے ساتھ ہے۔ میں تمہاری نگاہوں میں تمہارا وہی گولی استاد رہنا چاہتا تھا۔ بس اس کے علاوہ اور کچھ نہیں لیکن سچ پوچھوں تو تمہیں تمہاری موجودہ حالت میں دیکھ کر مجھے بہت خوشی ہوئی ہے کیونکہ تم اب وہ ڈاکٹر شاہ زمان نہیں رہے جو اپنا گھر لٹ جانے پر ساری ساری رات روتا رہا تھا۔ تم اب شمروز بن چکے ہو ایک مرد آہن۔ آگے بڑھ اپنا حق چھین لینے والے اب تو گلے لگ جانا ظالم۔'' اپنی بات ختم کر کے اس نے ایک بار پھر میرے آگے اپنے بازو پھیلا دیے اور ہم بہت پرجوش طریقے سے ایک دوسرے کے سینے سے لپٹ گئے۔ دیر تک ایک دوسرے کو اپنی بانہوں میں بھینچ کر اپنی محبت کا یقین دلاتے رہے۔

علیحدہ ہوئے تو ہماری آنکھوں میں ڈھیر ساری نمی تھی۔ ہم نے ایک دوسرے کو دیکھا اور ہنس پڑے۔ پھر میں نے اپنے بارے میں ساری سچائی بتا کر اس کا یہ گلہ بھی دور کر دیا کہ میں نے اسے اپنے زندہ ہونے کے بارے میں کیوں نہیں بتایا۔ آخر میں یہ کہا کہ جس طرح تم نے شرمندگی کی وجہ سے میرا سامنا نہیں کیا تھا میں نے بھی اسی شرمندگی کی وجہ سے اپنے بارے میں تمہیں نہیں بتایا تھا کہ میں بھی تمہاری نگاہوں میں شاہ زمان کی حیثیت سے زندہ رہنا چاہتا تھا۔ شمروز کی حیثیت سے نہیں۔''

پھر ہم نے آپس میں مزید باتیں کیں ایک دوسرے کے موبائل فون نمبرز کے تبادلے کیے پھر روزی بھی ہمارے ساتھ گفتگو میں شامل ہوگئی اور ہم دوبارہ ملنے کے وعدے پر ایک دوسرے سے رخصت ہوگئے۔

روزی کے گھر سے آنے کے بعد میں نے سوچا کہ سرمئی کے گھر جا کر حشام کی خیریت معلوم کرتا ہوں اور یہ سوچ کر میں نے اپنی گاڑی کا رخ شاہ فیصل کالونی کی جانب موڑ لیا۔

سرمئی کے گھر پر موجود گارڈ کو دیکھ کر میں ٹھٹک گیا پھر خیال آیا کہ یقیناً سرمئی نے ایسا سیکیورٹی کے تحت کیا ہوگا۔ بہر حال جانا تو تھا۔ میں نے بیل بجائی تو گارڈ نے تیز نگاہوں سے مجھے دیکھتے ہوئے سخت لہجے میں پوچھا۔

''کس سے ملنا ہے آپ کا نام؟''

''سرمئی صاحبہ سے ملنا ہے ان سے کہو کہ شمروز آیا ہے۔''

''سرمئی صاحبہ گھر پر موجود نہیں ہیں۔'' اس نے اتنا کہہ کر گیٹ بند کر دیا۔

''اگر وہ گھر پر نہیں ہیں تو کہاں گئی ہیں؟'' میں نے اس کے گیٹ بند کرنے کی حرکت پر اپنے غصے کو دباتے ہوئے پوچھا۔

''آئی ایم سوری میں اس بارے میں آپ کو کچھ نہیں بتا سکتا۔'' اس نے اندر سے جواب دیا۔

''اچھا ان کی امی تو ہوں گی ان سے جا کر کہو کہ شمروز ملنا چاہتا ہے۔'' میں نے کہا تو اس نے گیٹ پر لگے انٹر کوم سے اندر بات کی اور پھر مجھے گیٹ کی جانب آتی ہوئی قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ پھر چند لمحوں کے توقف کے بعد مجھے روشن آنٹی کی آواز سنائی دی۔

''گیٹ کھول دیجیے عثمان۔''

گیٹ کھلا اور میں اندر گیا سامنے روشن آنٹی کھڑی تھیں۔ وہ مجھے حیرانی سے دیکھتے ہوئے بولیں۔

''خیریت ہے بیٹا' تم اس وقت۔''

تب میں نے اپنی گھڑی میں ٹائم دیکھا فجر کی اذان میں تھوڑا ہی وقت باقی تھا۔

''آئی ایم سوری آنٹی مجھے احساس ہی نہیں ہوا کہ اتنا زیادہ وقت ہوگیا ہے۔ میں دراصل اس وقت کہیں اور سے آ رہا ہوں اس لیے مجھے ٹائم کا اندازہ ہی نہیں ہوا۔ میں حشام کی خیریت معلوم کرنا چاہ رہا تھا۔ سرمئی کو کال کر رہا تھا لیکن اس کا فون ہی نہیں مل رہا تھا۔ اس لیے خود چلا آیا۔''

''ارے تم ابھی تک یہیں کھڑے ہو آؤ اندر آؤ' اطمینان سے بیٹھو تو ساری بات بتاتی ہوں اور حشام کے بارے میں ابھی اطلاع ملی ہے کہ اسے ہوش آ گیا ہے۔ سرمئی اسپتال ہی گئی ہے۔ وہ مجھے اپنے ساتھ لیے اندر چلی آئیں۔

@......☆......@

''آصف پلیز بہت تیز گاڑی چلائیے۔'' میں نے بے تاب لہجے میں کہا۔

''آپ اطمینان سے بیٹھیں میں تیز ہی ڈرائیو کر رہا ہوں اور میرے خیال میں اس سے زیادہ تیز رفتاری ہمارے حق میں بہتر ثابت نہیں ہوگی۔'' آصف نے لمحہ بھر کے لیے بیک مرر میں نگاہیں اٹھا کر میری جانب دیکھا اور کہا۔

اور نہ جانے کیوں مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ گاڑی رینگ رہی ہے۔ میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ میرے پر لگ جائیں اور میں فضا میں اڑتی ہوئی حشام کے پاس پہنچ جاؤں لیکن یہ ممکن نہیں تھا۔ مجھے بہت صبر سے بیٹھ کر انتظار کرنا تھا۔ میرے تصور میں بار بار حشام کا ہنستا مسکراتا چہرہ آ رہا تھا اس کی شوخ چھیڑ چھاڑ آ رہی تھی اور میں دل میں بار بار اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کر رہی تھی کہ اس نے میرے حشام کو زندگی لوٹا دی۔

اللہ اللہ کر کے اسپتال آیا اور میں تیزی سے دروازہ کھول کر اپنے پیر کی چوٹ کی پروا کیے بنا بھاگتی ہوئی اسپتال میں اندر کی جانب بھاگی۔ مجھے اپنے پیچھے آصف کی آواز سنائی دی۔ وہ مجھ سے کچھ کہنا چاہ رہا تھا لیکن میرے پاس ٹائم ہی کہاں تھا کسی کی بھی

بات سننے کا میں نے حشام کو سلامت بات کرتے ہوئے دیکھنا چاہ رہی تھی۔

میں لوگوں کی پروا کیے بنا بھاگتی ہوئی آئی سی یو کی جانب آ گئی۔ میں سمجھ رہی تھی کہ انکل حشام کے پاس ہی بیٹھے ہوں گے لیکن وہ ایک بار پھر مجھے باہر پڑے صوفے پر بیٹھے دکھائی دیے میں نے اپنے ساتھ آنٹی کو لانے کی بھی زحمت گوارا نہیں کی اور دوڑتی ہوئی چلی آئی۔ انکل پر نگاہ پڑی تو میرے بھاگتے ہوئے قدموں میں ایک دم بریک لگ گئے اور سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں میرے ذہن میں ایک خوفناک خیال آیا کہ کہیں انکل نے مجھ سے جھوٹ تو نہیں بولا۔

انکل کی نگاہ جیسے ہی مجھ پر پڑی تو وہ اپنی جگہ سے اٹھے اور تیزی سے میرے نزدیک آ گئے۔

''آ گئیں بیٹی تم۔'' انہوں نے کہا پھر میرے عقب میں اپنی نگاہیں دوڑاتے ہوئے سوال کیا۔

''تمہاری آنٹی کہاں ہیں کیا وہ نہیں آئیں۔''

''آنٹی پیچھے آ رہی ہیں انکل، آپ مجھے یہ بتائیں کہ واقعی حشام کو ہوش آ گیا ہے؟'' میں نے مشکوک نگاہوں سے انہیں دیکھتے ہوئے پھولی ہوئی سانسوں کے درمیان سوال کیا۔

''ہاں بیٹی اللہ کریم کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ حشام کو ہوش آ گیا ہے اور ڈاکٹروں کے مطابق اس کی زندگی خطرے سے باہر ہے۔ ان شاء اللہ وہ بہت جلد صحت یاب ہو جائے گا۔'' انکل نے مسکراتی ہوئی آنکھوں کے ساتھ بتایا لیکن میرا دل اب بھی مطمئن نہ ہوا تو میں نے کہا۔

''پھر آپ یہاں کیوں بیٹھے ہیں حشام کے پاس کیوں نہیں ہیں۔''

''اس لیے کہ وہ آئی سی یو میں ہے ہم زیادہ دیر وہاں ٹھہر نہیں سکتے اور نہ ہی حشام سے زیادہ باتیں کر سکتے ہیں۔ دل تو یہی چاہ رہا ہے کہ اس کے پاس بیٹھے رہیں لیکن ہمیں ڈاکٹرز کی بات کا احترام لازمی کرنا ہے۔ وہ اس لیے کہ ہمیں حشام کی صحت و زندگی عزیز ہے۔'' انکل نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے مجھے تسلی دی اور آہستہ آہستہ سمجھایا۔

''لیکن انکل میں حشام کو ابھی دیکھنا اور ملنا چاہتی ہوں۔'' میں نے تڑپ کر کہا اتنے میں آنٹی بھی ہانپتی کانپتی چلی آئیں۔ آصف ان کے ساتھ تھا۔ آنٹی کو دیکھ کر انکل تیزی سے آنٹی کی جانب بڑھے اور پھر میں سب کچھ بھول کر اس منظر کو دیکھنے لگی جو میری آنکھوں کے سامنے تھا۔ انکل اور آنٹی نے آمنے سامنے ہو کر ایک دوسرے کے ہاتھ مضبوطی سے تھامے تھے اور دونوں ہنس رہے تھے اور دونوں کی آنکھوں سے تیزی سے آنسو بہہ رہے تھے۔

''مم...... میرا بچہ ٹھیک ہے نا۔'' آنٹی نے کپکپاتے ہوئے لہجے میں آنسوؤں سے بھیگی آواز میں کہا۔ یہ بات کہتے ہوئے وہ پوری جان سے لرز رہی تھیں۔

''ہاں ہمارا حشام اب بہتر ہے اسے ہوش آ گیا ہے، ہم پر اللہ کا ایک اور کرم ہو گیا۔ آج ایک بار پھر اس نے تمہاری دعا سن لی ہے۔'' اتنا کہہ کر انکل نے میری اور آصف کی پروا نہ کرتے ہوئے آنٹی کو اپنے سینے سے لگا لیا۔ اس منظر کو دیکھ کر میری آنکھیں بھی بہہ نکلیں۔ انکل نے اپنا ایک ہاتھ میری جانب بڑھایا تو میں بھاگتی ہوئی ان کے سینے سے لگ گئی۔

''بس اب رونا نہیں یہ آنسو پونچھ ڈالو ہم حشام سے ملنے جائیں گے لیکن ایک ایک کر کے اور خبردار کوئی اس کے سامنے رو دیا۔ مسکراتے ہوئے جانا اور پھر واپس آ جانا۔'' انکل نے ہم دونوں کو اپنے سینے سے علیحدہ کر کے اپنا چہرہ صاف کرتے ہوئے کہا تو ہم دونوں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے اپنے اپنے چہروں کو صاف کیا اور مسکرانے لگیں۔

''تم لوگ ادھر ہی رکو میں ڈاکٹر سے بات کر کے آتا ہوں۔'' انکل نے کہا اور ڈاکٹر کے روم کی جانب بڑھ گئے۔

''مس میرے لیے کیا حکم ہے، میں یہیں ٹھہروں یا آپ ساتھ جائیں گی۔'' آصف نے پوچھا۔

''فی الحال آپ جائیے آصف، مجھے جب واپس آنا ہوگا تو میں آپ کو فون کر لوں گی۔'' میں نے کہا تو وہ ''بہت بہتر'' کہہ کر چلا گیا۔

پھر انکل کے ساتھ ڈاکٹر ذیشان بھی باہر آ گئے اور مسکراتے ہوئے بولے۔

''آپ لوگوں کو بہت بہت مبارک ہو، آپ لوگوں کی دعائیں رنگ لے آئیں۔''

''ہم نے صرف دعائیں ہی کی ہیں اصل محنت تو آپ لوگوں کی ہے۔ اس لیے بہت بہت شکریہ۔'' میں نے کہا۔

''ایسا مت کہیے اگر دعا اور اللہ کی مدد شامل حال نہ ہو تو انسان لاکھ چاہنے کے باوجود کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ صحت اور زندگی اللہ ہی کے اختیار میں ہے۔'' انہوں نے بدستور مسکراتے ہوئے کہا۔

''آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں ڈاکٹر ذیشان۔'' انکل نے جواب دیا۔

''اینی وے اب یہ بتائیں کہ آپ دونوں سے پہلے کون جائے گا حشام سے ملنے۔'' انہوں نے میری اور آنٹی کی جانب دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''پہلے آنٹی جائیں گی۔'' میں نے جھٹ کہا میری بات سن کر انکل اور ڈاکٹر ذیشان مسکرانے لگے اور آنٹی نے آگے بڑھ کر میری پیشانی چومتے ہوئے دعا دی۔ ''خوش رہو۔''

''بھئی یہ بھی تو کہیں کہ ''حشام کے ساتھ خوش رہو۔'' میرے منہ سے خود بخود نکل گیا۔

''ہاں، ہاں میری بچی اللہ میرے حشام کو اور تجھے ہمیشہ سلامت رکھے اور تم دونوں ساتھ ساتھ زندگی کی بے پناہ خوشیاں سمیٹو۔'' آنٹی نے کہا تو میں اپنے کہے گئے جملے پر بری طرح شرما گئی۔

ڈاکٹر ذیشان آنٹی کو لے کر آئی سی یو میں چلے گئے اور میں اور انکل تنہا رہ گئے۔ میں بے قراری سے ٹہلنے لگی۔ انتظار کر رہی تھی کہ آنٹی باہر آئیں تو میں اندر جاؤں۔ اچانک مجھے ایک بات کا خیال آیا تو میں نے انکل سے پوچھا۔

''انکل آپ نے حشام سے کچھ پوچھا۔ اس واقعے کے بارے میں کوئی بات کی۔''

''نہیں بیٹا یہ وقت ابھی اس قسم کی کوئی بھی بات کرنے کا نہیں ہے اور میرا مشورہ ہے کہ تم بھی کوئی بات مت کرنا۔ دو چار دن کے بعد جب وہ مزید بہتر ہو جائے گا تو ہم پھر اس سے بات کریں گے۔'' انکل نے کہا۔

''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں ہمیں ابھی اس موضوع کو قطعی نہیں چھیڑنا چاہیے۔ ویسے آپ مجھے ایک بات بالکل سچ سچ بتائیں کہ آپ کو معلوم ہے کہ حشام ایسی کون سی رپورٹ بنا رہا تھا کہ جس کی وجہ سے اس پر یہ حملہ ہوا ہے اور اسے جان سے مار دینے کی کوشش کی گئی ہے۔''

میری بات سن کر انکل خاموش رہے اور میرے چہرے کی جانب دیکھنے لگے۔ پھر آہستہ سے بولے۔

''ہاں میرے علم میں ہے لیکن میں یہ بات نہیں جانتا تھا کہ اتنی اہم بات کسی کے علم میں آ جائے گی اور اس کی جان کے لالے پڑ جائیں گے۔''

"آپ مجھے تو بتائیں اس بارے میں اگر میرے علم میں ساری بات نہیں ہوگی تو ہم حشام کے دشمنوں تک کیسے پہنچیں گے۔" میں نے کہا۔

"بتاؤں گا سب کچھ بتاؤں گا ہمیں سر جوڑ کر بیٹھنا ہے اور پھر بات کرنی ہے اور مجھے امید ہے کہ ہم اس دشمن کو بھی ڈھونڈ نکالنے میں ضرور کامیاب ہو جائیں گے بس ذرا احتشام کی جانب سے پوری طرح اطمینان ہو جائے۔ انکل نے کہا۔

اور اس سے پہلے کہ میں مزید کوئی اور بات کرتی ڈاکٹر ذیشان اور آنٹی مجھے سامنے سے آتے ہوئے دکھائی دیے۔ آنٹی کے چہرے پر اس وقت جو خوشی اور طمانیت مجھ دکھائی دی اسے دیکھ کر میرے اندر بھی ڈھیروں اطمینان اتر آیا۔ آنٹی سیدھی میرے پاس آئیں اور مسکراتے ہوئے بولیں۔

"جاؤ بیٹی میرا بچہ تمہیں دیکھنے اور تم سے ملنے کے لیے بے تاب ہو رہا ہے۔"

"جی۔" میں نے ایک شرمگیں مسکراہٹ کے ساتھ سر جھکا کر کہا اور تیزی سے آگے بڑھ گئی۔

اندر آئی سی یو کی جانب چلتے ہوئے ڈاکٹر ذیشان بولے۔

"بھئی میں تو قائل ہو گیا کہ محبت میں بڑی طاقت ہوتی ہے۔"

"جی۔" میں نے رک کر حیرت سے انہیں دیکھا اور کہا۔

"یہی حقیقت ہے مس سرمئی کہ یہ صرف آپ کی محبت کی طاقت ہی تھی جو حشام کو آپ کی دل سے نکلی ہوئی بے تاب دعاؤں نے موت کے منہ سے اسے چھین لیا۔ ویسے میں آپ کو حقیقت بتاؤں کہ ہم تو اس کی زندگی سے تقریباً مایوس ہی ہو چکے تھے یا پھر ہمارا خیال تھا کہ اب شاید حشام کومے میں ہی اپنی زندگی کے دن پورے کرے گا۔"

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔" میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"لیکن اب ایسی کوئی بات نہیں ہے آپ جیت گئیں آپ کا پیار جیت گیا۔" انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا تو میں دھیرے سے مسکرا دی۔

ہم شیشے کے ایک بڑے سے دروازے کے ساتھ کھڑے تھے اندر کھڑے ایک گارڈ نے مجھے اور ڈاکٹر ذیشان کو دیکھا تو دروازہ کھول دیا۔ ہم اندر داخل ہو گئے یہ ایک بڑی سی راہداری تھی۔ سامنے ہی آپریشن تھیٹر تھا اور اس کے ساتھ ہی آئی سی یو وارڈ تھا۔

ڈاکٹر ذیشان نے وہاں رکھی ہوئے ربر کے سلیپر کی جانب اشارہ کیا کہ آپ اپنی چپلیں اتار کر انہیں پہن لیں۔ خود انہوں نے بھی سلیپر چینج کر لیے۔ اس عمل کے بعد ہم آگے بڑھے۔ آئی سی یو کا دروازہ بھی شیشے کا تھا۔ یہاں بھی ایک گارڈ کھڑا تھا اس نے دروازہ کھولا تو ہم اندر داخل ہو گئے۔ یہاں چار بیڈ تھے اور یہاں حشام کے علاوہ ایک اور بیڈ پر ایک مریض تھا۔

میری نگاہ سامنے والے بیڈ پر پڑی حشام آنکھیں موندیں لیٹا تھا۔ اس کے بازوؤں پر اب بھی سوئیاں لگی تھیں۔ ساتھ ہی اسٹینڈ پر ڈرپ لگی تھی۔ جس میں سے قطرہ قطرہ دوا نکل کر حشام کے بازو سے ہوتی ہوئی دل میں داخل ہو رہی ہے۔ سامنے ہی میز کے گرد کرسیاں ڈالے دو ڈاکٹرز موجود تھے۔ اس کے علاوہ دو نرسیں تھیں ایک حشام کے بیڈ کے پاس تھی اور دوسری دوسرے مریض کے پاس تھی۔

"پلیز سرمئی اپنے جذبات کو قابو میں رکھنا اور زیادہ بات مت کرنا یہ آئی سی یو ہے دوسرا مریض ڈسٹرب ہوگا۔" ڈاکٹر ذیشان نے میرے کان میں سرگوشی کی۔

حالانکہ حشام کو اس طرح بیڈ پر لیٹے دیکھ کر میرا دل پھٹا جا رہا تھا آنکھیں ایک بار پھر بہنے کے لیے تیار تھیں لیکن میں نے اپنے آپ کو سنبھالا اور بہت آہستگی سے حشام کے بیڈ کے نزدیک چلی گئی اور جیسے ہی میں وہاں پہنچی حشام نے اپنی آنکھیں کھول دیں۔ اس کے لب دھیرے سے مسکرانے کے انداز میں پھیل گئے پھر اس کے لبوں سے آہستہ سے سرگوشی میں میرا نام پھسل گیا۔

میں بھی دھیرے سے مسکرا دی۔ میری آنکھوں میں بھی آنسو تھے اور حشام کی آنکھیں بھی بھیگ گئیں۔ ڈاکٹر ذیشان نے مسکراتے ہوئے حشام کو دیکھا اور آہستہ سے نفی میں سر ہلایا۔ میں نے حشام کی انگلیوں میں تھرتھراہٹ دیکھی تو بے ساختہ اپنا لرزتا ہوا ہاتھ اس کی انگلیوں پر رکھ دیا اور بھیگے بھیگے لہجے میں دھیرے سے کہا۔

"کیسے ہو؟"

"دیکھ لو تمہارے بغیر کہیں نہیں جانے والا۔ موت کی وادی میں بھی نہیں۔" اس نے سرگوشی کی۔

"پلیز اب یہ نام مت لینا' اللہ تمہیں زندگی اور صحت دے۔" میں نے کانپتے ہوئے لہجے میں کہا تو حشام نے مسکراتے ہوئے اپنی آنکھیں موند لیں۔

"آؤ اب چلیں' جب ذیشان کو روم میں شفٹ کریں گے تب باتیں کرنا۔" ڈاکٹر ذیشان نے آہستہ سے کہا۔

"پلیز ڈاکٹر تھوڑی دیر اور......!" میں نے ملتجی انداز میں کہا تو ڈاکٹر ذیشان نے مسکراتے ہوئے نفی میں سر ہلا دیا۔

"میری ڈاکٹر تو یہ ہے اسے میرے پاس ہی رہنے دیں پلیز۔" حشام نے خاصے اونچے لہجے میں کہا تو وہاں موجود ڈاکٹر تیزی سے اٹھ کر آ گئی۔ تیز آواز میں ایک ہی جملہ بول کر حشام کی سانس تیز تیز چلنے لگی۔ بلڈ پریشر بتانے والا آلہ جو اس کے جسم پر لگا تھا اس کا گراف اوپر آنے لگا۔

"ڈاکٹر ذیشان آپ انہیں لے کر باہر جائیں۔ پھر نرس سے اس نے کوئی انجکشن لگانے کے لیے کہا۔

میں ذیشان کی حالت دیکھ کر گھبرا گئی۔ تو ڈاکٹر ذیشان میرا ہاتھ تھام کر مجھے باہر لے آئے باہر آ کر میں رونے لگی تو ڈاکٹر ذیشان نے مجھے سمجھایا کہ ابھی حشام بہت زیادہ کمزور ہے۔ اسے آئی سی یو میں رکھا ہوا ہے اس کی کوئی تو وجہ ہے ابھی ایک دو دن مزید لگیں گے تب وہ مزید بہتر ہوگا۔

"پلیز ڈاکٹر مجھے حشام کے پاس ٹھہرنے دیں میں وعدہ کرتی ہوں کہ ایک لفظ بھی نہیں بولوں گی۔" میں نے التجا کی۔

"لیکن وہ تو بولے گا۔ آپ سمجھ کیوں نہیں رہی ہیں۔ کسی بھی قسم کی کوئی جذباتی بات اس کے لیے بہتر نہیں ہے۔" ڈاکٹر ذیشان نے مجھے سمجھایا۔

"کیا حشام کا بی پی بہت بڑھ گیا ہے۔ اب کیا ہوگا؟" میں نے کہا۔

"اللہ خیر کرے گا۔ اسے ہلکی نیند کا انجکشن دینا پڑے گا آپ فکر نہ کریں۔ وہ جلد ٹھیک ہوگا۔"

باتیں کرتے ہوئے ہم نے اپنے سلیپر تبدیل کیے ڈاکٹر ذیشان نے مجھے شیشے کے دروازے کے پار کیا اور خود واپس اندر چلے گئے۔ میں انکل اور آنٹی کی جانب بڑھ گئی۔

میرے چہرے پر فکرمندی کے آثار دیکھے تو دونوں پریشان ہو گئے۔ تب پوچھنے پر میں نے ساری بات بتا دی۔

"وہ ایسا ہی جذباتی ہے۔" آنٹی نے محبت سے

چور لہجے میں کہا۔
ذرا ہی دیر بعد ڈاکٹر ذیشان واپس آ گئے اور بتایا کہ حشام اب بہتر ہے۔ اب بہتر یہی ہوگا کہ اب آپ لوگ کل اس سے ملیے گا۔ بلکہ میرا تو خیال ہے کہ آپ لوگ گھر جا کر آرام کریں۔ ہم یہاں موجود ہیں۔ اللہ تعالیٰ مزید بہتر کرے گا۔
انکل نے بھی یہی کہا کہ ہمیں اب گھر جا کر تھوڑا آرام کرنا چاہیے تو میں نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے کہا کہ ٹھیک ہے انکل میں بھی آپ لوگوں کے ساتھ آپ کے گھر چلتی ہوں۔
اتنے میں ایک گارڈ بہت تیزی سے ہماری جانب چلتا ہوا آیا اور بولا۔
"جناب بہت سے نیوز چینل والے اور اخباری نمائندے باہر آئے ہوئے ہیں اور وہ آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ آپ بتائیے کہ کیا حکم ہے۔"
"نیوز چینل والے۔" میں نے اچنبھے سے کہا۔
"یہ کیوں آئے ہیں۔ کیا انہیں اس بات کی خبر ہوگئی ہے کہ حشام کو ہوش آ گیا ہے۔ میرا تو خیال ہے کہ انہیں واپس بھیج دیتے ہیں۔"
"نہیں انہیں روکنے کی ضرورت نہیں ہے مجھے معلوم ہے مجھے ان سے کیا بات کرنی ہے۔ تم لوگ یہیں رکو میں آتا ہوں۔" انکل نے کہا اور گارڈ کے ساتھ آگے بڑھ گئے۔
"اف میرے اللہ یہ نیوز چینل والے بھی کتوں کی طرح خبروں کی بو سونگھتے پھرتے ہیں۔ کہاں کیا ہو گیا ہے یا ہو گیا انہیں سب پتا چل جاتا ہے۔" آنٹی نے اپنا سر پکڑ کر کہا تو میں ہنس دی آخر میرا تعلق بھی تو ایک نیوز چینل ہی سے تھا۔
میں آنٹی کو لے کر صوفے پر بیٹھ گئی تب ہی میرے فون کی بیل بجنے لگی۔ میں نے نمبر دیکھا تو گھر سے فون تھا میں سمجھ گئی کہ امی ہی ہوں گی اس لیے فون ریسیو کر لیا۔
"جی امی!" میں نے کہا۔
"بیٹا تم تو وہاں جا کر سب کچھ بھول ہی گئیں ایک فون ہی کر دیتیں حشام بیٹا کیسا ہے۔" امی نے شکایت کرنے کے بعد پوچھا۔
"حشام بہتر ہے امی! ابھی تو میں ان سے مل کر آئی ہوں۔ بس آپ کو فون کرنے ہی والی تھی کہ آپ کا فون آ گیا اور ہاں امی میں اسپتال سے انکل اور آنٹی کے ساتھ ان کے گھر جاؤں گی۔ آنٹی اکیلی ہیں نا۔"
"اللہ کا شکر ہے بیٹا کہ حشام اب بہتری کی جانب آ گیا ہے۔ ارے ہاں تمہارے جانے کے بعد شمروز آئے تھے حشام کی خیریت پوچھ رہے تھے۔ میں نے بتا دیا لو تم خود ہی ان سے بات کر لو۔" امی نے کہا تو ذرا سی توقف کے بعد مجھے شمروز بھائی کی آواز سنائی دی۔
"ہیلو سرمئی حشام اب کیسا ہے؟"
"بہتر ہے بھائی! بس اب اللہ سے دعا ہے کہ وہ جلد از جلد حشام کو بستر سے کھڑا کر دے۔"
"ان شاء اللہ ایسا ہی ہوگا۔" جواباً شمروز بھائی نے کہا پھر بولے۔ "سرمئی کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ میں حشام کو ایک نگاہ دیکھ لوں اس سے مل لوں۔"
"ابھی ایک دو دن رک جائیں بھائی ڈاکٹر جب حشام کو روم میں شفٹ کر دیں گے تب آپ ملنے آ جائیے گا لیکن آپ کو اپنی شکل و صورت میں تھوڑی تبدیلی کرنا ہوگی کیونکہ آپ کا یہاں آنا مناسب نہیں ہوگا۔" میں نے کہا۔
"یہ بات تو میں بھی جانتا ہوں سرمئی تم فکر نہ کرو میں اپنے آپ کو مکمل طور پر تبدیل کر کے آؤں گا اور ہاں روشن آنٹی بھی اسپتال آنا چاہ رہی ہیں میرا تو

خیال ہے کہ ہم انہیں برقعہ پہنا کر چہرے پر نقاب ڈال کر لا سکتے ہیں۔" شمروز بھائی نے کہا۔
"ٹھیک ہے بھائی اس بارے میں ہم بعد میں سوچیں گے۔" میں نے کہا۔
"اور ہاں سرمئی تمہارے لیے میرے پاس بہت اہم خبریں ہیں اور جہاں تک میں سمجھا ہوں ان خبروں کا تعلق حشام اور تمہاری ذات سے ہے۔ میرا خیال ہے کہ میں اس شخص تک پہنچ بھی گیا ہوں جو اس سارے معاملے کا ذمہ دار ہے۔" شمروز بھائی نے سرسراتے ہوئے لہجے میں کہا۔
"جی' آپ کا مطلب ہے کہ آپ اس شخص کو جان گئے ہیں' کون ہے وہ۔" میں نے تیزی سے کہا تو آنٹی نے چونک کر میری جانب دیکھا۔ تب مجھے احساس ہوا کہ مجھے یہاں بیٹھ کر یہ بات نہیں کرنی چاہیے۔ اس لیے میں فوراً اپنی جگہ سے اٹھی اور آنٹی کے قریب سے اٹھ کر دور چلی گئی۔
"میرے پاس تمہیں دکھانے کے لیے بھی کچھ ہے کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ میں خود تم سے مل لوں۔" انہوں نے کہا۔
اور اس سے پہلے کہ میں انہیں کوئی جواب دیتی مجھے انکل سامنے سے آتے ہوئے دکھائی دیے۔ تب میں نے سوچا کہ انکل کے مشورے کے بعد ہی میں شمروز بھائی سے کچھ کہہ سکتی ہوں۔ اس لیے ان سے کہا۔
"شمروز بھائی میں آپ کو تھوڑی دیر بعد کال کر کے بتاؤں گی۔ اس وقت آپ امی کے پاس ہیں نا' آپ وہیں رہیں اور کال کا انتظار کریں۔"
"ٹھیک ہے گڑیا' میں یہیں ہوں۔ تم فکر نہ کرو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میں تمہاری کال کا انتظار کروں گا۔" شمروز بھائی نے جواب دیا تو میں نے انہیں گڈ بائے کہا اور انکل کی جانب بڑھ گئی۔
"بات ہوگئی' کون کون سے چینل والے تھے کیا بات ہوئی؟" میں نے سوالات شروع کر دیے۔
"اطمینان سے بیٹھو سب بتاتا ہوں۔" انکل نے کہا تو میں صوفے پر بیٹھ گئی۔ انکل بھی بیٹھ گئے تب انہوں نے بتایا کہ "میں نے ابھی کسی کو بھی حشام کے ہوش میں آنے کے بارے میں نہیں بتایا ہے۔ یہ مشورہ مجھے ڈاکٹر ذیشان نے دیا ہے کہ ابھی ہمیں سب سے اس خبر کو چھپانا ہے جب تک حشام کافی بہتر نہیں ہو جاتا اور اس سے ایک فائدہ تو یہ ہوگا کہ ہمارا دشمن مطمئن رہے گا۔"
"وہ دشمن تو۔" میں نے آنٹی کی موجودگی کو محسوس کرتے ہوئے بات ادھوری چھوڑ دی۔ تو انکل بھی میری نگاہوں کے زاویے کو دیکھتے ہوئے خاموش رہے اور بولے۔
"سرمئی بیٹا تم اپنی امی کو فون کر کے بتا دو کہ تم ہمارے ساتھ ہی جا رہی ہو اب گھر چلو بڑی زور کی بھوک لگ رہی ہے گھر چل کر ناشتا کریں گے۔"
"جی انکل۔" میں نے کہا۔
آج اتنے دنوں کے بعد ہمیں بھوک کا احساس ہوا تھا۔ ورنہ جب سے یہ حادثہ ہوا تھا ہماری بھوک پیاس سب ہی مٹ گئی تھی۔
انکل نے ڈاکٹر ذیشان کو بتا دیا کہ ہم گھر جا رہے ہیں پھر ہم تینوں نیچے کار پارکنگ کی جانب آ گئے۔
میں اور آنٹی ایک جانب کھڑے تھے تب انکل گاڑی نکالنے چلے گئے اور اس وقت میں نے اپنی کار کو ایک بار پھر اسپتال کے گیٹ کی جانب آتے ہوئے دیکھا میں سوچنے لگی کہ اس میں کوئی آیا ہے۔
گاڑی میرے قریب آ کر رکی لیکن اس میں صرف آصف تھے مجھے وہاں کھڑے دیکھا تو پوچھا۔

"آپ یہاں کیوں کھڑی ہیں کہیں جا رہی ہیں کیا؟"

"ہاں میں انکل اور آنٹی کے ہمراہ ان کے گھر جا رہی ہوں آپ کیسے آئے ہیں؟"

"میں تو آپ لوگوں کے لیے ناشتا لے کر آیا تھا۔"

"ارے واہ یہ تو بہت اچھی بات ہے اب ہمیں ناشتا بنانا ہی نہیں پڑے گا ہم گھر جا رہے ہیں وہیں کھا لیں گے۔" میں نے خوش ہو کر کہا۔

"روشن نے بہت تکلیف کی۔" آنٹی نے تکلفاً کہا۔

"ارے کوئی بات نہیں ہے آنٹی' امی تو حشام سے بھی ملنے کے لیے بہت بے چین ہیں' حشام روم میں شفٹ ہو جائیں تو انہیں حشام سے ملوانے کے لیے لے آؤں گی۔" میں نے کہا۔

"وہ یہاں کیسے آسکتی ہیں؟" آنٹی نے حیران ہو کر کہا۔

"اس کی بھی ایک ترکیب میں نے سوچ لی ہے۔" میں نے دھیرے سے کہا۔

اتنے میں آصف گاڑی سے ناشتے کا سامان نکال لائے اور انکل بھی پارکنگ سے گاڑی لے آئے تو میرے اشارے پر آصف نے سامان انکل کی گاڑی میں رکھ دیا اور انکل سے کہا

"سر آپ ڈرائیونگ سیٹ چھوڑ دیں۔ میں آپ لوگوں کو لے جاتا ہوں۔ آپ تھکے ہوئے ہیں گاڑی کیسے ڈرائیو کریں گے۔"

"میں اگر تھک جاؤں گا تو یہ میری بیٹی ہے نا میرے ساتھ گاڑی یہ ڈرائیو کرے گی اور اب تو ویسے بھی تھکن اتر ہی گئی ہے۔ شاید آج نیند بھی آجائے۔" انکل نے خوش دلی سے کہا تو آصف واپس میری گاڑی کی جانب بڑھ گیا اور میں اور آنٹی انکل کی گاڑی میں بیٹھ گئے۔

گھر پہنچ کر ہم نے امی کا بھجوایا ہوا ناشتا کیا پھر نے انکل کو آرام کرنے کے لیے کہا تو وہ اپنے کمرے کی جانب بڑھ گئے۔ البتہ آنٹی میرے اصرار کے باوجود آرام کرنے کے لیے نہیں گئیں اور میرا ہاتھ پکڑ کر اور مجھے سینے سے لگا کر صوفے پر بیٹھ گئیں پھر مجھے اپنے سینے سے بھینچ بھینچ کر پیار کر رہی تھیں جیسے میں نہیں حشام ان کی بانہوں میں ہوں۔

اور میں نے سوچا کہ ماں ایسی ہی ہوتی ہے اسے اپنی اولاد سے تو پیار ہوتا ہی ہے اس کی اولاد جس سے پیار کرتی ہے وہ اس سے بھی پیار کرنے لگتی ہے۔

"کیا ہوا آنٹی۔" میں نے سر اٹھا کر ان کی جانب دیکھا تو ان کی آنکھوں میں ڈھیروں آنسو تھے۔ ان سے بات نہیں کی گئی تو محض سر ہلا کر رہ گئیں گویا کہہ رہی ہوں۔ "کچھ بھی تو نہیں۔"

"آپ پریشان مت ہوں آنٹی حشام ان شاءاللہ بالکل ٹھیک ہو جائیں گے میں ان سے ملی ہوں ان سے بات کی ہے بس چند روز کی بات اور ہے۔" میں نے سیدھے بیٹھ کر ان کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام کر محبت سے سہلاتے ہوئے تسلی بخش لہجے میں کہا۔

"ہوں۔" انہوں نے اس طرح زور سے کھینچ کر سانس لی جیسے نہ جانے کب سے روک رکھی ہو۔ پھر میرے چہرے کی جانب غور سے دیکھنے لگیں ان کی آنکھوں میں دنیا جہاں کی محبت چھپی تھی۔

"ایسے کیا دیکھ رہی ہیں۔" میں نے مسکرا کر پوچھا۔

"تمہیں پتا ہے سرمئی یہ تمہارا ہی نصیب ہے کہ اللہ پاک نے مجھ دکھی ماں کی ممتا کی لاج رکھ لی ہے۔ میرے حشام کو مجھے لوٹا دیا ہے ورنہ میں تو بہت ہی زیادہ بدنصیب ہوں۔ اتنی کہ کوئی ماں مجھ جیسی نہ ہوگی۔"

انہوں نے اپنے ہاتھ میرے ہاتھوں سے جدا کیے بنا نگاہیں نیچی کر کے کہا۔

"ایسا مت کہیں آنٹی۔" میں نے تیزی سے کہا۔

"حشام آپ کے بیٹے ہیں اور آپ ان کی ماں ہیں اور کہتے ہیں کہ ماں کے آنسوؤں اور فریاد سے تو عرش بھی کانپ جاتا ہے اور اللہ پاک کبھی ماں کے اپنی اولاد کے لیے پھیلے ہوئے ہاتھوں کو خالی نہیں لوٹاتا۔ یہ سب آپ کی دعاؤں کا کرشمہ ہی ہے آپ کے دن و رات کے سجدے ہیں کہ آخر اللہ کو ایک ماں پر رحم آ ہی گیا۔"

"ایسا اللہ پاک ضرور کرتا ہے لیکن ابھی تم نے کہا کہ ایک ماں کے ساتھ اور میں...... میں تو [illegible]" کہہ کر وہ اپنے دونوں ہاتھوں میں اپنا چہرہ چھپا کر رونے لگیں اور ان کی یہ بات سن کر میں بری طرح چونک گی کہ آنٹی نے یہ کہہ دیا۔

"کیا مطلب آنٹی...... آ...... آپ بھی تو...... آپ بھی تو حشام کی...... کیا آپ حشام کی ماں نہیں...... ہیں۔" میں نے اپنے ذہن میں اٹھتے ہوئے اس زہریلے سوال کو بالآخر کر ہی ڈالا۔

"آج میں تمہیں ایک بہت راز کی بات بتا رہی ہوں لیکن اس سے پہلے تم مجھ سے وعدہ کرو کہ تم یہ بات کبھی کسی کے سامنے نہیں کہو گی' حشام سے بھی نہیں میرے مرنے کے بعد بھی نہیں۔" انہوں نے بے ساختہ میرے چہرے کو اپنے ہاتھوں کے پیالے میں تھام لیا۔ ان کی آنکھوں اور لہجے میں ہزاروں التجائیں پوشیدہ تھیں۔

"وعدہ۔" میں نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے ان کی جانب دیکھتے ہوئے سرسراتے ہوئے لہجے میں کہا۔

"بتائیے نا کیا بات ہے؟"

"وہ بہت راز کی بات یہ ہے کہ میں حشام کی حقیقی ماں نہیں ہوں میں نے اسے جنم نہیں دیا ہے۔ میں تو یہ سوچ رہی تھی کہ میں تاحیات اس راز کی کسی کو بھی خبر نہیں ہونے دوں گی لیکن جب تم حشام کی زندگی میں آئیں اور تم نے اپنے بارے میں ہم سے کوئی بات نہیں چھپائی تو میرا ضمیر مجھے ملامت کرنے لگا کہ اگر میں تم سے اتنی اہم بات چھپا لیتی ہوں تو یہ تمہارے ساتھ سراسر بددیانتی ہوگی اور ویسے بھی میں تو ایک بدنصیب ماں ہوں لیکن تم نصیبوں والی ہو میں دن رات یہی سوچ رہی ہوں کہ اگر میرا حشام زندہ بچ گیا تو یہ تمہارا نصیب ہوگا اور میں تمہیں تمہاری پیدا کرنے والی اور [illegible] تمہیں پیار [illegible] کی اور آج جب ہم دونوں حشام سے مل کر آئے ہیں تو میں اب مزید اس راز کو تم سے چھپا نہیں سکتی اور ذرا دیکھو تو اللہ تعالیٰ نے تم دونوں کو کیسے ایک دوسرے سے ملایا ہے۔" انہوں نے کہا اور پھر خاموش ہو گئیں۔ پھر انہوں نے بہت تھکے تھکے انداز میں بے دم سی ہو کر اپنے آپ کو صوفے کی پشت گاہ کی جانب گرا دیا اور چھت کو گھورنے لگیں میں تھوڑی دیر تک انہیں گم صم بیٹھی اسی حالت میں دیکھتی رہی پھر پوچھا۔

"حشام کے ماں باپ کون تھے یا کہاں ہیں کیا انکل بھی حشام کے والد نہیں ہیں۔" تو انہوں نے نفی میں سر ہلا دیا پھر سیدھی ہو کر بیٹھ گئیں اور بولیں۔

"آج میں تمہیں اپنے بارے میں کچھ بتانا چاہتی ہوں سنو گی میری دکھ بھری داستان۔"

"جی آنٹی! میرے پاس بہت ٹائم ہے آپ بتائیں۔" میں نے نرم لہجے میں کہا تو وہ بولیں

"میرا تعلق ایک کھاتے پیتے گھرانے سے تھا ہم دو ہی بہن بھائی تھے بھائی جان ڈاکٹر تھے وہ انگلینڈ اسپیشلائز کے لیے گئے تھے وہیں انہیں ایک انگریز لڑکی "جوزی" پسند آگئی اور بھائی جان نے فون کر کے والدین کو یہ بات بتا دی کہ وہ جوزی سے شادی کر

رہے ہیں اور انہوں نے وہاں شادی کرلی۔

امی اور بابا جان کو اس بات کا بہت صدمہ ہوا کیونکہ بھائی جان ان کے اکلوتے بیٹے تھے اور بھائی جان کو لے کر امی کے دل میں ہزاروں ارمان تھے جیسے کہ ہر ماں کو ہی ہوتے ہیں۔

میں ان دنوں یونیورسٹی میں پڑھتی تھی۔ وہیں میری ملاقات تمہارے انکل سے ہوئی اور ہم ایک دوسرے کو پسند کرنے لگے تمہارے طلال انکل کا تعلق ایک مڈل کلاس فیملی سے تھا۔ ان کی صرف دو ہی بہنیں تھیں۔

میں نے امی کو جب اپنی پسند سے آگاہ کیا اور طلال کے بارے میں بتایا تو یہ جان کر کہ طلال کا تعلق ایک مڈل کلاس فیملی سے ہے ہتھے سے ہی اکھڑ گئیں اور انہوں نے صاف صاف کہہ دیا کہ طلال سے تمہاری شادی نہیں ہوسکتی.......لیکن.......

میرے بابا جان نے طلال سے ملنے کے بعد فیصلہ میرے حق میں دے دیا۔ طلال کے والد بھی ایک صحافی ہی تھے۔ بہت نڈر اور بے باک ایک سچے انسان۔ اپنے قلم اور پیشے کی لاج نبھانے والے طلال بھی ایسے ہی تھے۔ پیسانہ ہونے کے باوجود بابا جان کو طلال کی ان ہی خوبیوں نے یہ فیصلہ کرنے پر مجبور کردیا۔

میری شادی ہوگئی اور شادی کے ایک ہفتے کے بعد ہی امی کو دل کا اتنا شدید دورہ پڑا کہ وہ جان بر نہ ہوسکیں۔

میں مہینوں بلکہ سالوں اپنے آپ کو امی کا مجرم ٹھہراتی رہی ان کی موت کا ذمہ دار ٹھہراتی رہی۔ امی کے انتقال پر بھائی جان تنہا ہی پاکستان آئے تھے۔ تنہائی میں انہوں نے بہت دکھ سے مجھے یہ بات بتائی کہ وہ جوزی سے حقیقی محبت کرتے ہیں اور نہ تو اسے چھوڑنا چاہتے ہیں اور نہ ہی دوسری شادی کرنا چاہتے ہیں۔

"لیکن بھائی جان ایسی کیا بات ہوئی ہے آپ لوگوں کے درمیان جو آپ اس حد تک جا کر سوچ رہے ہیں۔" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"کیا بتاؤں بے بی۔" بھائی جان نے ندامت اور شرمندگی سے سر جھکا کر کہا۔ "جوزی بچے پیدا کرنا نہیں چاہتی جبکہ میری شدید خواہش ہے کہ میرے ہاں بچے پیدا ہوں۔ وہ بھی ڈھیر سارے۔ اس بات کو لے کر ہمارے درمیان کئی مرتبہ جھگڑا ہوا ہے میں نے اسے ہر طرح سے سمجھالیا ہے لیکن وہ بس ایک ہی بات کہتی ہے کہ اگر مجھ سے پیار کرتے ہو تو بچے کا نام مت لو۔"

"یہ فیصلہ بھی تو آپ ہی کا تھا۔ اب آپ بھگتیں۔" میں نے کہا اور اٹھ کر آ گئی۔ میں یہ بات نہیں جانتی تھی کہ قدرت میرا کتنا بڑا امتحان لینے والی ہے۔

میری شادی کو سال ہونے والا تھا اتفاق سے ڈاکٹر نے وہی ڈیٹ دی تھی جو ہماری شادی کی ڈیٹ تھی۔ بس چند دن ہی میرے گھر خوشی آنے میں تھے کہ ایک دن بابا جان بھی چپ چاپ اس دنیا سے چلے گئے۔ ان کی اچانک موت کا میرے اوپر بہت شدید اثر ہوا اور اسی رات ایک بہت تکلیف دہ عمل سے گزر کر میں نے ایک مردہ بیٹے کو جنم دیا۔

میرے دل پر دہرا صدمہ تھا ایک والد کی جدائی کا اور ایک اپنی پہلی اولاد کا طلال نے اس وقت مجھے بہت جذباتی سہارا دیا۔ انہوں نے میرا بہت خیال رکھا اور مجھے تسلیاں دیں کہ شاید یہ سب تمہارے والد کی اچانک موت کے صدمے کی وجہ سے ہوا ہے اور میں برابر طلال سے یہ کہتی رہی کہ نہیں یہ سب میرے اس جرم کی سزا ہے جو میں نے اپنی ماں کا دل دکھا کر

پائی ہے وہ میری تم سے شادی کے حق میں نہیں تھیں۔ طلال مجھے بار بار سمجھاتے کہ یہ سب تمہارا وہم ہے یا تمہارے اندر کا احساس جرم ہے ورنہ یہ سب تو منجانب اللہ ہے اور ہمارے نصیب میں تھا۔

اور پھر یہ سلسلہ چل پڑا اگلے سال پھر ایسا ہی ہوا اس بار پھر میں نے ایک مردہ بیٹے کو جنم دیا پھر تیسرے سال تیسرا بچہ مردہ ڈیڑھ سال کے بعد مردہ بچی پھر ایک سال کے بعد ایک اور مردہ بیٹی.......

پے در پے صدموں نے مجھے نڈھال کردیا تھا میں برسوں کی بیمار نظر آنے لگی حیرت ہوتی ہے خود پر کہ میں زندہ کیسے رہی مر کیوں نہیں گئی۔

اور ان ہی دنوں بھائی جان کا فون آیا اور انہوں نے مجھے اور طلال کو انگلینڈ بلوایا۔ انہوں نے یہ خوش خبری سنائی کہ جوزی ماں بننے والی ہے لیکن اس کی طبیعت ٹھیک نہیں رہتی تم اور طلال دونوں یہاں آجاؤ میں ٹکٹ بھجوا رہا ہوں۔ ان دنوں میری کوکھ میں ایک اور بچہ پرورش پا رہا تھا۔ اس لیے میں نے بھائی جان سے صاف انکار کردیا کہ میں سفر نہیں کرسکتی۔ میری حالت بھی ایسی ہی ہے۔

تب بھائی جان نے کہا کہ یہاں انگلینڈ میں ایک سے ایک بہترین گائنی کی ڈاکٹرز موجود ہیں۔ یہاں آنا تمہارے لیے بھی فائدہ مند ہوگا تم یہاں کے بہترین ڈاکٹرز کی زیر نگرانی میں رہنا تم دیکھنا ان شاء اللہ اس مرتبہ تمہاری گود خالی نہیں رہے گی۔

بھائی جان کا یہ مشورہ سن کر میں سوچ میں پڑ گئی تب طلال نے کہا کہ اس میں سوچنے کی کیا بات ہے ہمیں فوراً ہی انگلینڈ روانہ ہوجانا چاہیے۔

ہمارے لیے ویزہ اور ٹکٹ وغیرہ بھائی جان نے بھیجے اور ہم انگلینڈ پہنچ گئے۔ اتفاق سے جتنا ٹائم ڈلیوری میں میرا باقی تھا اتنا ہی جوزی بھابھی کا تھا۔ میں پہلی مرتبہ بھابھی سے ملی تھی اور پہلی ہی مرتبہ انہیں دیکھا تھا۔ بھائی جان نے نہ تو کبھی ان کی کوئی تصویر بھیجی تھی اور نہ ہی جب امی کے انتقال پر آئے تھے تو اپنے ساتھ لائے تھے سچ تو یہ ہے کہ ہمیں ان کی ذات سے کوئی دلچسپی ہی نہیں تھی اور نہ ہی انہیں دیکھنے کی چاہ تھی۔

وہ بہت محبت کے ساتھ مجھ سے ملیں ان کا خلوص اور اخلاق دیکھ کر میں حیران رہ گئی۔ وہ اردو بول رہی تھیں اور لباس بھی مشرقی ہی تھا یعنی انہوں نے شلوار قمیص پہنا ہوا تھا البتہ ان کی صحت مجھے ڈاؤن لگ رہی تھی۔ نکاح سے پہلے ہی وہ مسلمان ہوچکی تھیں۔

میں بھائی جان کے گھر پر رہنے لگی۔ بھائی جان کے ہی مشورے پر میں نے اس گائناکولوجسٹ سے اپنا چیک اپ کروایا جس کی زیر نگرانی بھابھی تھیں۔ بھابھی نے میرے لیے بہت سی نیک خواہشات کا اظہار کیا اور خلوص دل سے دعا کی کہ اللہ تعالیٰ اس مرتبہ تمہاری گود بھر جائے۔ پھر اپنی بات کہہ کر خاموش ہوگئیں اور پھر معنی خیز لہجے میں بولیں تم دیکھ لینا اس مرتبہ جب تم اپنے گھر لوٹو گی تو تمہاری گود خالی نہیں ہوگی ان شاء اللہ۔

میں اس وقت اتنے یقین سے کہی گئی اس بات کی تہہ تک نہ پہنچ سکی کاش میں اس وقت سمجھ جاتی کہ بھابھی یہ بات کیوں کہہ رہی ہیں۔

پورے تین ماہ ہوگئے اور پھر ایک دن اس طرح درد و اذیت میں مبتلا ہوگئی جیسے اس سے پہلے پانچ مرتبہ ہوچکی تھی درد کی ایک تیز لہر اٹھتی اور میں دہری ہوجاتی اور اس وقت بھی دل میں اللہ سے دعا کر رہی تھی کہ اللہ پاک مجھے زندہ بچہ عطا کرے ڈاکٹر بھی آخری وقت تک تسلی دیتی رہی کہ بے فکر رہو تمہارا بے بی بالکل ٹھیک ٹھاک ہے۔

بالآخر میں نے اس درد و اذیت سے نجات حاصل کر ہی لی اور میرے کانوں میں دنیا کی سب سے دل کش آواز یا پھر وہ آواز مجھے دل کش لگی ایک زندہ سلامت بچے کے رونے کی آواز سنی اور اس خوب صورت اور پرسکون احساس کے ساتھ آنکھیں موند لیں کہ اس مرتبہ واقعی اللہ نے مجھے زندہ سلامت بچہ عطا فرمایا ہے ورنہ اس سے پہلے تو ہمیشہ ہمارے کان اس آواز سے ترستے ہی رہے تھے۔

دو دن، صرف دو دن میں نے اپنے بانہوں میں اس بچے کے نرم و نازک وجود کے لمس سے سرشاری کی اور پھر اسے عجیب سے دورے پڑنے لگے اس کا سارا جسم نیلا ہو کر اکڑ جاتا۔ ڈاکٹرز نے لاکھ کوششیں کیں لیکن وہ بھی میری منحوس گود سے نکل کر منوں مٹی تلے جا سویا۔

میں تو اپنے حواس کھونے لگی۔ نیم پاگل سی ہونے لگی طلال اور بھائی جان کے ساتھ ساتھ جوزی بھابھی بھی میری دل جوئی کر رہی تھیں۔ میں نے دیوانگی کی حالت میں انہیں جھنجوڑ ڈالا کہ آپ نے تو کہا تھا کہ اس مرتبہ تمہاری گود خالی نہیں رہے گی یہ دیکھیں میری گود خالی ہے میں نے اپنے دونوں کو پھیلا کر کہا تو انہوں نے مجھے سینے سے لگا لیا اور بہت پرسکون اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولیں۔

"ہاں ہاں میں ابھی بھی یہی کہہ رہی ہوں کہ تمہاری گود خالی نہیں رہے گی۔"

ان کی بات سن کر مجھ سمیت طلال اور بھائی جان نے بھی انہیں چونک کر دیکھا اور ان کے جملے میں چھپا مطلب کھوجنے لگے۔

پھر بھابھی کی طبیعت خراب ہو گئی تکلیف شروع ہونے کے ساتھ ہی ان کا بی پی خطرناک حد تک بڑھ گیا۔ اس موقع پر ڈاکٹر نے بھائی جان سے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا تو بھابھی نے انہیں فوراً روک دیا۔

"پلیز ڈاکٹر آپ نے مجھ سے وعدہ کیا تھا۔" ان کی آنکھوں اور لہجے میں ہزاروں التجائیں تھیں الجھی الجھی سی ڈاکٹر خاموش رہی۔

"کیا بات ہے ڈاکٹر آپ کچھ کہنا چاہ رہی تھیں۔" بھائی جان نے بے تابی سے پوچھا۔ "آپ نے جوزی سے کیسا وعدہ کیا تھا۔"

"کچھ نہیں۔" ڈاکٹر نے بے بسی سے سر جھٹک کر جواب دیا پھر بولی۔ "ان کا آپریشن کرنا پڑے گا۔"

بھابھی کی ایسی حالت دیکھ کر ذرا دیر کو میں بھی اپنا دکھ بھول گئی۔ اسپتال میں ہم تینوں ہی موجود تھے۔ جب ایک نرس نے آ کر ہمیں خوش خبری سنائی کہ بھائی جان ایک بیٹے کے باپ بن گئے ہیں۔

ابھی ہم ڈھنگ سے خوش بھی نہیں ہو پائے تھے کہ وہی ڈاکٹر آئی اور بولی۔ "آئی ایم سوری مسٹر اسلام شیخ آپ کی وائف کی حالت ٹھیک نہیں ہے اور وہ آپ کو اور مسز طلال کو بلا رہی ہیں۔"

"کک...... کیا ہوا جوزی کو......؟" بھائی جان نے بوکھلا کر کہا۔

"میں بعد میں آپ کو ساری بات بتاؤں گی فی الحال آپ ان سے مل لیں۔"

پھر ہمیں وہ اپنے ہمراہ لے کر اندر گئی بھابھی کے جسم پر بہت سی مشینیں لگی تھیں۔ منہ پر آکسیجن ماسک بھی لگا تھا۔ بھابھی کے اشارے پر ڈاکٹر نے وہ ماسک اتار دیا۔ تب بھابھی نے بہت کمزور اور نحیف لہجے میں بھائی جان کو پکارا تو وہ ان پر جھک گئے۔ بھابھی بولیں۔

"اسلام میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے تمہیں ایک بچے کی خواہش تھی نا اور تمہاری لاکھ خواہش کے باوجود میں بچہ پیدا کرنا نہیں چاہتی تھی۔ وہ اس لیے...... اس لیے اسلام کے بچے کو پانے کے بعد تم ہمیشہ کے لیے مجھے کھو دیتے۔" اتنا کہہ کر بھابھی رکیں اور گہری گہری سانسیں لینے لگیں۔

"ڈاکٹر جوزی کو سنبھالیں پلیز۔" بھائی جان نے گھبرا کر کہا تو بھابھی نے ہاتھ کے اشارے سے ڈاکٹر کو روک دیا اور کہا۔

"مجھے ڈاکٹر نے بچہ پیدا کرنے سے منع کیا تھا لیکن اب مجھ سے تمہاری بے چینی اور بے قراری دیکھی نہیں جاتی تھی میری خواہش ہے کہ میرا بیٹا حشام میں نے اس کا نام حشام رکھ دیا ہے۔" انہوں نے بہ مشکل مسکرانے کی کوشش کی۔ "اس کو...... اس کو...... ماریہ...... کی گود میں دے دو۔" بہ مشکل اٹک اٹک کر بات کرنے میں ہی ان کی سانس اکھڑنے لگی۔ تب ڈاکٹر آگے بڑھی اور آکسیجن ماسک ان کے منہ پر لگانے لگی تب بھابھی نے اپنا ہاتھ اٹھا کر ماسک اپنے منہ سے ہٹا دیا اور گہرے گہرے سانسیں لیتے ہوئے بولیں۔

"ماریہ...... میں...... میں نے...... آپ...... اپنا وعدہ...... پو...... پورا کر دیا ہے۔" وہ اس وقت بہت کھینچ کر سانس لے رہی تھیں تب وہاں موجود ڈاکٹر اور نرسوں نے ہمیں وہاں سے باہر نکالا دیا۔ ڈاکٹر انہیں فوری طور پر کئی ٹریٹمنٹ دینے لگی۔

بھائی جان کی حالت بھی خراب ہونے لگی ان کا چہرہ اور آنکھیں سرخ انگارہ ہو رہی تھیں۔ طلال انہیں سنبھال رہے تھے اور میری تو جیسے عقل ہی ماؤف ہو گئی تھی کچھ بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔

اور پھر مجھ پر ایک اہم انکشاف ہوا کہ نہ صرف بھائی جان جوزی بھابھی سے بے انتہا پیار کرتے تھے بھابھی بھی انہیں بے انتہا چاہتی تھیں۔ شاید بچہ پیدا کرنے کے عمل سے گزرتے ہوئے شاید ان کی زندگی کو کوئی خطرہ تھا اس لیے ڈاکٹر نے انہیں یہ رسک لینے سے منع کیا تھا لیکن مسلسل انکار کرنے کے بعد بالآخر انہوں نے بھائی جان کی خواہش کے آگے ہتھیار ڈال ہی دیے۔ کاش وہ یہ بات بھائی جان کو پہلے ہی بتا دیتیں۔ بعد میں بھائی جان نے مجھے یہ بھی بتایا کہ جوزی جن کا اسلامی نام بھائی جان نے عائشہ رکھا تھا۔

اور پھر ڈاکٹر نے دس منٹ بعد ہی آ کر وہ روح فرسا خبر سنا دی کہ میرے محسن بھائی جان کی محبت عائشہ ہمیشہ کے لیے اس دنیا کو چھوڑ کر چلی گئی ہیں۔

حشام میری گود میں آیا تو میں اپنے سارے غم بھول گئی لیکن بھائی جان جیسے ساری دنیا کو فراموش کر بیٹھے۔ انہوں نے پلٹ کر ایک بار بھی حشام کو نہیں دیکھا نہ گود میں لیا اور نہ ہی پیار کیا۔

بعد میں ڈاکٹر نے ہمیں بتایا کہ عائشہ بھابھی کے ساتھ کوئی ایسا سنگین مسئلہ تھا کہ وہ بچہ پیدا نہیں کر سکتیں۔ ایسا کرنے میں ان کی جان کو خطرہ ہے لیکن بھابھی نے بھائی جان کی خواہش کو پورا کرنے کی خاطر اپنی جان کی قربانی دے دی اور اسی بات کو راز رکھنے کا وعدہ انہوں نے ڈاکٹر سے لیا تھا۔

بھائی جان کا اب دنیا سے دل اچاٹ ہو گیا تھا انہوں نے کہا کہ تم لوگ حشام کو لے کر پاکستان چلے جاؤ وہاں سب سے یہی کہنا کہ یہ تمہارا بچہ ہے اور میری بیوی کا انتقال ہو گیا ہے یہ کسی کو نہ بتایا کہ بچے کی پیدائش کے دوران اس کی ڈیتھ ہوئی تھی۔

"بھائی جان آپ بھی ہمارے ساتھ چلیے نا...... یہاں تنہا کیسے رہیں گے۔" میں نے حشام کو سینے سے لگاتے ہوئے روتے ہوئے کہا۔

"نہیں ماریہ، میں ساری زندگی عائشہ کی یادوں

کے ساتھ گزارنا چاہتا ہوں۔ یہ گھر جیسے اس نے اپنے ہاتھوں سے سجایا اور سنوارا تھا یہاں کے گوشے گوشے میں اس کی یادیں بکھری ہوئی ہیں۔ یہ سب کچھ بھی مجھ سے چھن گیا تو میں زندہ نہیں رہ پاؤں گا۔"

میں اور طلال جب پاکستان آنے لگے تو میں نے بھائی جان سے بہت کہا کہ ایک بار تو اپنے بچے کو سینے سے لگا کر پیار کر لیں لیکن انہوں نے منہ پھیر لیا اور بولے کہ اگر انہوں نے ایک بار بھی اسے اپنے سینے سے لگا لیا تو پھر خود سے جدا کرنا مشکل ہو جائے گا یا پھر یہ بھی ہو سکتا تھا کہ انہیں یہ خیال آ رہا ہو کہ اس بچے کی خواہش نے ان کی محبت کو ان سے چھین لیا۔

بھائی جان نے ڈاکٹر سے مل کر عائشہ بھابھی کے احترام میں برتھ سرٹیفکیٹ میں والدین کے نام کی جگہ میرا اور حشام کا نام لکھوا دیا تھا اسپتال اور ڈاکٹر کا نام البتہ حقیقی ہی تھا۔ میں حشام کو لے کر پاکستان آ گئی اور صرف ایک سال کے قلیل عرصے میں بھائی جان بھی بھابھی کے پاس پہنچ گئے دنیا سے جانے سے قبل وہ اپنی تمام جائیداد اور مال و متاع حشام کے نام کر گئے تھے۔ ان کے وکیل کا فون آیا تھا تمام جائیداد کا پاور آف اٹارنی انہوں نے طلال کو مقرر کر دیا تھا۔

کچھ عرصہ کے بعد طلال انگلینڈ گئے اور تمام جائیداد بیچ کر واپس آ گئے۔ جس وقت طلال سے میری شادی ہوئی تھی اس وقت طلال کے پاس کچھ بھی نہیں تھا سوائے ایک چھوٹے سے مکان کے لیکن آج بہت کچھ ہے میرے والدین اور بھائی جان کی جانب سے ملا ہوا۔

تمہیں پتا ہے سرمئی...... میری گود ہی منحوس ہے میری کوکھ سے جنم لینے والا میرا کوئی بھی بچہ زندہ دنیا میں نہیں آیا لیکن عائشہ بھابھی کا حشام جس نے میری ممتا کی بھڑکتی ہوئی آگ کو ٹھنڈا کر دیا۔

اور آج جب وہ ماشاء اللہ چھبیس سال کا بھرپور نوجوان ہو چکا ہے تب موت ایک بار پھر اسے مجھ سے چھیننے کے لیے آ گئی لیکن اب یہ تمہارا ہے اور تم اس کی ہو میں نے اور طلال نے ایک فیصلہ کر لیا تھا کہ ہم تمہیں ہی اپنی بہو بنائیں گے اور دیکھو میری بد نصیبی نے اسے موت کے منہ میں پہنچا دیا لیکن تمہارا نصیب اسے موت کے منہ سے کھینچ لایا ہے اس لیے تم مجھے بہت پیاری ہو۔

ایک بات اور بتاؤں حشام کے بعد ہم نے آئندہ کسی اور بچے کو پلان ہی نہیں کیا۔ میں اسے یہی بتاتی ہوں کہ چھ بچوں کے بعد اللہ نے تمہیں دیا تھا اور میں علاج کی غرض سے تمہاری پیدائش کے وقت انگلینڈ گئی تھی۔"

"آپ کوئی فضول بات مت سوچیں آنٹی...... کوئی نہ تو منحوس ہوتا ہے اور نہ ہی بد نصیب نصیب تو اللہ نے لکھے ہیں۔ وہ سب کام اچھے ہی کرتا ہے۔ حشام آپ کے بیٹے ہیں اور ہمیشہ رہیں گے۔" میں نے ان کے گلے میں بانہیں ڈالتے ہوئے کہا اور ان کے سینے سے لگ گئی۔

باتیں کرتے ہوئے ہمیشہ احساس ہی نہیں ہوا کہ کتنا سارا وقت گزر گیا ہے شاید کئی گھنٹے گزر گئے تھے۔

تب ہی طلال انکل نیند سے اٹھ کر نیچے لاؤنج میں آ گئے اور ہمیں وہاں بیٹھا دیکھ کر حیرانی سے بولے۔

"ارے تم لوگ ابھی تک یہیں بیٹھی ہو کیا باتیں ہو رہی ہیں۔"

"کچھ نہیں انکل بس ایسے ہی اِدھر اُدھر کی باتیں تھیں میں آنٹی سے حشام کے بچپن کے قصے سن رہی تھی۔" میں نے کہا تو انکل ہنس پڑے اور بولے۔

"بھئی اچھی سی چائے پلواؤ تو میں کچن میں چائے بنانے چلی گئی۔ آنٹی نے چائے ہاتھ میں لی اور اپنے کمرے میں چلی گئیں۔ وہ بہت مطمئن دکھائی دے رہی تھیں۔

اور میں سوچ رہی تھی اب پتا چلا کہ حشام ایک انگریز ماں کے بیٹے ہیں جب ہی اتنے خوب صورت ہیں میں نے بارہا یہ بات سوچی تھی کہ حشام میں نہ تو طلال انکل کی مشابہت ہے اور نہ ہی آنٹی کی کتنی حیرت کی بات ہے کہ گورے چٹے حشام کو مجھ جیسی سانولی سلونی لڑکی پسند آئی وہ بار بار اس بات کا اظہار کرتا تھا کہ اسے میری جھیل جیسی گہری بڑی بڑی سیاہ آنکھیں اور کالی گھٹاؤں جیسے بڑے بال پسند ہیں۔ وہ منہ بنا کے کہتا۔ "مجھے گوری لڑکیاں کبھی پسند نہیں آئیں مجھے تو شام کا سانولا پن پسند ہے برسات کے دنوں کی گہری سانولی شام۔"

اور میں چڑ کر اسے ایک مکا مارتی کہتی۔ "صاف صاف کیوں نہیں کہتے کہ تم "کالی کلوٹی ہو۔" تو مزے سے کہتا۔ "اچھا تمہیں یہ نام پسند ہے تو یہ رکھ دیتا ہوں اور میں مزید مکوں سے اس کی پٹائی کرتی اور وہ ایک دم سے میرے دونوں ہاتھ تھام لیتا اور خمار آلود سنجیدگی سے میری آنکھوں میں جھانک کر کہتا۔

"جانم تمہیں اپنے حسن جہاں سوز کا اندازہ ہی نہیں ہے۔ میں تو اسی دن تمہاری ان جھیل جیسی آنکھوں میں ڈوب کر فنا ہو گیا تھا جس دن پہلی دفعہ تمہیں دیکھا تھا۔"

اور میں گھبرا کر اپنی نگاہیں نیچی کر لیتی اور اپنے اتھل پتھل ہوتے دل کو سنبھال کر منہ پھیر کر کہتی۔

"بکواس کرنا تو کوئی تم سے سیکھے۔"

"بکواس کی کیا بات ہے یار......! سارے رومانس کا بیڑہ غرق کر دیتی ہو کبھی تو پیار سے بات کر لیا کرو۔"

میں چائے کی پیالی ہاتھوں میں تھامے سوچوں میں گم بیٹھی تھی۔ تب ہی انکل نے گلا کھنکھار کر مجھے اپنی جانب متوجہ کیا تو میں ہوش کی دنیا میں واپس آ گئی۔

انکل بہت غور سے میری جانب دیکھ رہے تھے بولے۔ "کیا سوچ رہی تھیں۔"

"کچھ بھی تو نہیں۔" میں نے اس طرح گھبرا کر جلدی سے جواب دیا جیسے انکل نے میری سوچ کو پڑھ لیا ہو۔ پھر گھبرا کر کہا۔ "وہ انکل...... میں یہ سوچ رہی تھی کہ...... ہاں...... میں یہ سوچ رہی تھی کہ......!"

"حشام گھر کب آئے گا۔" انہوں نے مسکراتے ہوئے میرا جملہ مکمل کر دیا۔

"ہاں یہی تو۔" میں نے بلا سوچے کہا تو انکل زور سے ہنس پڑے ان کی آنکھوں میں اور ہنسی میں شرارت تھی۔ میں بری طرح جھینپ گئی تو بولے۔

"میں اس حقیقت سے واقف ہوں کہ تم دونوں ایک دوسرے سے بہت پیار کرتے ہو۔" میں نے انکل کی بات سن کر سر جھکا لیا میں بھلا اس بات کے جواب میں کیا کہتی اور نہ چاہتے ہوئے بھی غیر ارادی طور پر میرے منہ سے ایک جملہ پھسل پڑا۔

"انکل آپ بھی حشام سے بہت پیار کرتے ہیں؟"

"یس آف کورس ہی مائی سن۔" انہوں نے چمکتی ہوئی آنکھوں سے فخریہ لہجے میں کہا۔ تو میں انہیں دیکھتی رہ گئی پچھلے دنوں جو حالت میں نے انکل کی دیکھتی تھی اسے دیکھ کر اس بات کو مان ہی نہیں سکتا کہ انکل طلال حشام کے والد نہیں ہے۔

"جی!" میں صرف اتنا کہہ سکی پھر اپنے احمقانہ سوال پر انہیں سوری کہا تو انہوں نے نرم مسکراہٹ کے سات "ڈونٹ وری۔" کہہ دیا۔

اچانک مجھے شمروز بھائی کے ساتھ صبح ہونے والی فون کی گفتگو یاد آ گئی تو میں نے کہا۔

"انکل آپ سے ایک بہت ضروری بات کرنا ہے اس کا تعلق حشام سے ہے کیا ہم اس وقت اس موضوع پر گفتگو کر سکتے ہیں۔"

"میرا خیال ہے بات تو ہمیں کرنی ہے اس لیے ہم اسٹڈی میں چل کر بیٹھتے ہیں پھر اطمینان سے وہاں گفتگو کریں گے۔"

میں نے بھی انکل کے خیال سے اتفاق کیا اور ہم اوپر اسٹڈی روم میں چلے گئے جانے سے پہلے میں نے ان کے کمرے میں جھانک کر دیکھا تو وہ سو رہی تھیں۔ ان کی جانب سے اطمینان ہوا تو میں انکل کے پیچھے چل دی۔

"ہاں اب بتاؤ تم کیا کہنا چاہ رہی تھیں۔" انکل نے اپنی مخصوص چیئر پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

تب میں نے انہیں شروع سے لے کر ساری بات بتادی جاوید کے ساتھ اس کے مووی کیمرے سے اسی روز والی ویڈیو کیسٹ کے نکالنے سے لے کر کرنل مشتاق کے حوالے کرنے تک اور پھر آج صبح شمروز بھائی کے ساتھ ہونے والی گفتگو بھی میں نے انکل کو بتادی۔

شمروز بھائی والی بات سن کر انکل نے بڑے پر جوش لہجے میں کہا۔ "بیٹی اسے ابھی اور اسی وقت یہاں بلوالو اگر اس کے لیے آنا ممکن ہو تو۔"

"ٹھیک ہے انکل میں ابھی ان سے بات کرتی ہوں۔" میں نے شمروز بھائی کو کال کر کے پوچھا کہ کیا وہ حشام کے گھر آ سکتے ہیں تو انہوں نے کہا کہ آ سکتا ہوں۔ بلکہ میں تو خود یہ چاہ رہا تھا کہ طلال صاحب سے مل کر ان سے ساری بات کروں اور کچھ دکھاؤں بھی، میں نے ساری تیاری کرلی ہے بس تمہیں میرا تھوڑا انتظار کرنا ہوگا۔ ایک گھنٹہ لگے گا۔"

"ٹھیک ہے آپ اطمینان سے آ جائیں میں اور انکل آپ کا انتظار کر رہے ہیں گھر میں سب ٹھیک ہے نا امی اماں اور بابا وغیرہ۔" جواب میں انہوں نے سب ٹھیک ہے کہا تو میں نے سوچا کہ امی سے ہی دو تین باتیں کرلوں۔ پھر امی سے دو چار باتیں کیں پھر فون رکھ دیا، میں فون کر کے فارغ ہوئی تو انکل کسی سے فون پر بات کر رہے تھے۔ فون بند کرنے کے بعد انہوں نے بتایا کہ وہ ڈاکٹر ذیشان سے بات کر رہے تھے۔ انہوں نے حشام کی خیریت معلوم کی تھی۔

جواب میں ڈاکٹر ذیشان نے بتایا کہ حشام اب ٹھیک ہے۔ حشام ان سے ناراض ہو رہا تھا کہ انہوں نے اس کا اصل ڈاکٹر بھگا کر اچھا نہیں کیا۔" آخری جملہ کہہ کر ہنس پڑے۔

"انکل پلیز مجھے تو بتادیں کہ حشام کس پروجیکٹ پر کام کر رہا تھا وہ کس کے خلاف ایسی کون سی رپورٹ بنا رہا تھا کہ اس کے ساتھ یہ سب ہوا۔"

میرا سوال سن کر انکل خاموش ہو گئے اور ایک گمبھیر سنجیدگی نے ان کے چہرے کا احاطہ کرلیا۔

انکل کی اتنی گمبھیر خاموشی دیکھ کر مجھے عجیب سی شرمندگی بھی ہو رہی تھی اور یہ احساس بھی کہ کیا وہ بات ایسی ہے کہ نہ تو حشام نے اس کو مجھ سے شیئر کیا اور نہ ہی اب انکل کچھ بتانا چاہ رہے ہیں۔ میں بس خاموشی سے سر جھکائے اپنے ہاتھوں کو الٹ پلٹ کر دیکھتی رہی۔ تب انکل نے بہت بھاری لہجے میں کہنا شروع کیا۔

"سرمئی بیٹا حقیقت تو یہ ہے کہ وہ بات بہت زیادہ کانفیڈینشل تھی اور اس بات کا علم سوائے میرے اور حشام کے کسی اور کو نہیں تھا تمہیں بھی اسی لیے نہیں بتایا کہ راز جب ہی تک راز رہتا ہے جب تک اپنے سینے میں محفوظ رہے زبان سے اگر ایک دفعہ بات نکل جائے تو وہ پرائی ہو جاتی ہے لیکن میں پہلے دن سے لے کر آج کے دن تک ایک یہی بات سوچے جا رہا ہوں کہ اس معلقہ شخص کو اس بارے میں علم ہوا تو کس طرح کیا ایسا تو نہیں کہ حشام نے کسی دوسرے فرد سے اس بات کا ذکر کر دیا ہو اور بالفرض اگر ایسا ہے تو وہ شخص یقیناً اس شخص کا آلۂ کار ہے۔ یہ بات بھی بہت ممکن ہے کہ اس شخص کا تعلق تمہارے نیوز چینل کے ہی کسی فرد سے ہو جس کے ذریعے یہ بات اس شخص تک پہنچ گئی لیکن بس ایک بات اور سوچ رہا ہوں کہ حشام جس شخص کے بارے میں یہ رپورٹ تیار کر رہا تھا۔ وہ پاکستان میں ہوتا ہی نہیں ہے بلکہ بہت کم کم ہی آتا ہے۔" وہ بہت پر سوچ انداز میں گفتگو کر رہے تھے۔

انکل کی اتنی ساری گفتگو کے بعد بھی مجھے اپنے سوال کا جواب نہ مل سکا اور میری الجھن برقرار رہی۔ تب میں نے ایک بار پھر پوچھا۔

"انکل مجھے میرے سوال کا جواب ابھی تک نہیں ملا ہے آخر وہ رپورٹ کیا تھی اور کس کے لیے تھی۔"

"اوہ ہاں۔" انکل نے گہری سوچوں سے باہر نکل کر چونک کر کہا۔ "وہ ایک خفیہ رپورٹ تھی اور حشام ایک خفیہ ایجنسی کے ساتھ مل کر اسے مرتب کر رہا تھا۔ وہ ملک دشمن عناصر کے خلاف رپورٹ تھی کچھ لوگ انڈیا کی بدنام زمانہ تنظیم "را" کے ساتھ مل کر پاکستان میں ایک بہت بڑی دہشت گردی کا پلان بنا رہے ہیں۔ پاکستان میں ان کے آلہ کار لوگ ہیں۔ جنہیں ان لوگوں نے ساتھ ملا رکھا ہے۔ یہ بات بھی معلوم ہوئی تھی کہ وہ لوگ ایسی دہشت گردی کا ارادہ رکھتے ہیں جس کے برپا ہونے کے بعد اس کا الزام پاکستانی عوام ایک دوسرے پر ہی لگائیں گے۔"

"اوہ مائی گاڈ۔" حشام اتنی اہم رپورٹ بنا رہا تھا تو انکل آپ کو کم از کم اس کی سیکیورٹی کا خیال تو رکھنا ہی چاہیے تھا۔" میں نے حیرت سے کہا۔

"ایسا سوچنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ میرے خیال میں اس بات کا کسی کو علم ہی نہیں تھا۔" انکل نے کہا تو میرے دماغ میں ایک روشنی کا جھما کا سا ہوا اور میں نے بہت ایکسائٹڈ ہو کر کہا۔

"انکل میں نے پہچان لیا ہے کہ حشام نے چینل پر کس سے اس بات کا ذکر کیا ہوگا۔"

"کس سے؟" انکل بے ساختہ اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑے ہو گئے اور اس سے پہلے کہ میں کوئی جواب دیتی کال بیل بجنے لگی۔

"ارے یہ کال بیل کس نے بجائی ہے۔ گیٹ پر موجود گارڈ کہاں ہے۔" انکل نے حیرت سے کہا۔ کیونکہ جب بھی کوئی ملنے والا آتا ہے وہ کال بیل نہیں بجاتا بلکہ گارڈ انٹر کام پر گھر پر اطلاع دیتا ہے کہ فلاں شخص آیا ہے پھر اندر سے جو بھی جواب اسے ملتا وہ اسی طرح کرتا تھا یا تو آنے والے کو اندر بھیج دیتا یا پھر اگر اس کا مطلوبہ شخص گھر پر نہیں ہوتا تو وہ باہر ہی سے منع کر دیتا تھا کال بیل بجنے کا مطلب یہ تھا کہ گیٹ پر گارڈ موجود نہیں ہے۔

انکل تیزی سے اسٹڈی روم کی کھڑکی کی جانب بڑھے جس کا رخ گیٹ کی جانب کھلتا تھا۔ یہ اسٹڈی روم اوپر کی منزل پر تھا۔ انہوں نے کھڑکی کھول کر دیکھا تو گارڈ اپنی جگہ موجود تھا میں بھی انکل کے پیچھے پیچھے چلی آئی انکل نے گارڈ کو آواز دی۔

"حضور بخش کون ہے؟"

"سر میں انٹر کام بجا رہا تھا کسی نے ریسیو نہیں کیا تو میں نے کال بیل بجادی۔ ایک صاحب آئے ہیں اور آپ سے ملنا چاہ رہے ہیں۔" حضور بخش نے

جواب دیا۔
اور تب ہی شمروز بھائی کی کال میرے موبائل پر آئی میں نے ریسیو کا بٹن پش کیا ہی تھا کہ شمروز بھائی کی آواز سنائی دی۔
"کہاں ہو گڑیا' میں اتنی دیر سے گیٹ پر کھڑا ہوں اندر سے کوئی ریسپونس ہی نہیں مل رہا' میں تو پریشان ہی ہو گیا تھا۔"
"سوری شمروز بھائی۔" کہہ کر میں نے فون بند کیا اور کہا۔ "انکل شمروز بھائی ہیں۔" تب انکل نے حضور بخش سے کہا کہ انہیں اندر آنے دو اور میں یہ کہتی ہوئی تیزی سے نیچے چلی گئی کہ میں شمروز بھائی کو لے کر آتی ہوں۔
نیچے آئی تو آنٹی بھی بے دار ہو چکی تھی اور ملازمہ نے دوپہر کا کھانا تیار ہونے کی خبر سنائی تو فی الحال میں نے شمروز بھائی کو نیچے ڈرائنگ روم میں ہی بٹھا دیا اور انکل کو نیچے ہی بلوا لیا۔
شمروز بھائی نے اپنا حلیہ تبدیل کیا ہوا تھا۔ انہیں ایسا کرنا ہی چاہیے تھا۔ گھر کے اندر آ کر بھی انہوں نے ملازموں کی وجہ سے اس حلیے میں رہنا مناسب سمجھا۔
انکل اور شمروز بھائی پہلے بھی ایک مرتبہ مل چکے تھے اس لیے مجھے تعارف کروانے کی زحمت نہیں کرنی پڑی۔ میں نے کہا۔ "پہلے کھانا کھا لیا جائے۔" تو انکل نے میرے خیال کی تائید کی اور ہم نے ایک خوش گوار ماحول میں ہلکی پھلکی گفتگو کے درمیان کھانا کھایا کیونکہ یہاں ملازم گھوم رہے تھے۔ ہم اس وقت بہت زیادہ محتاط تھے اور کوئی رسک لینا نہیں چاہتے تھے حد یہ کہ ہم شمروز بھائی کا نام لے کر بھی انہیں مخاطب نہیں کر رہے تھے کھانے کے بعد چائے پی کر فارغ ہوئے تو انکل نے شمروز بھائی سے کہا۔
"آیئے جناب میں آپ کو اپنی لائبریری دکھاتا ہوں اس کے لیے آپ کو میرے ساتھ اوپر چلنا ہوگا۔"
"انکل میں آؤں۔" میں نے کہا۔
"تم کہاں جا رہی ہو' انہیں جانے دو تم میرے پاس بیٹھو۔" آنٹی نے میرا ہاتھ تھام کر کہا تو میں بے چارگی سے انکل کی جانب دیکھنے لگی۔
انکل میری التجا کو سمجھ گئے اور بولے۔
"ابھی آ جاتی ہے ماریہ' دراصل کچھ کتابوں کے بارے میں سرمئی ہی زیادہ جانتی ہے۔ بہت دنوں بعد تو ہماری علمی محفل جمے گی۔ تم تھوڑا اور آرام کر لو۔" پھر انہوں نے مجھے مخاطب کیا اور بولی۔ "آ جاؤ بیٹی تم بھی آ جاؤ۔" تو میں نے آنٹی کا ہاتھ تھام کر محبت بھرے لہجے میں کہا۔
"دراصل میں چاہتی ہوں کہ انکل ذہنی طور پر ریلیکس ہو جائیں بس ابھی تھوڑی دیر میں آتی ہوں۔" تو انہوں نے مسکراتے ہوئے اثبات میں سر ہلا دیا تو میں تیزی سے اوپر بھاگی۔ کیونکہ انکل اور شمروز بھائی اوپر جا چکے تھے۔
انکل کے اشارے پر میں نے اسٹڈی روم کا دروازہ بند کر دیا اور ان لوگوں کے پاس آ کر بیٹھ گئی تب انکل نے شمروز بھائی سے کہا کہ وہ اب بتائیں کہ وہ کیا بتانا چاہتے ہیں جواب میں شمروز بھائی نے میرے باپ نواب سطوت کے پاس آنے والے اس شخص اور اس سے ہونے والی گفتگو سنا دی۔ ساتھ ہی انہوں نے یہ بھی بتایا کہ نہ جانے ان دونوں کی گفتگو سن کر مجھے ایسا لگا جیسے یہ لوگ جس جرنلسٹ لڑکے اور لڑکی کا ذکر کر رہے ہیں وہ حشام اور سرمئی ہی ہو سکتے۔ کیونکہ وہ شخص اس بات کا اعتراف کر رہا تھا کہ وہ اس جرنلسٹ کو موت کے گھاٹ اتارنے میں ناکام رہا ہے۔ میری چھٹی حس نے فوراً مجھے ہوشیار کر دیا اور میں نے اس شخص کی تصویر اپنے موبائل میں اتار لی۔

"گڈ۔" شمروز بھائی کی ساری بات سن کر انکل کی آنکھوں میں چمک آ گئی اور انہوں نے فوراً کہا۔
"تم مجھے وہ تصویر دکھا سکتے ہو۔"
"جی ہاں۔" یہ کہہ کر شمروز بھائی نے اپنے موبائل میں اس شخص کی تصویر دکھائی اس تصویر کو دیکھ کر ہم چونک پڑے اور ایک دوسرے کی جانب دیکھنے لگے۔
"کیا ہوا' کیا آپ لوگ اس شخص کو جانتے ہیں۔" شمروز بھائی نے باری باری میری اور انکل کی جانب دیکھتے ہوئے سوال کیا تو انکل نے گہری سنجیدگی میں ڈوبتے ہوئے اثبات میں سر ہلا دیا۔ میں خاموشی سے انکل کے چہرے کا جائزہ لے رہی تھی اور انتظار کر رہی تھی کہ آیا انکل بھی اس شخص کو اس حیثیت سے جانتے ہیں جیسا کہ میں اسے جانتی ہوں۔
"کون ہے یہ؟" شمروز بھائی نے پوچھا تو انکل بولے۔
"میں بہت اچھی طرح سے تو واقف نہیں ہوں لیکن میرا خیال ہے......!" یہ کہہ کر انکل رک گئے اور اٹھ کر چند قدم چلے وہ کچھ سوچ رہے تھے پھر ہماری جانب مڑتے ہوئے بولے۔
"مجھے بہت سال پہلے اس شخص کی دیکھی ہوئی ایک تصویر یاد آ گئی۔ یہ شخص چار بندوں کے قتل کے کیس کے سلسلے میں پولیس کو مطلوب تھا پھر یہ کہیں فرار ہو کر روپوش ہو گیا اور پولیس نے تھک کر یہ کیس فائلوں میں بند کر کے داخل دفتر کر دیا۔
میں یہ سوچ رہا ہوں اور یہ بات بہت اہم ہے کہ اس شخص کا نواب سطوت سے کیا تعلق ہے کیا یہ شخص نواب سطوت کے لیے کام کرتا ہے اس کا پالتو غنڈہ ہے اور نواب سطوت نے ہی اسے پناہ دی ہوئی ہے اور نواب سطوت ہی کی وجہ سے اس کا کیس دبا دیا گیا۔ دوسری اور اہم بات جو میں سمجھ رہا ہوں وہ یہ ہے کہ کیا نواب سطوت ہی وہ شخص ہے جس کے اشارے پر حشام کو مارنے کی کوشش کی گئی ہے۔"
انکل کی بات سن کر میرا دماغ بھک سے اڑ گیا اور میرے اوپر شدید ہیجانی کیفیت طاری ہو گئی۔ میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ میں ابھی جا کر اس موذی کا گریبان پکڑوں اور اس سے پوچھوں کہ بتا اے ظالم شخص میں نے اس دنیا میں آ کر ایسا کون سا بڑا گناہ کر دیا ہے کہ مجھ سے تیری دشمنی کا سلسلہ ختم ہی نہیں ہو رہا ہے۔ ان تمام سوچوں کے ساتھ ایک بہت ہی تکلیف دہ سوال کسی زہریلے ناگ کے پھن کی مانند میرے سامنے سر اٹھا کر کھڑا ہو گیا کہ کیا میرا باپ ہی وہ شخص ہے جس کے "را" والوں کے ساتھ تعلقات ہیں اور وہ اتنی دولت ہونے کے باوجود صرف چند سکوں کی خاطر اپنے ملک اور ملک میں بسنے والے کروڑوں لوگوں کی جان اور عزت کا سودا کر بیٹھا ہے۔
شدت جذبات سے میرا چہرہ سرخ ہو گیا اور میرا جسم ہولے ہولے کانپنے لگا۔ انکل نے میری یہ حالت دیکھی تو میرے قریب آئے اور تسلی کے انداز میں میرے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولے۔
"خود پر قابو رکھو بیٹی...... ہو سکتا ہے ایسا نہ ہو جیسا میں اندازہ لگا رہا ہوں۔ ابھی ہم حتمی طور پر اس سلسلے میں کسی کا نام نہیں لے سکتے ابھی تو بہت کچھ معلوم ہونا باقی ہے۔"
"معلوم کرنے کے لیے باقی اور کیا رہ گیا ہے انکل...... شمروز بھائی کی اس گفتگو سے یہی نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے۔" میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا تو شمروز بھائی نے انکل کی بات کی تائید کی اور مجھے سمجھانے لگے اچانک ایک خیال بجلی کی مانند میرے دماغ میں آیا اور میں نے اضطراری لہجے میں کہا۔

”انکل کیوں نہ ہم اس ویڈیو کو ایک بار پھر غور سے دیکھیں جس میں اس شخص کا چہرہ آیا ہے جس نے حشام پر فائر کیا ہے اگر یہ دونوں ایک ہی آدمی ہیں پھر تو ساری بات آئینے کی مانند صاف ہو جائے گی۔“

”ہاں یہ تم ٹھیک کہہ رہی ہو لیکن وہ ویڈیو تو کرنل مشتاق کے پاس ہے۔“ انکل نے کہا پھر شمروز بھائی سے کہا۔

”شمروز تم اس شخص کی یہ تصویر مجھے دے دو اور اپنے موبائل سے ڈیلیٹ کردو۔“ پھر انکل نے شمروز بھائی کے موبائل سے وہ تصویر اپنے موبائل میں منتقل کرلی اور پھر اسے ایک یو ایس بی میں سیف کر کے اپنے موبائل سے بھی ڈیلیٹ کردی اور ہم سے کہا کہ وہ اس تصویر کو کرنل مشتاق کے حوالے کردیں گے۔

بعد میں شمروز بھائی نے ہمیں نواب سطوت کی روحانی محفل کے بارے میں بھی بتایا اور یہ بھی بتایا کہ اس کے پاس کوئی غیر ملکی کسی ضروری کام کے سلسلے میں آیا ہوا ہے جو سرجانی میں قائم اس کے روحانی سینٹر میں ہی قیام پذیر ہے۔ یہ بات بھی ممکن ہے کہ حشام پر فائرنگ کروانے والا شخص وہی ہو نواب سطوت ابھی اپنے روحانی سینٹر میں ہی ہے کلفٹن والی کوٹھی میں واپس نہیں آیا ہے۔ وہ شخص کون ہے نہ تو میں نے اسے دیکھا ہے اور نہ ہی میں اس کے بارے میں کچھ بھی جانتا ہوں۔

شمروز بھائی کی بات سن کر ہم ایک دوسرے زاویے سے اس بات کو دیکھنے لگے۔ شمروز بھائی نے مزید ہماری راہ نمائی کرتے ہوئے بتایا۔

”نواب سطوت اصل میں لوگوں کا روحانی پیشوا ہے وہ لوگوں کے بڑے بڑے کام بڑی بڑی رقمیں لے کر کرتا ہے۔ جو لوگ اسے اپنا روحانی پیشوا مانتے ہیں وہ یہ سمجھتے ہیں کہ نواب اپنے روحانی علوم کے ذریعے ان کے یہ کام کرتا ہے۔ جبکہ میرے خیال میں حقیقت تو یہ ہے کہ وہ لوگوں کے کام اپنے بندوں کے ذریعے کرواتا ہے۔ لوگوں کے کام ہو جاتے ہیں اور ان کے دلوں میں اس کی عقیدت مزید بڑھ جاتی ہے۔“

پھر ہم دیر تک اس موضوع پر باتیں کرتے رہے۔ ساری گفتگو کو سامنے رکھ کر اس کا ہر پہلو سے جائزہ لیتے رہے اور کوئی حقیقی نتیجہ نکالنے کی کوشش کرتے رہے۔ بعد میں شمروز بھائی نے مجھے بتایا کہ جب میری بھیجی ہوئی ای میل نواب سطوت نے پڑھی تو اس کا ری ایکشن کیا ہوا تھا اور اس نے شمروز بھائی کے ذمہ کون سی ڈیوٹی لگادی ہے۔ یہ سب سن کر میرے دل و دماغ کی تپش کچھ کم ہوئی۔

”اب آپ کہاں جائیں گے بھائی۔“ میں نے ساری گفتگو کے اختتام پر ان سے پوچھا۔

”پتا نہیں گڑیا۔“ انہوں نے گہری اداسی سے کہا۔ ”میرا اپنا تو کوئی گھر نہیں ہے لے دے کر ایک ہی ٹھکانہ ہے نواب سطوت کی کوٹھی۔ وہیں چلا جاؤں گا سوچ رہا ہوں کہ نواب کے نزدیک ہی رہوں تاکہ مزید معلومات مل سکے۔ ابھی تو اس کی محفل میں شرکت کرنے کے بعد اس سے ملاقات ہی نہیں ہوئی ہے۔ ملاقات ہوگی تو اس کی بہت زیادہ تعریف بھی تو کرنا ہے اور اپنی بے پناہ عقیدت اور احترام کا اظہار بھی کرنا ہے۔“

”ہاں یہی مناسب ہے میرا خیال ہے کہ تمہیں زیادہ سے زیادہ اس کے نزدیک رہ کر بہت سی اہم معلومات حاصل کرنی ہیں اور وہ ہم تک پہنچانی ہیں اس کے بعد جب تم اس کی اجازت لے کر اس کے بچوں کی تلاش میں نکلو تو میرے پاس آجانا میں تمہیں کرنل مشتاق کی تحویل میں دے دوں گا۔ میرا خیال ہے کہ تمہارے جیسے بندوں کو کمانڈو کی تربیت لینی چاہیے۔“

”ہاں ہاں یہ بالکل ٹھیک ہے۔“ میں نے بچوں کی طرح خوش ہو کر کہا تو شمروز بھائی کی آنکھوں میں انکل کے لیے ڈھیروں تشکر کے جذبات تھے۔

شمروز بھائی جب ہمارے پاس سے اٹھ کر گئے تو رات کا اندھیرا پھیل چکا تھا۔ انہوں نے بتایا کہ وہ فی الحال کلفٹن ہی جارہے ہیں۔ پھر انہوں نے مجھ سے وعدہ لیا کہ جیسے ہی حشام کو آئی سی یو سے روم میں شفٹ کردیا جائے گا میں انہیں فون کر کے بتادوں گا اور پھر اپنے ساتھ حشام سے ملوانے کے لیے لے جاؤں گی۔

انکل رخصت ہوئے تو میں اور انکل بھی نیچے جانے لگے۔ لیکن پھر انکل کچھ سوچ کر وہیں رک گئے اور مجھ سے کہا کہ نیچے آنٹی کے پاس جاؤں انہیں یہاں کچھ کام ہے میں سمجھ گئی کہ انکل اس شخص کے بارے میں جس کی تصویر انہوں نے شمروز بھائی سے لی تھی مزید چھان بین کریں گے۔ مزید اس کے بارے میں معلومات کریں گے۔ انکل کے اسٹڈی روم سے ملحق ایک بہت بڑا ہال تھا۔ جہاں ان کی لائبریری تھی اور وہاں برسوں پرانے اخبارات اور اہم خبروں کا بہت نادر ذخیرہ تھا۔

نیچے آئی تو آنٹی مغرب کی نماز سے فارغ ہو کر تسبیح پڑھ رہی تھیں۔ مجھے دیکھا تو مسکراتے ہوئے تسبیح رکھ دی اور میرے چہرے پر پھونک ماردی اور بولیں۔

”فارغ کردیا تمہارے انکل نے‘ توبہ ہے میری بچی پر قبضہ ہی کر کے بیٹھ جاتے ہیں میں یہ دعا کر رہی تھی کہ اللہ کرے میرا حشام جلد از جلد صحت یاب ہو کر گھر آجائے اور بس تمہیں اپنے حشام کی دلہن بنا کر اپنے گھر لے آؤں۔ شکر ہے اللہ کا کہ تم آگئی ہو ورنہ تو اس گھر کی تنہائی مجھے ہڑپ ہی کر جائے۔“

”آپ کی ساری دعاؤں کے لیے میں یہ دعا کرتی ہوں کہ اللہ تعالیٰ جلدی سے آپ کی ساری

دعائیں قبول کرے آمین۔" میں نے شرما کر کہا اور آنٹی کی بانہوں میں منہ چھپالیا۔

☆

طلال صاحب کے گھر سے میں باہر آیا تو میرے ذہن میں بہت سی سوچیں تھیں اور مجھے اس بات کا کامل یقین تھا کہ حشام کو گولی مارنے کا حکم نواب سطوت ہی کا دیا ہوا تھا اور مجھے اس بات کا بھی یقین تھا کہ یقیناً نواب نے یہ کام ضرور کسی کے کہنے پر کیا ہے۔ اب وہ شخص کون ہے' کیا یہ شخص وہی ہے جو نواب کے پاس آیا ہے یا پھر کوئی اور ہے۔ اپنے اس سوال کا جواب مجھے تلاش کرنا تھا۔

میں چونکہ نواب کی کوٹھی جا رہا تھا اس لیے سوچ رہا تھا کہ کوئی سنسان سی جگہ دیکھ کر گاڑی روک لوں اور اپنے چہرے کے میک اپ سے نجات حاصل کرلوں۔

پھر ایک جگہ پیٹرول پمپ سے آگے جھاڑیوں کے پاس مجھے قدرے اندھیری گلی ملی تو میں نے اپنے چہرے پر لگی تمام مصنوعی چیزیں اتار دیں اور اپنی اصل شکل میں آ گیا اس وقت میڈم روزی کی کال میرے موبائل فون پر آ گئی۔ پانچ منٹ اس سے علیک سلیک کی وہ مجھ سے ایک بار پھر ملنا چاہ رہی تھی۔ اس نے مجھے بتایا کہ اسے مجھ سے بہت ضروری بات کرنی ہے۔

"فی الحال تو میں مصروف ہوں اگر مناسب سمجھو تو بتادو۔"

"ہاں تو فارغ ہو جاؤ تب آ جانا' وہ بات ایسی نہیں ہے کہ میں تمہیں فون پر بتاؤں' اطمینان سے بیٹھ کر کرنے کی ہے۔" اس نے نارمل انداز میں کہا۔

"پھر بھی کچھ تو بتاؤ۔" میں نے پرتجسس لہجے میں کہا۔

"کہا تو ہے' اطمینان سے کرنے کی ہے اگر صبر نہیں ہو رہا ہے تو ابھی آ جاؤ۔" اس نے شرارت آمیز لہجے میں کہا۔ "تمہارے ہی متعلق ہے۔"

"اچھا یہ بات ہے تو میں ابھی پہنچ رہا ہوں۔ تم انتظار کرو۔" میں نے کہا۔

"رات کو تو رکو گے نا' میں تیار ہو جاؤں۔" اس نے پھر شرارت سے بھرے لہجے میں کہا اور ہلکا سا قہقہہ لگا کر ہنس دی۔

"سچ سچ بتاؤ روزی تم سنجیدگی سے کہہ رہی ہونا۔"

"تم کس بات کے لیے کہہ رہے ہو کہ میں سنجیدہ ہوں رات کو رکنے کے لیے یا پھر تیار ہونے کے لیے۔" وہ مسلسل شرارت کر رہی تھی۔

"کیا بات ہے روزی۔ آج تمہارا موڈ بہت خوش گوار ہے۔ بہت شوخ ہو رہی ہو۔" میں نے معنی خیز لہجے میں کہا تو وہ سنجیدہ ہو گئی۔

"ارے یار کیا ہمیں خوش ہونے کا بھی حق نہیں ہے جس کو تمہارے جیسے پیارے شخص کی دوستی کا ساتھ مل جائے تو وہ خوش بھی نہ ہو۔"

"اچھا یہ بات ہے۔" میں نے کہا اور ہنس دیا پھر کہا۔ "محترمہ میں نے جو بات سنجیدگی سے پوچھی تھی وہ یہ تھی کہ کیا واقعی میرے حوالے سے کوئی اہم بات کرنی ہے۔"

"ہاں' ہاں سب مذاق چھوڑو' مجھے واقعی تم سے ایک اہم بات کرنی ہے تمہیں جب بھی ٹائم ملے میرے پاس آنا۔ تب ہم اطمینان سے بیٹھ کر بات کریں گے۔" اس نے کہا۔

"اچھا ٹھیک ہے میں ابھی آ رہا ہوں۔" میں نے آمادگی ظاہر کی تو وہ ایک بار پھر شرارت سے ہنستے ہوئے بولی۔

"ٹھیک ہے میں تیار ہو جاتی ہوں۔"

"ٹھیک ہے تیار ہو جاؤ' ذرا ہم بھی تو دیکھیں تمہاری تیاریاں۔" میں نے جواباً کہا۔

"سوچ لو میری تیاریاں بہت خطرناک ہوتی ہیں اور بندے کا استقبال اس سے زیادہ خطرناک۔" اس نے معنی خیز لہجے میں کہا میں اس کے جملے میں چھپے مطلب کو اچھی طرح سمجھ رہا تھا اس لیے انجان بنتے ہوئے کہا۔

"کیا بات ہے کیا آتشیں اسلحہ کے ساتھ استقبال کرو گی۔"

"ارے جان ہمارے حسن سے زیادہ آتش میں بھی طاقت نہیں ہے یہ تو لمحہ بھی نہیں لگاتا اور بندہ نگاہ ڈالتے ہی خاکستر ہو جاتا ہے۔"

"شٹ اپ۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ "آئی جسٹ کم انگ۔" اور فون بند کر دیا۔

پھر میں نے گاڑی اسٹارٹ کی اور ڈیفنس روزی کے فلیٹ کی جانب چل دیا۔ میں کلفٹن تو جا ہی رہا تھا اب میری سوچ کا رخ میڈم روزی کی جانب ہو گیا اور میں سوچنے لگا کہ یقیناً کوئی بہت ہی خاص بات ہوگی جو اس نے کال کر کے مجھے بلایا ہے اور میں نے اس کی جانب جانے کا ارادہ اس لیے بھی کرلیا کہ نواب اگر ابھی نہیں آیا تو مجھے فارغ بیٹھ کر اس کا انتظار ہی کرنا تھا۔ اچانک ہی مجھے یاد آیا کہ نواب تو پاکستان میں ہے ہی نہیں وہ تو دبئی چلا گیا ہے اس خیال کے آتے ہی میرے اندر ایک اطمینان اور بے فکری سی اتر آئی۔

میں ان ہی سوچوں کے ساتھ گاڑی اڑاتا ہوا چلا جا رہا تھا کہ اچانک ٹریفک سگنل ریڈ ہو گیا اور مجھے گاڑی کو بریک لگانے پڑے میں بے خیالی میں اِدھر اُدھر نگاہیں دوڑانے لگا۔ دوسری گاڑیاں بھی میرے دائیں بائیں آ کر رکنے لگی۔

میں نے دیکھا کہ ایک گاڑی میرے برابر میں آ کر رکی وہ ایک ٹیکسی تھی۔ ٹیکسی کی پچھلی سیٹ پر کوئی خاتون تنہا بیٹھی تھی۔ جو کھڑکی کی جانب منہ کیے باہر دیکھ رہی تھی۔ اس خاتون پر میری نگاہ پڑی تو میرے دل کی دھڑکن کئی گناہ بڑھ گئی اور میرا شدت سے جی چاہا کہ اسے پکاروں میں نے اسے آواز دینی چاہی تو آواز میرے حلق میں گھٹ کر رہ گئی۔ وہ کسی گہری سوچ میں گم کھڑکی سے باہر دیکھے جا رہی تھی۔ اس کے براؤن بال اڑ اڑ کر اس کے رخساروں کو چوم رہے تھے۔

پھر سگنل کی گرین لائٹ آن ہو گئی اور ٹریفک دوبارہ سے رواں ہو گیا۔ وہ ٹیکسی بھی ٹریفک کے اس سیلاب میں بہنے لگی۔ میں ایسا گم صم اور ہکا بکا بیٹھا تھا کہ گاڑی کو آگے نہ بڑھا سکا۔ پیچھے رکی ہوئی ٹریفک نے زور زور سے ہارن بجا کر جسے گاڑی آگے بڑھانے کا اشارہ دیا تو میں جیسے ہوش میں آ گیا اور گاڑی آگے بڑھادی۔

سوچنے سمجھنے کی جیسے ساری صلاحیتیں مفلوج ہو گئی تھیں۔ میں بس گاڑی بھگائے جا رہا تھا۔

تھوڑی دیر بعد مجھے احساس ہوا کہ غیر ارادی طور پر میں اس ٹیکسی کا پیچھا کر رہا ہوں اور پھر اس بات کا احساس ہوتے ہی میں شعوری طور پر اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگا ٹیکسی کا رخ کلفٹن کی جانب تھا وہ سی سائیڈ کی جانب جا رہی تھی اور جیسا میں نے سمجھا تھا ویسا ہی ہوا۔

ٹیکسی سمندر کے ساتھ ساتھ ملحق سڑک پر دوڑ رہی تھی۔ ایک مقام پر جب لوگوں کا رش نہ ہونے کے برابر تھا ٹیکسی رک گئی اور وہ اس سے اتر کر نیچے سمندر کی گیلی ریت پر جا کر چہل قدمی کرنے لگی۔

میں کنارے پر کھڑا اسے دیکھتا رہا پھر میں بھی نیچے اتر کر اس کی جانب چل دیا۔

(ان شاءاللہ باقی آئندہ)

⌘

اپنی مٹی

بھائی عمران احمد
تسلیمات و آداب!
آج کا نوجوان کامیابی کے پیچھے دیوانہ وار دوڑ رہا ہے' اپنی خود ساختہ منزل پانے کے لیے وہ اپنے ماں باپ بہن بھائیوں' عزیز رشتہ داروں غرضیکہ ہر اپنے کے جذبات کی لاشوں کو پھلانگتے بھاگا چلا جاتا ہے بعض اوقات وہ بھاگتے بھاگتے منزل کا نشان ہی کھو بیٹھتا ہے اور جب تھک کر پلٹ کر دیکھتا ہے تو علم ہوتا ہے وہ تو سراب کے پیچھے بھاگ رہا تھا منزل تو وہ پیچھے چھوڑ آیا۔ یہ کہانی بھی ایک ایسے نوجوان کی ہے جو سراب کے پیچھے دوڑتے دوڑتے تھک گیا تھا۔
والسلام
ریحانہ سعیدہ
لاہور

آج کاشانہ امن میں خوشی کا عالم تھا کیونکہ آج اس گھر کا سب سے بڑا بیٹا احسن امریکا سے ہارٹ اسپیشلسٹ بن کے لوٹ رہا تھا۔ امی جان نے پلاؤ دَم دیتے ہوئے گل کو آواز دی۔

"بیٹا! جلدی ادھر آؤ' بھائی کے آنے میں تھوڑا وقت ہے۔ شامی کباب تل لو اور چٹنی اور سلاد بھی بنالو۔ پتا نہیں احسن وہاں پر کیا کھاتا ہوگا' اچھی بھلی صحت تھی جب یہاں سے گیا تھا تو۔"

"امی آپ بھی نا بس یونہی پریشان ہوتی ہیں' ابھی صحت مند ہی ہوں گے آخر امریکا سے لوٹ رہے ہیں۔ آپ فکر نہ کریں۔ میں نے بھائی کے لیے ٹرائفل بھی بنا کر رکھ دیا ہے۔ ابھی کھانا بھی اے ون قسم کا تیار کرلیتی ہوں۔ آپ بھائی کے استقبال کی تیاریاں کریں اور......"

"او بہنا! کچھ اس دیسی بھائی کا بھی خیال کرلو جو کب سے تمہارے ایک شامی کباب کا منتظر خالی پیٹ خالی ہاتھ دروازے کی چوکھٹ کو تھامے کھڑا ہے۔" علی نے دہائی دیتے ہوئے کہا۔

"یہ میرا دیسی بھائی پہلے ہی کھانے پینے میں لاہوریوں کو مات کیے ہوئے ہے اس لیے آج لنچ کا افتتاح امریکن پلٹ بھائی کے ہاتھوں ہونا ہے۔" گل نے علی کو منہ چڑاتے ہوئے کہا۔

دادا جان اور امی لاؤنج میں بیٹھے گزرے وقت کو یاد کررہے تھے' جب احسن نے BSC میں ٹاپ کیا تھا اور پھر احسن کی خواہش پر دادا جان نے اپنا آبائی مکان اور امی نے اپنا خاندانی زیور بیچا تاکہ احسن اپنے خواب کو پورا کرسکے اور آج وہ ہارٹ اسپیشلسٹ بن کر اپنے خواب کی تعبیر حاصل کرچکا تھا۔ بیل ہوتے ہی علی نے بھاگ کر دروازہ کھولا اور احسن اپنے ابو کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلتا ہوا دادا جان کے پاس آکر جھکا۔ دادا جان' امی اور بہن بھائی سے ملنے کے بعد سب کھانا کھانے لگے۔

"اوہو امی جان! آپ نے یہ سب کیا بنالیا پلیز کل سے اس طرح کا کھانا مت بنائیے گا۔"

"کیا ہوا بیٹا! یہ سب تو تمہیں امریکا جانے سے پہلے بہت پسند تھا۔"

"امی جان! اب میں اس طرح کی خوراک نہیں کھاتا' یہ شامی کباب' پلاؤ' قورمہ وغیرہ وغیرہ۔ ایک برگر ہی کافی تھا میرے لیے۔" امی تو یک دم خاموش ہوگئیں لیکن علی چپ نہ رہ سکا۔

"بھیا امریکا میں برگر کھا کھا کر آپ تنگ نہیں ہوئے جو یہاں بھی برگر کی فرمائش۔"

"تم پاکستانیوں کو تو کھانے کے علاوہ اور کوئی کام ہی نہیں۔" گل نے ہنستے ہوئے علی کو دیکھا اور ٹون میں گانے لگی۔ "ہم پاکستانی ہیں ہم پاکستانی......"

"چھوڑو سب خرافات اور کل سے احسن کی مرضی کے مطابق کھانا بنالینا۔" ابو نے بحث سمیٹتے ہوئے کہا۔

"امی یہ بھائی عجیب سے نہیں ہوگئے۔" علی امی کی گود میں سر رکھتے ہوئے بولا۔

"بس بیٹا ابھی ذرا نئے ماحول سے آیا ہے اس لیے۔"

"پر امی زیادہ عمر انہوں نے یہاں گزاری اور چھ سال میں اپنی اصل کو بھول گئے۔"

"میرا خیال ہے کسی پاکستانی لڑکی سے بھائی کی شادی کردیں ایسا نہ ہو گوری میم وہاں سے منگوالیں اور آپ اس کی انگریزی سن سن کر اپنا بلڈ پریشر ہائی کرتی رہیں۔" گل نے بھی امی کے پاس بیٹھتے ہوئے کہا۔

"اللہ نہ کرے۔" امی نے ایک ہاتھ دل پر رکھتے ہوئے اور دوسرا ہاتھ گل کی کمر پر مارتے ہوئے کہا۔

"اوئی امی! مجھے کس گناہ کی سزا دی ہے آپ نے۔"

"تم نے ایسا سوچا بھی کیوں' میں نے بچپن سے شیزانہ کو اپنے احسن کے لیے مانگ رکھا ہے۔ کتنی پیاری نیک سگھڑ سلیقہ مند اور ادب آداب والی بچی ہے۔" امی نے چاچو کی بیٹی کی تعریف کرتے ہوئے کہا اور اب تو اس کا ایم اے بھی مکمل ہوچکا ہے۔"

"اچھا کیا تم نے یاد کرادیا میں آج ہی احسن سے بات کرتی ہوں تاکہ آج کل میں منگنی کرکے تین چار ماہ تک شادی کردیں۔"

"واہ جی واہ بھیا ہمارے دلہا بنیں گے' گھوڑے پر بیٹھیں گے۔" علی خوش ہوتے ہوئے بولا۔

❀......☆......❀

احسن ابھی باہر سے باہر آیا تھا جب امی ابو نے اپنے کمرے میں اسے بلالیا۔

"جی ابو! آپ نے بلایا۔"

"دراصل برخوردار! اب ہم چاہتے ہیں کہ تمہارے سہرے کے پھول کھل جائیں یعنی تمہاری شادی ہوجائے۔ اس لیے شیزانہ کو تمہاری امی نے اور میں نے منتخب کیا ہے۔"

"کیا......؟ اونو امی! مجھے اس جھینپو سی لڑکی سے شادی نہیں کرنی۔" احسن کی نظر میں دوپٹہ لیے معصوم سی شیزانہ کی تصویر لہرائی۔

"کیا مطلب ہے تمہارا احسن! امریکا پلٹ ہونے کا مطلب یہ نہیں کہ تم اچھی باعزت لڑکی کو جھینپو کہو' ابھی اس نے پنجاب یونیورسٹی سے ماسٹر کیا ہے پُر اعتماد اور قابل لڑکی ہے۔" امی نے قدرے غصے سے کہا۔ "اور تم نے کیا کوئی گوری پسند کی ہوئی ہے؟"

"ارے نہیں امی! ابھی مجھے ذرا سیٹل ہونے

دیں پھر دیکھیں گے۔" احسن نے بات ختم کرتے ہوئے کہا۔ "ابھی ذرا مجھے کہیں جانا ہے پھر بات کریں گے۔" یہ کہتے ہی اس نے گاڑی کی چابی اٹھائی اور کمرے سے باہر چلا گیا۔

❀......☆......❀

"پتا نہیں کیا بات ہے احسن کے ابو! جب سے احسن باہر سے آیا ہے اس کے مزاج ہی نہیں مل رہے۔ کل ابا جی نے اس کے لیے حلوہ پوری کا ناشتہ منگوایا اور اس نے ایک لقمہ بھی نہیں لیا بلکہ صاف کہہ دیا۔ "دادا جان! یہ ناشتہ گندے سندے ہاتھوں کا بنا ہوا ہے میں تو بریڈ اور بٹر لوں گا۔" مجھے منع کر دیا کہ گوالے کا دودھ نہیں میرے لیے ڈبے کا دودھ منگوائیں۔ علی نے اتنے پیار سے کہا بھائی آئیں آج انارکلی سے چاٹ اور باغ جناح سے گول گپے کھا کے آتے ہیں۔ آپ کو پتا ہے یہ تینوں بچے کتنے شوق سے چاٹ اور گول گپے کھانے جاتے تھے اور جناب کے صاحب زادے نے جواب دیا سوری میں یہ تھرڈ کلاس چیزیں نہیں کھا سکتا۔ شام کو میکڈونلڈ چلیں گے یا چائنیز۔ گل تو بے چاری چپ رہی لیکن علی نے فوراً کہہ دیا بھائی ہم دیسی بندوں کو دیسی کھانے ہی راس آتے ہیں سوشکریہ اور گل اور وہ دونوں چلے گئے۔ احسن اپنے اس قسم کے رویے سے سب سے کٹ کے رہ جائے گا۔ آپا نے ملتے ہوئے ماتھا چوما تو ان کے سامنے ہی ٹشو پر ڈیٹول لگا کر صاف کرنے لگا۔ مجھے تو اس لڑکے سے جتنی امیدیں تھیں سب ختم ہو گئیں۔"

"تم فکر نہ کرو اللہ سب ٹھیک کر دے گا۔"

❀......☆......❀

احسن نے رات کو ای میل چیک کی تو امریکن اسپتال سے آنے والی آفر نے اسے ہواؤں میں اڑا دیا۔

"او گاڈ! میری منزل مجھے مل گئی۔ وہ دیوانوں کی طرح اچھل رہا تھا۔ صبح سب کو یہ خبر سناؤں گا۔"

احسن بے زاری سے اپنے کمرے سے نکلا۔

"یہاں صبح صبح ہی پھیریوں والے شور مچانا شروع کر دیتے ہیں' ساری نیند کا ستیاناس کر دیا۔"

"بیٹا ایسا نہیں کہتے وہ اپنے رزق کی تلاش میں ہیں۔ جو عبادت بھی ہے اور نیکی بھی۔"

"لیکن اس پیاز والے کی وجہ سے میری آنکھ کھل گئی ہے۔ رات بھی میں اتنی لیٹ سویا تھا۔"

"چلو اب گیارہ بج گئے' ناشتہ کر لو۔"

"امی آپ سے ایک بات کرنی ہے امریکن ہاسپٹل نے مجھے جاب آفر کی ہے اور میں شاید ایک دو دن تک واپس امریکا چلا جاؤں گا۔"

"کیا......؟" امی نے پریشانی سے کہا۔ "پر بیٹا! تمہارے خواب تو یہ تھے کہ میں ہارٹ اسپیشلسٹ بن کر پاکستان میں جاب کروں گا تو اب یہ دوبارہ امریکا واپسی کیوں؟"

"اس لیے میری پیاری امی جان! کیونکہ یہاں نہ تو اچھی جابز ہیں نہ سیلری اور مجھے یہاں کا گندا سندا ماحول بھی پسند نہیں' میں ہر سال آتا رہوں گا۔" احسن امی کے چہرے کو تھپتھپاتے ہوئے اپنے کمرے میں چلا گیا۔

❀......☆......❀

آج سارا گھر بہت پریشان اور احسن خوشی سے چہکتا پھر رہا تھا۔

"اچھا بیٹا! تم کم از کم منگنی کر کے تو چلے جاؤ۔ پتا نہیں پھر تمہارے آنے پر میں زندہ رہوں یا نہیں۔" دادا جان نے احسن کے پاس بیٹھتے ہوئے کہا۔

"آپ کو کچھ نہیں ہوگا دادا جان! میں سب سے پہلے آپ کو بلاؤں گا۔"

"نہیں بیٹا! مجھے تو اپنی مٹی سے پیار ہے۔ میری تو قبر بھی اس مٹی میں بنے گی۔" بہت سے دعاؤں کی زنجیر میں احسن دوبارہ امریکا سدھار گیا۔

❀......☆......❀

سر انتھونی نے احسن کو اپنے کمرے میں بلایا۔

"اے مسٹر پاکی! کل تم اپنی داڑھی کٹوا کے آنا کیونکہ بہت سے لوگ تم سے آپریٹ اس لیے نہیں کرواتے کہ یہ طالبان دہشت گرد ہے۔"

"پر سر......"

"نو سرور آپ کو اگر ڈیوٹی جوائن کرنی ہے تو داڑھی کٹوانی ہوگی۔"

"او کے سر!"

احسن اپنی داڑھی کٹواتے ہوئے بہت دکھی ہو رہا تھا کیونکہ داڑھی اس پر سوٹ بھی کرتی تھی بلکہ بقول گل اور علی کہ آپ کا چہرہ بڑا نورانی لگتا ہے۔ خیر تھوڑی بہت قربانی تو دینی پڑتی ہے اچھے مستقبل کے لیے' احسن نے سوچتے ہوئے کندھے جھٹکے۔

"او یو آر لکنگ سو نائس!" مس ڈیزی نے اسے اپنے آفس سے نکلتے دیکھا تو فوراً کمنٹس دیئے۔

"داڑھی کٹوانے کے بعد تو تم اتنے اچھے لگ رہے ہو کہ میرا دل کر رہا ہے تمہیں پرپوز کر دوں۔ کیا تمہیں ڈاکٹر ڈیزی ایک لائف پارٹنر کی حیثیت سے قبول ہے؟" ڈاکٹر ڈیزی نے احسن کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا اور پھر احسن کے شرم سے سرخ پڑتے چہرے کو دیکھتے ہوئے بولی۔ "او پاکستانی شائے لس بی بولڈ" اور احسن کو شیزانہ کے لیے بولے ہوئے لفظ جھینپو کی یاد آ گئی۔

"نہیں دراصل میں سوچ رہا تھا کہ پرپوزل تو کینڈل لائٹ ڈنر میں قبول کروں گا۔" احسن نے پُراعتماد ہوتے ہوئے کہا۔

"او کے پھر ڈنر کرتے ہیں رات کو۔" احسن سوچ رہا تھا کہ ڈیزی کو سیڑھی بناتے ہوئے وہ کم از کم یہاں عزت تو حاصل کر سکتا ہے۔ چند ہی دنوں میں احسن اور ڈیزی ایک دوسرے کے قریب آ گئے۔

"ڈیزی! میں چاہتا ہوں تم ایک دفعہ پاکستان چل کر میرے گھر والوں سے مل لو پھر تو ہم نے واپس ہی آنا ہے۔"

"او نو میں اس جلتے ملک میں نہیں جا سکتی اور ہاں آج میں نے کھانا بنایا ہے اس لیے برتن تم دھوؤ گے۔" کھانے کے نام پر ڈیزی نے انڈے اور بریڈ کے پیس احسن کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔ "جلدی سے کھانا کھالو مجھے ولیم کی ڈرنک پارٹی میں جانا ہے' تم بھی ساتھ چلنا او کے۔" احسن نے تابعداری سے لیس کہا۔

ڈرنک پارٹی کلب میں تھی ولیم اور اس کے دوستوں نے بے تحاشا ڈرنک کی اور پھر گھناؤنی حرکات میں مشغول ہو گئے۔ ڈیزی بھی جھومتی جھامتی ولیم کے گلے سے لگ گئی۔ احسن کا غیرت مند خون جوش میں آیا اور اس نے ڈیزی کو پکڑا اور باہر کی طرف جانے لگا۔ ڈیزی نے اس سے ہاتھ چھڑایا اور غصے سے بولی۔

"او بلیڈی باسٹرڈ! اتنے دنوں سے میں تمہارے ساتھ ہوں بے حس مرد مجھے یہاں تو

انجوائے کرنے دو۔ تم میں تو مردانگی ہے نہیں۔"
احسن نے ایک بھرپور تھپڑ اس کے منہ پر مارا۔
"آؤ میں تمہیں مردانگی دکھاؤں' تم بے غیرت لوگ' غیرت عزت اور پاکیزگی سے واقف نہیں۔" ولیم کے دوستوں نے احسن پر حملہ کر دیا۔ زخمی زخمی احسن فلیٹ میں واپس لوٹا۔

❀......☆......❀

اگلے دن اس کے لیے مزید قیامت بن کے آیا سر انتھونی نے پھر اسے اپنے آفس میں بلایا۔
"مسٹر احسن! تمہاری شکایت ہے کہ تم آپریشن کرتے ہوئے جادو منتر پڑھتے ہو۔"
"نہیں سر! میں تو آپریشن کرنے سے پہلے اللہ کا نام لیتا ہوں اور دعا مانگتا ہوں کہ میرے ہاتھوں کسی انسان کی جان کا زیاں نہ ہو۔"
"بہرحال وارننگ ہے آپ کے لیے آپ آئندہ ایسا کچھ نہیں پڑھیں گے۔ اگر پڑھنا ہے تو بائبل پڑھ لیں' آپ اب امریکا میں ہیں اس لیے بیک ورڈ اور دقیانوسی باتیں چھوڑ دیں۔" احسن منہ لٹکائے آفس سے باہر نکلا' دل بہت اداس تھا۔ اس لیے گھر والوں سے بات کرنے لگا۔ امی نے بتایا کہ آج ساگ اور مکئی کی روٹی بنائی تھی اور احسن کو بہت پسند تھی اس لیے فون بند کرنے کے بعد شہر کی سڑکوں پر دیسی کھانا ڈھونڈنے نکلا پر سڑکوں پر برگر سینڈوچز کے سوا کچھ نہ تھا اور گوشت میں بھی حلال حرام کا شک' سو احسن نے برگر لیا اور سڑکوں پر پھرتے ہوئے سوچنے لگا کہ پردیس بھی کاٹ رہا ہوں لیکن نہ عزت ہے نہ خالص رشتوں کی محبت بالآخر اس نے ایک فیصلہ کیا اور مطمئن ہو کر اپنے فلیٹ پر آ گیا۔

❀......☆......❀

صبح صبح دروازے پر ہونے والی تیز بیل نے سب کو جگا دیا۔ دادا جان نے دروازہ کھولا سب اپنے اپنے کمروں سے باہر نکل آئے۔
"ارے احسن بیٹا! تم بغیر داڑھی کے؟" احسن کو پہچانتے ہوئے کہا۔
"جی دادا جان! میں آپ کی محبتوں کے حصار میں پھر سے لوٹ آیا ہوں۔ منگوائیں حلوہ پوری سب مل کر ناشتہ کریں گے۔" احسن نے پرانے اسٹائل میں بولتے ہوئے کہا۔
"واقعی بھائی؟" علی نے حیرانی سے کہا۔
"آپ ہمارے ساتھ انار کلی کی چاٹ اور باغ جناح کے گول گپے بھی کھائیں گے؟"
"ہاں سب کھاؤں گا۔" احسن نے بات مکمل کی اور سب ہنسنے لگے پھر سے گھر میں خوشی کا سا سماں ہو گیا سب احسن کی اس کایا پلٹ پر حیران تھے۔
شام میں سب اکٹھے بیٹھے تو احسن نے سب سے معافی مانگتے ہوئے کہا۔
"میں ناسمجھ تھا جو اتنی محبت اور خلوص کو چھوڑ کر صرف پیسے کی چکا چوند سے متاثر ہو گیا لیکن یہ چکا چوند لمحاتی تھی اور مجھے لوٹ کر آپ لوگوں کی طرف ہی آنا تھا اور ہاں امی! آپ چاچو کو شادی کی تیاری کا کہہ دیں کیونکہ شیزانہ جیسی جھینپو لڑکیاں ہی ہم پاکستانی مردوں کو سوٹ کرتی ہیں۔"
"سچ ہے اپنے ملک کے کانٹے بھی سنبل و ریحان سے بہتر ہوتے ہیں۔" دادا جان نے بات سمیٹتے ہوئے کہا۔

بازگشت

عمران احمد قریشی صاحب
السلام علیکم!
عشق عبادت ہے' عشق نبیوں' ولیوں کی میراث ہے اگر حرص اور ہوس سے پاک ہو تو انسان کو فرشتوں سے بھی آگے لے جاتا ہے جیسا کہ عزازئیل (شیطان) جو اللہ کی محبت میں ایسا ڈوبا کہ اللہ نے اسے جن ہوتے ہوئے نور سے تخلیق کیے گئے فرشتوں کا سردار بنادیا اور جب اس کے عشق میں حرص شامل ہوا تو وہ رہتی دنیا تک لعنتی قرار پایا۔ شاید عشق ہی پل صراط ہے جہاں ہلکی سی لغزش انسان کو فرش سے عرش اور عرش سے فرش پر لے آتی ہے۔ یہ کہانی بھی ایک ایسے ہی عاشق کی ہے جس نے عشق کی اصل روح کو سمجھے بغیر عشق کیا تھا۔
والسلام
محمد سلیم اختر
راولپنڈی

وہ میری سہاگ رات تھی مگر میں نے اپنی دلہن کا گھونگھٹ تک نہ اٹھایا اور اسے صاف صاف بتا دیا کہ مجھے اس سے کوئی غرض نہیں۔ میں ناہید سے محبت کرتا تھا اور کرتا رہوں گا۔ میں یہ کہہ کر مسہری پر برف کی سِل کی مانند سو گیا۔
روبی...... میری ماموں زاد اور منگیتر تھی' میں اسے ناپسند کرتا تھا اور اس سے شادی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں ناہید کو پسند کرتا تھا اور اس کے ساتھ ہی شادی کرنا چاہتا تھا مگر ہم دونوں کے والدین ہمارے راستے کی دیوار بن گئے۔ میں نے ناہید کو کورٹ میں جا کر شادی کرنے کی ترغیب دی مگر وہ نہ مانی اور یوں میری شادی روبی سے ہو گئی مگر میں نے روبی کے جسم کو چھوا تک نہیں تھا۔
یوں ہی دو سال کا عرصہ گزر گیا اس عرصہ میں ناہید کی شادی اس کے کسی کزن کے ساتھ ہو گئی' یوں میرا زخم اور بھی گہرا ہو گیا اور روبی سے میری نفرت فزوں تر ہوتی گئی اور میں جو شادی سے قبل ہی اس کے مرنے کی دعائیں مانگا کرتا تھا' اب ان دعاؤں میں اور بھی شدت آ گئی مگر روبی بھی ڈھیٹ تھی' اس نے میرے تمام تر ستم کے باوجود میری زندگی سے نہ نکلنے کا ارادہ کر رکھا تھا۔

❀......❀......❀

پھر انہی دنوں وہ دبی دبی سرگوشیاں جو میں پچھلے دو سال سے سنتا اور نظر انداز کرتا چلا آ رہا تھا۔ اب بلند آہنگ طعنوں میں بدل گئیں اور میرے بارے میں خاندان بھر نے یہ فیصلہ صادر کر دیا کہ مجھ میں اولاد پیدا کرنے کی صلاحیت ہی نہیں ہے۔ میں اپنی ذات پر ایسا شرمناک الزام بھلا کیسے برداشت کر سکتا تھا' یہ تو میری مردانگی کی توہین تھی۔ یوں جوش کی آگ نے برف کی سل کو پگھلا دیا اور میں نے روبی کو شوہر کی محبت دے ڈالی۔ تین ماہ بعد ہی وہ ساری نگاہیں جو مجھ پر طنز کے تیر برساتی تھیں' مجھے

معذرت خواہانہ انداز میں دیکھنے لگیں۔ امی جان کے چہرے پر بھی فخر و انبساط کی روشنی بکھر گئی اور وہ روبی کا کچھ زیادہ ہی خیال رکھنے لگیں۔ اب تو وہ ایک پوتے کی دعائیں مانگتی نظر آتیں۔

مگر ادھر میں تھا کہ ان کمزور لمحوں کی یاد مجھے جلائے دے رہی تھی۔ جب میں نے روبی کو اپنی قربت سے نوازا تھا' میں جھنجلانے لگا تھا' وحشت کے عالم میں اپنے بال نوچنے لگتا' جو مجھ پر بیت رہی تھی اس کا تو میں نے تصور ہی نہیں کیا تھا' مجھے اپنی زندگی کی جنت میں صرف اور صرف ناہید ہی کی طلب تھی لیکن روبی کسی ناگن کی طرح میری جنت میں در آئی تھی اور اب میں جہنم کی اس آگ میں جل رہا تھا۔

❁ ...... ❁ ...... ❁
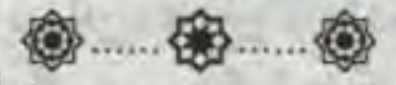
ہمارے محلہ میں ایک عورت پہلی زچگی کے دوران فوت ہوگئی تھی اور کچھ دیر بعد اس کا بچہ بھی فوت ہوگیا تھا۔ مجھے بے حد دکھ ہوا تھا' میں اس کے شوہر کے پاس افسوس کرنے گیا تھا وہ بیوی کی موت پر بہت ہی افسردہ تھا۔ واپسی پر میرے دل سے یہ دعا نکلی کہ خدا کرے روبی بھی زچگی کے دوران مرجائے اور اس کے پیٹ میں پرورش پانے والا میرا بچہ بھی زندہ نہ رہے۔

ایسی دعا مانگنے کے بعد مجھے خود سے شرمندگی محسوس ہوئی لیکن اگلے ہی لمحے پھر میری روبی سے نفرت عود کر آئی اور روبی کے زچگی کے دوران مرنے کی خواہش نے زیادہ سختی سے اپنے پنجے میرے پتھر دل میں گاڑ دیئے۔

باقی عرصہ میں نے کیسے گزارا یہ ایک لمبی کہانی ہے۔ بس اتنا کہ میرے انتظار میں وہی شدت تھی جو کسی محبوب کو شادی کے بعد اپنی محبوبہ کے بطن سے اپنے پہلے بچے کی پیدائش کے انتظار میں ہوتی ہے اور پھر رات آگئی' جب روبی درد سے کراہنے لگی اور میرے جوش کا عالم سوا ہوگیا۔

❁ ...... ❁ ...... ❁

ہوا بھی وہی جس کی مجھے خواہش تھی۔

روبی مرگئی اور اس کے ساتھ بچہ بھی' جب دائی نے مجھے یہ خبر سنائی تو میرے چہرے پر ایک فاتحانہ مسکراہٹ بکھر گئی۔ دائی میرا یہ روپ دیکھ کر بھونچکی رہ گئی پھر اچانک مجھے احساس ہوا کہ مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے' اس لیے میں نے فوراً چہرے پر افسردگی کا نقاب اوڑھ لیا۔

پورے خاندان میں صف ماتم بچھ گی' رشتہ داروں اور عزیزوں کا تانتا بندھ گیا۔ وہ امی سے ان کی نوجوان بہو اور نوزائیدہ پوتے کی موت پر تعزیت کا اظہار کرتے اور امی غم کی کیفیت میں پھٹی پھٹی نگاہوں سے انہیں دیکھتی رہتیں۔ ابا کی حالت بھی ان سے کچھ مختلف نہ تھی اور ظاہری طور پر میں بھی امی اور ابا کے ساتھ تھا لیکن میرا من روبی کی موت سے پرُسکون ہوگیا تھا۔ میں بار بار اپنے دل کے تہہ خانے میں اتر کر کے اور دروازہ بند کر قہقہے لگاتا تھا۔ پاگلوں کی طرح اپنی دعا کی قبولیت پر ہنستا تھا لیکن پھر یکا یک میں محسوس کرنے لگا کہ دل کے تہہ خانے میں جب بھی میرے قہقہوں کی بازگشت میرے کانوں میں در آتی ہے' میں خوف زدہ ہوجاتا ہوں یوں جیسے مجھ پر کوئی ہنس رہا ہے اور میرے کانوں میں پگھلا ہوا سیسہ ڈال رہا ہے۔

تب میں نے اپنے دل میں قلعہ بند ہونا چھوڑ دیا لیکن ایک آواز کی بازگشت میں اب بھی سن رہا تھا۔

''تم قاتل ہو' تم نے اپنی معصوم اور وفا شعار بیوی اور اپنے بچے کو قتل کیا ہے۔ تم قاتل ہو...... تم خونی ہو۔''

میں چیخ چیخ اٹھتا۔ ''یہ جھوٹ ہے میں نے کسی کو قتل نہیں کیا۔ مجھے روبی سے نفرت تھی۔ میں نے اس کی موت کی خواہش بھی کی تھی لیکن میں نے اسے قتل نہیں کیا۔ میں قاتل نہیں ہوں۔''

تب میرے ہر سو لوگوں کی نگاہیں مجھ پر گڑ جاتی تھیں اور مجھے یوں محسوس ہوتا تھا گویا یہ نگاہیں مجھ پر طنز کے تیر برسا رہی ہیں اور کہہ رہی ہیں کہ ہاں تم نے روبی کو قتل کیا ہے۔ میں ان نگاہوں سے بھاگ بھاگ جاتا تھا' یہ نگاہیں مجھ سے دور بھی ہوجاتی تھیں لیکن دو آنکھیں پھر بھی میرے سامنے رہتی تھیں۔ روبی کی آنکھیں...... پتھرائی ہوئی آنکھیں...... یہ آنکھیں مجھ سے کہتی تھیں کہ میں ان کا قاتل ہوں۔ ان کی روشنی میں نے چھینی ہے۔

❁ ...... ❁ ...... ❁
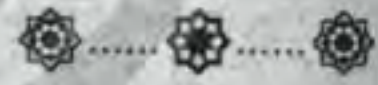
دن ہفتوں' ہفتے مہینوں اور مہینے سال میں بدل گئے اور میرے اندر یہ احساس جڑ پکڑتے ہوئے ایک تناور درخت بن گیا کہ میں نے روبی کو قتل کیا تھا۔ صرف روبی کو ہی نہیں بلکہ اپنے بچے کو بھی۔ میری ذہنی حالت بگڑتی چلی گئی' میں کسی کام کا نہ رہا۔ مجھے اپنے آپ کا ہوش ہی نہ رہا' کپڑے پھٹے ہوئے' بال بے ترتیب اور خاک سے اٹے ہوئے۔ ایسے ہی عالم میں ایک بار ناہید سے سامنا ہوگیا تو اس نے مجھے پہچانا ہی نہیں' وہ اپنے شوہر کے ساتھ جارہی تھی اور اس کی گود میں ایک خوب صورت سا بچہ تھا۔ وہ میرے قریب سے یوں گزر گئی جیسے میری اس سے کبھی آشنائی ہی نہ رہی ہو۔

تب میرے جنون میں شدت آگئی' میں نے آئینہ میں اپنی اصلی صورت دیکھ لی تھی وہ جس کے لیے میں نے اپنی بیوی اپنے بچے کو محبت کی بجائے موت کی دعا دی تھی' وہی مجھے بھول گئی تھی تو پھر میں اب زندہ رہ کر کیا کروں۔ میرے اندر نفرت کا لاوا اٹھا تھیں مارنے لگا۔ مجھے ناہید سے پہلی بار نفرت ہوئی' اس کی بے رخی نے میرا سینہ چھلنی کردیا۔ کیا میں ایک نظر دیکھ لینے کے قابل بھی نہ رہا تھا۔ میرے دل و دماغ پر جذبات کی حکمرانی ہوگئی' کچھ سمجھ نہ آیا اور میں نے ناہید کا پیچھا کرنا شروع کردیا' میں نے اس کا گھر دیکھ لیا اور پھر ایک روز وہ گھر میں اکیلی تھی' میں اس کے گھر جا پہنچا' ناہید نے مجھے گھر سے نکل جانے کو کہا کہ میں اب کسی کی بیوی ہوں' کسی کی امانت ہوں اور تم اب میرے لیے غیر ہو۔ تو میں برداشت نہ کرسکا اور ناہید اس کے بیٹے دونوں کو موت کی نیند سلا دیا۔

❁ ...... ❁ ...... ❁

میں اب سزائے موت کا قیدی ہوں اور جیل میں زندگی کے آخری دن گزار رہا ہوں' مجھے اب انتظار ہے پھانسی کے پھندے کا کیونکہ میں اسی قابل ہوں۔ میں انسان نہیں درندہ ہوں اور درندوں سے نفرت کی جاتی ہے' نفرت اور صرف نفرت۔

❖

سفر حجاز

محترم عمران بھائی

السلام علیکم!

ہمیشہ کی طرح آج میں کسی کی سچی روداد لے کر حاضر نہیں ہوئی ہوں بلکہ اپنی مقدس سفر، سفر حجاز کی روداد سنا رہی ہوں۔ میں نے شہناز بانو سے ان کی زبانی ان کے سفر حجاز کے واقعات سنے، اپنی تو اس مقدس سفر اور دیار رحمت العالمین کی باتیں اور پھر شہناز بانو کا انداز بیان مجھے یوں لگا جیسے میں ان کے ساتھ مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کی گلیوں میں گھوم رہی ہوں وہ گلیاں وہ راستے جہاں ہمارے آقا صلی اللہ علیہ وسلم کے قدم مبارک پڑے، ان کی باتیں سن کر آنکھیں بھیگ بھیگ جا رہی تھیں۔ میرا دل چاہا اسے قارئین کے ساتھ شیئر کروں، امید ہے یہ ایمان افروز تحریر آپ کو بھی پسند آئے گی۔ دعاؤں میں ہمیشہ رہنا چاہتی ہوں، اللہ تعالیٰ ہم سب کو حجاز مقدس کے سفر کی سعادت نصیب فرمائے، آمین۔

والسلام

شہنی ارشاد

کراچی

میں امی کے لیے سوپ بنا رہی تھی کہ میرا سیل فون بجنے لگا، سوپ اس مرحلے پر تھا کہ اسے چھوڑ کر نہیں جا سکتی تھی اس لیے کچن سے ہی آواز لگائی۔

''امی! ذرا میرا فون سن لیں، نام پوچھ لیجیے گا میں بعد میں کرلوں گی۔''

امی نے میرے کہنے پر میرا فون ریسیو کیا اور پھر ان کے بولنے کی آوازیں آنے لگیں۔ امی کے باتیں کرنے سے میں سمجھ گئی کہ آنے والا فون کس کا ہوگا، میں نے تیار ہونے پر سوپ پیالے میں نکالا اور چھوٹی ٹرے میں رکھ کر امی کے پاس لے آئی، میں نے دیکھا کہ امی کے چہرے پر ایک آسودہ سی مسکراہٹ ہے اور وہ مزے سے باتیں کر رہی تھیں۔

''امی! آپ سوپ پئیں، نہیں تو ٹھنڈا ہو جائے گا۔ آپ نے بہت باتیں کرلیں آپی سے، اب آپ فون مجھے دے دیں۔'' میں نے امی کی جانب ٹرے کھسکاتے ہوئے کہا۔

''لو بھئی آ گئی تمہاری چہیتی! اب تم اس سے باتیں کرو، میری جانب سے اللہ حافظ۔'' امی نے بات ختم کر کے فون میری جانب بڑھا دیا۔ میں نے فون جھٹ کان سے لگایا اور چہکتی ہوئی آواز میں کہا۔

''السلام علیکم آپی! کیا بات ہے، امی بہت خوش نظر آ رہی ہیں، کیا آپ نے انہیں کوئی خوش خبری سنا دی ہے۔''

''ارے تمہیں کیسے پتا کہ یہ میرا ہی فون ہے؟'' آپی نے حیرانی سے پوچھا۔

''اس میں اتنی حیرانی کی کیا بات ہے آپی! میرے سیل پر آنے والی کالوں میں صرف ایک آپ ہی کی کال ایسی ہوتی ہے جس سے امی بات کرتی ہیں۔ ویسے کیا ہے وہ خوش خبری؟'' میں نے مزے سے کہا۔

''خبر تو واقعی بہت خوشی کی ہے بلکہ یوں سمجھو کہ اللہ پاک نے میری زندگی کی سب سے بڑی آرزو کو پورا کر دیا ہے۔'' آپی نے شکر گزار لہجے میں کہا۔

''اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کی حج کی کال آ گئی ہے۔'' کیوں کہ میں یہ بات جانتی تھی کہ زندگی میں ہر جانب سے مطمئن ہونے کے بعد اب آپی کی سب سے بڑی خواہش کیا ہے۔ پچھلے سال بھی وہ ساری تیاریوں کے باوجود صرف سیٹ نہ ملنے کے سبب نہ جا سکی تھیں اور ہفتوں دل گرفتہ رہی تھیں۔

''تم بالکل ٹھیک سمجھی ہو چندا! ابھی تھوڑی دیر قبل علی نے آ کر بتایا ہے کہ حج ٹریول والوں کی جانب سے فون آیا ہے کہ آپ رقم جمع کروا دیں بس اب ان شاء اللہ میں حج ادا کرنے ضرور جاؤں گی۔'' ان کے لہجے میں ایک عجیب طرح کی سرشاری تھی۔

''ان شاء اللہ!'' جواباً میں نے صدق دل سے کہا۔

پھر ہم ادھر اُدھر کی باتیں کرنے لگے، آپی سے میں ہمیشہ اپنی پرسنل باتیں شیئر کرتی تھی کیوں کہ میری کوئی بہن نہیں ہے اس لیے میں نے انہیں ہمیشہ اپنی بڑی بہن کا درجہ دیا ہے۔

شہناز آپی کے والد اور میرے والد آپس میں بہت گہرے دوست تھے، میرے ابو شہناز آپی کے ابو سے عمر میں چھوٹے تھے اس لیے ان کی شادی بھی بعد میں ہوئی۔ شہناز آپی سے چھوٹے تین بھائی ہیں اور میرے بھائی مجھ سے بڑے ہیں، اس لیے جب میں پیدا ہوئی تو آپی مجھے بہت پیار کرتی تھیں، ان کی شادی ہوگئی تب بھی ان کا پیار میرے ساتھ اسی طرح رہا۔ نہ جانے کیوں کب اور کس طرح انہوں نے میری آئیڈیل کا روپ دھار لیا۔ غیر ارادی طور پر میں ان کی طرح بننے کی کوشش کرنے لگی۔ حد یہ کہ مجھے لکھنے کی تحریک بھی ان ہی کی وجہ سے ہوئی انہوں نے مجھے قدم قدم پر گائیڈ بھی کیا، آج میرے بھائی شادیاں کر کے اپنے اپنے گھر بسا کے بیٹھے ہیں لیکن شہناز آپی کی اور میری محبت اسی طرح قائم ہے۔

گاہے بگاہے ہم فون پر باتیں کرتے رہے اور ایک دوسرے کی خیریت بھی پوچھتے رہے، آپی نے بتایا کہ انکل کے ساتھ اسعد بھی جا رہے ہیں تو میں نے بہت خوشی کا اظہار کیا۔ آپی ان دنوں بہت زیادہ مصروف تھیں تو میں ہی امی کے ہمراہ ان سے ملنے کے لیے چلی گئی۔ وہ بہت خوشی خوشی جانے کی تیاریاں کر رہی تھیں، اب جانے میں کم ہی دن رہ گئے تھے بلکہ جب ان کے سامان کی پیکنگ ہو رہی تھی میں بھی ان کے گھر چلی گئی اور ان کی بہو کے ساتھ مل کر سامان پیک کروانے لگی۔

میری آنکھوں میں بار بار نمکین پانی بھر آتا اور میری آنکھوں کے سامنے بار بار خانۂ کعبہ اور روضۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا تصور آ جاتا اور میں صدق دل سے دعا کرتی کہ یا اللہ! یہ حسین موقع مجھے ایک بار پھر عطا فرما۔ میں نے عمرہ ادا کیا تھا، حج نہیں رکن اسلام کی ادائیگی کا لطف ہی کچھ اور ہے۔

آپی سامنے بیڈ پر بیٹھی تھیں، انکل بھی آ گئے کہ آپی کے سیل فون کی بیل بجی، انہوں نے فون اٹھایا اور نمبر دیکھا پھر بولیں۔

''تنزیلہ کا فون ہے۔'' (یہ ان کی بھابی ہیں)۔

آپی نے فون سنا اور اگلے ہی لمحے ان کے ہاتھوں سے فون گر گیا۔ وہ بُری طرح کپکپا رہی تھیں اور آنکھوں سے ڈھیروں پانی بہہ رہا تھا، ہم سب یہ دیکھ کر بُری طرح چونک گئے، انکل جو اُن کے قریب بیٹھے تھے انہوں نے گھبرا کر آپی کو سنبھالا اور بولے۔

''کیا ہوا؟ کس کا فون تھا؟''

''علی...... میری امی چلی گئیں......'' آپی نے کہا اور بس......؟

پرسوں صبح آپی کی فلائٹ تھی اور آج یہ سانحہ رونما ہوگیا۔ وہ بار بار ایک ہی بات کہہ رہی تھیں۔

''میری امی کو کیا ہوا تھا وہ تو بالکل ٹھیک تھیں۔

نئے افق 1 فروری 2013ء

رات تو میں ان سے مل کر معافی مانگ کر اور ڈھیروں دعائیں لے کر آئی تھی۔"

میں اور مہوش روتے ہوئے آپی کو سنبھال رہے تھے وہ قرآن کی معلمہ تھیں' ہزاروں لوگوں کو انہوں نے قرآن کی تعلیم دی تھی اور اپنے انتقال سے آدھے گھنٹے قبل ہی وہ اپنے مدرسے سے فارغ ہوئی تھیں' غسل کر کے ظہر کی نماز ادا کرنے کھڑی ہوئی تھیں کہ انہیں اللہ نے اپنے پاس بلالیا۔

ان کا اپنا مدرسہ تھا اور وہ فی سبیل اللہ قرآن پڑھایا کرتی تھیں' میری بھی استاد تھیں۔ میں نے قرآن ان سے پڑھا اور سیکھا تھا۔

ہم سب ان کی امی کے گھر پہنچ گئے' میں امی کو لے کر پہنچی۔ آپی نے اپنی بہنوں کے ہمراہ انہیں غسل دیا' کیوں کہ اپنی زندگی میں ہی آپی سے کہہ دیا تھا کہ "میرا غسل شہناز دے گی۔"

آپی بہت زیادہ صبر کا مظاہرہ کر رہی تھیں' میں بھی ان سے بے پناہ محبت کرتی تھی۔ مجھے رہ رہ کر ان کا پیار اور شفقت یاد آ رہا تھا۔ وہ بہت اعلیٰ اخلاق والی تھیں اور ان کے احباب کا حلقہ بہت وسیع تھا۔ بے تحاشا لوگ آئے ہوئے تھے' مغرب کی نماز میں تدفین تھی لیکن پھر پتا چلا کہ ملک سے باہر آپی کی سب سے چھوٹی بہن اور بہاولپور میں موجود دوسری بہن جمعہ کی صبح پہنچ رہی ہیں اس لیے تدفین کا پروگرام بعد نماز جمعہ طے پایا اور بے حد پُرسکون نیند سوتی ہوئی چچی جان کو ایدھی کے سردخانے میں رکھوا دیا گیا۔

وہ رات بہت طویل اور بھاری تھی' ہم سب رات بھر جاگتے رہے چچی جان کی باتیں کرتے رہے۔ دوسرے دن صبح نو بجے ان کی بہنیں بھی پہنچ گئیں اور بعد نماز جمعہ چچی جان کی نماز جنازہ کے بعد تدفین کردی گئی۔

میں مسلسل آپی کے ساتھ تھی' ان کی بہو بھی آپی کے پاس ہی تھی۔ میں نے ہی آپی کے موبائل سے کچھ اپنی نئے افق کی قاری بہنوں کو میسج کیے' سب کے فون آگئے۔

شام کو میں آپی کو لے کر ان کے گھر واپس آگئی کیوں کہ صبح آپی کی روانگی تھی' میں نے اور مہوش نے زبردستی آپی کو لٹا دیا کیوں کہ ان کا بی پی بہت زیادہ ہائی ہو رہا تھا۔

صبح پانچ بجے فجر کی نماز ادا کر کے ہم سب ایئر پورٹ کے لیے روانہ ہوئے' انہیں ایئر پورٹ چھوڑ کر میں گھر جانے لگی تو مہوش زبردستی مجھے گھر لے گئی کہ دل بہت اداس ہو رہا تھا آپ گھر چلیں اس کی امی اور بٹی بھی تھیں۔

شام کو چچی جان کا سوئم تھا ہم وہاں چلے گئے' قرآن خوانی کے بعد درس قرآن ہوا اور پھر دعا ہوئی۔ بہت سے لوگوں کو آپی کے حج پر جانے کا پتا نہیں تھا' اس لیے سب ان کے بارے میں پوچھ رہے تھے' آپی درس قرآن بھی دیتی ہیں' اپنے والد کے سوئم پر بھی انہوں نے ہی درس قرآن دیا تھا اور دعا کرائی تھی۔

ان دنوں میرا دل بہت اداس رہتا تھا' رہ رہ کر آپی کا خیال آجاتا تھا کہ پتا نہیں وہ وہاں کیسی ہوں گی؟ فون پر بات بھی ہوئی لیکن مختصر سی' فون پر سعد نے بتایا تھا کہ امی کی طبیعت خراب ہو جاتی ہے لیکن وہ امی کا بہت خیال رکھ رہے ہیں۔

پھر حج ہو گیا اور حج کی ادائیگی کے فوراً بعد یکم نومبر کو آپی کراچی واپس آگئیں۔ وہ کمزور ہو گئی تھیں' میں آج رات پھر آپی کے گھر رک گئی۔ سارا دن بہت سے لوگ آتے رہے میں اور مہوش مہمانوں کی خاطر داری میں' بہت مصروف رہے۔

میرا شدت سے دل چاہ رہا تھا کہ میں سفر حجاز کی

لیمہ کی کہانی آپی کی زبانی سنوں مگر مجھے موقعہ ہی نہیں مل رہا تھا' اُدھر امی تنہا تھیں پھر امی کے پاس آگئی۔ دو چار دن کے بعد مجھے موقعہ ملا تو میں آپی کے پاس گئی اور ان سے ساری روداد سنی۔

اور قارئین! اس کے بعد ہی میرا دل چاہا کہ میں اس سہانے اور خوب صورت سفر کی کہانی تحریر کروں' میں نے اپنی خواہش کا اظہار آپی سے کیا کہ آپی آپ یہ سب تحریر کریں' تو آپی نے کہا۔

"فی الحال میرا لکھنے کا موڈ نہیں ہے تم اگر چاہو تو لکھ دو۔" سو میں نے فیصلہ کیا کہ میں نے ڈھیروں کہانیاں لکھی ہیں۔ ان سچی کہانیوں میں مجھے اپنی جانب سے ردوبدل کرنی پڑتی ہے لیکن یہ باتیں ایسی ہیں کہ ان میں کسی ردوبدل کی ضرورت نہیں ہے' میں نے آپی کی زبانی ان کے دلی جذبات اور احساسات سنے اور چاہتی ہوں کہ آپ سب بھی میرے ساتھ ہم تن گوش ہوجائیں۔ آپی نے جو سنایا وہ ان کی زبانی سنیے۔

"میرے دل کی عجیب حالت تھی' اللہ کے گھر جانے اسے دیکھنے اور اس کا دیوانہ وار طواف کرنے کا تصور بھی تھا تو دوسری جانب امی کی جدائی سے دل غم کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوبا ہوا تھا۔ ابھی گھنٹے ہی کتنے ہوئے تھے کہ میں نے بہتی ہوئی آنکھوں اور لرزتے اور کپکپاتے ہوئے لبوں سے اس دعا کے ساتھ امی کو ہمیشہ کے لیے رخصت کر دیا تھا کہ "اے میرے رب! میرے معبود میری ماں کے ساتھ اس طرح رحمت اور شفقت کا برتاؤ کرنا' جس طرح انہوں نے بچپن میں مجھے پالا تھا۔"

ائیر پورٹ پر زیادہ لوگ نہیں آسکے تھے ہمیں رخصت کرنے' بس چند لوگ تھے' جہاز نے جیسے ہی پرواز کی' میں نے اپنے احرام پر ایک نگاہ ڈالی اور اپنی ساری توجہ اپنے ربّ کی جانب کر لی اور خود کو سمجھایا کہ ہم میں جو بھی اس دنیا میں آیا ہے اسے ایک نہ ایک دن اسے خیرباد کہنا ہی ہے اور جب دل نے اس اٹل حقیقت کو تسلیم کر ہی لیا ہے تو ہمیں بھی اپنی آخرت کی فکر کرنی چاہیے' دنیا سے ایسے اعمال لے کر جائیں کہ روز قیامت اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے آگے کوئی ندامت کوئی شرمندگی نہ ہو۔ ہمارے چہرے روشن ہوں' ہمارا اعمال نامہ ہمارے دائیں ہاتھ میں دیا جائے' اللہ تعالیٰ ہمارے نور کو مکمل کردے جو اس طویل اور سخت ترین دن میں ہمارے دائیں جانب اور آگے ہی آگے دوڑے۔"

میں سیٹ کی پشت گاہ سے سر ٹکائے اور آنکھیں موندے ایسی ہی سوچوں میں گم تھی کہ اچانک جہاز میں اعلان ہوا کہ میقات آگیا ہے' آپ سب عمرے کی نیت کر لیں۔

میں نے صدق دل سے عمرے کی نیت کی اور پھر سوچوں میں گم ہوگئی' علی جو میرے برابر والی سیٹ پر بیٹھے تھے اور مسلسل مجھے دیکھ رہے تھے' بہت نرمی سے بولے۔

"تم ٹھیک ہوناں......؟"

"الحمدللہ!" میں نے ایک گہرا سانس لیتے ہوئے کہا تو وہ بس مجھے دیکھتے ہی رہ گئے۔ مجھے وہ صبر کی تلقین بھی نہ کر سکے۔ الفاظ ہی نہیں تھے کیوں کہ وہ جانتے تھے کہ یہ دکھ بہت بڑا ہے اور صبر اللہ تعالیٰ ہی عطا کرے گا۔ ان کے چہرے پر میں نے گہری اداسی دیکھی تو ان کی تسلی کے لیے ایک پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

"علی! آپ پریشان نہ ہوں میں اب ٹھیک ہوں۔" تو وہ بھی میرے ہاتھ کی پشت کو تھپتھپا کر دھیرے سے مسکرا دیئے۔ البتہ اسعد بار بار فکرمندی سے میرے پاس آرہے تھے اور پھر میرا دل بہلانے

کے لیے مجھ سے باتیں کرنے لگے۔
جدہ ائیر پورٹ پر جہاز رکا اور پھر کئی گھنٹے لگ گئے۔ بے پناہ رش تھا۔ ایک طویل اور تھکا دینے والے پروسس سے گزر کر ہم مکہ میں ہلٹن ہوٹل پہنچ گئے وہاں فریش ہوئے سامان رکھا اور عمرے کی ادائیگی کے لیے حرم آگئے۔
ہوٹل حرم سے بالکل متصل تھا ہمیں زیادہ چلنا نہیں پڑا البتہ خانہ کعبہ کے دیدار کے لیے کافی اندر جانا پڑا۔
خانہ کعبہ کے دیدار کے تصور سے ہی دل کی عجیب حالت ہورہی تھی آنکھوں سے اشک سیلاب کی صورت رواں تھے اور قدموں میں لڑکھڑاہٹ تھی۔ یہاں بھی لوگوں کا بے پناہ رش تھا ایسا محسوس ہورہا تھا گویا ساری دنیا ہی آج صحن کعبہ میں امڈ آئی ہے میں نے اپنی آنکھیں کھولیں لیکن آنسوؤں کی دھندلاہٹ سے کچھ بھی دیکھنے سے قاصر تھی۔
سیڑھیوں کے قریب رک کر میں نے اپنی نگاہیں اوپر اٹھائیں۔
”اف میرے اللہ...... میرے دل کی دھڑکنوں کو قابو میں کردے خانہ کعبہ کے دیدار کے لیے یہ کیوں اتنا بے قابو ہوا جارہا ہے۔“
کہتے ہیں کہ جیسے ہی خانہ کعبہ پر پہلی نگاہ پڑے تو بنا پلک جھپکائے جو پہلی دعا مانگی جائے وہ قبول ہوجاتی ہے لیکن انسان اتنا ایکسائیڈ ہوتا ہے کہ پلک جھپک ہی جاتی ہے لیکن...... میرا حال عجیب تھا آنکھیں جیسے پھٹ گئیں میں بنا پلک جھپکائے اس سیاہ رنگ کی پرشکوہ عمارت کو دیکھ رہی تھی اس کی عظمت اور جاہ جلال جو دنیا کی کسی اور عمارت میں نہیں۔
میں کعبہ کو دیکھتی رہی دیکھتی رہی...... پھر میرے لبوں سے ٹوٹے ہوئے لفظوں میں یہ دعا نکلی۔
”یا اللہ تو مجھے مستجاب دعا بنادے۔“ (میں جو دعا مانگوں وہ قبول ہو)۔
دعا سے فارغ ہوئے تو سیڑھیاں اتر کر نیچے مطاف (طواف کرنے کی جگہ) پہنچے۔ لوگوں کا رش دیکھ کر سوچا کہ یا اللہ یہاں تو تل دھرنے کی جگہ نہیں ہے ہم طواف کیسے کریں گے۔ میں لمحے بھر کو رکی تو پیچھے سے بہت سے لوگوں کا ایک ریلا آیا اور ہم دھکے سے آگے بڑھ گئے اور سیدھے گرین لائٹوں کی سیدھ میں آگے بڑھے۔ گرین لائٹس حجر اسود کی سیدھ کی نشاندہی کے لیے لگائی گئی ہیں۔ لوگوں کے دھکے بڑھتے گئے اور ہم آگے بڑھتے رہے اسعد اور علی نے مجھے آگے اور پیچھے سے سپورٹ دی ہوئی تھی ہم نے ایک دوسرے کو مضبوطی سے تھاما ہوا تھا۔
حجر اسود کی سیدھ میں پہنچ کر بمشکل حجر اسود کا استلام کیا۔ اس روز مجھے شدت کے ساتھ پیارے نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی حکمت کا احساس ہوا کہ انہوں نے طواف کے دوران اپنی چھڑی سے حجر اسود کو استلام کیوں کیا تھا اس لیے کہ وہ بات جانتے تھے کہ ایک دن ایسا بھی آئے گا جب اس کعبہ کا ایک ہی وقت میں لاکھوں لوگ طواف کررہے ہوں گے اور سب کے لیے ممکن نہ ہوگا کہ وہ طواف شروع کرنے سے قبل اور ہر چکر کے شروع کرنے سے قبل حجر اسود کا بوسہ لے سکیں اور ان لوگوں کے دلوں میں کوئی بھی نہ رہ جائے۔ اس لیے حجر اسود کو بوسہ دیا جائے یا اشارے سے استلام کیا جائے دونوں عمل ہی سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔
طواف کے دوران بھی دل کی عجیب حالت تھی یہ سوچ رہی تھی کہ اللہ تعالیٰ کا عرش عین خانہ کعبہ کے اوپر ہے۔ اس وقت میرے دل و دماغ میں نہ دنیا کا نہ کسی رشتے کا نہ اولاد کا نہ ماں باپ کا کوئی احساس نہیں تھا صرف میں اور میرا اللہ......!

تیسرا کلمہ درود پاک اور دعائیں لبوں پر جاری تھیں۔ رکن یمانی سے حجر اسود کی جانب آتے ہوئے بے ساختہ زبان کہنے لگی۔
”یا اللہ تو ہمیں دنیا میں بھی بھلائی عطا فرما اور آخرت میں بھی بھلائی عطا فرما اور ہمیں جہنم کے عذاب سے بچا۔ جنت میں باعزت طریقے سے داخل فرما یا عزیز و یا غفار۔“
اللہ کے کرم سے طواف کے سات چکر مکمل ہوئے تو بڑی مشکل سے لوگوں کے اس رش سے باہر آئے اور اندر برآمدے میں دو رکعت طواف کے شکرانے کی ادائیگی کے بعد جی بھر کے آب زم زم پیا۔ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ آب زم زم کو اس دعا کے ساتھ کعبہ کی جانب رخ کرکے خوب پیٹ بھر کے پینا چاہیے کہ ”یا اللہ مجھے علم نافع عطا فرما میرے رزق میں اضافہ فرما اور مجھے صحت عطا فرما۔“
علی نے کہا ”تم تھوڑی دیر بیٹھ کر ستالو تھک گئی ہوگی۔“ اس لیے دس منٹ بیٹھ گئی نگاہیں پھر کعبہ پر جم گئیں۔ پتا نہیں کیسا سحر ہے اس پرشکوہ عمارت میں کہ انسان کی نگاہ جیسے اس پر چپک کر رہ جاتی ہے ادھر ادھر کا کوئی ہوش ہی نہیں رہتا۔ اندر کی کیفیت کیا ہوتی ہے کیسی ہوتی ہے وہ شاید مجھ سمیت کوئی بھی بیان نہیں کرسکتا۔ وہ کیفیت بیان کرنے کی ہوتی ہی نہیں ہے وہ صرف ایک احساس ہوتا ہے اور ہر شخص کا یقیناً جدا جدا احساس ہوتا ہے۔
اب ہمیں عمرے کی سعی کرنی تھی صفا مروہ کے درمیان چلنا یہاں بھی سات چکر لگانے پڑتے ہیں۔ یہاں بھی ہم نے مروہ سے خانہ کعبہ کا استلام کیا اور پہلے چکر کے لیے صفا کی جانب بڑھے۔
سعی ایک طویل اور کافی تھکا دینے والا عمل ہے یہاں بھی لوگوں کا بے تحاشا رش تھا اور یہاں بھی انسان دوسروں کے دھکوں سے آگے بڑھتا ہے ان دونوں پہاڑوں کے درمیان چلتے ہوئے میں مسلسل حضرت بی بی حاجرہ کے بارے میں سوچ رہی تھی آج ہم کتنے مزے سے پکے ماربل کے ٹھنڈے فرش پر چل رہے ہیں جگہ جگہ اے سی سے ٹھنڈی ہوائیں آرہی ہیں ہمیں اتنی ساری سہولتوں میں بھی صرف چلنا کتنا مشکل لگ رہا ہے ہم تھکے جارہے ہیں اور ایک وہ تھیں اللہ تعالیٰ کی نیک اور صابر خاتون انہیں رب پر کتنا توکل اور بھروسہ تھا کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام انہیں اور ان کے ننھے بچے کو اس بیاباں میں تنہا چھوڑ کر جارہے تھے تو انہوں نے اپنے شوہر سے پوچھا کہ ”آپ ہمیں یہاں کیوں چھوڑ کر جارہے ہیں؟“ اس پر حضرت ابراہیم خاموش رہے پھر پوچھا۔ ”کیا اللہ نے ایسا کرنے کا حکم دیا ہے؟“
تو انہوں نے کہا ”ہاں“ تو مطمئن لہجے میں جواب دیا۔
”پھر اللہ ہمیں تنہا نہیں چھوڑے گا۔“ سبحان اللہ! اللہ پر توکل کی انتہا تھی۔
پھر پانی کی تلاش میں کسی آنے والے قافلے کی آس میں وہ بے تابی سے ایک پہاڑ سے دوسرے پہاڑ کے درمیان جارہی تھیں اور جب تنہا بچہ نگاہ سے اوجھل ہوجاتا تو پھر دوڑ کر تیزی سے آگے بڑھتیں۔ بیٹے پر نگاہ پڑتی اور اسے ٹھیک ٹھاک دیکھ کر پھر آگے بڑھ جاتیں اور پیارے رب کو ان کی یہ ادا اتنی پسند آئی کہ اللہ نے مسلمانوں پر حج وعمرے کی ادائیگی کے لیے سعی کو واجب قرار دے دیا۔ وہ جگہ جہاں حضرت بی بی حاجرہ تیزی سے دوڑی تھیں اپنے بچے کو دیکھنے کے لیے اس جگہ تیزی سے دوڑنے کا حکم ہے لیکن خواتین کے لیے نہیں۔ مرد حضرات تیز دوڑتے ہیں اس جگہ کی نشاندہی کے لیے بھی سبز رنگ کی ٹیوب

لائینس لگائی گئی ہیں۔

مجھے ننگے پاؤں چلنے کی عادت نہیں ہے شاید اس لیے جب میں نے سعی کے سات چکر مکمل کیے تو میرے پیروں کا بہت بُرا حال تھا' پیروں میں چھالے پڑ گئے تھے۔ مروہ پر ساتواں چکر مکمل کرنے کے بعد میں نے وہاں موجود ایک خاتون سے جن کے ہاتھ میں قینچی تھی اور وہ دوسری خواتین کے بال کاٹ رہی تھیں' میں نے بھی اپنے بالوں کی چوٹی نکال کر ان سے درخواست کی کہ وہ میرے بھی بال تراش دیں تا کہ میرا عمرہ مکمل ہو جائے اور احرام کی پابندی ختم ہو۔

اسعد اور علی حرم کے سامنے موجود نائی کی دکان پر چلے گئے اور جب وہ بال اتروا کہ واپس آئے تو میری ہنسی نکل گئی' دونوں بغیر بالوں کے عجیب سے لگ رہے تھے۔

”کیا ہے بھئی امی! اب ہنسیں تو مت۔ پتا ہے اپنے سارے گناہ بالوں کی صورت میں اتروا کر آ رہے ہیں۔“ اسعد نے جھینپ کر کہا تو میں نے آگے بڑھ کر اس کی پیشانی کو چوم لیا۔

پھر ہم نے اطمینان سے بیٹھ کر چند نوافل ادا کیے اور دیر تک رو رو کر اور گڑگڑا کر اللہ سے دعائیں کیں۔ میری اس وقت کی دعاؤں میں میں نے زیادہ تر اپنے مرحوم والدین کے لیے دعا کی۔ تمام مسلمانوں کے گناہوں کی مغفرت کی دعا کی اور اللہ سے صراط المستقیم اور سنت کی پیروی کی دعا کی۔

اب پیروں میں واپسی کی طاقت نہیں رہی تھی' میں مسلسل دو راتوں کی جاگی ہوئی تھی اور بھوکی بھی تھی۔ پیر بہت بھاری بھاری محسوس ہو رہے تھے دیکھا تو پیروں پر بہت زیادہ ورم آ گیا تھا لیکن ایک احساس ہمت دلا رہا تھا کہ یہ تکلیف اللہ کے لیے اٹھا رہی ہوں۔ اس کو راضی کرنے کے لیے' اس کی اتنی نعمتیں پانے کے باوجود ہم اس کی کتنی نافرمانی اور ناشکری کرتے رہے اور وہ مہربان ربّ ہمیں محبت کے ساتھ مہلت پر مہلت دیتے جا رہا ہے شاید ہمارے اس عمل سے ہماری توبہ سے راضی ہو جائے اور ہمیں بخش دے' ہمیں جہنم کے عذاب سے بچا لے' آخرت کی شرمندگی سے بچا لے۔

ہوٹل پہنچے تو معلوم ہوا کہ ہم لوگوں کے لنچ اور ڈنر کا انتظام ایک دوسرے ہوٹل میں ہے۔ ناشتا اسی ہوٹل میں ملے گا لیکن لنچ اور ڈنر کے لیے ہوٹل دارالایمان جانا پڑے گا۔

ہمارا روم تیئیسویں (23) فلور پر تھا۔ روم میں پہنچ کر میری ہمت ہی نہیں ہو رہی تھی اور کھانے کا دل بھی نہیں چاہ رہا تھا لیکن علی اور اسعد نے ہمت دلائی کہ اگر کھانا نہیں کھاؤ گی تو حج کے لیے طاقت کیسے آئے گی۔ وہ مرحلہ تو اور بھی مشکل ہے۔

بس اس خیال سے آدھے گھنٹے کے آرام کے بعد دوبارہ ہمت کی اور اسعد کا ہاتھ تھام کر پیدل چلتی رہی۔ ان دنوں میں جو میں نے وہاں گزارے اسعد نے میرا بے انتہا خیال رکھا اور خدمت بھی کی۔ میرے دل سے ہر لمحے اس کے لیے دعائیں نکلتی رہتی تھیں۔

ہوٹل کا ریستوران لوگوں سے بھرا ہوا تھا' کوئی ٹیبل خالی نہیں تھی۔ ہم نے انتظار کیا' ٹیبل خالی ہوئی تو اسعد نے مجھے اور علی کو بیٹھنے کے لیے کہا اور خود کھانا لینے چلے گئے' یہاں بوفے سسٹم تھا' بہترین قسم کا کھانا تھا لیکن نہ جانے کیوں اندر سے دل ہی نہیں چاہ رہا تھا کھانے کا۔ علی اور اسعد نے بار بار اصرار کیا تو میں نے بمشکل تھوڑا سا کھایا پھر ہم حرم واپس آ گئے نماز عشاء کی ادائیگی کے لیے۔

میں خواتین کے پورشن میں آ گئی لیکن یہاں

ساری جگہ فل تھی' میں بڑی مشکل سے عورتوں کے درمیان چلتی ہوئی آگے تک گئی۔ عورتوں سے درخواست بھی کی کہ مجھے ذرا سی جگہ دے دیں مگر کوئی بھی اپنی جگہ سے ذرا بھی ہلنے کے لیے تیار نہیں تھی پھر پیچھے واپس آئی' بے بسی سے کھڑی سب جانب نگاہ دوڑا رہی تھی۔ بار بار التجا کی کہ مجھے ذرا سی جگہ دے دیں لیکن بڑی بے رخی سے جواب ملتا۔ ”ہم خود بہت تنگ بیٹھے ہیں۔“

میرے پیروں میں اب کھڑے رہنے کی سکت نہیں رہی تھی یہ محسوس ہو رہا تھا کہ اب میں ان عورتوں کے اوپر گر پڑوں گی۔ مجھے رونا آنے لگا' میں بڑی مشکل سے ایک پاؤں پھنسا کر کھڑی تھی کہ اقامت کی آواز بلند ہوئی اب مجھے اور بھی شدت سے رونا آیا کہ اللہ میں کیسے نماز ادا کروں گی۔

میری آنکھوں سے بے تحاشا آنسو بہنے لگے اور دل میں اللہ کو پکارا اور کہا۔

”یا اللہ تیرے اتنے بڑے گھر میں ایک میرے لیے ہی جگہ نہیں ہے۔“ اور کیا تم یقین کرو گی اس بات کا کہ میرے ربّ نے کیسے میری فریاد سنی' میں نے جوں ہی نیچے نگاہ ڈالی میں اپنے دونوں پیروں کے ساتھ اس طرح کھڑی تھی جیسے میں اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی ہوں۔ میرے لیے جگہ خالی تھی' بے ساختہ اپنے ربّ پر بے انتہا پیار آیا واقعی وہ سمیع و بصیر ہے' ہر لمحہ ہمارے ہر احساس اور ہر سوچ سے واقف ہے۔

میں روتے روتے سجدے میں گر پڑی۔ اقامت ہو چکی تھی' امام صاحب صفوں کو سیدھا کرنے کی ہدایت کر رہے تھے' میں بھی اس بات کے شدید احساس کے ساتھ کہ وہ حی و قیوم ذات میری شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے۔

امام صاحب نے اللہ اکبر کہا تو سب کے ساتھ میں نے بھی تمام دنیا کو پس پشت ڈال کر ربّ کے سامنے تن من کے ساتھ حاضر ہو گئی۔

نماز کی ادائیگی کا جو لطف آج آیا تھا وہ شاید برسوں بعد نصیب ہوا تھا' نماز کے بعد دعا مانگ رہی تھی کہ موبائل پر وائبریشن محسوس ہوئی۔ علی کا میسج آیا تھا کہ باہر آ جاؤ۔ میں بادلِ ناخواستہ اٹھی' اس جگہ سے جانے کا دل ہی نہیں چاہ رہا تھا بس یہ دل چاہ رہا تھا کہ اللہ کے آگے سجدے میں پڑی رہوں' روتی رہوں۔ پیارے ربّ کی منتیں کرتی ہوں کہ وہ مجھ گناہ گار کو معاف کر دے' مجھ سے راضی ہو جائے۔

کیا کرتی مجبوری تھی جانا تھا پھر بھی میں نے خاصا ٹائم لگا دیا' اسعد مجھے ڈھونڈتا ہوا وہیں آ گیا۔ وہ پریشان ہو گیا کہ کہیں امی کو کچھ ہو تو نہیں گیا۔ میں نے میسج کا جواب بھی تو نہیں دیا تھا۔

”کیا ہے بھئی تم لوگوں کو کیا جلدی پڑی ہے جانے کی' دعا تو مانگنے دو۔“ میں نے ناگواری سے کہا۔

”امی پورے پینتالیس منٹ ہو گئے ہیں آپ کو میسج کیے' آپ نے کوئی جواب بھی نہیں دیا اس لیے میں پریشان ہو گیا تھا۔ اس وقت چلیں چل کر تھوڑا آرام کر لیں' صبح فجر سے پہلے آ جائیں گے۔“ اس نے مجھے سہارا دے کر اٹھایا کیوں کہ میرے پیر جام ہو گئے تھے اور مجھ سے کھڑا بھی نہیں ہوا جا رہا تھا۔

”دیکھیں تو آپ کی حالت کیا ہو رہی ہے۔“ اس نے فکر مندی سے کہا۔

”کچھ نہیں ہوا ہے مجھے' اللہ کرم کرے گا۔“ میں نے اسے تسلی دی اور ہم ہوٹل واپس آ گئے۔

ہوٹل آئے تو اسعد نے مجھے پین کلر گولی دی اور ایک اعصاب کو ریلیکس کرنے کی بھی دوا دی اور مجھے بیڈ پر لٹا کر میرے پاؤں دبانے لگا' مجھے پتا ہی نہیں چلا کب میں سو گئی۔

صبح چار بجے ہمارے موبائل کے الارم بجے تو ہم بیدار ہوگئے اور وضو کرکے حرم آگئے۔ یہاں اس وقت بھی رش کا وہی عالم تھا۔ جدہ ائیر پورٹ پر پندرہ منٹ بعد دنیا بھر سے حاجیوں کی فلائٹیں آرہی تھیں۔ زیادہ تر لوگ احرام میں دکھائی دے رہے تھے اور آنے والی ہر نماز میں پہلے سے زیادہ رش بڑھ رہا تھا۔ چار بجے حرم سے تہجد کی اذان ہوتی ہے اور ایک گھنٹے بعد فجر کی اذان اور نماز ہوتی ہے پھر نماز کے بعد ہر کوئی طواف کرنے لگتا ہے۔

پانچ دن کے بعد ہمیں مدینہ جانا تھا' مدینے جانے سے پہلے ہمیں مکہ میں زیارتیں کرائی گئیں۔ اس وقت تو بسوں میں بٹھا کر ہی ہمیں بس میں بیٹھے بیٹھے ہی ہر جگہ کے بارے میں بتایا گیا مگر پہلے جب میں عمرے کے لیے یہاں آئی تھی تب میرے کزن نے مجھے یہاں کی تمام زیارتیں کروائی تھیں جن میں مسجد جن کا واقعہ میں نے تمہیں پہلے سنایا بھی تھا' اس وقت بھی مسجد جن بند تھی اور باہر سے ہی دیکھی تھی۔

پانچویں دن ہمیں بتایا گیا کہ دن کے تین بجے بسیں تیار ہوں گی اور مدینہ کے لیے روانگی ہے۔ آپ نے صرف ضرورت کا سامان اور کپڑے وغیرہ جو مدینے میں استعمال کرنے ہیں وہ لے لیں' باقی سامان پیک کرکے ہوٹل کے کمرے کے باہر رکھ دیں کیوں کہ مدینہ میں دس دن قیام کے بعد آپ لوگوں کو عزیزیہ میں ٹھہرایا جائے گا اور آپ کا یہ سامان آپ کو وہیں مل جائے گا۔

نکلتے نکلتے عصر کی نماز کا وقت ہوگیا تو سب نے کہا نماز کے بعد بس چلے گی' اس لیے عصر کی نماز کے فوراً بعد بسیں روانہ ہوگئیں۔

مدینے جاتے ہوئے راستے میں صرف بلند و بالا پہاڑ اور ریگستان دکھائی دیا اور میں ان پہاڑوں کو ریگستان کو دیکھتے ہوئے تمام راستے درود شریف پڑھتے ہوئے حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے ہجرت مدینہ کے سفر کے بارے میں سوچتی رہی کہ یا اللہ ہم تو کتنے مزے سے اے سی بسوں میں مدینے جارہے ہیں اور ان ہی سنگلاخ پہاڑوں کے درمیان میرے پیارے نبی نے کس طرح سفر کیا ہوگا اور کتنے دنوں کی مسافت کے بعد آپ مدینے پہنچے تھے۔ اس سے پہلے غارِ ثور میں دشمنوں کی نگاہ سے چھپ کر تین دنوں کا قیام...... مجھے کتابوں میں پڑھا ہوا ایک ایک لفظ یاد آنے لگا اور آنکھیں بار بار ان کے اس مشکل ترین سفر کی صعوبتوں کو یاد کرکے چھلکتی رہیں جو پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے جاں نثار دوست اور صحابی حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اٹھائی تھیں۔ راستے میں نمازوں کی ادائیگی اور چیک پوسٹوں پر رکنے کی وجہ سے ہم تقریباً سات آٹھ گھنٹوں میں مدینہ پہنچے یہاں ہمارا قیام سلور مبارک ہوٹل میں تھا' یہ ہوٹل بھی مسجد نبوی سے بہت قریب تھا اور اس کی بالکل سیدھ میں باب النساء نامی مسجد نبوی کا گیٹ تھا۔

علی نے کہا۔ ”لو بھئی یہاں بھی تم اللہ کا شکر ادا کرو کہ تمہیں مسجد آنے جانے میں زیادہ چلنا نہیں پڑے گا۔“ البتہ علی اور اسعد کو کافی آگے چل کر دوسرے گیٹ سے اندر مسجد میں جانا پڑتا تھا۔

ہم لوگوں نے تھوڑی دیر آرام کیا پھر غسل کرکے دوسرا لباس پہنا اور چار بجے تہجد کی اذان سنتے ہی ہم حرم کی جانب چل دیئے۔

اس وقت بھی دل کی دنیا اتھل پتھل ہورہی تھی لبوں پر درود پاک تھا تو قدموں میں لڑکھڑاہٹ بھی تھی۔ پیشانی پر عرق ندامت کہ یا اللہ کیسے سامنا کریں گے اپنے محبوب نبی کا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس امت کے لیے کتنے دکھ اٹھائے' رات رات بھر اللہ کے آگے سجدے میں رہے اور لبوں پر صرف اپنی امت کے لیے دعائیں۔ ہم جو اتنی محبت کا دعویٰ کرتے ہیں' سینہ ٹھوک ٹھوک کر ان کے امتی ہونے پر فخر کرتے ہیں لیکن ہمارا عمل کیا ہے؟ ہم نے اپنی نفسیاتی خواہشات کو پورا کرتے ہوئے لمحہ بھر کو بھی رک کر کیا کبھی یہ سوچا کہ کہیں میرے نبی نے اس عمل کو کرنے سے مجھے روکا تو نہیں ہے اگر جواب ہاں میں بھی آیا تو ہم سر سے جھٹک دیتے ہیں اور کرتے اپنے من کی ہی ہیں۔ ہم خوش ہوتے رہتے ہیں یہ سوچ کر کہ اللہ کے نبی قیامت کے دن ہماری شفاعت کریں گے لیکن وہ اعمال کرنے سے باز نہیں رہتے ہیں جن سے ہمیں جہنم کی سزا ہی نہ ملے۔ ہم کیوں نہیں اپنا شمار صالحین اور صادقین میں کرنے کی کوشش کرتے۔

اللہ! کیا منہ لے کر جاؤں گی اپنے پیارے نبی کے آگے' یہ جسم تو جسم یہ روح بھی گناہوں کے بوجھ سے آلودہ ہے۔ ندامت اور شرمندگی کی انتہا تھی' آنسو مسلسل بہہ رہے تھے۔

مسجد میں داخل ہونے کی دعا کے بعد نفلی اعتکاف کی دعا کے ساتھ حرم پاک میں داخل ہوئی' نگاہیں اس سرزمین کو بار بار چوم رہی تھیں۔ نرم اور سبک چلتی ہوئی معطر ہوائیں دھیرے سے میرے گناہ گار وجود کو چھوتے ہوئے جاتیں اور میرے کان میں سرگوشی کرتیں۔

”تم خوش نصیب ہو کہ اللہ نے تمہیں دوبارہ اس جگہ آنے کا موقع دیا ہے' آؤ ایک بار پھر نہ توڑنے والا وعدہ اپنے محبوب نبی سے کرکے جانا کہ اب تم سنت کے مطابق اپنی زندگی گزاروگی تاکہ روز قیامت حوض کوثر پر تمہاری ملاقات تمہارے محبوب نبی سے ہو اور ان کے دست مبارک سے تمہیں آب کوثر پینا نصیب ہو۔“

میں نے تحیۃ مسجد نفل ادا کرکے صلوٰۃ التوبہ پڑھی پھر مزید نوافل پڑھے' گڑگڑا کر اپنے' اپنے والدین' اپنے اساتذہ' بہن بھائی' دوستوں اور تمام مسلمانوں کے لیے مغفرت کی دعا کی۔ اللہ سے ہدایت مانگی' پیارے نبی کی حقیقی محبت مانگی ویسی محبت' جیسی محبت کرنے کا حق ہے۔ نماز میں تشہد پڑھتے ہوئے جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر درود سلام پڑھا تو یہاں لطف ہی کچھ آیا۔ روضہ کے اتنے قریب آکر درود و سلام پڑھنے کی ہر مسلمان کو سعادت نصیب فرمائے۔“

نماز الفجر سے فارغ ہوئی تو روضہ اطہر پر حاضری دینے کے لیے آگے بڑھی' دیکھا تو انتظار میں پہلے ہی کم از کم ایک ہزار خواتین تھیں' وہاں موجود انتظامیہ کی خواتین گروہ بنا بنا کر خواتین کو باری باری اندر بھیجتی تھیں۔ میں بھی انتظار کرنے والیوں کے ساتھ بیٹھ گئی' ایک تو یہ بات معلوم ہوئی کہ خواتین کے لیے روضہ کا دروازہ سات بجے کھلے گا' ابھی پونے دو گھنٹے باقی تھے دوسرے میں یہ دیکھ اور سن رہی تھی کہ وہ انتظامیہ کی خواتین پاکستان اور انڈیا کی خواتین کو سب سے آخر میں بٹھا رہی تھیں۔ وہ ملکوں کے نام لے لے کر پکار رہی تھیں کہ وہاں کی خواتین آگے آجائیں' ایسا نہ جانے کیوں وہ کررہی تھیں بعد میں مجھے اس کی وجہ بھی معلوم ہوگئی کہ انڈین اور پاکستان کی خواتین شاید بہت بدتمیزی کرتی ہیں۔

میں خاموشی سے بیٹھ کر درود پاک پڑھنے لگی کہ جب میرا نمبر آئے گا تب میں بھی چلی جاؤں گی تقریباً ساڑھے آٹھ بجے ہمارا گروپ جانے لگا لیکن جیسے ہی میں نے جانے کے لیے قدم بڑھایا انہوں نے روک دیا کہ بہت ساری خواتین چلی گئی ہیں' اب ان کے بعد جانا' میں شکستہ دل کے ساتھ رک گئی انتظار کی یہ گھڑیاں بڑی کٹھن اور جان لیوا تھیں۔

انتظامیہ کی خواتین ہاتھوں کی زنجیر بنا کر خواتین کو روکے کھڑی تھیں۔ سب سے آگے میں تھی کہ اچانک میرے پیچھے کچھ خواتین کا شور اٹھا اور اس سے پہلے کہ میں پیچھے دیکھتی۔ مجھے اپنی پشت پر شدید تکلیف کا احساس ہوا اور پھر میں چند افریقی خواتین کے نرغے میں چاروں جانب سے پھنس گئی' سب نے مل کر مجھے اتنی طاقت اور قوت سے دھکا دیا کہ انتظامیہ کی خواتین کے ایک دوسرے سے ہاتھ چھوٹ گئے اور وہ سب دور دور زمین پر گر پڑیں' جب میں ان کے درمیان بُری طرح پھنسی ہوئی تھی' کیفیت یہ تھی کہ میرے دونوں کندھے دائیں بائیں سے ایک دوسرے سے جڑنے لگے اور میرا گلا دب گیا اور سانس رکنے لگا اور وہ اسی حالت میں مجھے اپنے ساتھ گھسیٹتی ہوئی آگے بڑھتی چلی گئیں وہ زور زور سے محمد رسول اللہ کا نعرہ لگا رہی تھیں۔ میں نے دل میں کلمہ طیبہ پڑھ لیا کہ شاید میرا وقت پورا ہو چکا ہے' کیوں کہ میں سانس نہیں لے پا رہی تھی' میں اتنی بُری طرح ان کے نرغے میں چاروں جانب سے پھنسی ہوئی تھی کہ بالکل جنبش نہیں کر پا رہی تھی' وہ لوگ اسی طرح دوسری خواتین کو دھکے دیتی گراتی ریاض الجنہ کی جانب آ گئیں۔

میری آنکھوں سے بُری طرح آنسو بہہ رہے تھے' تکلیف کی انتہا تھی لیکن اس حالت میں بھی میں نے الصلوٰۃ والسلام وعلیک یارسول اللہ پڑھا' درود پڑھتی رہی پھر ایک عورت کو دوسری عورت کا دھکا پڑا تو میں بھی اس کے ساتھ گر گئی۔ وہاں موجود انتظامیہ کی ایک خاتون نے میرا ہاتھ پکڑ کر کھینچا اور مجھے وہاں سے باہر نکالا۔

میں وہاں سے ہٹ کر ایک دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ میں بُری طرح رو رہی تھی' میں نے اس طرح تو نہیں سوچا تھا کہ میں روضہ پر اس طرح حاضری دوں گی اور سلام پڑھوں گی۔ انتہائی ادب کا مقام ہے' یہاں تو سانس بھی احتیاط سے لینی چاہیے' نگاہیں زمین میں گڑھی ہوتی ہوں آواز پست ہو اور اپنے دل کے تمام تر احترام اور جذبہ محبت کے ساتھ سلام پڑھا جائے پھر جاں نثار دوست اور صحابہ رضوان جو پہلو میں استراحت فرما ہیں۔ ان پر سلام بھیجا جائے' نوافل ادا کیے جائیں اور دعائیں کی جائیں۔

پانچ منٹ بعد مجھے اس جگہ سے بھی اٹھا دیا گیا کہ دوسری خواتین کے لیے جگہ خالی کریں۔ میں پھر وہاں رکی ہی نہیں اور روتی ہوئی حرم پاک سے باہر نکل آئی۔ حالاں کہ مجھے ٹھیک طریقے سے ابھی راستہ معلوم بھی نہیں تھا' میں روتی ہوئی چلی جا رہی تھی اور سوچ رہی تھی کہ یا اللہ ایسا کیوں ہوا' مجھ سے ایسی کون سی غلطی ہوگئی' اللہ پاک نے تو سورۃ الاحزام (مفہوم) میں صحابہ کرام کو بھی وارننگ دی ہے کہ میرے رسول کو تمہارے کسی عمل سے ذرا سی بھی تکلیف نہ ہو' اپنی آواز بلند مت کرو۔ کہیں ایسا نہ ہو تمہارے سارے اعمال غارت ہو جائیں' میں رو رو کر دعائیں کر رہی تھی کہ یا اللہ مجھے معاف کردے' میں ایسا کرنا نہیں چاہ رہی تھی۔

بڑی مشکل سے ہوٹل کا راستہ ملا' ورنہ میرے دل کی حالت یہ ہو رہی تھی کہ دل چاہ رہا تھا کہ مدینے کی گلیوں میں گم ہو جاؤں۔ ہوٹل پہنچی تو علی روم میں تھے' مجھے تنہا دیکھ کر پریشان ہو گئے اور پوچھا کہ اسعد کہاں ہے' میں نے کہا مجھے نہیں معلوم اور رونا شروع کر دیا۔ اسعد باب النساء پر پچھلے دو گھنٹوں سے کھڑا تھا کہ امی آئیں گی تو انہیں ساتھ لے کر جاؤں گا لیکن میں اپنی دھن میں نکل آئی اور رش کی وجہ سے اسعد مجھے نہیں دیکھ سکے' علی نے فون کر کے اسعد کو واپس بلایا پھر مجھ سے رونے کا سبب پوچھا تو میں نے سب بتایا' وہ

مجھے سمجھانے لگے کہ اللہ تم سے ناراض نہیں ہوگا تم نے ایسا جان بوجھ کر نہیں کیا ہے۔

وہ جمعۃ المبارک کا دن تھا' وہ سارا دن میرا روتے' استغفار اور درود پڑھتے ہوئے گزرا۔ نہ کھانے کا دل چاہ رہا تھا نہ پینے کا۔ بہت زیادہ دباؤ پڑنے کی وجہ سے سانس لینے سے سینے میں درد ہو رہا تھا' نماز عشا کی ادائیگی کے بعد رات کو دس بجے ہم سونے کے لیے لیٹ گئے' کیوں کہ گزشتہ رات سفر میں جاگتے ہوئے گزری تھی۔

وہ رات کے تین بجے کا وقت تھا' میں نے خواب میں دیکھا کہ میں ہوٹل کے اسی کمرے میں اسی بیڈ پر لیٹی ہوں' میرے دائیں جانب اسعد کا بیڈ تھا اور بائیں جانب علی کا۔ دائیں جانب بہت بڑی کھڑکی تھی' عالم خواب میں وہی منظر تھا میں نے دیکھا کہ کھڑکی سے سفید نور کی بہت سی کرنیں اندر کمرے میں آ رہی ہیں۔ وہ گول گول ساری چھت پر چکر کاٹ کر پورے کمرے میں پھیل رہی ہیں اور میں بیڈ پر لیٹی انہیں حیرت سے دیکھ رہی ہوں پھر ایک آواز آتی ہے۔

''یہ نور کی کرنیں ہیں اور یہ مسجد نبوی سے آ رہی ہیں۔'' یہ سنتے ہی میری آنکھ کھل گئی۔ میں اپنے رب کی رحمتوں کے قربان جاؤں' آنکھ کھلتے ہی میں نے سچ مچ وہ منظر دیکھا وہ نور کی کرنیں سچ مچ کھڑکی کے راستے کمرے کی چھت پر آ کر پھیل رہی تھیں۔ میرے منہ سے بے ساختہ نکل گیا ''سبحان اللہ'' اور پھر میں نے درود شریف پڑھنا شروع کر دیا اور علی اور اسعد کو آواز دی۔

''اٹھو دیکھو' مسجد نبوی سے نور کی کرنیں آ رہی ہیں۔'' وہ دونوں بوکھلا کر اٹھ گئے مگر وہ نور کی کرنیں ایک دم غائب ہو گئیں۔ میری عجیب سی حالت ہو رہی تھی' دل اتنی شدت سے زور زور سے دھڑک رہا تھا گویا ابھی پھٹ کر باہر نکل آئے گا۔ میں رو بھی رہی تھی اور ہنس بھی رہی تھی۔

دونوں نے مجھے سنبھالا اور ہم سب درود پاک کا ورد کرنے لگے پھر چار بجے مسجد سے تہجد کی اذان سنائی دی تو ہم حرم پاک آ گئے۔ میں بہت زیادہ خوش تھی پھر میں نے روضہ پر جانے کی جرأت نہیں کی اور اللہ پاک سے دعا کرتی رہی کہ اللہ پاک آپ مجھے اس طرح باادب روضہ پر لے جائیں گے جیسا کہ ان کا حق ہے۔ میں نے پورے ہفتے انتظار کیا اور دعائیں کیں پھر آخری رات میں بہت صبر و تحمل سے انتظار کرتی تھی تقریباً چار گھنٹے بیٹھی رہی آخر میں بیس پچیس خواتین رہ گئیں میں بار بار سب کو کہتی تھی کہ کس طرح باادب طریقے سے ہمیں روضہ پر حاضری دینی ہے۔

اپنی باری آنے پر میں لرزتے قدموں سے نگاہیں نیچی کیے اپنی دھڑکنوں کو باادب رہنے کی تلقین کرتے ہوئے ریاض الجنتہ میں داخل ہوئی' بہت اطمینان سے سلام عرض کیا۔ درود پاک پڑھا' میری والدہ مرحومہ نے مجھ سے آخری ملاقات میں کہا تھا کہ روضہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر میرا سلام کہنا' اس لیے سب سے پہلے ان کا سلام پہنچایا پھر دوسرے دوست احباب اور رشتہ داروں کا آخر میں تمام مسلمانوں کی جانب سے پھر اطمینان سے چار نوافل ادا کیے' دعائیں کیں اور پھر دوسروں کو موقع ملے یہ سوچ کر باہر نکل آئی اور اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس نے مجھ پر احسان عظیم کیا اور مجھ گناہ گار کو یہ سعادت عطا فرمائی' بہت خوش نصیب ہیں وہ لوگ جن کو اللہ تعالیٰ دنیا ہی میں اس جنت میں داخلے کی اجازت عطا فرماتا ہے۔

اگلی صبح ناشتے کے بعد ہی ہمیں مدینے سے روانگی کی تیاری کا کہہ دیا گیا۔ دل بہت ملول اور افسردہ تھا۔ شدت سے دل چاہ رہا تھا کہ اللہ پاک یہیں اس جگہ

اپنے پاس بلالے اور میرا خاکی جسم اس پاک سرزمین کی مٹی میں مل جائے' پتا نہیں نصیب میں یہاں دوبارہ آنا لکھا ہے یا نہیں' دل میں لاکھ خواہش رکھنے کے بعد بھی زندگی اس کی مہلت دیتی ہے یا نہیں۔ پچھلی دفعہ جب یہاں آئی تھی تو رو رو کر التجائیں کرتی آئی تھی کہ یا اللہ مجھے دوبارہ یہاں ضرور بلانا اور دل میں اس بات کا کامل یقین موجود تھا کہ اللہ پاک اب بھی میری التجا کو رد نہیں کریں گے۔

بس نماز ظہر کے بعد روانہ ہوئی تو اچانک ہی تیز دھوپ ختم ہوکر ایک دم ڈھیرے سارے بادل آئے اور ٹھنڈی ٹھنڈی پانی کی موٹی موٹی بوندیں برسنے لگیں۔ سبک ہوا خراماں خراماں چلتے ہوئے ہمیں الوداع کہہ رہی تھی۔ دل سے نکلا سبحان اللہ۔ جیسے میزبان یہ محبوب اللہ ہیں ایسا اس دنیا میں نہ کوئی ہوا نہ ہے اور نہ بھی ہوگا۔ اپنے مہمانوں کو بھی اللہ کی رحمت کے ساتھ رخصت کررہے ہیں' بس دو چار منٹ وہ رحمت برسی پھر دھوپ نکل آئی اور میں گردن موڑے شان وعظمت کی نشانی سبز گنبد کو دیکھتی رہی' کتنی ہی دیر تک وہ دکھائی دیتا رہا پھر نگاہ سے اوجھل ہوگیا اور میں نے کہا۔

''الوداع اے محبوبِ اللہ! الوداع اے محسن انسانیت الوداع! اے شافع محشر۔ آپ نے خوب میزبانی کا حق ادا کیا۔

مدینے میں قیام کے دوران ہم نے مدینے میں اہم مقامات کی زیارت بھی کی۔ پہلے جب میں مکہ عمرے کے لیے آئی تھی تب میرے ایک کزن مکہ میں حدودِ حرم میں ہی رہائش پذیر تھے۔ میں نے مکہ میں ان ہی کے گھر قیام کیا تھا اور انہوں نے ہی مجھے یہاں کے اہم مقامات کی زیارتیں کروائی تھیں۔ اس بات کو میں اپنی خوش نصیبی ہی کہوں گی کہ میری چھوٹی بہن جو امی کے انتقال پر پاکستان آئی تھی اب وہ جدہ واپس آ گئی تھی۔ شاہد بھائی ان دنوں مدینے میں تھے انہیں صبا کی آمد کا پتا چلا تو امی کی تعزیت کے لیے وہ صبا کے پاس گئے' تب صبا نے انہیں بتایا کہ شہناز باجی مدینے میں ہیں۔ انہوں نے صبا سے علی کا نمبر لیا اور اسی وقت فون کیا اور دوسرے دن شام کو وہ ہمارے ہوٹل ہم سے ملنے کے لیے آئے' پھر انہوں نے ہمیں مدینے کی زیارتیں کروائیں۔

اُحد کا پہاڑ جو نہ جانے کب سے اسی جگہ بڑی شان سے سر اٹھائے کھڑا ہے' عہد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے دور کے ہر واقعے کا گواہ ہے۔ جس کے لیے اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''میں اُحد سے محبت کرتا ہوں اور اُحد مجھ سے محبت کرتا ہے' یہیں غزوہ اُحد کے موقع پر ایک چھوٹی پہاڑی ٹکڑی پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کا ایک دستہ کھڑا کیا تھا جو بڑی بہادری اور جواں مردی سے یہودیوں اور دشمنانِ اسلام سے مقابلہ کررہے تھے لیکن خالد بن ولید نے (جو اس وقت ایمان نہیں لائے تھے) پیچھے سے آ کر حملہ کیا اور تمام صحابہ کو شہید کردیا' اس جگہ یادگار شہداء بھی ہے پھر وہ مقام دیکھا جہاں مدینے کے اطراف غزوہ خندق والی جگہ ایک طویل سڑک بنادی گئی ہے البتہ جہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کے مورچے تھے وہاں چھوٹی چھوٹی مساجد بنادی گئی ہیں۔ وہاں پہاڑ پر جانے کے لیے سیڑھیاں بنی ہیں لیکن وہاں کسی کو جانے نہیں دیا جاتا۔ ہم نے نزدیک سے جا کر دیکھا وہاں ایک لائبریری بھی ہے وہاں سے کچھ کتب بھی لیں۔

پھر ہم اُحد کے پہاڑ کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے اس مقام پر بھی گئے جہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دندان مبارک شہید ہونے کے بعد مختصر سا قیام کیا تھا'

وہ ایک چھوٹا سا غار ہے اور وہاں پہاڑ پر باہر کی جانب ایک سوراخ ہے' اس جگہ کو بھی تاروں کی باڑ لگا کر لوگوں کے لیے بند کردیا ہے۔ کہتے ہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پہاڑ پر اس جگہ اپنی انگلی لگائی تھی تو یہاں سے پانی جاری ہوگیا تھا' یہ جگہ قدرے سنسان اور بے حد قدیم جگہ تھی۔ یہاں لوگوں کی آمد و رفت بھی نہیں تھی۔ میں نے یہاں باڑ کے اندر پہاڑ کے حصے کی جانب بہت زیادہ بالکل سیاہ بلیاں دیکھیں جو اپنی زرد نگاہوں سے ہمیں گھور رہی تھیں۔ مجھے اس جگہ قدرے خوف محسوس ہوا' میں مسلسل درود پاک کا ورد کررہی تھی' اسعد میرے منع کرنے کے باوجود تار کی باڑ کو پار کرکے اندر سے غار کو دیکھنے چلے گئے' میں دور کھڑی تھی' وہاں اندر نہیں جاسکتی تھی اس لیے اسعد کے ہاتھ میں اپنا موبائل دے کر کہا کہ غار کی اندر سے تصویر کھینچ لو تاکہ میں بعد میں دیکھ لوں۔

پھر تھوڑا آگے بڑھے تو ہم نے اُحد کے پہاڑ کا وہ حصہ دیکھا جب غزوہ اُحد کے موقع پر اللہ کے نبی کا دشمنوں نے پیچھا کیا اور آپ اُحد کے پہاڑ پر چڑھے اور اس سے کہا: ''مجھے پناہ دے'' تو اللہ کے حکم سے پہاڑ درمیان سے پھٹ گیا اور اس میں ایک سرنگ سے بن گئی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہاں قیام کیا۔ وہ جگہ بہت زیادہ اونچائی پر ہے' اب حکومت سعودی عرب نے اس سرنگ کو سیمنٹ سے بند کردیا ہے' بس تھوڑا سا حصہ کھلا چھوڑا ہے' ہم نے بس دور سے دیکھا اور اتنی اونچائی پر چڑھنے کی کوشش نہیں کی یہیں پر ایک مسجد کے بھی آثار ہیں جس کے بارے میں یہ معلوم ہوا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوہ اُحد کے دن نماز ظہر ادا کی تھی بعد میں ترکوں نے یہاں ایک مسجد بنادی تھی لیکن اب وہ بھی کھنڈرات میں تبدیل ہوگئی ہے۔

پھر ان تمام زیارتوں کی سعادت سے فارغ ہوکر ہم دوبارہ واپسی کے لیے شاہد بھائی کی پراڈو میں بیٹھ گئے۔ تب اسعد نے میرا موبائل مانگا اور تصاویر دیکھنے لگا' جیسے ہی اس اندھیرے غار کی تصویر آئی میں اور اسعد حیران رہ گئے وہاں غار کے اندرونی حصے میں ایک روشنی کا گول سا ہالہ دکھائی دے رہا تھا' سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ کیا ہے' اسعد نے کہا۔

''امی غار میں تو بالکل اندھیرا تھا۔'' ہم بار بار موبائل بند کرتے پھر دیکھتے وہ روشنی کا ہالہ ہمیں دکھائی دیتا رہا۔

ہوٹل واپس آ کر جب ہم سونے کے لیے لیٹ گئے تب علی کو یاد آیا کہ ہم گاڑی میں بیٹھے کسی روشنی کے ہالے پر ڈسکس کررہے تھے وہ بولے۔

''مجھے بھی تو دکھاؤ۔'' اور انتہائی حیرت انگیز بات یہ ہوئی کہ جب علی کو دکھانے کے لیے وہ تصویر نکالی تو روشنی کا ہالہ غائب تھا اور غار کی جگہ اندھیرا ہی دکھائی دے رہا تھا' اللہ ہی جانے یہ کیا اسرار تھا' اپنے بھید وہی جانے۔

مسجد قبا اور مسجد قبلتین میں بھی نمازیں پڑھیں' جنت البقیع کی بھی زیارت کی' غرض کہ مدینے میں جو کچھ دیکھا جس طرح کا وقت گزارا وہ مرتے دم تک کے لیے دل ودماغ اور نگاہوں میں نقش ہوگیا ہے۔

اللہ کی رحمت اور سلامتی ہو ہمارے پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر ان کی آل پاک پر' صحابہ کرام رضوان اللہ علیہ اجمعین پر اور پیروی کرنے والوں پر۔ اے اللہ تُو ہمیں ہمارے والدین اور تمام مسلمان مردوں اور عورتوں کو بخش دے اور عذاب جہنم سے بچا' آمین۔

مدینے سے ہم عزیزیہ آ گئے' یہاں مردوں اور عورتوں کا الگ الگ قیام تھا۔ دو دن کے بعد حج شروع ہونے والا تھا۔

میرے روم میں میرے علاوہ تین خواتین اور تھیں، اللہ نے بہترین ساتھی عطا فرمائے، ہم نے دینی باتیں سیکھنے اور سکھانے میں وقت گزارا۔

سات ذوالحج کی رات کو ہم سب نے غسل کرکے حج کا احرام باندھا، نیت کی اور منیٰ کے لیے روانہ ہوگئے اور صبح سے پہلے منیٰ پہنچ گئے، یہاں پیدل چلنے والوں کا اور بڑی بڑی بسوں کا اتنا زیادہ رش تھا کہ پندرہ منٹ کا راستہ ایک گھنٹے میں طے ہو رہا تھا۔

منیٰ میں ہم لوگ خیمے میں پہنچے یہ ایک کافی بڑا خیمہ تھا۔ ارے ہاں میں ایک بات تو بتانا بھول گئی، مدینے سے روانگی سے پہلے ہم نے عمرے کا احرام پہنا اور نیت کی اور پھر عزیزیہ میں اپنا سامان رکھ کر مسجد الحرام عمرے کی ادائیگی کے لیے روانہ ہوگئے۔ ہم رات کے دو بجے حرم پہنچے اور جب عمرہ کرکے فارغ ہوئے تو فجر کی اذان ہو رہی تھی۔ نماز کے بعد وہاں سے نکلے تو صبح آٹھ بجے عزیزیہ پہنچے تھے۔ لوگوں کا اتنا زیادہ رش دیکھ کر طبیعت گھبرا رہی تھی کہ یا اللہ! ارکان حج کیسے ادا ہوں گے لیکن یہ بھی اللہ پاک کا وہ معجزہ ہے جو ایک عام نگاہ سے محفوظ رہتا ہے۔ اتنے لوگوں کے تمام ارکان حج اپنے مقررہ ٹائم پر ادا ہوجاتے ہیں۔

منیٰ میں ہمیں آرام کے لیے جو بستر ملا تھا اس کی چوڑائی اٹھارہ انچ تھی، لمبائی البتہ زیادہ تھی وہ صوفہ کم بیڈ تھا۔ مجھے دروازے کے ساتھ جگہ ملی، جس کی وجہ سے میں نے کافی پریشانی اٹھائی لیکن صرف یہ سوچ کر سب کچھ صبر سے برداشت کیا کہ یہ دکھ اللہ کو راضی کرنے کے لیے اٹھا رہی ہوں اور وہ اس کی بہترین جزا دے گا۔

منیٰ میں کوئی اور کام نہیں ہوتا صرف پانچ نمازیں ادا کرنی ہوتی ہیں، باقی قرآن پاک کی تلاوت و ذکر اذکار اور دعاؤں میں مصروف گزرا۔ آٹھ اور نو ذی الحج کی درمیانی رات کو ہم سب میدان عرفات کے لیے روانہ ہوگئے، وقوف عرفات حج کا رکن اعظم ہے، حج میں تین فرض اور چھ واجب ہیں، پہلا فرض احرام پہن کر حج کی نیت کرنا، دوسرا وقوف عرفات اور تیسرا طواف زیارت۔

رات کو ہم میدان عرفات میں پہنچ گئے، یہاں بھی ایسے ہی گدے ملے جیسے منیٰ میں تھے، یہاں درخت اور گھاس تھی، اس لیے مختلف قسم کے کیڑے مکوڑے، مکڑیاں ہمارے اوپر چڑھ رہے تھے اور ہم بہت آہستگی سے پھونک مار کر انہیں اپنے جسموں سے علیحدہ کر رہے تھے۔ احرام کی حالت میں ایک معمولی سے کیڑے کو بھی نہیں مار سکتے، جسم سے میل کچیل بھی صاف نہیں کرسکتے۔

عرفہ کا دن...... میں اس دن کو کبھی نہیں بھول سکتی، بار بار ایک ہی خیال آ رہا تھا کہ آج کے دن اللہ تعالیٰ تمام فرشتوں کو مخاطب کرکے کہتا ہے، انہیں دیکھو یہ میرے لیے اپنے گھر کا عیش و آرام چھوڑ کر آئے ہیں، ان کے بال پراگندہ ہیں، لباس میلا ہے، جسم میلا ہے، آج جو بھی صرف میری رضا کے لیے یہاں آیا ہے میں نے اسے گناہوں سے اس طرح پاک کردیا، جیسے اس کی ماں نے ابھی اسے جنم دیا ہو۔

آج ہی کے دن سارے سال میں شیطان سب سے زیادہ ذلیل و خوار ہوتا ہے، وہ روتا ہے، چیختا اور چلاتا ہے اپنے منہ پر طمانچے مارتا ہے اور کہتا ہے۔ "ہائے میری بدبختی! میں نے ان لوگوں کو دن رات بہکایا، ان سے گناہ کروائے، اللہ کی نافرمانی کروائی اور آج یہاں اس جگہ آکر انہوں نے کیسے اپنے آپ کو اللہ سے بخشوالیا۔ میری ساری محنت اکارت گئی۔"

عرفہ کے دن بعد نماز عصر سے لے کر غروب آفتاب تک کا وقت دعاؤں کی قبولیت کا وقت ہوتا ہے، ہم نے دن بھر تو خوب دعائیں کیں، سب کو یاد رکھا، پاکستان سے بہت سے فون اور میسجز آئے اور دعاؤں کے لیے کہا۔ میں نے دوستوں اور دشمنوں کے لیے اللہ سے خیر و ہدایت مانگی، خاص طور پر سب کی مغفرت، بخشش، صحت و تندرستی، صراط المستقیم پر چلنے کی اور یہ کہ جو حج کی آرزو رکھتا ہو اللہ اسے یہاں ضرور بلائے۔

غروب آفتاب کے بعد مزدلفہ کی جانب روانگی ہوئی، یہاں کھلے آسمان تلے رات گزاری جاتی ہے، عادت اور دعائیں کی جاتی ہیں۔ کہتے ہیں کہ اللہ کے پیارے نبی نے عرفہ کے دن اپنی امت کے لیے تین دعائیں مانگی تھیں۔ اللہ تعالیٰ نے دو قبول فرمائیں اور کہا کہ ایک دعا نہیں قبول کروں گا لیکن محبوب اللہ نے وہی دعا مزدلفہ کی رات میں فجر کی نماز کے بعد مانگی تو اللہ نے قبول فرمائی اور ارشاد ہوا کہ یہاں مانگی گئی کوئی بھی دعا میں رد کر ہی نہیں سکتا، سبحان اللہ!

ہم رات کے تقریباً پونے تین بجے مزدلفہ پہنچ سکے۔ مزدلفہ میں جس جگہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قیام فرمایا تھا وہاں مسجد شائر الحرام ہے۔ ہمارا قیام اسی مبارک تھا، پیروں میں اور جسم میں طاقت نہیں تھی، پیروں پر ورم بڑھتے بڑھتے گھٹنوں سے اوپر تک آگیا تھا لیکن ہمت جوان تھی، ایک لگن تھی جس نے ہر تکلیف سے بے نیاز کردیا تھا۔ یہاں فجر کی اذان ہوئی تو جگہ جگہ لوگ باجماعت نماز ادا کرنے لگے۔ نماز سے فارغ ہوکر کھڑے ہوکر اور ہاتھ اٹھا کر دیر تک گریہ وزاری کرتی رہی۔ اللہ سے یہ بھی التجا کی کہ اللہ یہاں موجود آنے والے ہر فرد کا حج اور دعائیں اور توبہ قبول فرمالے۔

آج دس ذی الحج تھی اب ہمیں بڑے شیطان کو کنکریاں مارنی تھیں، یہاں سے جمرات کی جانب چلے، زوال سے قبل بڑے شیطان کو کنکریاں ماری جاتی ہیں۔ دل میں شیطان اور تمام شیطانی اعمال سے شدید نفرت لیے اور اللہ پاک سے اس بات کی دعا اور عہد کرتے ہوئے شیطان کو کنکریاں ماریں کہ اللہ ہمیں شیطان کے شر اور تمام شیطانی اعمال سے محفوظ رکھے۔

کنکریاں ہم نے مزدلفہ سے ہی چنی تھیں، کُل انچاس (49) کنکریاں چنی جاتی ہیں بلکہ ماری 49 جاتی ہیں لیکن احتیاطاً زیادہ کنکریاں اٹھا لیتے ہیں کہ شاید کوئی ٹھیک نشانے پر نہ لگے یا ہاتھ سے گر جائے، اسے دوبارہ نہیں اٹھاتے۔

یہاں لوگوں کا بے پناہ رش تھا اور اے سی کے باوجود بہت گرمی تھی، لوگوں کی واپسی کے لیے دوسرا راستہ ہے لیکن کیوں کہ وہ راستہ ذرا طویل ہوجاتا ہے اسی لیے لوگ آنے والے راستے ہی سے واپس پلٹ جاتے ہیں۔ میں کنکریاں ماری تھی اسعد علی مار چکے تھے، اتنے میں لوگوں کا ایک بڑا ریلہ واپس پلٹا اور میں دھکا لگنے سے گرنے لگی۔ تب ماشاء اللہ اسعد نے ایک ساتھ مجھے اور علی کو سنبھالا اور مضبوطی سے تھامے رکھا، یہاں بھی میرا دم گھٹنے لگا، میں نیم ہوش ہوگئی۔ بڑی مشکل سے مجھے باہر نکالا اور باہر بٹھایا پھر آب زم زم مجھے پلایا تب میرے حواس بحال ہوگئے۔

پھر یہاں سے ہم مختلف جگہوں پر کھڑے سیکیورٹی گارڈز سے عزیزیہ کا راستہ پوچھتے پوچھتے اپنے فلیٹ میں آگئے۔

کنکریاں مارتے ہی علی نے اپنے حج ٹریول گروم کے ممبر کو فون کرکے اطلاع دے دی تھی کہ ہم نے کنکریاں مار لی ہیں، ہماری قربانیاں کردی جائیں۔

جمعہ کا دن تھا یہاں میں نے فلیٹ میں نماز ظہر ادا

کی اور اسعد اور علی نے مسجد جا کر نماز جمعہ ادا کی پھر جب بار بار وہاں سے یہ اطلاع آئی کہ ہماری قربانیاں ہوگئی ہیں تو میں نے اپنے بال ترشوائے۔ اسعد اور علی نے حلق کروایا پھر غسل کر کے احرام اتار کر دوسرا لباس پہن لیا' اب ہمیں حج کی سعی اور طواف زیارت کے لیے مسجد الحرام جانا تھا' یہاں سے ٹیکسی کر کے حرم پہنچے اور نماز العصر سے فارغ ہو کر طواف زیارت شروع کیا۔ ہمیں نیچے مطاف میں جگہ نہیں ملی ہم ٹاپ پر چلے گئے' یہاں طواف کافی دیر میں ہوتا ہے رش بہت زیادہ تھا' پہلا چکر ہی ایک گھنٹے میں ہوا اور پورا طواف تقریباً ساڑھے پانچ گھنٹے میں مکمل ہوا پھر حج کی سعی کر کے رات کے ساڑھے گیارہ بجے فارغ ہوئے۔ ابھی حج کا ایک واجب طواف وداع بھی کرنا تھا مگر اس وقت تھکن بہت زیادہ ہوگئی تھی اس لیے واپس منیٰ آ گئے۔ آج رات بھی منیٰ ہی میں قیام کرنا تھا' اگلے دن صرف جمرات کی رمی کرنی تھی۔ آج تینوں شیطانوں کو کنکریاں مارنی تھیں۔ جمرات سے فارغ ہوئے تو سیدھے حرم آ گئے' ابھی طواف وداع جو حج میں واجب ہے ادا کرنا تھا۔ طواف وداع کیا حرم میں ہی رہے' پھر رات کو منیٰ کے لیے روانہ ہوگئے' آج رات بھی منیٰ ہی میں رکنا تھا۔ حج کے دنوں میں یہاں کرائے پر چلنے والی گاڑیاں ٹیکسیاں اور وین وغیرہ حاجیوں سے منہ مانگا کرایہ وصول کرتی ہیں۔ فی بندہ سو ریال کرایہ مانگ رہا تھا' اس کے باوجود سیدھے منہ کسی سے بات بھی نہیں کرتے' ہم نے بھی تین افراد کا کرایہ تین سو ریال طے کیا اور ایک ٹیکسی میں بیٹھ گئے۔

ٹیکسی والا نہ جانے کن کن راستوں سے لے کر چلا آیا بالآخر عزیزیہ کے قریب ہمیں اتار دیا کہ اب آگے خود منیٰ چلے جاؤ' ٹیکسی آگے نہیں جاسکتی۔ اس کی بہت خوشامد کی کہ بھائی راستہ طویل ہے' ہمارے ساتھ خاتون ہیں اور ان کی طبیعت خراب ہے لیکن اس نے جیسے اپنے کان ہر فریاد کے سننے کے لیے بند کر لیے تھے' اپنا کرایہ وصول کیا اور ہمیں زبردستی ٹیکسی سے اتار دیا۔

پھر ہم نے پیدل چلنا شروع کیا' اونچے نیچے راستے' سرنگیں' پل...... اترتے چڑھتے' گرمی اور پسینے سے بے حال چلتے جارہے تھے ایک جگہ تو میری حالت بہت زیادہ خراب ہوگئی اور میں بے ہوش ہوئی۔ علی اور اسعد بے حد پریشان ہوگئے' ہمارے پاس پانی بھی ختم ہوگیا تھا۔

بہر حال میں نے دوبارہ اپنی ہمت جمع کی اور دوبارہ چلنے لگے' ہمارے ساتھ بہت سارے لوگ تھے جو پیدل چل رہے تھے یہاں جگہ جگہ پولیس کھڑی تھی ہم کسی جگہ پہنچتے تو پولیس والے آگے نہیں جانے دیتے اور کہتے دوسری جگہ سے جاؤ' یہ راستہ بند ہے' اس طرح راستہ طویل سے طویل تر ہوتا جارہا تھا' بھوک اور پیاس سے الگ حالت خراب تھی۔ اللہ اللہ کر کے منیٰ پہنچے تو وہاں راستہ بھٹک گئے' ایک سے خیمے' ایک سا راستہ ہمارا مکتب نمبر دس تھا' ہم رات کے تین بجے تک بھٹکتے رہے' آخر ایک جگہ دیوار پر اسعد کو منیٰ کا نقشہ دکھائی دیا اور اس نے اپنے مکتب تک جانے کا راستہ سمجھا اور ہم اپنے خیمے میں پہنچے۔

میں چلتے ہوئے راستے میں کئی جگہ لڑکھڑا کر گری۔ جس سے گھٹنوں میں شدید چوٹ آئی' پیروں پر پیدل چلنے سے اتنا ورم آ گیا تھا کہ گھٹنے موڑے نہیں جارہے تھے۔ آج رات منیٰ میں قیام کی آخری رات تھی کل ذی الحج کی بارہ تاریخ تھی اور حج کا آخری عمل بارہ تاریخ کو تینوں شیطانوں کو کنکریاں مارنی تھیں۔

میری خرابی طبیعت کی بناء پر آخری دن رمی کے لیے اسعد اور علی مجھے نہیں لے گئے اور اسعد نے میری جانب سے کنکریاں ماریں۔ مجھے ان لوگوں نے عزیزیہ میں چھوڑ دیا تھا' اس روز بھی بے حد گرمی تھی۔ اسعد اور علی جب رمی کر کے آئے تو ان کی حالت بھی کافی ڈاؤن تھی۔

اللہ کا شکر کہ حج ادا ہوگیا۔ اللہ پاک قبول فرمائے پھر جدہ سے صبا کا فون آ گیا کہ باجی میں اطہر (اس کا شوہر) کو بھیج رہی ہوں آپ جدہ آ جائیں' ہمارے پاس صرف دو دن بچے تھے پھر ہمیں پاکستان واپس جانا تھا۔ اس روز اطہر ہمیں لینے آئے لیکن راستے میں اتنا زیادہ ٹریفک جام تھا کہ وہ عزیزیہ نہ پہنچ سکے اور واپس چلے گئے۔

اگلے روز صبح ہی اطہر آ گئے اور ہم جدہ چلے گئے۔ یہاں علی کے بہت سارے دوست اور ان کی فیملی تھی' سب کی خواہش تھی کہ ہم ایک وقت کا کھانا ضرور ان کے ہاں کھائیں لیکن میں نے تو معذرت کر لی البتہ علی نے ایک ہی صاحب کے گھر سارے دوستوں کو بلالیا۔

جدہ میں میری بھانجیوں عائشہ اور اریبا نے میری بہت خدمت کی' میری اب طبیعت خاصی بہتر تھی' دو دن کے قیام کے بعد ہم عزیزیہ واپس آ گئے اسی روز روانگی تھی۔

کعبہ کا الوداعی طواف کرتے ہوئے دل کی بہت عجیب حالت تھی' آنکھوں سے آنسو رک ہی نہیں رہے تھے یہی سوچ رہی تھی کہ پتا نہیں دوبارہ اس کو دیکھ بھی پاؤں گی یا نہیں۔

اللہ سے رو رو کر دعا کی کہ اللہ اگر میری زندگی ابھی باقی ہے تو مجھے دوبارہ بہت جلد بلانا۔ میں نے حجر اسود کو بوسہ بھی نہیں دیا' حطیم میں نماز بھی نہیں پڑھی۔ میں نے روتے ہوئے علی سے کہا تو انہوں نے مجھ سے وعدہ کیا کہ ان شاء اللہ زندگی بخیر رہی تو بہت جلد تمہیں دوبارہ یہاں لے کر آؤں گا تب اتنا رش نہیں ہوگا' تب یہ سارے کام کر لینا۔

یکم نومبر کو میں کراچی ائیر پورٹ پر اتری' بہت سے لوگ لینے کے لیے آئے ہوئے تھے لیکن میری نگاہیں صرف ایک ہستی کو تلاش کر رہی تھیں' جو مجھے کہیں دکھائی نہیں دے رہی تھی اور آج اتنے دن ہوگئے سب سے ملاقات ہوگئی لیکن ان سے نہیں ہوئی پھر یہی دعا کرتی ہوں کہ یا اللہ جنت میں مجھے اپنے والدین سے ملانا۔'' آپی خاموش ہوئیں تو میری اور مہوش کی پلکیں بھیگی ہوئی تھیں۔

محترم قارئین! میں ہمیشہ کوئی نہ کوئی کہانی لے کر حاضر ہوئی ہوں لیکن جو کچھ میں نے شہناز آپی کی زبانی سنا' مجھے بہت اچھا لگا۔ اس لیے میں نے سوچا کہ آپ کو اس مرتبہ یہ سچی روداد سناتی ہوں۔ جس کی راوی میری اور آپ کی آپی شہناز ہیں۔ تحریر کے وقت ہوسکتا ہے میں بہت سی باتیں لکھتے ہوئے بھول گئی ہوں' اس لیے آپی سے معذرت۔ اس کے علاوہ آپی کے جذبات اور احساسات بھی شاید میں ٹھیک طرح نہ بیان کر پاتی ہوں۔ کیوں کہ وہ سب باتیں ایک حساس دل صرف محسوس کرسکتا ہے' بیان کرنا یا تحریر کرنا مشکل ہوتا ہے۔

آخر میں ایک دعا کہ یا اللہ پاک! ہم سب وہ مسلمان جو فریضۂ حج کی ادائیگی اور روضہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر حاضری کے لیے دن و رات تڑپ رہے ہیں' اللہ ہم سب کو یہ سعادت نصیب فرمائے آمین۔

قسط نمبر 6

گنگا کے پجاری

اے حمید

جب بھی بارش اور جنگلات کے ساتھ ہندوستان کا تذکرہ آتا ہے' ذہن میں صرف اور صرف ایک ہی شخصیت کا تصور اور پیکر جھن سے اتر آتا ہے وہ تصور اور پیکر محترم اے حمید کا ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں غریق رحمت کرے' ان کے بارے میں نئے افق کے مدیر اور معروف کہانی کار اظہر کلیم مرحوم فرمایا کرتے تھے۔ اے حمید بارش کی منظر کشی کرتے ہیں تو کسی میں بند قاری کو محسوس ہوتا ہے کہ باہر بارش ٹپاٹپ برس رہی ہے اور جب وہ قہوہ کا ذکر کرتے ہیں تو قہوے کی خوشبو چاروں طرف پھیلی محسوس ہوتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں وہ جادوگر تھے جو اپنی تحریر کے ذریعے پڑھنے والے کو اپنے سحر میں جکڑ لیتے ہیں۔

زیر نظر ناول بھی اے حمید کا سفرنامہ جنوبی ہند ہے۔ جس میں آپ کو ایڈونچر سسپنس کے ساتھ معصوم محبتوں کے فسانے بھی ملیں گے۔

میں پاروتی کے پہلو میں ایک قدم پیچھے ہو کر کھڑا تھا۔

سانپ بھی اپنی جگہ سے بالکل نہیں ہلا تھا۔ پاروتی اسے ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی تھی۔ پھر اس نے ہاتھ جوڑ کر سانپ کو نمسکار کیا اور اس کے آگے جھک گئی۔ میں اس کی ہدایت کے مطابق اپنی جگہ پر بے حس و حرکت کھڑا رہا۔ مجھے یہی ڈر تھا کہ یہ ہندو توا ہم پرست عورت تو اپنی پوجا پاٹھ میں لگ گئی ہے اگر سانپ نے اچھل کر مجھ پر حملہ کر دیا تو میں اپنا بچاؤ نہیں کر سکوں گا۔ پاروتی کسی منتر کا جاپ کرنے لگی۔ منتر پڑھ کر وہ اپنے اوپر پھونک مارتی اور پھر منتر پڑھنے لگتی۔ سانپ اسی طرح کنڈلی مارے بیٹھا رہا۔ پاروتی ہاتھ جوڑے ہوئے آہستہ آہستہ پیچھے ہٹتی گئی۔ میں بھی اس کے ساتھ ہی پیچھے ہٹنے لگا۔ ہم جھاڑیوں سے باہر نکلے تو پاروتی نے میری طرف مسکرا کر دیکھا اور کہا۔

''ہماری بڑی خوش قسمتی ہے کہ شو دیوتا کے اندر ناگ کے درشن ہو گئے۔ یہ اندر ناگ ہے جس کو یہ سانپ درشن دیتا ہے اس کے بگڑے ہوئے کام سنور جاتے ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''تو اپنے اندر ناگ سے کہو کہ ہماری جو کشتی سمندری طوفان میں بہ گئی وہ واپس لا دے۔''

پاروتی بولی۔ ''ہو سکتا ہے کشتی شام تک واپس آ جائے۔''

میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

''اس قسم کے جاہلانہ عقیدوں کی وجہ سے تم اس حال تک پہنچی ہو۔ اگر تمہارے ماتا پتا سنتھالی سپیروں کو اپنے گھر میں گھسنے ہی نہ دیتے تو آج تمہاری یہ حالت نہ ہوتی۔ مگر وہ بھی دوسرے ہندوؤں کی طرح دیوی دیوتاؤں کو اپنا بھگوان مانتے تھے۔ انہوں نے سنتھالی سپیروں کی دیوتاؤں کی طرح آؤ بھگت کی اور وہ بدمعاش سپیرے تمہیں اغوا کر کے لے گئے۔''

پاروتی نے مجھے گھور کر دیکھا۔ کہنے لگی۔

''کبھی کبھی مجھے یہ دیوی دیوتا سب جھوٹ لگتا ہے؟ لیکن میں ان عقیدوں سے پیچھا نہیں چھڑا سکتی۔ یہ میرے خون میں شامل ہو چکے ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''خدا تمہیں سیدھا راستہ دکھائے۔ اب یہ بتاؤ کہ شام ہو رہی ہے۔ رات کہاں گزارنی ہے؟ مجھے خطرہ ہے کہ رات کو یہاں کوئی درندہ وغیرہ کہیں سے نکل آئے۔''

پاروتی نے ارد گرد کے درختوں کو دیکھا۔

''ہم ان درختوں پر بھی رات کو بسیرا کر سکتے ہیں۔ مگر یہ بڑے اونچے درخت ہیں۔ ان پر چڑھنا آسان نہیں۔''

میں نے کہا۔ ''اور پھر ساحل پر جو چٹانیں ہیں وہاں چل کر دیکھتے ہیں۔ شاید وہاں کوئی ایسا ٹھکانہ مل جائے جہاں رات بسر کی جا سکے۔''

پاروتی بولی۔ ''لیکن میرے لیے دو تین سانپوں سے ڈسوانا بڑا ضروری ہے۔''

میں نے اسے سرزنش کرتے ہوئے کہا۔

''یہ جو سانپ تھا اس سے ڈسوا لیتی۔ اس سے کیوں نہیں ڈسوایا؟''

پاروتی نے زیر لب تبسم کے ساتھ کہا۔

''یہ اندر ناگ شو دیوتا کا خاص سانپ تھا' اس نے بھی میرے جسم کی بو پا لی تھی۔ اسے بھی پتہ چل گیا تھا کہ میں آدھی سے زیادہ ناگن بن چکی ہوں۔ وہ مجھے کبھی نہ ڈستا۔''

ہم اسی طرح باتیں کرتے ساحل پر سمندر میں دور تک پھیلی ہوئی چٹانوں میں آ گئے۔ سمندر کا پانی ان چٹانوں کے اندر تک چلا گیا تھا۔ ہم پانی میں چلتے ان چٹانوں میں رات بسر کرنے کے لیے کوئی جگہ تلاش کر رہے تھے کہ پاروتی دوڑ کر ایک طرف گئی اس نے جھک کر پانی میں ہاتھ ڈالا اور جب باہر نکالا تو اس کے ہاتھ میں ایک دھاری دار سانپ پیچ و تاب کھاتے ہوئے اس کی کلائی اور بازو پر بار بار ڈس رہا تھا۔ پاروتی بڑے آرام سے کھڑی سانپ سے ڈسوا رہی تھی۔ میں چند قدم کے فاصلے پر کھڑا یہ تماشا دیکھ رہا تھا۔

جب سانپ میں مزید ڈسنے کی طاقت نہ رہی تو پاروتی نے اس کا سر منہ میں ڈال کر کھانا شروع کر دیا۔ میں نے منہ دوسری طرف کر لیا۔ یہ مکروہ منظر میں نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اس کام سے فارغ ہو کر وہ میرے پاس آئی تو بڑی خوش نظر آ رہی تھی۔ کہنے لگی۔

''یہ سمندر کا سانپ تھا۔ سمندر کے سانپ کا زہر ٹھنڈا ہوتا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''پاروتی! میرا کہا مانو اور تم سانپ کھانا چھوڑ کر مچھلیاں کھانا شروع کر دو۔''

وہ سر جھٹک کر بولی۔

''کہاں مچھلی کہاں سانپ کہاں' راجہ بھوج اور کہاں گنگوا تیلی۔''

میں سمجھ گیا کہ یہ عورت اب لاعلاج ہو چکی ہے۔

تھوڑی دیر چٹانوں میں چلنے پھرنے کے بعد ہم نے ایک چٹان میں رات بسر کرنے کی جگہ تلاش کر لی۔ یہ ایک کھوہ تھی جو سمندری موجوں نے بنایا ہوا تھا۔ میں تھک گیا تھا۔ کھوہ میں چٹان کی دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ پاروتی کھڑی تھی۔ کہنے لگی۔

''تم نے ابھی تک کچھ نہیں کھایا۔ میں تمہارے لیے کچھ کھانے کو لاتی ہوں۔''

اور وہ چلی گئی۔ کوئی پندرہ بیس منٹ کے بعد آئی تو اس کے ایک ہاتھ میں چھوٹے چھوٹے زرد کیلوں کا گچھا تھا اور دوسرے ہاتھ میں دو کچے ناریل تھے۔ میں کیلے اور ناریل کھاتے کھاتے تھک گیا تھا مگر وہاں اس کے سوا کھانے کو کچھ بھی نہیں تھا۔ مچھلیاں سمندر میں دور دور تک تھیں اور اگر کوئی مچھلی ہم پکڑ بھی لیتے تو اس کو روسٹ کرنے کے لیے آگ کہاں سے جلاتے۔ میرے پاس ماچس بھی نہیں تھی۔

دن کی روشنی کم ہونے لگی تھی۔ ابر آلود آسمان کی وجہ سے سورج غروب ہوتا نظر نہیں آ رہا تھا۔ ہم کچھ دیر چٹانوں کے اندر بیٹھے جزیرے سے فرار کی ترکیبیں سوچتے رہے۔ ہمارے سامنے ایک ہی ترکیب تھی کہ کسی طریقے سے گرے پڑے دو چار درختوں کی شاخوں کو کاٹ کر انہیں آپس میں باندھ دیا جائے اور سمندر میں ڈال کر اس پر بیٹھ جائیں اس میں خطرہ بھی تھا۔ درختوں کی شاخیں سمندری موجوں کے تھپیڑوں سے الگ الگ بھی ہو سکتی تھیں۔ اس کے سوا اور کوئی دوسرا طریقہ ذہن میں نہیں آ رہا تھا۔

ابھی شام بھی نہیں ہوئی تھی۔ ہمیں پوری رات اس چٹان میں گزارنی تھی۔ پاروتی کہنے لگی۔

"چلو چل کر جزیرے میں پھرتے ہیں۔ ہو سکتا ہے جھونپڑے میں کوئی آدمی آ گیا ہو۔ اگر اس کی کشتی سمندر میں نظر آ گئی تو ہم اسے لے کر فرار ہو جائیں گے۔"

یہ ناقابل یقین باتیں تھیں۔ پھر بھی میں وقت گزارنے کے لیے پاروتی کے ساتھ چٹانوں سے نکل کر جزیرے میں داخل ہو گیا۔ جزیرے میں دھندلا دھندلا اندھیرا اترنے لگا تھا۔ چھوٹا سا جزیرہ تھا۔ دس پندرہ منٹ تک ہم جزیرے کے اندر سیدھ میں چلتے رہے۔ اس کے بعد جزیرے کا مشرقی ساحل آ گیا۔ ہم سخت بور ہو گئے تھے۔ میں نے پاروتی سے کہا۔

"اس سے تو یہی بہتر تھا کہ چٹان میں ہی بیٹھے رہتے۔ یہاں کوئی نہیں آتا۔ جھونپڑی بھی خالی پڑی تھی۔"

پاروتی سمندر میں مشرق کی جانب دیکھ رہی تھی۔ اچانک اس نے ہاتھ کے اشارے سے دور سمندر میں مجھے کچھ دکھاتے ہوئے کہا۔

"میرا خیال ہے کوئی جزیرے کی طرف آ رہا ہے۔"

میں نے سمندر پر نگاہ دوڑائی۔ دور ایک کشتی جزیرے کی طرف بڑھ رہی تھی۔ میں نے کہا۔

"پاروتی! کچھ لوگ کشتی میں بیٹھے اس طرف آ رہے ہیں۔ ہو سکتا ہے یہ جنگلی لوگ ہوں۔ جلدی سی کسی جگہ چھپ جاتے ہیں اگر یہ کشتی یہاں چھوڑ کر دوسری طرف گئے تو ہم ان کی کشتی لے کر بھاگ جائیں گے۔"

"بالکل ٹھیک ہے۔ اس درخت پر چڑھ جاتے ہیں۔"

ساحل کے ساتھ ساتھ ناریل کے درختوں کی جو قطار دور تک چلی گئی تھی اس میں ایک چھوٹے قد کا گھنا درخت بھی تھا۔ اس کی شاخیں بڑی گھنی تھیں۔ ہم جلدی جلدی درخت پر چڑھ کر شاخوں میں اس طرح چھپ کر بیٹھ گئے کہ ہمیں سمندر کا ساحل صاف نظر آ رہا تھا۔ کشتی آہستہ آہستہ قریب ہوتی جا رہی تھی۔ ہم دونوں درخت کی ٹہنیوں میں چھپے بڑے غور سے کشتی کو قریب آتے دیکھ رہے تھے جب کشتی مزید قریب آ گئی تو اس میں بیٹھے ہوئے آدمی نظر آنے لگے۔ یہ تین آدمی تھے۔ ان میں ایک عورت بھی تھی۔ ساحل پر آ کر وہ کشتی سے اتر گئے۔ اب ہم نے دیکھا کہ عورت دبلی پتلی لڑکی تھی۔ آدمیوں کے جسم تقریباً عریاں تھے۔ کمر کے ساتھ کیلے کے پتوں کی جھالریں سی باندھ رکھی تھیں۔ جسم پر مختلف رنگ کی لکیریں پڑی تھیں۔ ان میں سے ہر ایک کے کندھے سے تیر کمان لٹک رہا تھا اور ہاتھوں میں کلہاڑیاں تھیں۔ لڑکی نے لمبا سا کرتہ پہنا ہوا تھا جو اس کے گھٹنوں تک چلا گیا تھا۔ انہوں نے لڑکی کے دونوں ہاتھ رسی سے باندھے ہوئے تھے۔ لڑکی

ان سے اپنا آپ چھڑانے کی کوشش کر رہی تھی اور وہ لڑکی کو گھسیٹتے ہوئے ساحل پر لا رہے تھے۔ پاروتی نے آہستہ سے کہا۔

"ہے بھگوان! یہ جنگلی لوگ تو لڑکی پر ظلم کریں گے۔"

میں نے کہا۔ "اپنے بھگوان کے لیے خاموش رہو۔"

میں یہ دیکھ رہا تھا کہ کشتی چرانے کا امکان کہاں تک ہے۔ انہوں نے کشتی کو ریت پر کھینچ لیا تھا اور وہ کشتی سے زیادہ دور نہیں تھے۔ میں دل میں دعائیں مانگنے لگا کہ یہ لوگ لڑکی کو لے کر جزیرے کے اندر چلے جائیں تاکہ ہمیں کشتی میں بیٹھ کر فرار ہونے کا موقع مل جائے۔ مگر وہ لوگ کچھ اور پروگرام بنا کر جزیرے پر لڑکی کو لائے تھے۔ انہوں نے کشتی سے کوئی پچاس فٹ کے فاصلے پر لڑکی کے بازو کھول دیئے اور اسے زبردستی پکڑ کر ریت پر لٹا دیا۔

ایک آدمی نے تھیلے میں سے لکڑی کی میخیں نکال لیں۔ انہوں نے لڑکی کے چاروں طرف لکڑی کی میخیں ریت میں گاڑ دیں۔ پھر لڑکی کے دونوں ہاتھ اور دونوں پاؤں ان میخوں کے ساتھ باندھ دیئے۔ اب لڑکی بالکل جکڑی ہوئی زمین پر پڑی تھی۔ وہ ہاتھ پیر بھی نہیں ہلا سکتی تھی۔ صرف گردن ادھر ادھر ہلاتے ہوئے دیکھ رہی تھی اور اپنی زبان میں بار بار کچھ کہہ رہی تھی۔ میرے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔

"یہ لوگ کیا کرنے لگے ہیں؟"

پاروتی نے دھیمی سرگوشی میں کہا۔

"میرا خیال ہے یہ لڑکی کو قتل کر کے کھا جائیں گے۔"

دو آدمی لڑکی کے پاس بیٹھ گئے۔ ایک آدمی کلہاڑی لے کر درختوں کی طرف چل پڑا۔ وہ ہماری طرف ہی آ رہا تھا۔ میں نے پاروتی کے کان میں کہا۔

"بالکل نہ بولنا......"

ہم دونوں سانس روک کر شاخوں میں ساکت ہو گئے۔

جنگلی آدمی ہم سے چند فٹ کے فاصلے پر درختوں کے نیچے گری پڑی لکڑیاں اٹھانے لگا۔ وہ خشک گھاس بھی کاٹ رہا تھا۔ تین چار پھیرے لگا کر وہ ڈھیر ساری لکڑیاں اور خشک گھاس پھوس لے گیا۔ ان جنگلی آدمیوں نے مل کر لکڑیاں اور گھاس پھوس زمین پر جکڑی ہوئی لڑکی کے چاروں طرف ڈھیریاں سی بنا کر ڈال دیا۔ ایک ڈھیری لڑکی کے سر کے بالکل قریب پیچھے کی جانب لگا دی گئی۔

لڑکی اونچی آواز میں رونے اور اپنی زبان میں بار بار ایک ہی جملہ دہرانے لگی۔ میں نے پاروتی سے کہا۔

"یہ لوگ لڑکی کو زندہ جلا رہے ہیں۔ ہمیں اس کو بچانے کی کوشش کرنی چاہیے۔"

پاروتی نے کہا۔ "ہم ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ وہ تین آدمی ہیں۔ ان کے پاس زہر میں بجھے ہوئے تیر ہیں۔ میں زیادہ سے زیادہ ایک جنگلی کو مار لوں گی۔ اس کے بعد ہماری موت یقینی ہے۔"

پاروتی نے درست کہا تھا۔ اس قسم کی حرکت ہم دونوں کو لڑکی سمیت موت کے منہ میں لے جا سکتی تھی۔ ہمارے دیکھتے دیکھتے ان جنگلی آدمیوں نے گھاس پھونس اور درختوں کی شاخوں کی ڈھیریوں کو آگ لگا دی اور لڑکی کے گرد اچھل اچھل کر چیخ چیخ کر چکر لگانے لگے۔ وہاں دھواں اٹھنے لگا۔ تینوں جنگلی لڑکی کو اردگرد جلتی ہوئی آگ کے حوالے کر کے کشتی کی طرف دوڑ کر گئے۔ کشتی کو کھینچ کر سمندر میں ڈالا اس میں بیٹھے اور تیزی سے چپو چلاتے دور ہونے لگے۔

مجھ سے نہ رہا گیا۔ لڑکی کی چیخیں بلند ہو رہی

تھیں۔ اگرچہ آگ براہ راست اس کے اوپر نہیں لگی تھی لیکن آگ اس کے چاروں طرف تھی اور آہستہ آہستہ آگ کے شعلے اس کی طرف بڑھ رہے تھے اور دھوئیں سے بھی اس کا دم گھٹ رہا تھا۔ میں نے پاروتی سے کہا۔

"جب تک جنگلی سمندر میں نظر آ رہے ہیں تم درخت پر ہی رہنا۔ میں لڑکی کو بچانے جاتا ہوں۔"

میں نے درخت سے نیچے چھلانگ لگادی اور زمین کے ساتھ لگ کر جھک جھک کر کچھ دوڑ کر کچھ رینگ کر جتنی جلدی پہنچ سکتا تھا لڑکی کے پاس پہنچ گیا۔ میں نے ایک طرف سے آگ پر ریت ڈال کر اسے بجھانا شروع کردیا۔ لڑکی کے سر کی طرف سے میں نے آگ بجھادی۔ لڑکی پھٹی پھٹی آنکھوں سے میری طرف دیکھنے لگی۔ وہ چیخ چیخ کر مجھے اپنی زبان میں کچھ کہنے لگی۔ میں نے جلتی ہوئی گھاس اور لکڑیوں کو پرے ہٹادیا۔ اور جلدی جلدی لڑکی کے ہاتھ پیر کھول دیئے اور اسے لیٹے لیٹے بازوؤں سے پکڑ کر ریت پر اپنی طرف گھسیٹ لیا۔

لڑکی اٹھنے لگی تو میں نے اسے پکڑ کر وہیں لٹادیا اور اپنی زبان میں کہا۔

"لیٹی رہو۔ اٹھو نہیں۔"

لڑکی سہمی ہوئی تھی۔ میرے کھینچ کر نیچے بٹھانے سے ہی ریت پر میرے ساتھ پڑی رہی۔ وہ لمبے لمبے سانس لے رہی تھی۔ ہمارے اور سمندر کے درمیان آگ اور دھوئیں کی دیوار کھڑی ہوگئی تھی جس نے ہمیں سمندر میں واپس جاتے جنگلی لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل کردیا تھا۔ میں نے اس دیوار کا فائدہ اٹھاتے ہوئے لڑکی کا ہاتھ پکڑ کر اسے اٹھایا اور اسے کھینچتا اور اپنے ساتھ دوڑاتا ہوا درختوں میں لے آیا۔

اس دوران پاروتی بھی درخت سے نیچے اتر چکی تھی۔ ہم نے لڑکی کو وہیں جھاڑیوں کے پاس بٹھادیا۔ لڑکی کا رنگ گہرا سانولا ناک نقشہ انڈونیشیا کے علاقے والے لوگوں کی طرح ذرا چپٹا تھا۔ وہ حیران ہو کر کبھی مجھے اور کبھی پاروتی کو دیکھتی۔ میں نے لڑکی سے ہندوستانی میں پوچھا۔

"تمہارا نام کیا ہے۔ یہ کون تھے؟"

لڑکی نے کوئی جواب نہ دیا۔ پاروتی نے بھی اس سے دو تین بار یہی سوال کیے۔ مگر لڑکی یا تو ہماری زبان نہیں سمجھ رہی تھی یا ابھی صدمے کے اثر سے باہر نہیں ہوئی تھی۔

سمندر پر جنگلیوں کی کشتی اب ہماری نگاہوں سے اوجھل ہوگئی تھی۔ ہم لڑکی کو لے کر ساحل پر کھلی فضا میں لے آئے۔ جہاں اسے لٹا کر آگ لگائی گئی تھی وہاں آگ ابھی تک لگی ہوئی تھی اور دھواں بھی اٹھ رہا تھا۔ جب لڑکی کے ہوش و حواس ذرا بحال ہوئے تو اس نے ٹوٹی پھوٹی ہندوستانی زبان میں کہا۔

"میں مچھوا...... یہ دشمن...... میں بابا ماما...... دور...... میرا گھر......"

کافی دیر بعد اس کی ٹوٹی پھوٹی باتوں کو جوڑ کر ہم اس نتیجے پر پہنچے کہ وہ اپنے ماں باپ کے پاس ساتھ والے کسی قریبی جزیرے میں رہتی ہے۔ یہ لوگ دشمن قبیلے کے آدمی تھے۔ اسے ہلاک کرنے کے لیے یہاں لے آئے تھے۔ اس کی باتوں سے یہ معلوم کر کے ہمیں بڑا حوصلہ بھی ہوا کہ کوئی دوسرا جزیرہ جہاں آبادی بھی ہے وہاں سے قریب ہی ہے۔ اب سوال یہ تھا کہ لڑکی کو جو اپنا نام مچھوا بتا رہی تھی اس کے جزیرے تک کس طرح پہنچایا جائے اور خود بھی وہاں کس طرح پہنچا جائے۔

رات ہم نے چٹان کی کھوہ میں گزاری۔ دوسرے

دن ہم اس جگہ پر آگئے جہاں رات کو لڑکی کو جانگلی آدمیوں نے زندہ جلانے کے لیے لٹایا تھا۔ وہاں جلی بجھی راکھ کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ لڑکی نے چیخ چیخ کر کچھ کہا۔ وہ سمندر کی طرف اشارہ کررہی تھی۔ اشارہ کرتے ہی وہ درختوں کی طرف بھاگ گئی۔ ہم نے سمندر کی جانب دیکھا۔ دور سمندر میں ایک کشتی ساحل کی طرف بڑھتی چلی آرہی تھی۔ میں نے پاروتی سے کہا۔

"میرا خیال ہے اس لڑکی کے دشمن قبیلے کے لوگ ہوں گے۔ اسی لیے یہ لڑکی ان کو دیکھ کر بھاگ گئی ہے۔"

"تو پھر ہمیں بھی درختوں میں جا کر چھپ جانا چاہیے۔ ہم اس بار انہیں زندہ نہیں چھوڑیں گے۔"

یہ کہہ کر پاروتی نے میرا ہاتھ پکڑا اور درختوں کی طرف بھاگی۔ ہم ناریل کے جھنڈوں میں آئے تو جانگلی لڑکی وہیں جھاڑیوں میں چھپی سمندر کی طرف دیکھ رہی تھی۔ ہم نے اس سے پوچھا کہ یہ کون لوگ آرہے ہیں؟ لڑکی نے ہمیں بڑی مشکل سے سمجھایا کہ یہ دشمن قبیلے کے لوگ ہیں اور اس کی جلی ہوئی ہڈیاں اور کھوپڑی لینے آئے ہیں۔ ہم لڑکی کو وہاں سے دور لے گئے اور اسے جھاڑیوں کے پیچھے بٹھا کر اشاروں اور ٹوٹی پھوٹی زبان میں سمجھایا کہ وہ وہیں رہے اور کسی حالت میں بھی ساحل سے سمندر کی طرف نہ آئے۔ میں اور پاروتی ساحل والے درختوں کی اوٹ میں بیٹھ گئے اور کشتی کو ساحل کی طرف آتے دیکھنے لگے۔ کشتی اب قریب آگئی تھی۔ اس میں صرف آدمی بیٹھے تھے۔ انہوں نے ساحل پر آتے ہی کشتی سے چھلانگیں لگادیں اور کشتی کو ریت پر کھینچنے کے بعد اس مقام پر آکر غور سے نیچے ریت کو دیکھنے

اور پاؤں سے جلی ہوئی شاخوں اور گھاس پھوس کی راکھ کو ادھر ادھر ہٹانے لگے۔ پھر وہ تعجب سے ادھر ادھر دیکھنے اور ایک دوسرے سے تیز تیز آواز میں باتیں کرنے لگے۔ صاف لگ رہا تھا کہ انہیں راکھ میں لڑکی کی ہڈیاں اور کھوپڑی نہیں ملی جس پر وہ حیران اور جھنجلائے ہوئے ہیں۔

اچانک ایک آدمی نے زمین پر پاروتی اور لڑکی کے پاؤں کے نشان دیکھ کر چیخ ماری۔ کلہاڑی والے ہاتھ کو بلند کیا اور وہ نشان اپنے ساتھی کو بھی دکھانے لگا۔ دونوں جھک کر نشان کو دیکھنے اور پاؤں کے نشانوں کے ساتھ ساتھ ہمارے والے درختوں کی طرف آنے لگے۔ کیونکہ پاؤں کے نشان انہیں ہماری طرف ہی لا رہے تھے۔ پاروتی نے مجھے کندھے پکڑ کر جھنجوڑتے ہوئے کہا۔

"تم پیچھے ہٹ جاؤ۔ میں ایک کو سنبھال لوں گی۔ تم موقع دیکھ کر دوسرے کو پکڑ لینا۔"

اس سے پہلے کہ میں سمجھ سکوں کہ اس نے یہ کس قسم کا فیصلہ کیا ہے وہ دوڑ کر درختوں سے نکل کر ان جنگلی آدمیوں کے سامنے آگئی۔ میں حیرت زدہ ہو کر درخت کی اوٹ میں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ دونوں جنگلی وہیں سیدھے ہو کر پاروتی کو غور سے دیکھنے لگے۔ پاروتی نے لپک کر ایک آدمی کا بازو تھاما اور اسے دوسری طرف لے گئی۔ وہ جنگلی زور سے ہنس پڑا۔ اس نے اپنی زبان میں اپنے ساتھی سے کچھ کہا اور پاروتی کو وہیں ریت پر گرالیا۔ شاید پاروتی یہی چاہتی تھی۔ دوسرا آدمی وہیں کھڑا ان دونوں کو تکتا رہا۔ اس کی پیٹھ میری طرف تھی۔

پاروتی جنگلی آدمی کے ساتھ زمین پر گرتے ہی اپنا کام کرچکی تھی۔ کیونکہ جنگلی زمین پر بے حس و حرکت پڑا تھا۔ پاروتی نے اٹھ کر دوسرے آدمی کو بھی اشارے

سے اپنی طرف بلایا۔ دوسرا آدمی ڈرتا ڈرتا جھکا جھکا کلہاڑی ہاتھ میں لیے پاروتی کی طرف بڑھا۔ پاروتی نے بلند آواز میں مجھ سے مخاطب ہوکر کہا۔

"باہر مت نکلنا۔ میں اسے بھی نرگ میں پہنچا رہی ہوں۔"

جیسے ہی دوسرا جنگلی پاروتی کے قریب آیا پاروتی نے اپنے دونوں بازو پھیلا دیئے جیسے اسے اپنے قریب آنے کی دعوت دے رہی ہو۔ جنگلی نے جھک کر اپنے ساتھی کو دیکھا جس پر پاروتی کے ناخنوں کا قاتل زہر اپنا کام کر چکا تھا۔ جیسے ہی وہ جھکا پاروتی اس سے لپٹ گئی اور اس کی گردن میں انگلیوں کے سارے ناخن چبھو دیئے۔ دس انگلیوں کے ناخنوں کا زہر ایک دم سے جنگلی کے خون میں شامل ہوا تو اس پر سب سے پہلا اثر یہ ہوا کہ وہ اپنی جگہ پر ساکت ہوگیا۔ اس کے ہاتھ سے کلہاڑی گر پڑی۔ پاروتی نے جلدی سے کلہاڑی اٹھائی اور چار پانچ قدم پیچھے ہٹ گئی۔ دونوں جنگلی ختم ہو چکے تھے۔ پاروتی دوڑ کر میرے پاس آ گئی۔ ہم جنگلی لڑکی کے پاس گئے۔ اسے بتایا کہ اس کے دونوں دشمن ختم کر دیئے گئے ہیں۔ جب اسے دونوں کی لاشیں ریت پر پڑی ہوئی دکھائی دیں تو جنگلی لڑکی کے حلق سے ایک چیخ نکلی۔ یہ خوشی کی چیخ تھی۔ وہ ہمیں سمجھانے لگی کہ کشتی ہمارے پاس موجود ہے۔ میرے ماں باپ کے جزیرے پر چلو۔ میں تمہیں وہاں لیے چلتی ہوں۔ ہم کشتی میں سوار ہوگئے۔ جنگلی لڑکی اور میں نے چپو سنبھال لیے اور کشتی سمندر میں اس جزیرے کی طرف چل پڑی جس جزیرے پر جنگلی لڑکی کے ماں باپ رہتے تھے۔

......☆☆☆......

ہم جنگلی لڑکی کے جزیرے پر پہنچ گئے۔ لڑکی ہمیں اس جگہ لے گئی جہاں ایک پہاڑی کے دامن میں جنگلی لوگوں کی جھونپڑیاں تھیں۔ لڑکی کے ماں باپ نے لڑکی کو دیکھا تو دوڑتے ہوئے آئے اور اسے گلے لگالیا۔ دوسرے جنگلی بھی ہمارے اردگرد جمع ہوگئے۔ لڑکی نے اپنی زبان میں ماں باپ کو ہمارے بارے میں بتایا۔ انہوں نے ہماری بڑی آؤ بھگت کی۔ ہمیں مچھلی اور پھل کھانے کو دیئے۔ ایک دن اور ایک رات ہم نے ان لوگوں کے پاس گزارے۔ مشکل یہ پیش آئی کہ وہ ہماری زبان نہیں سمجھتے تھے۔

پاروتی نے بہت کوشش کر کے صرف اتنا معلوم کیا کہ یہ جزیرہ انڈونیشیا کے طویل ترین جزائر سماٹرا اور ملایا کے درمیانی سمندر یعنی خلیج ملاکا کے درمیان کا کوئی ویران جزیرہ ہے۔ میں نے غور کیا تو معلوم ہوا کہ ہم ہندوستان کے جنوب میں کافی نیچے آ گئے ہیں اور اب ہمیں سب سے پہلے اس زمانے کے ملایا اور آج کے ملائیشیا کی بندرگاہ کوالالمپور جانا ہوگا اور وہاں سے ہندوستان تک کا سمندری سفر طے کرنا ہوگا۔ جب یہ ساری صورت حال پاروتی کو بتائی تو وہ کچھ پریشان ضرور ہوئی لیکن کہنے لگی۔

"کم از کم جاپانیوں اور بحری ڈاکوؤں سے تو نجات ملی۔ اب ہم تعلیم یافتہ شہروں میں سفر کر کے انڈیا پہنچیں گے۔"

میں نے کہا۔ "ہمارے پاس ان شہروں میں داخل ہونے کے لیے پاسپورٹ ویزا نہ ہوا تو ہمیں پکڑ کر جیل میں بند کر دیا جائے گا۔"

پاروتی نے بڑی عقل مندوں والی بات کی۔ کہنے لگی۔

"ان سارے ملکوں پر جاپانیوں نے قبضہ کر رکھا تھا۔ جنگ ختم ہوگئی ہے۔ جاپانی بھاگ گئے ہیں۔

یہاں پھر سے انگریزوں کی حکومت بن گئی ہے۔ کسی نے پوچھا تو ہم کہہ دیں گے کہ ہم جنگ میں جاپانیوں کی قید میں تھے۔ ہمارے پاس پاسپورٹ وغیرہ کچھ نہیں ہے۔"

میں بہت حد تک اس معاملے میں مطمئن ہوگیا۔

اب سوال اس جزیرے سے نکلنے اور ملایا کی بندرگاہ کوالالم پور پہنچنے کا تھا۔ جنگلی لوگوں نے ہمارے لیے ایک کشتی تیار کردی تھی جس میں چھ سات روز کا کھانے پینے کا سامان رکھ دیا۔ وہ اپنی زبان میں اور اشاروں سے ہمیں سمجھاتے رہے کہ ہمیں سمندر میں کس طرف سفر کرنا ہوگا اور کتنے دن کے بعد ہم ملایا کے ساحل پر پہنچیں گے۔ میں سخت بیزار تھا۔ میں نے پاروتی سے کہا۔

"تم ہی ان کی جنگلی زبان سمجھو۔ میرے تو کچھ پلے نہیں پڑ رہا۔"

پاروتی میں ایک بات میں نے دیکھی تھی کہ وہ سخت مایوسی کی حالت میں بھی پرامید ضرور رہتی تھی۔ شاید اس لیے کہ اس کا مزاج ہی ایسا ہو یا شاید یہ سانپوں کے زہر کا اثر ہو۔ کہنے لگی۔

"میں سمجھ رہی ہوں۔ تمہیں بھی سمجھا دوں گی۔"

منہ اندھیرے ہماری کشتی جنگلیوں کے جزیرے سے سمندر میں روانہ ہوگئی۔ سب لوگ ہمیں رخصت کرنے ساحل پر جمع تھے۔ ہماری کشتی آہستہ آہستہ سمندر میں بہنے لگی۔ میں اور پاروتی دونوں چپو چلا رہے تھے۔ ساحل پر سمندر کی موجیں واپس جاتے ہوئے ہماری کشتی کو بھی اپنے ساتھ سمندر میں دور تک لے گئیں۔ جنگلی لوگوں نے جس طرف جانے کو کہا تھا ہم کشتی کو اس طرف چلا رہے تھے۔ سب سے بڑی نشانی ہمیں یہ دی گئی تھی کہ سورج ہمیشہ ہمارے عقب میں طلوع ہونا چاہیے۔ بہر حال ہم ایک مرتبہ پھر کھلے سمندر میں تھے۔ فرق صرف اتنا تھا کہ اس بار ہمارے پاس کھانے پینے کا کافی سامان بھی موجود تھا اور کشتی ایسی تھی کہ سمندری موجوں کے ساتھ ہی اوپر اٹھ جاتی اور ان موجوں کے ساتھ ہی نیچے آ جاتی تھی۔ یعنی سمندری موجیں ہماری کشتی سے ٹکرا کر اسے الٹ نہیں سکتی تھیں۔ ہاں اگر سمندر میں طوفان آ جائے تو پھر بچنا مشکل تھا۔ میں دل ہی دل میں یہی دعا مانگ رہا تھا کہ یا خدا ہمیں سمندری طوفان سے محفوظ رکھنا۔

دن کے وقت ہم چلے تھے۔ سارا دن سمندر میں کشتی بہتی رہی۔ دھوپ اور بارش سے بچنے کے لیے جنگلیوں نے کشتی میں ایک طرف ترپال کی چھت ڈال دی تھی۔ سمندر میں خاص طور پر جنوبی سمندروں میں جب دھوپ چمکتی ہے تو اس کی چمک اور گرمی ناقابل برداشت ہوتی ہے۔ ہم سائبان کے سائے میں آ کر بیٹھ جاتے۔ کشتی ایک ہی رخ پر جا رہی تھی۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد ہم سورج کی سمت دیکھ کر اندازہ لگا لیتے تھے کہ ہم صحیح جانب جا رہے ہیں یا نہیں۔ ابھی تک ہم اپنے خیال میں درست سمت کو جا رہے تھے۔

ایک دن گزر گیا۔ پھر دوسرا اور تیسرا دن بھی گزر گیا۔ چوتھے دن دوپہر کے وقت ہمیں شمال مشرق کی جانب سمندر میں دور سیاہ لکیر دکھائی دی۔ پاروتی نے وہ لکیر مجھے دکھائی اور کہا۔

"یہ دھرتی ماتا کی لکیر ہے۔"

میں نے لکیر کو غور سے دیکھا۔ واقعی یہ زمین کی لکیر تھی۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا لیکن اس لکیر کو جنگل کے درختوں کی شکل اختیار کرتے کرتے پورے دو دن لگ گئے۔ ہم ایک جگہ ساحل پر کشتی سے اتر گئے۔ اترتے ہی ہم زمین پر چت لیٹ گئے اور آنکھیں بند کرلیں۔ آپ اندازہ نہیں کر سکتے کہ جب آدمی تین

چار دن سمندر میں بے یار و مددگار ایک تنہا کشتی میں سفر کرنے کے بعد زمین پر قدم رکھتا ہے تو اس کی جذباتی کیفیت کیا ہوتی ہے۔ اس وقت زمین اللہ تعالیٰ کی سب سے بڑی نعمت محسوس ہوتی ہے۔ ہمیں یوں محسوس ہو رہا تھا کہ ہم دوبارہ زندہ ہوگئے ہیں۔ دیر تک ہم ساحل سمندر کی ریت پر لیٹے رہے پھر اٹھے اور درختوں کی چھاؤں میں آ کر بیٹھ گئے۔

سب سے پہلے تو ہمیں یہ معلوم کرنا تھا کہ ہم واقعی ملایا کے ساحل پر پہنچے ہیں کہ کسی دوسرے ویران جزیرے پر آ گئے ہیں۔ کچھ دیر آرام کرنے کے بعد ہم درختوں کے نیچے ایک طرف چل پڑے۔ درخت ناریل کے بھی تھے اور تاڑ اور دیودار کے بھی تھے۔ آگے جا کر ربر کے درختوں کی قطاریں دیکھیں تو میں سمجھ گیا کہ یہ ملایا ہی ہے۔ ایک جگہ ندی بہہ رہی تھی۔ اس کا پانی میٹھا تھا۔ سمندر میں ہم ناریل کا پانی ہی پیتے رہے تھے۔ اتنے دنوں کے بعد ندی کا میٹھا پانی پیا تو طبیعت بشاش ہوگئی۔ پھر ہم نے سب سے پہلے اپنے کپڑے ندی میں دھوئے۔ خوب نہائے۔ جب کپڑے سوکھ گئے تو انہیں پہنا اور ایک طرف روانہ ہوگئے۔ پاروتی کی بھوک تیز ہوگئی تھی۔ میں نے تو جنگلی کیلے اور ناریل کھا کر پیٹ بھر لیا تھا مگر پاروتی کی بھوک نہیں مٹی تھی۔ میں نے اسے بے چینی سے ادھر ادھر دیکھتے اور ناک اونچی کر کے سونگھتے دیکھا تو کہا۔

"تمہیں یہاں بہت سانپ مل جائیں گے فکر نہ کرو۔"

وہ ابھی تک فضا میں سانپوں کی بو سونگھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ میری بات سن کر بولی۔

"اس طرف سے مجھے سانپوں کی بو آ رہی ہے تم یہاں بیٹھو۔ میں ابھی آتی ہوں۔"

مجبوراً مجھے وہیں بیٹھنا پڑا۔ کوئی پندرہ منٹ کے بعد پاروتی درختوں میں سے میری طرف آئی تو وہ بڑی خوش خوش تھی۔ کہنے لگی۔

"یہاں کے سانپ بڑے زہریلے اور گرم ہیں۔"

میں نے کہا۔ "اب مجھے یہ نہ بتانا کہ تم نے کتنے سانپوں سے اپنے آپ کو ڈسوایا ہے اور کتنے سانپ کھائے ہیں۔"

وہ مسکراتی ہوئی میرے پاس آ کر بیٹھ گئی۔ میں نے اسے کہا۔

"پاروتی! ہم اب شہروں میں داخل ہو رہے ہیں وہاں تمہیں اتنی آسانی سے سانپ نہیں ملیں گے۔ وہاں کیا کرو گی۔ اس لیے میری بات مانو اور یہ بری عادت ترک کردو اور دوسرے انسانوں کی طرح زندہ رہنا سیکھو۔"

پاروتی اپنے بازو پر وہ جگہ دیکھ رہی تھی جہاں اس نے سانپ سے ڈسوایا تھا۔ وہاں مجھے تھوڑا تھوڑا خون نکلتا نظر آیا۔ کہنے لگی۔

"تم میری فکر نہ کرو۔ شہروں میں بھی سانپ مل جاتے ہیں۔ سانپ جہاں ہوگا مجھے اس کی بو آ جائے گی۔"

ہم نے کچھ دیر آرام کیا اور اٹھ کر دوبارہ چلنے لگے۔

کوئی ایک گھنٹے بعد ہم ایک چھوٹے سے گاؤں میں پہنچ گئے۔ یہاں لوگوں سے معلوم ہوا کہ ہم واقعی ملایا کے ملک میں ہیں۔ اس گاؤں کے لوگ ملائی مسلمان تھے۔ جب انہیں معلوم ہوا کہ میں مسلمان ہوں تو وہ بڑے خوش ہوئے۔ میں نے پاروتی کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

"یہ میری بیوی ہے۔ ہم جاپانیوں کے جنگلی قیدی کیمپ سے بھاگے ہیں۔ بڑی مشکل سے یہاں پہنچے ہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ جاپانی یہاں سے دفع ہوگئے

ہیں۔
گاؤں کے ملائی مسلمانوں نے ہمیں کھانا کھلایا۔ ہمیں نئے کپڑے پہننے کو دیئے۔ میں نے کرتے کے اوپر دھوتی باندھ لی۔ جس طرح ملایا کے دیہاتی مسلمان باندھا کرتے ہیں۔ پاروتی کو بھی انہوں نے اسی قسم کا لباس دیا جو اس نے پہن لیا۔ ہمیں نئے چپل بھی دیئے۔ ہم دو دن وہاں ملائی مسلمانوں کے مہمان رہے۔ انہوں نے ہمیں بتایا کہ سامنے والی پہاڑیوں کے پیچھے ہمیں ایک سڑک ملے گی جو ہمیں مغرب کی طرف ایک شہر میں پہنچادے گی وہاں ریلوے اسٹیشن ہے جہاں سے ہم گاڑی میں بیٹھ کر کوالالم پور پہنچ سکتے ہیں۔

رخصت کرتے ہوئے ان نیک دل ملائی مسلمانوں نے ہمیں کچھ رقم بھی دی۔ ہم ان کا شکریہ ادا کر کے رخصت ہوئے اور سامنے والی پہاڑیوں کی طرف روانہ ہوگئے۔ سارا دن چلتے رہے سورج غروب ہو رہا تھا کہ ہم پہاڑیوں کی دوسری جانب سڑک پر آگئے۔ یہ کشادہ اور پختہ سڑک تھی۔ سڑک پر سے ٹرک اور فوجی گاڑیاں گزر رہی تھیں۔ ان فوجی گاڑیوں میں جاپانیوں کے بجائے انگریز فوجی بیٹھے نظر آتے تھے۔ ہمیں ایک ٹرک والے نے اپنے ٹرک میں بٹھالیا۔ شام کو ہم ایک شہر میں پہنچے جس کا نام میں اب بھول گیا ہوں۔ اسٹیشن پر جا کر معلوم ہوا کہ کوالالم پور کو رات کے وقت گاڑی چلتی ہے۔ ہم وہیں اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر ہی ایک طرف ہو کر بیٹھ گئے۔ پاروتی نے ملائی مسلمان عورتوں والا لباس پہن رکھا تھا۔ میری طرف دیکھ کر بولی۔

''میں اس لباس میں کیسی لگتی ہوں؟''

میں نے کہا۔ ''اتنی بری نہیں لگتی ہو۔''

وہ بڑی لگاوٹ سے میرے قریب ہو کر بولی۔

''تم نے مجھے اپنی بیوی کہا ہے تو کیوں نہیں مجھ سے بیاہ کر لیتے؟ میں تمہاری بڑی سیوا کیا کروں گی۔''

میں نے دل میں کہا تم سے شادی کرنے سے تو بہتر ہے کہ میں سانپوں سے بھرے ہوئے کنوئیں میں چھلانگ لگادوں۔ میں نے اسے جواب دیا۔

''کوئی اور بات کرو پاروتی۔''

وہ انگلیاں چٹخاتے ہوئے ادھر ادھر دیکھنے لگی میں سمجھ گیا کہ وہ کیا چیز تلاش کر رہی ہے۔ میں نے کچھ نہ پوچھا اور خاموش رہا۔ وہ کچھ بے چین ہونے لگی میں پھر بھی جان بوجھ کر چپکا ہو کر بیٹھا رہا۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ میں نے پوچھا۔

''کیا بات ہے؟''

وہ بولی۔ ''میں ذرا باتھ روم تک جارہی ہوں۔''

اگرچہ وہ تقریباً جنگلی لڑکی بن چکی تھی اس کے باوجود وہ ایک بڑے شہر کی رہنے والی تھی۔ وہ شہر کے ادب آداب اور تمدن کو پوری طرح سمجھتی تھی۔ مگر مصیبت یہ تھی کہ وہ شہر میں جنگل کی خوراک تلاش کرنے جارہی تھی۔ قریب ہی ریفریشمنٹ روم تھا۔ وہ اس کے اندر چلی گئی۔ کوالالم پور کو جانے والی ٹرین کے آنے میں ابھی کافی دیر تھی۔ پاروتی ریفریشمنٹ روم سے باہر آئی تو بدستور بے چین تھی۔ میرے پاس آکر بیٹھ گئی۔

میں نے کہا۔ ''تمہیں کہا تھا ناں کہ اپنی بری عادت چھوڑ دو۔ شہر میں تمہیں اتنی آسانی سے سانپ نہیں ملیں گے۔''

پاروتی نے تڑپ کر میری طرف دیکھا۔ اس کے منہ سے پھنکار کی سی آواز نکلی۔ وہ بالکل جنگل والی لڑکی بن گئی تھی۔

''مل جائیں گے سانپ تم کیوں پریشان ہوتے ہو۔ سانپ خود مجھے تلاش کر کے میرے پاس آجائیں گے۔''

میں اٹھ کر کاؤنٹر پر چلا گیا جہاں سگریٹ فروخت ہوتے تھے۔ ایک پیکٹ سگریٹ خریدا۔ سگریٹ سلگایا اور بنچ پر پاروتی کے پاس بیٹھ کر خاموشی سے سگریٹ پینے لگا۔ دل میں تھوڑی سی تشویش بھی تھی کہ اگر پاروتی کو کوئی سانپ نہ ملا تو کہیں اسے کچھ ہو نہ جائے۔ سانپ اس کے جسم کا اس کی زندگی کا حصہ بن چکے تھے۔ رات ہو چکی تھی۔ اسٹیشن پر کافی رونق تھی۔

پاروتی نے اپنا چہرہ پلیٹ فارم کے جنوبی سرے کی طرف کیا اور کچھ سونگھنے لگی۔ پھر میرا بازو کھینچتے ہوئے بولی۔

''میرے ساتھ آؤ۔ ایک سانپ مجھے اپنی طرف بلا رہا ہے۔''

میں نے دل میں کہا یا خدا خیر ہو۔ یہ شہر ہے۔ کہیں یہ عورت مجھے کسی مصیبت میں نہ پہنچادے۔ مجبوراً اٹھ کر اس کے ساتھ چل پڑا۔ پاروتی کی حس اسے دھوکہ نہیں دے سکتی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ جس طرف وہ جارہی ہے ادھر کہیں نہ کہیں کوئی سانپ ضرور ہوگا۔ ٹرین کے چلنے میں ابھی بہت وقت تھا۔ میں نے سوچا کہ چلو یہ تماشہ بھی دیکھ لیتے ہیں۔ پلیٹ فارم جہاں ختم ہوتا تھا وہاں ایک طرف ایک کیبن بنا ہوا تھا۔ شاید یہ ریلوے کا کوئی موڑ وغیرہ تھا۔ پاروتی نے اس کیبن کی طرف جاتے ہوئے کہا۔

''سانپ اس طرف ہے۔''

کیبن کے آگے تھوڑی سی جگہ تھی جہاں کیلے کے درخت اور گھاس وغیرہ لگی ہوئی تھی۔ وہاں صرف ایک بلب جل رہا تھا۔ زیادہ روشنی نہیں تھی۔ ہم وہاں پہنچے تو ایک چوکیدار کہیں سے نکل کر آ گیا۔ اس نے ملائی زبان میں ہم سے کچھ پوچھا۔ میں نے ٹوٹی پھوٹی ہندوستانی میں اسے بتایا کہ ہم نے یہاں ایک سانپ دیکھا ہے۔ اس کو مارنا چاہتے ہیں تاکہ کسی مسافر کو نہ ڈس لے۔ چوکیدار ہندوستانی زبان سمجھ لیتا تھا۔ سانپ کا سن کر وہ بھی خوف زدہ سا ہو گیا۔ کہنے لگا۔

''کہاں دیکھا تھا سانپ؟''

اس کے پاس ایک ڈنڈا تھا پاروتی نے کہا۔

''تم اس طرف جاکر بیٹھو۔ ہم خود سانپ کو ڈھونڈھ کر ماردیں گے۔ کہیں سانپ تمہیں نہ کاٹ لے۔''

چوکیدار پہلے ہی خوفزدہ تھا۔ وہ جلدی سے گھاس اور درختوں میں سے نکل کر دور چلا گیا۔ میں نے پاروتی سے کہا۔

''میں بھی ادھر چلا جاتا ہوں۔ کہیں سانپ نے مجھے ڈس لیا تو میں ناحق میں مارا جاؤں گا۔''

پاروتی نے بڑے محبت بھرے انداز میں کہا۔

''کسی سانپ میں اتنی ہمت نہیں کہ وہ میرے پیارے دوست کو کاٹے۔ میں تو اسے کچا چبا جاؤں گی۔''

میں نے کہا۔ ''وہ تو تم ویسے بھی اسے کچا چبا جاؤ گی۔ میں اس طرف جاتا ہوں۔''

میں بھی وہاں سے دور ہٹ گیا۔ اچانک پاروتی ایک طرف کو جھکی جھکی دوڑ پڑی میں سمجھ گیا اس نے سانپ کو دیکھ لیا تھا۔ وہ وہیں غائب ہوگئی۔ جب اسے کافی دیر لگ گئی تو چوکیدار میرے پاس آکر کہنے لگا۔

''کہیں تمہاری عورت کو سانپ نے نہ کاٹ لیا ہو۔''

میں نے کہا۔ ''وہ سانپ کو ختم کر کے ہی آئے گی۔''

اور واقعی پاروتی سانپ کو پورے کا پورا ختم کر کے ہی آئی۔ وہ خالی ہاتھ تھی اور بڑی ہشاش بشاش تھی۔

کہنے لگی۔
"میں نے سانپ کو مار دیا ہے۔"
چوکیدار نے اطمینان کا سانس لیا۔"
ہم واپس پلیٹ فارم پر آ گئے۔ میں نے پاروتی سے پوچھا۔
"سانپ ایک تھا یا دو؟"
وہ افسوس کے ساتھ بولی۔
"ایک ہی تھا۔ کاش دو تین ہوتے۔ لیکن کافی زہریلا سانپ تھا۔"
میں نے دل میں سوچا کہ شہر میں جانے سے ایک فائدہ تو ضرور ہو گا کہ وہاں کے سارے سانپ ایک ایک کر کے ختم ہو جائیں گے۔ وہاں سے ہم آدھی رات کو ٹرین میں سوار ہوئے اور باقی کی ساری رات اگلا سارا دن اور اس سے اگلی رات کا سفر طے کرنے کے بعد تیسرے دن صبح سویرے ملایا کے سب سے بڑے شہر کوالالم پور پہنچ گئے۔ وہیں اسٹیشن پر ہم نے ناشتہ کیا۔ پاروتی کو سانپوں کی تلاش تھی۔ میں نے اسے کہا۔
"خدا کے لیے اپنے آپ کو کنٹرول میں رکھو۔ یہ شہر ہے یہاں اتنی جلدی سانپ نہیں ملیں گے۔"
یہاں سے ہمیں سمندری جہاز میں سوار ہو کر انڈیا جانا تھا۔ یہ چھ ایک دن کا سمندری سفر تھا۔ اس زمانے میں سمندری جہازوں کی رفتار زیادہ نہیں ہوا کرتی تھی۔ ہمارے پاس کافی رقم تھی جو گاؤں کے ملائی مسلمانوں نے آپس میں چندہ کر کے ہمیں دی تھی۔ ہم نے شہر کے ایک چھوٹے سے غریبانہ ہوٹل میں ایک کمرہ لے لیا۔ ہم نے ایک دوسرے کو میاں بیوی ظاہر کیا۔ میں پاروتی کو ہوٹل میں چھوڑ کر بندرگاہ کی طرف روانہ ہو گیا تا کہ پتہ کروں کہ ہندوستان کو جہاز کس روز روانہ ہوتا ہے۔ معلوم ہوا کہ پرسوں ایک جہاز دو پہر کے بعد روانہ ہونے والا ہے۔ اس کی ٹکٹ بندرگاہ کے ساتھ ہی ایک آفس میں فروخت ہوتے تھے۔ میں نے وہاں سے جہاز کے تھرڈ کلاس کے کوالالم پور سے کلکتے تک کے دو ٹکٹ خرید لیے۔
دن بھر ہم شہر کی سیر وغیرہ کرتے رہے۔ رات کو ہوٹل میں واپس آئے تو پاروتی کا جسم ایک بار پھر ٹوٹ رہا تھا۔ کہنے لگی۔
"تم ہوٹل میں بیٹھو میں باہر جا کر اپنی خوراک تلاش کرتی ہوں۔"
میں نے کہا۔ "پاگل ہو گئی ہو۔ یہ شہر ہے جنگل نہیں۔"
وہ بولی۔ "یہاں باغ بہت ہیں۔ ان علاقوں کے باغوں میں سانپ بچھو اکثر مل جاتے ہیں۔ میں ابھی واپس آ جاؤں گی۔"
اور وہ تیزی سے کمرے سے نکل گئی۔
وہ کوئی دو گھنٹے بعد واپس آئی تو بڑی خوش تھی کہنے لگی۔
"مجھے کافی دور تک جانا پڑا۔ ایک جگہ ربڑ کے درختوں کا ذخیرہ تھا۔ وہاں چار سانپ مل گئے۔ دو میں نے وہیں کھا لیے دو اپنے ساتھ لے آئی ہوں۔"
میں اچھل کر پلنگ پر چڑھ گیا۔
"ان کو یہاں کیوں لے آئی ہو؟"
وہ تیز لہجے میں بولی۔
"کل کیا کھاؤں گی۔ کل کس سے اپنے کو ڈسواؤں گی تم سے؟"
میں چپ ہو گیا۔ اس نے دونوں سانپ اپنی قمیص کے اندر چھپائے ہوئے تھے۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے اس نے دونوں سانپ نکال کر ہاتھوں میں پکڑ لیے۔ دونوں سیاہ رنگ کے ڈیڑھ ڈیڑھ بالشت لمبے سانپ تھے اور پاروتی کے ہاتھوں میں تڑپ رہے

تھے۔ ہوٹل کے کمرے میں ایک چھوٹی میز پر ایک تانبے کا گلاس پڑا تھا۔ پاروتی نے دونوں سانپ میز پر رکھ کر جلدی سے ان کے اوپر گلاس اوندھا رکھ دیا۔
"ہے بھگوان یہاں شہر کے باغوں کے ذخیروں کے سانپ بڑے زہریلے ہیں۔ دیکھو میرے بازو پر ان کے کاٹنے سے خون نکل آیا ہے۔"
وہ مجھے اپنا بازو دکھانے لگی۔ میں نے منہ دوسری طرف کر لیا۔
"خدا کے لیے مجھے یہ منظر نہ دکھاؤ۔"
پاروتی بازار سے ایک چھوٹا سا تھیلا خرید لائی جس کے اوپر زپ لگی تھی۔ زپ سے تھیلا بند ہو جاتا تھا۔ اس نے دونوں سانپ تھیلے میں ڈال کر زپ سے اس کا منہ بند کر دیا۔
"اب دو دن کے لیے میرے پاس میری خوراک جمع ہو گئی ہے۔"
دونوں دن پاروتی نے ایک ایک سانپ پر گزارہ کیا۔ جس روز شام کو ہمیں کوالالم پور سے کلکتے کے لیے روانہ ہونا تھا اس روز سہ پہر کے بعد پاروتی ربڑ کے ذخیروں اور شہر کے غیر آباد علاقوں کی طرف نکل گئی اور تھیلے میں اکٹھے چھ سات سانپ بھر کر لے آئی کہنے لگی۔
"جہاز میں میرے کام آئیں گے۔"
اس زمانے میں سمندری جہاز پر سوار ہوتے وقت سامان کی چیکنگ وغیرہ نہیں ہوتی تھی۔ کسی نے نہ پوچھا اور پاروتی سانپوں کے تھیلے سمیت جہاز پر سوار ہو گئی۔ شام کے وقت جہاز نے بندرگاہ سے لنگر اٹھا دیا۔ اسے ایک بڑا اسٹیمر لوہے کی زنجیر سے کھینچتا ہوا گہرے پانیوں میں لے گیا۔ وہاں جہاز کے انجن اسٹارٹ ہو گئے اور جہاز سمندر میں اپنے سفر پر روانہ ہو گیا۔ جس روز ہم روانہ ہوئے اس روز بھی بارش ہو رہی تھی۔ چنانچہ ہم نے اپر ڈیک کی بجائے لوئر ڈیک میں اپنے بستر لگا لیے تھے۔ سمندر میں کافی تموج تھا۔ ساری رات سارا دن جہاز میں رولنگ ہوتی رہی۔ پاروتی روزانہ دن کے وقت تھیلے میں سے ایک سانپ نکال کر اسے قمیص کے اندر چھپا کر جہاز کے باتھ روم میں ساتھ لے جاتی اور اس سے اپنے آپ کو خوب ڈسوا کر اور اسے ہڑپ کرنے کے بعد منہ ہاتھ دھو کر ہشاش بشاش واپس آ جاتی۔ کوالالم پور سے چلے ہوئے ہم چار دن کے بعد رنگون پہنچے۔
جہاز پورا ایک دن رنگون کی بندرگاہ پر کھڑا رہا۔ یہاں کچھ مسافر اتر گئے اور کچھ سوار ہو گئے۔ ان میں بنگالی مسافروں کی تعداد زیادہ تھی۔ میں بنگلہ زبان بول اور سمجھ لیتا تھا پاروتی تو تھی ہی بنگالن، ہمارے ڈیک پر بھی کچھ بنگالی کنبے اپنا سامان لے کر آ گئے تھے۔ میں نے پاروتی سے کہا کہ ان لوگوں سے زیادہ بے تکلف ہونے کی کوشش نہ کرنا مگر ایک مدت کے بعد اسے اپنے ہم زبان لوگ ملے تھے ایک بنگالی میاں بیوی ہمارے پاس ہی سامان لگا کر بیٹھے تھے۔ پاروتی اس کی بیوی سے بنگالی زبان میں خوب باتیں کرنے لگی۔ یہ بنگالی جوڑا نوجوان ہی تھا مگر زیادہ پڑھا لکھا نہیں تھا۔ پاروتی ان سے خوب گھل مل گئی۔ میں نے سوچا کہ چلو اس کا دل لگا رہے گا۔ اب اسے کچھ دنوں کے بعد تو اپنے ماتا پتا کے پاس پہنچ ہی جانا ہے۔ میں نے بھی سوچ لیا تھا کہ پاروتی کو کلکتے میں اس کے گھر چھوڑ کر میں بھی اپنے پنجاب کی طرف روانہ ہو جاؤں گا۔ مجھے بھی اپنے گھر سے نکلے کافی عرصہ گزر گیا تھا۔ رنگون سے کلکتے پہنچنے میں جہاز نے پورے تین دن لگائے۔ چوتھے روز دن کے وقت جہاز کلکتے کے دریائے ہگلی میں داخل ہو گیا۔ پاروتی اپنے شہر کا ساحل اور ساحل کے درختوں اور اڑتے پرندوں کو دیکھ کر بچوں کی طرح خوش ہو رہی تھی۔ ہم

اوپر والے ڈیک پر جنگلے کے ساتھ لگ کر کھڑے تھے۔ پاروتی کوئی بنگلہ گیت گنگنانے لگی۔ وہ بڑی خوش تھی کہ ایک مدت کے بعد اپنے ماتا پتا کی شکل دیکھے گی۔ میری طرف دیکھ کر بولی۔

''وہ مجھے دیکھ کر کس قدر خوش ہوں گے۔ کیا وہ مجھے پہچان لیں گے؟ کیوں نہیں۔ مجھے میری ماتا جی میرے بابو جی ضرور پہچان لیں گے۔ میں بڑی بدل گئی ہوں نا۔ پہلے میرا رنگ کالا کہاں ہوتا تھا' اب میں بڑی کالی ہوگئی ہوں۔''

میں نے اس کو کہا۔

''پاروتی! اپنے بھگوان کے لیے میری ایک بات مان لو اور گھر پہنچ کر سانپوں کی دوستی چھوڑ دینا۔ ذرا سوچو۔ تمہارے ماتا پتا کو جب پتہ چلے گا کہ تم سانپ کھاتی اور سانپوں سے اپنے آپ کو ڈسواتی ہو تو انہیں کتنا دکھ ہوگا۔''

پاروتی گہری سوچ میں پڑ گئی۔ کہنے لگی۔

''تم شاید ٹھیک کہتے ہو۔ میں گھر جانے کے بعد یہ عادت چھوڑ دوں گی۔''

تیسرے پہر جہاز کلکتے کی خضر پور جیٹی کے ساتھ جا کر لگ گیا۔ ہمارے پاس کوئی سامان تو تھا نہیں۔ بندرگاہ سے نکل کر ایک ٹیکسی لی اور پاروتی نے اسے اپنے محلے کا پتہ بتا کر وہاں چلنے کو کہا۔ جب ہم اس محلے میں پہنچے تو معلوم ہوا کہ پاروتی کے ماتا پتا تو ایک عرصہ ہوا مکان چھوڑ کر جا چکے ہیں۔ پاروتی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور وہ اپنے مکان کی سیڑھیوں پر بیٹھ گئی۔

پاروتی کے مکان میں کوئی دوسرے کرایہ دار آ گئے تھے۔ ہمسایوں میں سے بھی اکثر لوگ وہاں سے جا چکے تھے۔ کسی کو کچھ معلوم نہ تھا کہ پاروتی کے ماں باپ کس شہر میں نقل مکانی کر گئے ہیں۔ پاروتی انتہائی غمزدہ ہو رہی تھی۔ میں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

''شہر میں تمہارا کوئی رشتے دار ہے تو چلو وہاں چل کر پوچھ لیتے ہیں۔ ہو سکتا ہے تمہارے ماتا پتا کا انہیں کچھ علم ہو۔''

پاروتی نے کہا۔ ''شہر میں ہمارا کوئی رشتے دار نہیں ہے۔''

میں بھی بڑی الجھن میں پڑ گیا تھا۔ پاروتی کو میں اتنے بڑے شہر میں اکیلا بھی نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب پاکستان کے قیام کا اعلان ہو چکا تھا اور ہندوستان کے مختلف شہروں میں ہنگامے شروع ہو چکے تھے۔ کلکتہ شہر کی فضا بھی خراب تھی۔ یہ سب کچھ ہمیں وہیں پاروتی کے پرانے محلے کے بنگالی ہندوؤں نے بتایا۔ ایک بنگالی عورت نے پاروتی سے کہا کہ تم درگا ماتا کے مندر میں چلی جاؤ۔ رات وہاں گزار دو۔ صبح اپنے ماتا پتا کا شہر میں کھوج لگانا۔ پاروتی نے وہاں مجھے اپنا خاوند ہی ظاہر کیا تھا اور ظاہر ہے کہ وہ لوگ مجھے بھی ہندو ہی سمجھ رہے تھے۔ بعد میں پاروتی نے مجھے بتایا کہ وہ لوگ بتا رہے تھے کہ ایک روز پہلے ان کے محلے میں دو مسلمان آ گئے تھے۔ محلے کے ہندو بنگالیوں نے ان دونوں کو چھرے مار کر مار ڈالا تھا۔

پاروتی ابھی تک اپنی گلی میں مکان کے باہر بیٹھی ہوئی تھی۔ میں نے اس سے پوچھا کہ اب اس کا کیا ارادہ ہے۔ اس نے اداس آنکھوں سے میری طرف دیکھا اور بولی۔

''تم اپنے وطن جانا چاہتے ہو تو بے شک چلے جاؤ میں کسی نہ کسی طرح زندگی بسر کر لوں گی۔''

میرے دل پر اس جملے کا بڑا اثر ہوا۔ اصل میں مجھے بھی پاروتی کے ساتھ ایک خاص انس سا پیدا ہو گیا تھا۔ آخر ہم اتنی مدت تک مصیبتوں میں ایک دوسرے کے ساتھ رہے تھے۔ اب اس حالت میں چھوڑ کر جانا میں مناسب نہیں سمجھتا تھا۔ میں بھی اس کے پاس ہی بیٹھ گیا۔ میں نے اسے کہا۔

''پاروتی! میں اس حالت میں تمہیں چھوڑ کر نہیں جاؤں گا۔''

''میری خاطر اپنے آپ کو مشکل میں کیوں ڈالتے ہو؟''

میں نے کہا۔ ''بات صرف اتنی سی ہے کہ میں تمہیں بے یار و مددگار نہیں چھوڑنا چاہتا اور کچھ نہیں تو کم از کم کسی اپنے رشتے دار کا ہی ٹھکانہ بتا دو۔ میں تمہیں وہاں چھوڑ آؤں گا۔''

وہ کہنے لگی۔ ''دلی میں میری ایک خالہ رہتی تھی۔ شاید ماتا جی وہاں چلی گئی ہوں۔''

''تو چلو دلی چلتے ہیں۔''

ہم گلی سے نکل کر بازار میں آ گئے۔ پاروتی کہنے لگی۔

''میں کلکتے میں ناگن ماتا کے مندر میں ایک بار درشن کے لیے ضرور جانا چاہتی ہوں تم میرے ساتھ چلو۔''

''یہ ناگن ماتا کا مندر کہاں ہے؟''

''زیادہ دور نہیں ہے۔ میں ایک دو بار وہاں جا چکی ہوں۔ یہاں سے رکشا لیتے ہیں۔''

ناگن ماتا کا مندر کلکتہ شہر کے شمالی مضافات میں بانس اور ناریل کے جھنڈوں کے پاس ایک ندی کے کنارے پر تھا۔ ایسا ہی مندر تھا جیسا کہ بنگال میں ہندوؤں کے مندر ہوتے ہیں۔ کافی ہندو مرد عورتیں وہاں نظر آ رہی تھیں۔ مندر کے بڑے دروازے پر ایک سانپ کا مجسمہ لگا تھا جس کا نچلا دھڑ سانپ کا اور اوپر والا دھڑ عورت کا تھا۔ پاروتی نے بتایا کہ یہ ناگن ماتا کی مورتی ہے۔ مجھے اس کی ناگن ماتا سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ میں صرف یہ چاہتا تھا کہ پاروتی کو اس کے رشتے داروں کے پاس پہنچا کر اپنے شہر میں امرتسر کی طرف روانہ ہو جاؤں۔ مجھے یہ اطمینان ضرور ہونا چاہیے تھا کہ پاروتی محفوظ جگہ پر پہنچ گئی ہے۔ میرا اس کا اتنی دیر کا ساتھ تھا ہم نے بڑے مصیبتوں کے دن دیکھے تھے۔ یہ ناممکن تھا کہ میں اسے بے یار و مددگار چھوڑ کر چلا جاتا۔

پاروتی نے مجھے ہندو ظاہر کیا ہوا تھا۔ وہ مجھے اپنے ساتھ مندر میں لے گئی۔ وہاں اسے ایک جوگن عورت ملی۔ اس نے دور سے پاروتی کو دیکھا تو اس کے پاس آ گئی۔ عمر چالیس سے اوپر ہوگی۔ رنگ اس کا بھی کالا تھا۔ بال کھلے تھے۔ ماتھے پر سرخ تلک لگا تھا۔ گیروی ساڑھی پہن رکھی تھی۔ اس نے پاروتی کے کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بنگلہ زبان میں کہا۔

''میا! میرے ساتھ چل تجھے ناگن ماتا کا آشیرباد دلاؤں۔''

پاروتی نے مجھے ایک طرف بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود اس جوگن کے ساتھ مندر کے بڑے کمرے میں داخل ہو گئی۔ میں ایک طرف درخت کے نیچے چھوٹے سے چبوترے پر بیٹھ گیا۔ کافی دیر کے بعد پاروتی واپس آئی۔ وہ بڑی خوش نظر آ رہی تھی۔ میں نے سمجھا کہ شاید اسے اپنی ماتا پتا کا ٹھکانہ معلوم ہو گیا ہے۔ میرے پاس آئی تو میں نے پوچھا۔

''یہ جوگن کون تھی؟ کیا اس نے تمہیں تمہارے ماتا پتا کے بارے میں کچھ بتایا ہے؟''

پاروتی نے میرا ہاتھ پکڑا اور مجھے ایک طرف لے گئی۔ کہنے لگی۔

''تمہیں ایک راز کی بات بتانا چاہتی ہوں۔ مگر یہاں نہیں۔ اس طرف آ جاؤ۔ ان درختوں کے نیچے

چل کر بیٹھتے ہیں۔"
کچھ فاصلے پر گھاس کا چھوٹا سا قطعہ تھا جہاں ناریل اور املی کے درختوں نے چھاؤں ڈال رکھی تھی۔ کلکتے کا آسمان اس روز ابر آلود تھا۔ ہم ان درختوں کے نیچے جا کر بیٹھ گئے۔
"اب بتاؤ وہ راز کی بات کیا ہے؟"
راز کی بات جو مجھے پاروتی نے بتائی وہ بڑی ہیبت ناک اور ناقابل یقین تھی۔ جوگن جو پاروتی کو مندر میں لے گئی تھی ناگن ماتا کی بھکشنی تھی۔ اس نے پاروتی کو دیکھتے ہی پہچان لیا تھا کہ یہ لڑکی سانپوں سے اپنے آپ کو ڈسواتی ہے اور سانپ کھاتی ہے اور ایک عرصہ سے یہ کام کر رہی ہے۔ اس نے پاروتی کے آگے ایک حیرت انگیز انکشاف کیا۔ اس نے پاروتی سے کہا کہ تم اپنی طاقت سے بے خبر ہو۔ تم ایک مدت سے سانپ سے ڈسوا رہی ہو اور سانپ کھا رہی ہو۔ تم کو معلوم نہیں کہ برما کے جنگلوں میں میں نے بے خبری میں ایک ایسا سانپ مار کر کھا لیا تھا جو ناگن ماتا کے دشمن قبیلے کا سب سے بڑا سانپ تھا اور جس کا نام پدم گری سانپ تھا۔ اس سانپ نے تمہارے خون میں ایک ایسی طاقت پیدا کر دی ہے کہ اگر تم تین راتیں ایک خاص چلہ کرو تو ناگ ماتا کی کرپا سے تمہارے اندر ایسی شکتی آ جائے گی کہ تم جس وقت چاہو انسان سے ناگن کا روپ دھار سکو گی اور ناگن سے انسان کی شکل میں بھی واپس آ سکو گی......
جوگن نے پاروتی کو یہ بھی بتایا کہ چونکہ تم نے ناگن ماتا کے دشمن سانپ کو ہلاک کر کے کھایا تھا اس وجہ سے ناگن ماتا تم سے بہت خوش ہے اور تین راتوں کا چلہ کاٹنے کے بعد وہ تمہیں درشن بھی دے گی اور تمہیں انسان سے ناگن اور دوبارہ انسان کا روپ اختیار کرنے کی شکتی بھی دے دے گی۔
جب پاروتی مجھے ساری رام کہانی سنا چکی تو میں نے مذاق میں کہا۔
"پاروتی! اس کا مطلب ہے کہ اب تم خود سانپ بننے والی ہو۔ دیکھنا سانپ بن کر کہیں مجھے نہ ڈس لینا۔"
پاروتی نے کہا۔
"تم اسے مذاق مت سمجھو۔ جوگن میا نے جو کچھ کہا ہے وہ سچ بھی ہو سکتا ہے۔ ذرا سوچو اگر مجھے یہ طاقت مل گئی کہ میں جب چاہے انسان سے ناگن اور ناگن سے دوبارہ انسان بن جاؤں تو میری زندگی میں کتنا بڑا انقلاب نہیں آ جائے گا۔ میں دنیا کی سب سے انوکھی عورت بن جاؤں گی۔ کیونکہ آج تک ایسی عورت کسی نے نہ دیکھی ہو گی۔"
مجھے اس کی باتوں پر ذرا بھی یقین نہیں آ رہا تھا لیکن مجھے اس کی خوشنودی منظور تھی۔ میں نے سر کھجاتے ہوئے کہا۔
"اچھا یہ بتاؤ کہ تم نے کیا فیصلہ کیا ہے؟"
پاروتی بولی۔ "میں ناگن ماتا کے مندر میں تین راتوں کا چلہ کاٹوں گی۔"
میں نے کہا۔ "ٹھیک ہے، اگر تمہاری خوشی اسی میں ہے تو چلہ کاٹ کر دیکھ لو۔ میں اتنی دیر اپنے دوست کے ہاں چلا جاؤں گا اس کا فلیٹ لوئر چت پور روڈ پر ہے۔"
پاروتی نے میرے بازو کو تھام کر اپنا سر میرے ساتھ لگا دیا۔
"تم میرے سچے دوست ہو۔ بس میں آج رات ہی سے چلہ شروع کر دوں گی۔ جوگن میری مدد کر دے گی۔"
میں نے اسے کہا۔
"ذرا ہوشیار رہنا۔ کہیں یہ اس جوگن عورت کی کوئی چال نہ ہو۔ کہیں یہ بھی سنتھالی سپیروں کی کوئی پھوپی خالہ نہ ہو۔"
پاروتی نے گردن اونچی کر کے کہا۔
"اب میں وہ بیوقوف بھولی بھالی پاروتی نہیں ہوں۔ میں سنتھالی سپیروں کے پورے خاندان کو ختم کر سکتی ہوں۔ مجھے کوئی سپیرا ہاتھ لگا کر تو دیکھے......"
میں پاروتی کو مندر میں چھوڑ کر لوئر چت پور روڈ اپنے پرانے دوست جان کے پاس آ گیا۔ وہ مجھے حیران ہو کر دیکھنے لگا۔
"تم اتنا عرصہ کہاں غائب رہے؟"
میں نے کہا۔ "بمبئی میں تھا اور کہاں جاتا۔ بھئی ایکٹر بننے گیا تھا۔ اتنی مدت مارا مارا پھرتا رہا۔ کام نہ بنا۔ واپس آ گیا۔"
"اب کیا ارادہ ہے؟ یہاں کلکتے میں تو فضا بڑی خراب ہو رہی ہے۔ پاکستان بن گیا ہے۔ میں تو پاکستان چلا جاؤں گا۔"
میں نے کہا۔ "میں بھی پاکستان چلا جاؤں گا۔"
جان نے کہا "بالکل ٹھیک ہے۔ بمبئی وغیرہ کی طرف مت جانا۔ وہاں بھی فسادات شروع ہو گئے ہیں۔ پنجاب میں تو بڑے زبردست فسادات ہو رہے ہیں۔ میرا خیال ہے ہم یہاں سے رنگون چلے چلیں گے وہاں سے کسی سمندری جہاز میں بیٹھ کر کراچی پہنچ جائیں گے۔"
میں نے کہا۔ "یہ بالکل صحیح پروگرام ہے۔ میں تمہارے ساتھ ہوں۔ کب پاکستان چلنے کا ارادہ ہے؟"
میں نے دل میں سوچ رکھا تھا کہ تین راتیں چلہ پورا کرنے کے بعد میں پاروتی کو لے کر اس کے رشتے داروں کے پاس دلی پہنچا دوں گا اور جس طرح بھی ہو سکے گا خود دلی سے پاکستان پہنچ جاؤں گا۔ اپنے دوست کو میں نے یہ سب بالکل نہیں بتایا تھا۔ اس لیے میں اس کی ہاں میں ہاں ملائے جاتا تھا۔
تین راتیں میں نے اپنے دوست کے فلیٹ پر گزاریں۔ تین راتیں پاروتی ناگن ماتا کے مندر میں چلہ کاٹتی رہی۔ اس نے مجھے کہہ دیا کہ میں اس دوران مندر میں نہ آؤں۔ مجھے مندر میں جانے کی کوئی ضرورت ہی نہیں تھی۔ ویسے بھی مندر کی گھٹی گھٹی تنگ فضا میں ہمیشہ مجھے دم گھٹتا محسوس ہوتا تھا۔ ہندوؤں کے مندر تنگ گھٹے ہوئے اور حبس آلود ہوتے ہیں۔ تنگ کوٹھڑیاں تنگ راہ داریاں اور نیچی نیچی چھتیں اور فضا میں پھیلی ہوئی لوبان کی تیز بو...... جب کہ مسلمانوں کی عبادت گاہیں فراخ کشادہ اور کھلی ہوتی ہیں۔ اس سے دونوں قوموں کے کردار کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔
تین راتوں کے بعد صبح کے وقت میں ناگن والے مندر میں گیا۔ پاروتی نے مجھے جس جگہ بیٹھ کر انتظار کرنے کو کہا تھا میں وہاں بیٹھ گیا۔ میں نے پاروتی کو اپنی طرف آتے دیکھا۔ پہلی نظر میں میں نے اسے بالکل نہیں پہچانا۔ اس نے گیرے رنگ کی ساڑھی پہنی ہوئی تھی۔ سر کے بال شانوں پر کھلے تھے۔ ہاتھ میں گیندے کے پھولوں کا ہار تھا۔ قریب آئی تو میں نے اسے پہچانا۔ وہ میری طرف دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ میں نے پوچھا۔
"چلہ کاٹ لیا پاروتی؟"
وہ میرے سامنے گھاس پر بیٹھ گئی۔ اس کی آنکھوں میں ویسے تو ہر وقت ایک خاص قسم کی خوفناک سی چمک رہا کرتی تھی، مگر اس وقت اس کی آنکھیں ہلکی ہلکی سرخ بھی ہو رہی تھیں۔ اس نے میرے ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اس کا ہاتھ گرم تھا۔ کہنے لگی۔
"میرا چلہ کامیاب رہا۔"

"کیا مطلب؟ یعنی اب تم انسان سے ناگن اور ناگن سے انسان بن سکتی ہو؟"

میں نے ہنستے ہوئے پوچھا۔ پاروتی نے میرا ہاتھ چھوڑ دیا۔

"تم مجھے بہت عزیز ہو۔ تم نے ہر مصیبت میں میرا ساتھ دیا ہے۔ میں تمہارے کردار کی عظمت سے بڑی متاثر ہوئی ہوں۔ واقعی مسلمان کے کردار میں ایک خاص شرافت اور عظمت ہوتی ہے۔ جس کا مجھے تمہارے ساتھ رہ کر تجربہ ہوا ہے۔ میں جانتی ہوں جب ت مجھے انسان سے سانپ اور سانپ سے واپس انسان بنتے دیکھو گے تو اسے بھی شعبدہ بازی ہی سمجھو گے۔ یقین کرو یہ شعبدہ بازی ہی ہوگی لیکن عام آدمی کے لیے یہ ایک حقیقت ہوگی۔ یہ علم جس کے منتروں کا جاپ کرکے میں نے انسان سے ناگن بن جانے کی شکتی حاصل کی ہے شیطانی علم ہے۔ شیطان اس علم کی مدد سے انسانوں کو گمراہ کرتا ہے اور خدا سے انہیں دور رکھنے کی کوشش کرتا ہے یوں سمجھ لو کہ میں اس علم کی طاقت کرنے کے ساتھ ہی شیطان کے گروہ میں شامل ہوگئی ہوں۔ اتنا ضرور ہے کہ میرے اندر جو انسانیت ہے اس کا احساس زندہ ہے اور ناگن بن کر بھی زندہ رہے گا۔"

میں نے پاروتی کی باتیں سن کر کہا۔

"پاروتی! تم کبھی کبھی سچائی کی باتیں کرتی ہو۔ تم بہت تھوڑی ہندو ہو۔ زیادہ مسلمانہ و۔ پھر تم پوری مسلمان کیوں نہیں ہو جاتی؟"

پاروتی زمین کو تکنے لگی۔ پھر میری طرف آنکھیں اٹھا کر دیکھا اور بولی۔

"بہت ممکن ہے ایسا وقت بھی آ جائے۔ لیکن ابھی مجھے شیطان کے ساتھ رہ کر اس کی شکتی کی مدد سے اپنے دشمنوں سے بدلہ لینا ہے۔ اپنے ماتا پتا کا سراغ لگانا ہے۔ اس کے بعد مجھے لگتا ہے کہ میرا راستہ وہی ۳ ہوگا جس پر تم چل رہے ہو۔"

میرے دل میں پاروتی کے لیے مزید احترام کے جذبات پیدا ہوگئے۔ اس لڑکی نے فلسفے کی کتابیں نہیں پڑھی تھیں جتنی زندگی اس نے بسر کی تھی ساری کی ساری دکھوں مصیبتوں اور درد و الام سے بھری ہوئی تھی۔ ان مصیبتوں اور آفتوں نے پاروتی کو ایسا علم سکھا دیا تھا جس نے اس کے دل کے ایک کونے کو ضرور روشن کر دیا تھا۔ یہی روشنی ایک دن پاروتی کے سارے دل کو روشن کرنے والی تھی۔ یہ وہ عورت تھی جو مرنے کے لیے جنوبی بنگال کے جنگلوں میں اکیلی چھوڑ دی گئی تھی۔ جس کے جسم کو سانپوں نے کاٹ کاٹ کر زہر بنا دیا تھا مگر اس عورت کے اندر زندہ رہنے اور بہتر زندگی بسر کرنے کی جو تڑپ تھی اور س تڑپ نے اس کے ارادوں کو جو طاقت دی تھی اسے کوئی بھی نہ مار سکا تھا۔ یہی وہ طاقت اور توانائی تھی جو پاروتی کو ایک نئی زندگی کی نئی منزل کی طرف لیے جا رہی تھی۔

میں نے پاروتی کو چھیڑتے ہوئے کہا۔

"چلو اب انسان سے سانپ بن کر دکھاؤ۔"

پاروتی ایک لمحہ کے لیے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مجھے گھورتی رہی۔ اس کی آنکھوں میں واقعی ایک نئی مقناطیسی کشش پیدا ہوگئی تھی۔

"یہاں نہیں...... میرے ساتھ مندر کے پیچھے آؤ۔"

وہ مجھے لے کر مندر کے پیچھے آ گئی۔ یہاں چھوٹا سا تالاب تھا۔ پتھر کی سیڑھیاں تالاب کی سطح تک جاتی تھیں۔ تالاب کے کونے میں ایک برجی تھی۔ اس برجی کے ساتھ اونچی اونچی جھاڑیاں اگی ہوئی تھیں۔ دن کا وقت تھا مگر اس طرف دور دور تک کوئی انسان نظر نہیں آتا تھا۔ پاروتی نے ان جھاڑیوں کے درمیان مجھے اپنے سامنے بٹھا لیا۔

"مجھے عورت سے سانپ بنتے دیکھ کر تم ڈر تو نہیں جاؤ گے؟"

میں نے کہا۔ "ڈروں گا شاید نہیں مگر حیران ضرور ہوں گا لیکن پہلے تم سانپ تو بنو۔"

پاروتی کہنے لگی۔

"ایک بات یاد رکھنا جس وقت میں ناگن کے روپ میں ظاہر ہوگئی تو میں تمہاری بات تو سن لوں گی لیکن تم میری بات نہ سمجھ سکو گے کیونکہ میں اس وقت سانپوں کی زبان میں ہی با کر سکوں گی۔"

"کیا سانپوں کی بھی کوئی اپنی زبان ہوتی ہے؟"

پاروتی مسکرائی۔

"سانپ ہلکی ہلکی سسکاروں اور دھیمی دھیمی پھنکاروں کی زبان میں ایک دوسرے سے بات کرتے ہیں۔ اگر ہم کچھ دیر اور ایک دوسرے کے ساتھ رہے تو میں تمہیں یہ زبان بھی سمجھا دوں گی...... لو...... اب مجھے ناگن کے روپ میں دیکھنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔"

میرے دل میں یہ خیال بھی تھا کہ پاروتی مجھے بے وقوف بنا رہی ہے۔ یہ خیال بھی آ جاتا تھا کہ اس کے پاس کوئی شیطانی منتر آ گیا ہے اور شیطان کئی شکلیں بدل کر انسانوں کے سامنے ظاہر ہو جایا کرتا ہے۔ ہو سکتا ہے یہ انسان سے سانپ بن جائے۔ بے یقینی اور بے یقینی کے عالم میں پاروتی کے سامنے بیٹھا اسے دیکھ رہا تھا۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ وہ جوگیوں کی طرح آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئی اور منہ ہی منہ میں کسی منتر کا جاپ شروع کر دیا۔

آج بھی جب میں یہ سطریں لکھتے ہوئے اس وقت کو یاد کرتا ہوں تو یقین نہیں آتا کہ جو کچھ دیکھا وہ واقعی وقوع پذیر ہوا ہو۔ میرا خیال ہے کوئی تین چار منٹ تک پاروتی منہ ہی منہ میں منتروں کا جاپ کرتی رہی۔ پھر اس کا جسم آگے پیچھے اور دائیں بائیں آہستہ آہستہ ہلنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد اس کے منہ سے سسکاریوں ایسی آوازیں نکلنے لگیں۔ سچ کہہ رہا ہوں میں خوف زدہ ہوگیا۔ سوچا اٹھ کر بھاگ جاؤں۔ پھر خیال آیا کہ یہ ہندو لڑکی کیا کہے گی کہ میں مسلمان کا بچہ ہو کر ڈر کے مارے بھاگ گیا۔ میں اپنی جگہ پر بیٹھا رہا۔ بمشکل مزید ایک منٹ گزرا ہوگا کہ پاروتی کے حلق سے پھنکار کی آواز نکلی اور وہ غائب ہوگئی۔ میں جلدی سے پیچھے ہٹ گیا۔ کیونکہ جس جگہ پر وہ بیٹھی ہوئی تھی اب وہاں سیاہ رنگ کا ایک سانپ کنڈلی مارے، پھن کھولے بیٹھا جھوم رہا تھا۔ خوف کے مارے ایک بار تو میرا حلق خشک ہوگیا۔ مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا مگر سب کچھ میری آنکھوں کے سامنے ہوا تھا۔ ایک عورت میری آنکھوں کے سامنے غائب ہوگئی تھی اور اس کی جگہ سانپ آ گیا تھا۔ سانپ آہستہ آہستہ دائیں بائیں پھن لہرا رہا تھا اور اپنی دو شاخہ زبان بار بار باہر نکال رہا تھا۔ میں نے بڑی مشکل سے اپنے آپ کو یہ کہہ کر سنبھالا کہ ممکن ہے یہ پاروتی کے شیطانی منتروں کا اثر ہو اور ان منتروں نے میری نظر بندی کر دی ہو۔ کیونکہ بہرحال دنیا میں جادو ٹونا تو اپنی جگہ پر موجود ہے اور سفلی عمل سے دوسروں کی نظر بندی بھی لوگ کرتے ہیں۔ میں نے ہمت کرکے سانپ کی طرف گھور کر دیکھا اور پوچھا۔

"پاروتی! کیا یہ تم ہو؟"

میرے سامنے کنڈلی مار کر بیٹھے ہوئے سانپ نے آگے پیچھے پھن کو یوں ہلایا جیسے کہہ رہا ہو۔ ہاں میں ہی پاروتی ہوں۔ میں نے گھبراہٹ میں کہا۔

"پاروتی انسانی شکل میں واپس آ جاؤ مجھے یقین

آ گیا ہے۔"
میں نے ابھی پلک بھی نہیں جھپکی تھی کہ میرے سامنے سانپ کی جگہ پاروتی بیٹھی تھی۔ وہ مسکرا رہی تھی۔ کہنے لگی۔
"جو کچھ تم نے دیکھا ہے یہ چلتر ہے۔ نرگ ودیا ہے جس کو تم شیطانی عمل کہا کرتے ہو۔"
وہ اٹھ کر میرے دائیں جانب آ کر بیٹھ گئی۔
"جانتے ہو یہ سب نظروں کی شعبدہ بازی ہے میرا یہ وشواش ہے کہ میں انسانی روپ میں ہی تھی لیکن دیکھنے والوں کو ناگن دکھائی دے رہی تھی۔ تمہاری جگہ اگر کوئی خدا کا باعمل بزرگ بندہ ہوتا تو وہ مجھے انسانی روپ میں ہی دیکھتا ہم تم دنیا دار ہیں۔ اور مایا کے جال میں پھنسے ہوئے ہیں۔ ہم چیزوں کو ان کی اصلی شکل میں نہیں دیکھ سکتے۔"
میں نے محسوس کیا کہ پاروتی کی روح میں ایک نئی بیداری ایک نیا شعور پیدا ہو رہا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا۔
"تم نے انسان سے ناگن بننے کی شکتی بہرحال حاصل کرلی ہے۔ اب تمہارا کیا پروگرام ہے؟"
پاروتی نے کہا۔ "میں اپنی اس شکتی سے اپنے ان دشمنوں سے بدلہ لینا چاہتی ہوں جنہوں نے مجھے اغوا کیا۔ میری زندگی کو جہنم بنایا اور میرے گھر کو تباہ کیا اور میرے ماتا پتا کو مجھ سے جدا کردیا لیکن سب سے پہلے میں اپنے ماتا پتا کی تلاش میں دلی جانا چاہتی ہوں۔ وہاں امار پور نام کی ایک آبادی ہے جہاں بھی میری خالہ رہا کرتی تھیں ہوسکتا ہے میرے ماتا پتا وہیں ہوں۔"
میں نے کہا۔ "تو پھر ہم آج ہی دلی کی کوئی ٹرین پکڑ لیتے ہیں۔"
پاروتی کہنے لگی۔ "تمہارے پاس ٹکٹ کے پیسے ہوں گے؟ میرے پاس تو اب کچھ بھی نہیں بچا۔"
میں نے جیب میں سے ساری رقم نکال لی۔ یہ کل پندرہ روپے دس آنے تھے۔ اگرچہ اتنے پیسے اس زمانے میں بڑی رقم ہوا کرتی تھی۔ لیکن پاروتی نے کہا۔
"میرے اندر جو نئی طاقت پیدا ہوئی ہے اس کی وجہ سے مجھے دوسری کئی چھوٹی چھوٹی طاقتیں بھی حاصل ہوگئی ہیں۔ مثال کے طور پر میں سانپوں کی زبان بول سکتی ہوں اور سمجھ سکتی ہوں۔ میں سانپوں پر حکم چلا سکتی ہوں۔"
پاروتی مسکرائی، کہنے لگی۔
"تم نے ضرور سن رکھا ہوگا کہ زمین کے اندر جو خزانہ دفن ہوتا ہے اس پر ایک سانپ بیٹھا ہوتا ہے جو خزانے کی حفاظت کرتا ہے۔"
"ہاں...... کہانیوں میں پڑھا تھا۔" میں نے بے نیازی سے کہا۔
پاروتی کہنے لگی۔ "میں اس خزانے کے سانپ پر بھی حکم چلا سکتی ہوں۔ میں اسے حکم دے سکتی ہوں کہ خزانے میں سے کوئی ہار کوئی قیمتی ہیرا یا سونے کی اشرفیاں مجھے لا کر دے اور وہ اسی وقت مجھے لا دے گا۔"
میں نے ہلکا سا قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔
"پاروتی! تم الف لیلیٰ کی کہانیوں کی باتیں کرنے لگی ہو۔ یہ سب خیالی باتیں ہیں۔"
وہ سنجیدہ ہوگئی۔ مجھے بازو سے پکڑ کر اٹھایا اور اپنے ساتھ مندر کے دروازے کی طرف چلاتے ہوئے بولی۔
"میرے ساتھ دریا پر چلو۔ وہاں ایک پرانے محل کا کھنڈر ہے۔ ماتا جی کہا کرتی تھیں کہ یہ کسی سورج بنسی خاندان کے راجہ کا محل ہوا کرتا تھا۔ ہوسکتا ہے اس محل کے کھنڈر میں کوئی خزانہ دفن ہو۔"

میں نے دل میں کہا کہ چلو یہ تماشہ بھی دیکھ لیتے ہیں۔ کلکتے کے شمال کی جانب دریائے جمنا بہتا ہے جس کو وہاں دریائے ہگلی کہتے ہیں۔ ہم ٹرام کار میں بیٹھ کر دریا کی طرف چل دیئے۔
دریائے ہگلی کے کنارے ایک کھنڈر تھا جس کی شکستہ دیواروں پر گھاس اگ رہی تھی۔ ایک بھی چھت سلامت نہیں تھی۔ جگہ جگہ پتھروں اینٹوں کے ڈھیر پڑے تھے۔ گلہریاں ادھر ادھر پھر رہی تھیں۔ یہ سورج غروب ہونے کا وقت تھا۔ کلکتہ شہر کے آسمان پر دن کی روشنی مغرب کی طرف سمٹتے ہوئے نارنجی رنگت اختیار کر رہی تھی۔ پاروتی میرے ساتھ چلتی کھنڈر کے پاس آ کر کھڑی ہوگئی۔
"یہی کبھی راجہ کا محل تھا۔"
"اب تو یہاں سوائے اینٹ پتھر اور سوکھی گھاس کے اور کچھ بھی نہیں ہے۔ یہاں کہاں سے خزانہ ملے گا۔"
پاروتی بولی۔
"ایسی جگہوں پر ہی خزانے ہوا کرتے ہیں، چلو کھنڈر کے اندر چلتے ہیں۔"
ہم کھنڈر کی چار دیواری میں آ گئے۔ وہاں کافی جھاڑ جھنکاڑ تھا۔
میں نے کہا۔ "یہاں کہیں سے کوئی سانپ بچھو نکل آیا تو میں تو مارا جاؤں گا۔" پاروتی نے کہا۔
"میرے ہوتے ہوئے کسی سانپ بچھو کی مجال ہے کہ تمہیں کچھ کہے۔"
وہ جھک کر فضا میں کچھ سونگھتے ہوئے قدم قدم آگے بڑھ رہی تھی۔ ایک جھاڑی کے پاس جا کر اس نے جلدی سے اندر ہاتھ ڈالا اور جب ہاتھ باہر نکالا تو اس کے ہاتھ میں نسواری رنگ کا سانپ بل کھا رہا تھا اور اس کی کلائی پر ڈس رہا تھا۔ پاروتی سانپ کو اسی طرح پکڑے کھڑی رہی۔ جب سانپ نے کلائی پر ڈستے ڈستے تھک کر گردن نیچے ڈال دی اور پاروتی نے میری طرف دیکھ کر کہا۔
"منہ دوسری طرف کرلو۔"
میں نے منہ دوسری طرف کرلیا۔ جب تھوڑی دیر بعد گردن گھما کر پاروتی کو دیکھا تو اس کے ہاتھ میں سانپ نہیں تھا۔ کہنے لگی۔
"اس کا گوشت کڑوا تھا۔"
میں نے اسے ہاتھ جوڑ کر کہا۔
"خدا کے لیے آئندہ میرے سامنے یہ مکروہ حرکت نہ کرنا۔"
پاروتی نے میری بات کی طرف کوئی دھیان نہ دیا اور جھکے جھکے قدم قدم جھاڑیوں اور پتھر کے ڈھیروں میں آگے بڑھتی رہی۔ میں اپنی جگہ پر کھڑا رہا۔ وہ پتھروں کی ڈھیری کے پاس جا کر رک گئی۔ جھک کر پتھروں کو سونگھا۔ گردن اٹھا کر کہنے لگی۔
"یہاں آؤ، یہاں کوئی خزانہ دفن ہے۔ مجھے خزانے کے سانپ کی بو آ رہی ہے۔"
میں نے خیال کیا کہ یہ بھی نظر بندی کا کوئی کھیل ہوگا۔ آج کل کہاں دفن شدہ خزانے ملتے ہیں۔ میں نے کندھے سکیڑتے ہوئے صاف صاف کہہ دیا۔
"اگر یہاں تمہیں خزانے کا شبہ ہے تو پھر خود ہی زمین کھودو۔ میں یہ مزدوری نہیں کرسکتا۔"
پاروتی مسکرانے لگی۔
"ہمیں زمین کھودنے کی کیا ضرورت ہے؟"
"تو پھر تمہیں جو خزانہ نظر آ رہا ہے وہ باہر کون لائے گا؟ تمہارا تایا یا ابا؟"
"تمہیں ابھی تماشہ دکھاتی ہوں۔"
یہ سب کچھ مجھے اب تماشہ ہی لگتا تھا۔ ہوسکتا ہے آپ بھی اسے تماشہ ہی خیال کرنے لگے ہوں لیکن

ایک بات ضرور ہے' اس دنیا میں جہاں ہم آپ رہ رہے ہیں بعض اوقات ایسے واقعات رونما ہو جاتے ہیں کہ انسانی عقل حیران کھڑی رہ جاتی ہے۔ ہم نے اپنی دنیا اور اس دنیا کے معمولات کو چند اصولوں اور ضابطوں میں تقسیم کر رکھا ہے جنہیں ہم حقائق کہتے ہیں۔ ہم ہر واقعے کو حقائق کے اصولوں پر پرکھتے ہیں جو ہمارے ان ضابطوں اور حقائق کے خود ساختہ اصولوں کے منافی ہوتا ہے تو ہم حیران ہو کر ایک دوسرے کا منہ تکنے لگتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کائنات میں ایسے ایسے سربستہ راز ہیں کہ جن کی بابت ہمیں علم تو کیا ان کا وہم وگمان تک نہیں ہے۔ قدرت نے ہمیں بہت کچھ دے کر بہت کچھ ہم سے چھپا لیا ہے۔ ہم اپنی طرف سے قدرت کے اسرار کا ایک پردہ اٹھا کر بڑے خوش ہوتے ہیں کہ ہم نے نیچر کو تسخیر کر لیا ہے۔ ہمیں کیا معلوم کہ قدرت کی سٹیج پر ایک پردہ اٹھتا ہے تو پیچھے ایک پردہ گر بھی جاتا ہے۔ آج انسان ہوا میں اڑ رہا ہے کل تک ہوا میں اڑنے والے کو جادوگر یا بھوت پریت سمجھا جاتا تھا۔ کل کا جادو' کل کا طلسم آج کی سائنس بن کر ترقی کی منزلیں طے کر رہا ہے۔ آج صرف جن بھوت غائب ہوتے ہیں' کیا معلوم کل انسان بھی غائب ہونا سیکھ جائیں اور جس طرح فیکس مشین میں ڈالی گئی تحریر ایک سیکنڈ میں ہزاروں میل کا سفر طے کر کے دوسرے براعظم کے شہر میں لگی فیکس مشین میں ظاہر ہو جاتی ہے اس طرح ہو سکتا ہے کل انسان بھی اسی طرح ایک شہر سے غائب ہو کر دوسرے شہر میں پہنچ جائے۔

پاروتی پتھروں کے پاس بیٹھ گئی۔ میں ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ آسمان پر شام کی نارنجی روشنی آہستہ آہستہ قرمزی ہونے لگی تھی۔ پاروتی نے منہ ہی منہ میں کوئی منتر پڑھا اور پھر اس کے منہ سے سسکاریوں کی آوازیں نکلنے لگیں۔ میں سمجھ گیا کہ وہ سانپوں کی زبان میں خزانے کے سانپ سے مخاطب ہے۔ یہ بات آپ کو بھی بڑی عجیب لگے گی اور اس وقت مجھے بھی بڑی عجیب لگی تھی کہ ایک انسان سانپ سے باتیں کر رہا ہے لیکن جیسا کہ میں نے پہلے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے میں اب بھی یہی کہوں گا کہ سائنس کی بدولت وہ زمانہ بھی ضرور آ جائے گا جب انسان جانوروں کی بولیوں اور جانور انسانوں کی زبان سمجھنے لگیں گے۔

پاروتی کوئی پندرہ سیکنڈ تک چھوٹی چھوٹی سسکاریوں کی کوڈ زبان میں کچھ بولتی رہی پھر میری طرف متوجہ ہو کر بولی۔

"میں نے تمہیں غلط نہیں کہا تھا۔ نیچے ایک خزانہ موجود ہے۔ میں نے خزانے کے سانپ سے کہا ہے کہ وہ میرے لیے خزانے میں سے کوئی بھی چیز منہ میں ڈال کر لے آئے۔"

میں اس کے پاس بیٹھ گیا۔

"بھلا دیکھتا ہوں تمہارا خزانے والا سانپ زمین کے اندر سے کیا لاتا ہے۔"

میں بالکل صاف صاف بیان کر دوں گا' مجھے پاروتی کی باتوں پر آدھا یقین اور آدھی بے یقینی تھی۔ یا یوں سمجھ لیں کہ پورا پورا یقین بھی تھا اور پوری پوری بے یقینی بھی تھی۔ کبھی خیال آتا کہ ایسا کبھی نہیں ہو سکتا' کبھی خیال آتا کہ ہو سکتا ہے ایسا ہو بھی جائے۔ اب تو مجھے پورا پورا یقین ہو گیا ہے کہ اس دنیا میں ہر چیز ممکن ہے' میں نے پاروتی سے کہا۔

"پتھر ہٹا کر سانپ کے لیے راستہ بنا دیتے ہیں۔"

پاروتی نے مجھے منع کیا۔

"نہیں' اس کی ضرورت نہیں ہے۔ سانپ اپنے لیے راستہ خود بنا لے گا۔"

پھر میری آنکھوں نے ایک سفید سانپ کو دیکھا جس کی جلد شیشے کی طرح چمک رہی تھی۔ وہ پتھروں کے درمیان سے باہر نکل کر پاروتی کے سامنے کنڈلی مار کر بیٹھ گیا۔ میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ سانپ کے منہ میں سونے کی چھوٹی سی لڑی تھی جس میں ایک سرخ رنگ کا نگ چمک رہا تھا۔ پاروتی نے سونے کی لڑی سانپ کے منہ سے نکال کر اسے غور سے دیکھا۔ پھر سانپ کی زبان میں سی سی کر کے اس سے دو تین باتیں کیں۔ سانپ جدھر سے آیا تھا ادھر ہی کو واپس چلا گیا۔ اس نے سونے کی لڑی مجھے دکھائی۔

"دیکھو۔ یہ سونے کی ہے' اس میں یہ عقیق بھی لگا ہوا ہے۔ یہ ضرور بڑا قیمتی ہو گا۔"

سرخ رنگ کا عقیق انگوٹھے کے سائز کا تھا اور شام کی روشنی میں اس میں سے شعاعیں نکلتی محسوس ہو رہی تھیں۔ میں نے کہا۔

"یہ تو ہمیں بازار میں لے جا کر بیچنا پڑے گا کہیں ہمیں پولیس چوری کے شبے میں نہ پکڑ لے۔ اچھا تھا کہ تمہارا سانپ خزانے میں سے سونے کی اشرفیاں لے آتا۔"

پاروتی بولی۔ "سونے کی اشرفیاں بیچنے جاتے جب بھی لوگوں کو ہم پر شک پڑ سکتا تھا۔ اس لڑی کے بارے میں تو میں سنار سے کہہ سکتی ہوں کہ ہمارے خاندانی ہار کی ایک لڑی باقی رہ گئی ہے اسے بھی فروخت کرنا پڑ رہا ہے۔"

میں نے اس سے کہا۔

"اب رات ہو رہی ہے ہم اس وقت کہاں اسے صرافہ بازار میں لے جا کر فروخت کرتے پھریں گے۔ بہتر یہی ہے کہ ہم رات کی گاڑی سے اسے ساتھ ہی لے کر دلی چلے چلتے ہیں۔ دلی جا کر اسے فروخت کر دیں گے۔"

"یہ خیال بھی ٹھیک ہے۔ ہمارے پاس دلی جانے کا ریل کا کرایہ تو موجود ہی ہے۔"

"بالکل۔"

پاروتی نے سونے کی لڑی مجھے دیتے ہوئے کہا۔

"اسے تم اپنے پاس سنبھال کر رکھ لو۔ چلو اب ریلوے اسٹیشن پر چل کر دلی جانے والی گاڑی کا پتہ کرتے ہیں۔"

دریا کے علاقے سے نکل کر ہم بڑی سڑک پر آئے۔ وہاں سے ایک ٹیکسی پکڑی اور کلکتہ کے ہوڑہ ریلوے اسٹیشن پر پہنچ گئے۔ معلوم ہوا کہ دلی جانے والی گاڑی رات کے سوا نو بجے چلے گی۔ اس وقت ابھی شام کے سات ہی بجے ہوں گے۔ ہم نے دلی تک کے دو تھرڈ کلاس کے ٹکٹ خریدے اور پلیٹ فارم پر آ کر بیٹھ گئے۔ کلکتے میں ابھی فضا اتنی خراب نہیں ہوئی تھی۔ لوگ باتیں کر رہے تھے کہ پنجاب میں بہت خون خرابہ ہو رہا ہے اور جالندھر امرتسر میں سخت فسادات ہو رہے ہیں۔ مجھے اس لیے زیادہ پریشانی نہیں ہوئی کہ میرے گھر والے لاہور شہر میں تھے اور لاہور پاکستان میں تھا۔ امرتسر میں ہمارے کچھ رشتہ دار ضرور تھے۔ کسی وقت ان کا خیال ضرور آ جاتا تھا پھر سوچتا کہ وہ صدیوں سے وہاں آباد ہیں۔ انہیں کوئی کچھ نہیں کہے گا اور وقت آنے پر وہ آسانی سے نکل جائیں گے۔

میں نے کینٹین کے کاؤنٹر سے دو گلاس چائے کے لیے' ایک گلاس پاروتی کو دیا اور ہم دونوں پلیٹ فارم پر کاؤنٹر کے قریب ہی بینچ پر بیٹھ کر چائے پینے اور باتیں کرنے لگے۔ پاروتی کے اندر ایک نئی تبدیلی پیدا ہو گئی تھی۔ اس کے بارے میں مجھے اس

نے خود ہی بتایا۔

"جب سے میرے اندر انسان سے ناگن بن جانے کی شکتی پیدا ہوئی ہے مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ اب مجھے سانپوں سے ڈسوانے اور سانپ کھانے کی حاجت نہیں رہی۔ وہ حالت وہ کیفیت جو سانپ ڈسوانے کے بعد مجھ پر طاری ہوتی تھی اب اس کے بغیر بھی مجھ پہ طاری رہتی ہے۔"

میں نے کہا۔ "خدا کا شکر ہے کم از کم اس مکروہ عادت سے تو تمہارا پیچھا چھوٹا۔"

پاروتی نے کہا۔

"اور سنو! اب مجھے بھوک بھی نہیں لگتی، میرا مطلب ہے میں کچھ نہ بھی کھاؤں تو لگتا ہے میرے اندر کمزوری پیدا نہیں ہوگی۔ ایک طرح سے میرے اندر ایک سانپ کی ساری باتیں پیدا ہو رہی ہیں۔ جانتے ہو سانپ صرف ایک بار کھاتا ہے اور پھر لمبے عرصے تک کچھ بھی نہیں کھاتا۔ میں بھی دن میں ایک بار کھانا کھالوں تو پھر بھوک ہی نہیں لگتی۔ اس وقت بھی مجھے بالکل بھوک نہیں ہے۔"

میں نے اسے کہا۔ "تمہارا تو پیٹ کا مسئلہ حل ہو گیا اب تمہارا کھانا بھی میں خود کھایا کروں گا۔"

پاروتی نے چائے کا گلاس اپنے پاس بینچ پر رکھتے ہوئے کہا۔

"میری ایک بات سنو۔ تمہیں ایک ضروری بات بتانا چاہتی ہوں۔ اس کو ہمیشہ یاد رکھنا۔ اس میں میری زندگی کا راز چھپا ہوا ہے۔"

پاروتی ایک لمحے کے لیے پلیٹ فارم کے فرش کو گھورنے لگی پھر میری طرف نگاہیں اٹھائیں اور کہا۔

"میری زندگی اب لمبی ہوگی۔ تم اس کا اندازہ نہیں لگا سکو گے۔ میرے ایسی عورت جو کئی برسوں تک سانپوں سے اپنے آپ کو ڈسواتی رہی ہو اور سانپوں پر گزارہ کرتی رہی ہو جب وہ ناگن ماتا کا چلہ کاٹ کر انسان سے ناگن بننے کی طاقت حاصل کرتی ہے تو اس دنیا میں اس کی عمر بہت لمبی ہو جاتی ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہوتی ہے کہ عام انسانوں کے برخلاف کھانے پینے سونے اور دوسری انسانی ضرورتوں اور کمزوریوں سے بے نیاز ہو جاتی ہے۔ میں تمہیں بتا چکی ہوں کہ اب مجھے بھوک نہیں لگتی۔ میں اگر چاہوں تو کھا لی لوں نہ کھاؤں تو مجھے کچھ نہیں ہوگا۔ میں سانپ کھانے سے بے نیاز ہو گئی ہوں۔"

میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"لیکن تمہارے ساتھ کوئی حادثہ بھی تو ہو سکتا ہے۔ تم گاڑی کے نیچے آسکتی ہو، تم پر کسی مکان کی چھت گر سکتی ہے۔ فسادات میں تمہیں کوئی گولی مار سکتا ہے۔" پاروتی نے جواب دیا۔

"تم نے بالکل ٹھیک سوال کیے ہیں۔ میرے ساتھ بھی دوسرے لوگوں کی طرح اس قسم کے حادثے گزر سکتے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ جب میرے سر پر کسی مکان کی چھت گرے گی جب میں کسی گاڑی کے نیچے آؤں گی اور جب بھی مجھے کوئی گولی مارے گا تو اس سے ایک سیکنڈ پہلے میں سانپ بن چکی ہوں گی۔"

میں نے کہا۔ "لیکن سانپ کی شکل میں بھی تم مر سکتی ہو۔ چھت گرنے سے کچلی جا سکتی ہو۔ گاڑی کے نیچے آنے سے تمہارے ٹکڑے ہو سکتے ہیں۔ پستول کا فائر تمہیں ٹکڑے ٹکڑے کر سکتا ہے پھر تو تم مر جاؤ گی پھر کیسے زندہ رہ سکو گی؟"

پاروتی نے مسکرا کر کہا۔

"یہی وہ راز کی بات تھی جو میں تمہیں بتانے لگی تھی۔ سنو! اگر میرے ساتھ کبھی ایسا حادثہ پیش آجائے اور میرے جسم کے ٹکڑے ہو جائیں تو تمہیں

میری زندگی کی خاطر ایک کام کرنا ہوگا۔ تم میری لاش کے ٹکڑے اکٹھے کر کے کسی برتن میں بند کر دینا۔ کوہ ہمالیہ کے شمال میں وار جلنگ سے تین کوس اوپر کی جانب کیلاش پربت ہے۔ وہاں ایک شومندر ہے، اس مندر کے پیچھے ایک تالاب ہے۔ میرے جسم کے ٹکڑے کسی ایسے برتن یا ڈبے میں بند کر کے جس کے اندر پانی نہ جا سکے، اس تالاب میں ڈال دینا۔ چھ دن کے بعد اس برتن کو نکال کر کھولو گے تو میرے جسم کے ٹکڑے جڑ گئے ہوں گے اور میں زندہ ہو چکی ہوں گی۔ جو کچھ میں نے تمہیں بتایا ہے اسے یا تو اپنے پاس لکھ کر رکھ لینا، یا اپنے ذہن میں اسے اچھی طرح یاد کر لینا۔ کیونکہ اگر تم نے ایسا نہ کیا اور سانپ کی شکل میں میری لاش کے ٹکڑے وہیں پڑے رہنے دیئے تو میں واقعی مر جاؤں گی۔"

قدرتی طور پر ایک سوال میرے ذہن میں پیدا ہوا۔ میں نے کہا۔

"پاروتی! اس کا مطلب ہوا کہ مجھے تمہارا محافظ بن کر ساری زندگی تمہارے ساتھ رہنا پڑے گا۔ یہ کیسے ممکن ہے، ایک نہ ایک دن تو میں تم سے جدا ہو جاؤں گا۔ اس کے بعد تم کیا کرو گی؟"

پاروتی بولی۔ "جب تک تم میرے ساتھ ہو ٹھیک ہے مجھے تسلی ہوگی کہ اگر میرے ساتھ کوئی حادثہ گزرا تو تم مجھے مرنے سے بچا لو گے۔ جب تم مجھ سے جدا ہو جاؤ گے تو پھر جو خدا کرے گا وہی ہوگا۔ ہو سکتا ہے مجھے تمہارے ایسا کوئی اور دوست مل جائے۔"

میں نے کہا۔ "ہاں، پھر ٹھیک ہے۔"

پاروتی نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔

"ابھی تو تم اس وقت تک میرے ساتھ رہو گے نا، جب تک میں ان سنتھالی سپیروں سے انتقام نہیں لے لیتی جنہوں نے میری زندگی برباد کی ہے۔" بولی۔

میں نے یونہی کہہ دیا۔

"ہاں اس وقت تک تو میں تمہارے ساتھ ہوں۔ خدا تمہارا بھلا کرے۔"

پاروتی نے بے اختیار مجھے دعا دی۔ میں نے محسوس کر لیا تھا کہ پاروتی نے کچھ عرصے سے بھگوان کی جگہ خدا کا نام لینا شروع کر دیا تھا۔ اس کی وجہ میری سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ ہو سکتا ہے اس کے اندر کوئی خاص تبدیلی پیدا ہو رہی ہو۔ کیونکہ میں نے دیکھا تھا کہ وہ ہندو ازم اور ہندوؤں کے رسم و رواج سے برگشتہ ہو رہی تھی۔ کچھ میری صحبت کا بھی اثر تھا۔

پلیٹ فارم پر پندرہ بیس ہندو بنگالیوں کا ایک جلوس کانگریس کی جھنڈیاں لہراتا بندے ماترم اور ہندوستان زندہ باد کے نعرے لگاتا گزر گیا۔ پاروتی نے پوچھا۔

"کیا ہندوستان آزاد ہو گیا ہے۔ کیا انگریز یہاں سے چلا گیا ہے؟"

کلکتے آکر مجھے ہندوستان کی سیاسی صورت حال کا پورا علم ہو چکا تھا۔ جہاں تک مجھے یاد ہے وہ جون جولائی کے دن تھے۔ ابھی 14 اگست کا تاریخی دن نہیں آیا تھا۔ اصولی طور پر ہندوستان اور پاکستان کی آزادی کا اعلان ہو چکا تھا۔ اس دوران شمالی ہندوستان خاص طور پر مشرقی پنجاب اور یوپی میرٹھ مراد آباد وغیرہ میں ہندو مسلم فسادات شروع ہو گئے تھے۔ یہ ساری خبریں میں اخبار میں پڑھ لیتا تھا۔ ہندو سکھوں کو مسلمانوں کی علیحدہ مملکت پاکستان بن جانے کا سخت غصہ تھا اور انہوں نے مسلمانوں کے گھروں کو نذر آتش کرنا اور ان پر اکا دکا قاتلانہ حملے شروع کر دیئے تھے۔

یہ ساری باتیں میں نے پاروتی کو بتائیں تو وہ

"آخر مسلمانوں کو اپنی مرضی کے مطابق زندگی بسر کرنے کا حق حاصل ہے۔ میں نے ہندو گھرانے میں جنم لیا ہے۔ میں تمہیں بتاتی ہوں کہ ہندو بہت تنگ دل ہوتا ہے اور مسلمان سے تو وہ ہمیشہ سے نفرت کرتا آیا ہے۔"

میں نے پاروتی سے کہا۔ "اسی لیے تو مسلمانوں نے اپنے لیے علیحدہ وطن پاکستان بنایا ہے۔ میں نے بھی بچپن میں دیکھا ہے کہ ہم کبھی کسی ہندو کے گھر میں جاتے تھے تو ان کی عورتیں ہم سے دور بھاگ جاتی تھیں۔ کہتی تھیں اگر ہم کسی مسلمان سے چھو گئیں تو ہم بھرشٹ ہو جائیں گی۔ ہمیں سات بار گنگا میں اشنان کرنا پڑے گا۔"

پاروتی کہنے لگی۔

"خدا نے مسلمانوں کے ساتھ پورا انصاف کیا ہے۔ بڑا اچھا ہوا کہ مسلمانوں کا وطن پاکستان بن گیا۔ خدا نے چاہا تو میں ایک بار پاکستان دیکھنے ضرور جاؤں گی۔"

ہم باتیں کر رہے تھے کہ ٹرین پلیٹ فارم پر آ کر لگ گئی مسافروں میں ہلچل سی مچ گئی۔ ہر کوئی ٹرین کی طرف دوڑا۔ پتہ چلا کہ ہوڑہ میل ہے اور یہی ٹرین ہمیں دلی لے جائے گی۔ اس زمانے میں عورتیں بھی تھرڈ کلاس میں اپنے مردوں کے ساتھ بیٹھ جاتی تھیں۔ چنانچہ پاروتی بھی میرے ساتھ تھرڈ کلاس کے ایک ڈبے میں بیٹھ گئی۔

جس وقت ہم پلیٹ فارم پر بیٹھے باتیں کر رہے تھے اس وقت آسمان پر کالی گھٹائیں چھانے لگی تھیں۔ جب ٹرین کلکتہ کے ہوڑہ اسٹیشن سے چلی تو بارش شروع ہو گئی۔ ایک بات کا مجھے بڑا اطمینان ہو گیا تھا کہ اب پاروتی نہ تو سانپوں سے ڈسوائے گی اور نہ انہیں اپنی خوراک بنائے گی۔ بلکہ اب تو وہ کھانے پینے سے بالکل ہی آزاد ہو گئی تھی۔ کہنے کو تو اس نے مجھے یہی کہا تھا اب دیکھنا یہ تھا کہ دلی تک کے سفر میں وہ کچھ کھانے پینے کو مانگتی ہے یا نہیں۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ کچھ کھائے پیئے بغیر وہ زندہ رہ سکے گی، لیکن جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں قدرت کا نظام ایک سربستہ راز ہے۔ یہاں کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ ٹرین رات کے اندھیرے میں کلکتہ شہر کی جھلملاتی روشنیوں کو پیچھے چھوڑتی ہوئی بھاگی جا رہی تھی۔ ڈبے کی کھڑکیاں کھلی تھیں۔ ٹھنڈی ہوا آ رہی تھی۔ کسی وقت بارش کی بوچھاڑ بھی اندر آ جاتی تھی۔ ہمارے ساتھ والے بنگالی مسافر نے بارش سے بچنے کے لیے کھڑکی کا شیشہ چڑھا دیا۔ سفید سانپ نے کھنڈر کے خزانے میں سے جو عقیق کے نگ والی سونے کی لڑی ہمیں لا کر دی تھی وہ میں نے اپنے پاس بڑی اچھی طرح سے سنبھال کر رکھی ہوئی تھی۔

کلکتے سے دلی تک کا سفر بڑا لمبا سفر تھا۔

میں نے پاروتی سے کہا کہ میں اس کے سونے کے واسطے اوپر برتھ پر جگہ بنا لیتا ہوں۔ وہ ہلکے سے تبسم کے ساتھ بولی۔

"مجھے سونے کی ضرورت نہیں ہے، تم بھول گئے ہو کہ میں......"

اور اس نے اپنے ہونٹ میرے کان کے پاس لا کر فقرہ مکمل کیا۔

"میں ناگن ہوں۔"

ٹرین نے مضافات کا کوئی چھوٹا اسٹیشن چھوڑا تو ریل کی پٹڑیوں نے بہت شور مچایا۔ میں نے پاروتی سے کہا کہ مجھے تو ضرور نیند آ جائے گی۔ میں اپنے لیے جگہ بناتا ہوں۔ اوپر والے برتھ پر کسی مسافر کی گٹھڑیاں پڑی تھیں۔ میں نے انہیں بڑی احتیاط سے ایک طرف کر کے اتنی جگہ بنا لی کہ میں ٹانگیں سکیڑ کر لیٹ سکتا تھا۔ میں واپس پاروتی کے پاس آ کر بیٹھ گیا کہ جب نیند آئے گی تو اوپر برتھ پر چڑھ کر سو جاؤں گا۔ پاروتی کھڑکی کے شیشے سے باہر گرتی بارش کے قطروں کو دیکھ رہی تھی۔ کسی کسی وقت وہ مجھ سے ان جنگلوں کی بات کر لیتی جہاں سے گزر کر ہم آئے تھے۔ اسے وہ جنگل بہت یاد آ رہے تھے۔ ہم اسی طرح کبھی خاموش اور کبھی باتیں کرتے رہے۔ ڈبے میں دوسرے مسافر بھی اپنی اپنی باتوں میں لگے تھے۔ کچھ مسافر سونے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ ٹرین کلکتے سے بہت آگے نکل آئی تھی اور اندھیرے میں بنگال کے سرسبز کھیتوں میدانوں اور ندی نالوں پر سے گزرتی چلی جا رہی تھی۔

مجھے نیند آنے لگی تو میں نے پاروتی سے کہا۔

"میں اوپر برتھ پر سونے جاتا ہوں۔ تم کسی سٹیشن پر اترنا بالکل نہیں۔"

وہ ہنس دی۔

"اب مجھے اترنے کی ضرورت نہیں ہے۔"

میں برتھ پر چڑھ کر لیٹ گیا۔ چلتی ٹرین میں مجھے بڑی جلدی نیند آ گئی۔ ایک دھچکے سے میری آنکھ کھلی تو میں نے محسوس کیا کہ ٹرین رک گئی ہے۔ میں نے سر نیچے کر کے دیکھا۔ پاروتی اپنی سیٹ پر اسی طرح بیٹھی تھی۔ کھڑکی کا شیشہ اترا ہوا تھا۔ باہر پلیٹ فارم پر بڑی روشنیاں تھیں۔ میں نیچے اتر آیا۔ پاروتی نے کہا۔

"آسن سول کا اسٹیشن آیا ہے۔"

آسن سول سے صوبہ بہار کا علاقہ شروع ہو جاتا ہے۔ ہوڑہ ایکسپریس نے ہمیں شام کے وقت دلی پہنچا دیا۔ وہاں سے ہم تانگہ لے کر پاروتی کی خالہ کے گھر پہنچے تو وہاں بھی تالا لگا تھا۔ معلوم ہوا کہ دلی میں فسادات کے ڈر سے وہ لوگ کسی دوسرے شہر چلے گئے ہیں۔ پاروتی بولی۔

"اب کیا کریں؟"

میں نے کہا۔ "واپس اسٹیشن پر چل کر رات گزارتے ہیں صبح سوچیں گے کہ اب کیا کرنا ہے؟"

ہم اسی تانگے میں واپس دلی سٹیشن کی طرف چل پڑے۔ اندھیرا ہو گیا تھا۔ ایک چوک میں اچانک ہندو بلوائیوں نے ہمیں گھیر لیا۔ ان کے ہاتھوں میں ڈنڈے اور چھرے تھے۔ پاروتی نے کہا۔ ہم ہندو ہیں، کلکتے جا رہے ہیں۔ ایک ہندو نے میری طرف گھور کر دیکھا اور کہا۔

"یہ ہمیں مسلمان لگتا ہے۔ ہم اس کا معائنہ کریں گے۔"

میرا رنگ اڑ گیا۔ کیونکہ اب بلوائیوں سے میرا بچنا مشکل تھا۔

......☆☆☆......

پاروتی بڑی جرات کر کے میرے آگے آ گئی، کہنے لگی۔

"یہ میرا پتی ہے۔ میں ناگ دیوتا کی بھکشنی ہوں اگر تم نے میرے پتی کو ہاتھ لگایا تو ناگ دیوتا تمہیں زندہ نہیں چھوڑیں گے۔"

ہندو بلوائی ذرا ٹھٹک گئے لیکن ایک ہندو نے للکار کر کہا۔

"یہ بھی مسلمان ہے اس کو بھی مار ڈالو۔"

میں بھول گیا تھا کہ کلکتے سے چلتے وقت پاروتی نے ایک سانپ اپنی قمیص کے اندر چھپا کر رکھ لیا تھا۔ چونکہ اب اسے سانپ کھانے کی ضرورت نہیں تھی اس لیے یہ سانپ اس کی قمیص کے اندر محفوظ پڑا تھا۔ جیسے ہی بلوائی مجھے ہلاک کرنے کے لیے آگے بڑھا پاروتی نے اونچی آواز میں ناگ دیوتا کا کوئی منتر پڑھا اور قمیص کے اندر سے سانپ نکال کر بلوائیوں پر

اچھال دیا۔ سانپ اور چور کی بڑی دہشت ہوتی ہے۔ جیسے ہی سانپ بلوائیوں کے اوپر گرا وہ سر پر پاؤں رکھ کر ایک طرف کو بھاگے۔ پاروتی نے کوچوان کو آواز دی۔

''تانگہ یہاں سے نکال کرلے چلو''

مگر کوچوان وہاں سے خدا جانے جان بچا کر کہاں غائب ہو چکا تھا۔ میں نے پاروتی سے کہا۔

''تانگے میں بیٹھو۔ جلدی کرو۔''

وہ تانگے میں بیٹھی، میں نے گھوڑے کی باگیں سنبھالیں اسے سانٹا رسید کیا گھوڑا ذرا بدکا اور پھر سڑک پر اسٹیشن کی طرف دوڑ پڑا۔ اس سے پہلے میں نے کبھی تانگہ نہیں چلایا تھا۔ اس روز مجھے معلوم ہوا کہ تانگہ چلانا کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ کیونکہ کوچوان کو صرف باگیں ٹھیک طرح سے سنبھالنی ہوتی ہیں۔ تانگے کو گھوڑا سنبھالتا ہے۔

اس کے باوجود ایک آباد سڑک پر آ کر ہم نے تانگہ چھوڑ دیا۔ کیونکہ سڑک پر ٹریفک جاری تھی اور یہاں حادثے کا ڈر تھا۔ میں نے پارورتی سے کہا۔

''اگر عین وقت پر تم سانپ نکال کر ان پر نہ پھینکتیں تو میرا بچنا ناممکن تھا۔''

پاروتی نے بڑے پیار سے کہا۔

''تمہاری طرف کوئی آنکھ اٹھا کر تو دیکھے۔''

رات کے نو دس بجے کا وقت ہوگا۔ دلی میں فسادات کی اکا دکا وارداتوں کے شروع ہو جانے سے سڑک بے رونق تھی۔ کسی وقت کوئی گاڑی تیزی سے گزر جاتی تھی۔ کوئی رکشہ ٹیکسی بھی نظر نہیں آ رہی تھی۔ ہم سڑک پر چلنے لگے۔ آگے چوک آ گیا۔ یہاں ہمیں ایک رکشا مل گیا جس نے ہمیں ریلوے اسٹیشن پہنچا دیا۔ ہم نے باقی ساری رات ریلوے سٹیشن کے پلیٹ فارم پر گزاری۔ دن کی روشنی ہوئی تو میں نے پاروتی سے پوچھا کہ اب اس کا کیا پروگرام ہے۔ پاروتی کہنے لگی۔

''مجھے ماتا پتا کی بہت یاد آ رہی ہے۔ خدا جانے میرے بغیر ان کا کیا حال ہو رہا ہوگا۔ میں صرف ایک بار ان سے مل کر انہیں بتا دینا چاہتی ہوں کہ میں زندہ ہوں۔ اس کے بعد میں سنتھالی سپیروں سے انتقام لینے بنگال کے جنوبی جنگلوں کی طرف نکل جاؤں گی۔ تمہاری مرضی ہے تم میرے ساتھ چلنا یا نہ چلنا۔''

میں نے کہا۔ ''مگر تمہارے ماتا پتا تو جھانسی میں ہیں اور ہمیں کچھ معلوم نہیں کہ وہ وہاں کس جگہ ٹھہرے ہوئے ہیں۔''

پاروتی کچھ سوچ کر بولی۔

''پتا جی کبھی اپنے جھانسی کے ایک دوست کا ذکر کیا کرتے تھے۔ وہ ان کا کلاس فیلو تھا۔ اور اب جھانسی میں کسی سینما ہاؤس کا مالک ہے۔ اس کا نام کچھ نریندر کمار یا نرمل کمار قسم کا تھا۔ اگر ہم جھانسی جائیں تو اس آدمی کا پتہ چل سکتا ہے۔ کیا تم میرے ساتھ جھانسی چلو گے؟''

میں نے دل میں عہد کیا ہوا تھا کہ اس بے یار و مددگار اور مصیبت زدہ لڑکی کو جب تک محفوظ ہاتھوں میں نہیں پہنچاؤں گا اس کا ساتھ نہیں چھوڑوں گا۔ چنانچہ میں اس کے ساتھ جھانسی جانے پر تیار ہو گیا۔ میں نے جیب سے رقم نکال کر گنی۔ ایک روپے ہی باقی رہ گئے تھے۔ اس رقم سے ہم ٹرین کے ذریعے جھانسی نہیں پہنچ سکتے تھے۔ پاروتی نے کہا۔

''کیوں نہ یہاں خزانے والا ہار بازار میں لے جا کر بیچ دیں۔ اس سے ہمیں کافی رقم مل جائے گی۔ ہم نئے کپڑے اور نئے جوتے بھی خرید لیں گے۔''

میں بھی اس ہار یا سونے کی لڑی سے پیچھا چھڑانا

چاہتا تھا۔ میں نے کہا۔ ''چلو دلی کے صرافہ بازار میں چلتے ہیں۔''

ہم نے وہیں اسٹیشن سے صرافہ بازار کا پتہ معلوم کیا اور ٹرام میں بیٹھ کر چل پڑے۔ ہمیں قلی نے بتایا تھا کہ تیسرے چوک میں جا کر ٹرام سے اتر جانا۔ پھر بائیں ہاتھ کو بازار میں مڑو گے تو صرافہ بازار میں پہنچ جاؤ گے۔ ہم نے ایسا ہی کیا۔ تیسرے چوک پر ٹرام رکی تو ہم ٹرام سے اتر کر بائیں طرف بازار میں مڑ گئے۔ یہ ایک تنگ سا بازار تھا۔ سناروں کی کتنی ہی دکانیں تھیں۔ الماریوں میں زیورات سجے ہوئے تھے۔ پولیس بھی وہاں پر موجود تھی۔ ہم ایک دکان میں آ گئے۔ یہ ایک ہندو لالے کی دکان تھی۔ گدی پر ایک موٹا لالہ بیٹھا بیڑی پی رہا تھا۔ پیچھے دیوار پر رام اور سیتا کی تصویر لگی تھی۔ ہمارے کپڑے معمولی سے تھے۔ لالہ جی نے پہلے تو ہمیں مشکوک نظروں سے دیکھا اور پوچھا۔

''کیا بات ہے؟''

میں نے قمیص کے اندر سے سرخ عقیق والی سونے کی لڑی نکال کر اسے دی تو وہ اسے غور سے دیکھنے لگا۔ سونے کی لڑی کے منکوں کو اس نے کسوٹی پر رگڑا۔ پھر عقیق کو عینک لگا کر الٹ پلٹ کر دیر تک دیکھتا رہا۔ اس کے بعد اس نے لڑی ایک طرف رکھ دی اور پوچھا۔

''یہ تمہیں کہاں سے ملی ہے؟''

پاروتی نے کہا۔

''ہمارے حالات ٹھیک نہیں رہے۔ یہ میرا شادی کا ہار تھا۔ اس کی لڑیاں توڑ توڑ کر بیچتے رہے ہیں۔ یہ آخری لڑی رہ گئی تھی۔ اسے بھی بیچنے آئے ہیں۔''

لالہ نے پوچھا۔

''پہلی لڑی جہاں بیچی تھی اس نے کیا دیا تھا؟''

ہما اسلم...... احمد پور سیال

اے دوست نہ کبھی بھول سکی میں میلہ تیری بستی کا
میں تجھ سے کیسے دور رہوں تو حصہ میری ہستی کا
اے لوگو نہ اصرار کرو، وہ مجھ سے مل نہ پائے گا
وہ چاند زمیں پہ کیوں اترے، وہ عادی ہے کب پستی کا

حنا، وینا، ثناء...... کراچی

مکان و لامکاں میں لائقِ حمد و ثنا تو ہے
فقط ہے بندگی تیری، جہانوں کا خدا تو ہے
اندھیرے میں اُجالے میں ہے جو بھی، دیکھتا تو ہے
تصور میں نہیں آتا تصورِ سے ورا تو ہے

پاروتی نے بڑی ہوشیاری سے کام لیتے ہوئے کہا۔

''لالہ تم بتاؤ اس کا کیا دو گے؟''

لالہ جی کا چہرہ بتا رہا تھا کہ بڑا قیمتی عقیق ان کے ہاتھ لگ گیا ہے لیکن وہ ظاہر کر رہا تھا کہ یہ معمولی سے ہار کی لڑی ہے۔ کہنے لگا۔

''پتھر مصنوعی ہے۔ سونا ٹھیک ہے میں تمہیں اس کے پانچ سو روپے دے سکتا ہوں۔ اس سے زیادہ ایک پائی بھی نہیں دوں گا۔''

پانچ سو روپے کی رقم 1947ء میں بہت کافی رقم ہوا کرتی تھی۔ پاروتی نے میری طرف دیکھا۔ میں نے اسے اشارہ کیا کہ ٹھیک ہے۔ پاروتی بولی۔

''ٹھیک ہے لالہ جی لڑی رکھ لیں اور ہمیں پانچ سو روپے دے دیں۔''

لالہ جی نے تجوری میں سے سو سو کے پانچ نوٹ نکال کر ہمیں دے دیئے۔ یہ انگریزی کرنسی تھی۔ میں نے کہا۔

''اب تو ہندوستان آزاد ہو گیا ہے کیا انگریزی نوٹ لوگ لے لیں گے؟''

لالہ جی بولے۔ ”ہندوستان آزاد ضرور ہو گیا ہے مگر ابھی یہاں انگریزی نوٹ ہی چلتے ہیں جاؤ اب اپنا راستہ ناپو۔“

میں نے سو سو روپے کے پانچوں نوٹ اپنی قمیص کی جیب میں سنبھال کر رکھ لیے۔ پاروتی نے کہا کہ اب اسٹیشن پر چل کر معلوم کرتے ہیں کہ جھانسی کی گاڑی کب جائے گی۔ ہم صرافہ بازار سے نکلے اور چوک میں آ گئے۔ یہاں سے ہمیں ٹرام کار میں بیٹھ کر ریلوے اسٹیشن پہنچنا تھا۔ ہم اسٹاپ پر ٹرام کا انتظار کر رہے تھے کہ پولیس کے دو سپاہی ہمارے پاس آ گئے۔ ان میں ایک سکھ تھا۔ اس نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے پوچھا۔

’کون ہو بھئی تم؟“

میں نے اسے بتایا کہ ہم کلکتہ سے دلی آئے تھے یہاں ہمارے رشتے دار ہمیں نہیں ملے اب ان کی تلاش میں جھانسی جا رہے ہیں۔ سکھ سپاہی نے اپنے ساتھی سے کہا۔

”گوپال داس یہ تو جھانسی جا رہے ہیں۔“

دوسرا سپاہی جو ہندو تھا اس نے میرا بازو پکڑ لیا اور کہنے لگا۔

”اور جو چوری کا مال تم ابھی ابھی بیچ کر آ رہے ہو اس کا پہلے حساب کتاب تو چکاؤ‘ چلو ہمارے ساتھ تھانے......“

میں اور پاروتی انہیں کہتے ہی رہ گئے کہ ہم نے جو سونے کی لڑی فروخت کی ہے وہ ہماری اپنی تھی۔ ہمارے پاس پیسے ختم ہو گئے تھے۔ مگر انہوں نے ایک نہ سنی اور ہمیں پکڑ کر تھانے لے آئے جو قریب ہی تھا۔ وہاں ایک موٹا سکھ تھانیدار بیٹھا تھا۔ اس نے بھی ہم پر چوری کا الزام لگایا اور میری جیب سے پانچ سو کے نوٹ نکال کر اپنے قبضے میں کر لیے اور حوالدار سے کہا۔

”ان کو حوالات میں بند کر دو۔ کل عدالت میں ان کا چالان پیش کریں گے۔“

صورت حال ایک دم سے پلٹ گئی تھی۔ کہاں ہم جھانسی جا رہے تھے اور کہاں ہمیں حوالات میں بند کیا جا رہا تھا۔ میں نے پاروتی کی طرف دیکھا۔ وہ سخت غصے میں تھی۔ میں نے اسے آہستہ سے کہا۔

”خدا کے لیے ذرا صبر کرنا۔ کوئی ایسی ویسی حرکت نہ کر بیٹھنا۔ میں تھانیدار سے خود بات کرتا ہوں۔“

میں سکھ تھانیدار کو سمجھانے لگا کہ ہم چور نہیں ہیں سونے کی لڑی میری پتنی کی ماتا جی کی تھی۔ اس نے ہم دونوں کو پنجابی میں گالی دی اور حوالدار سے کہا۔

”میرا منہ کیا دیکھ رہے ہو۔ بند کر دو انہیں حوالات میں۔“

حولات سامنے ہی تھی۔ سلاخوں والے دروازے کے باہر سنتری رائفل لیے کھڑا تھا۔ ہمیں اندر بند کرنے لگے تو پاروتی نے کہا۔

”مجھے باتھ روم جانا ہے۔“

سکھ تھانیدار نے پاروتی کو گالی دی اور فحش مذاق کیا۔ پاروتی کا میں نے چہرہ دیکھا۔ وہ غصے سے سرخ ہو رہا تھا۔

”وہ سامنے باتھ روم ہے۔“

کونے میں غسل خانے کا دروازہ تھا۔ پاروتی غسلخانے میں چلی گئی۔ مجھے حوالات میں بند کر دیا گیا۔ تھانے میں ایک سکھ تھانیدار تھا۔ ایک سنتری حوالات کے باہر کھڑا تھا اور دونوں سپاہی جو ہمیں پکڑ کر وہاں لائے تھے وہ ہمیں تھانیدار کے حوالے کر کے باہر چلے گئے تھے۔

میں حوالات کے فرش پر سلاخوں کے پاس بیٹھ گیا۔ مجھے معلوم تھا کہ ابھی کچھ نہ کچھ ہونے والا ہے۔ پاروتی یونہی غسل خانے میں نہیں گئی تھی۔ سکھ تھانیدار رجسٹر پر جھکا کچھ لکھ رہا تھا۔ چھت کا پنکھا چل رہا تھا۔ جب پاروتی کو غسل خانے میں گئے دس پندرہ منٹ ہو گئے تو سکھ تھانیدار نے چپڑاسی سے کہا۔

”اوئے شبراتی! دیکھ اوئے! یہ تیری ماسی اندر کیا کر رہی ہے۔ پیٹ دے دروازہ۔“

چپڑاسی شبراتی ساتھ والے کمرے میں سے نکل کر آیا اور اس نے جاتے ہی غسل خانے کا دروازہ کھول دیا۔ اس نے کہا۔

”سردار جی اندر تو کوئی نہیں ہے۔“

سکھ تھانیدار نے چونک کر غسل خانے کی طرف دیکھا۔ میں بھی دیکھ رہا تھا۔ غسل خانہ خالی تھا۔ سکھ تھانیدار جلدی سے اٹھا اور غسل خانے کی طرف لپکا۔ ابھی اس نے دو قدم ہی اٹھائے تھے کہ لڑکھڑایا اور گر پڑا۔ حوالات کا سنتری اس کی طرف دوڑا۔ چپڑاسی نے سکھ تھانیدار کو اٹھانے کی کوشش کی تو وہ بھی ایک طرف گر گیا۔

اب میں نے نسواری رنگ کے اس سانپ کو دیکھ لیا تھا جو اصل میں پاروتی ناگن کے روپ میں تھی۔ اس نے سکھ تھانیدار اور چپڑاسی دونوں کو ڈس لیا تھا۔ حوالات والا سنتری قریب جا کر تھانیدار پر جھکا تو پاروتی نے اسے بھی ڈس دیا۔ وہ بھی وہیں ڈھیر ہو گیا۔ میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا تھا اور باہر دروازے کی طرف دیکھتا رہا کہ کوئی دوسرا سپاہی تو اندر نہیں آ تا۔ کیونکہ کسی کے اندر آ جانے سے سانپ کی زندگی کو خطرہ تھا۔ وہ ضرور اسے مار ڈالتا۔ پاروتی نے ناگن بن جانے کے بعد ان تینوں کو کچھ اس طرح ڈسا تھا کہ ان کی آواز تک نہیں نکلی تھی۔ جیسے ان کے گلے بند ہو گئے ہوں۔

پاروتی سانپ کے روپ میں تیزی سے رینگتی ہوئی میرے قریب آ گئی۔ قریب آتے ہی اس نے انسانی شکل اختیار کر لی اور بولی۔

”حوالات کو تالا لگا ہے۔ اس کی چابی سنتری کی پیٹی سے لگی ہو گی۔ میں لاتی ہوں۔“

میں نے اسے کہا۔

”تھانیدار نے ہمارے پانچ سو کے نوٹ اپنی جیب میں رکھ لیے تھے وہ بھی نکال لانا۔“

پاروتی دوڑ کر تینوں بے ہوش یا مرے ہوئے آدمیوں کے پاس گئی۔ سنتری کی پیٹی میں سے چابیوں کا گچھا نکالا۔ اس کے بعد تھانیدار کی جیب میں سے پانچ سو کے نوٹ نکالے۔ بھاگ کر میرے پاس آئی۔ چوتھی چابی لگانے سے حوالات کا تالا کھل گیا۔ اس نے نوٹ میری قمیض کی جیب میں ڈالے اور بولی۔

”تھانے کے دروازے پر وہی دونوں سپاہی ہوں گے۔ پیچھے سے جاتے ہیں۔ پیچھے ضرور کوئی دروازہ ہو گا۔“

ہم ایک کمرے سے نکل کر تھانے کے پیچھے احاطے میں آئے۔ یہاں ایک آدمی چارپائی پر بیٹھا اپنے بدن پر تیل کی مالش کر رہا تھا۔ ہم بڑے اطمینان سے اس کے قریب سے گزر گئے۔ سامنے احاطے کا چھوٹا دروازہ تھا۔ اس دروازے سے نکل کر ایک گلی میں آ گئے۔ گلی میں مکان کے باہر دو عورتیں بیٹھی باتیں کر رہی تھیں۔ بھاگنے سے انہیں شک پڑ سکتا تھا۔ ہم تیز تیز چلنے لگے۔ گلی آگے جا کر ایک طرف مڑ گئی۔ آگے پھر ایک گلی تھی۔ اس گلی نے ہمیں دوسرے بازار میں پہنچا دیا۔ ایک خالی رکشا قریب سے گزرا۔ میں نے اسے ہاتھ دیا۔ وہ رکا۔ ہم اس میں گھس گئے۔ میں نے کہا۔

”نئی دلی کی طرف چلو۔“

پاروتی نے میری طرف دیکھا۔ میں نے اسے آہستہ سے کہا۔
"اب ہم ریلوے اسٹیشن نہیں جاسکتے۔"
رکشا تیزی سے نئی دلی کی طرف روانہ ہوگیا۔ نئی دلی وہاں سے کافی دور تھی۔ راستے میں ہم نے کوئی بات نہ کی۔ دلی اور نئی دلی کی تھوڑی بہت مجھے پہچان تھی۔ میں نے رکشا ڈرائیور سے کہا۔
"ہمیں بارہ کھمبا پر اتار دینا۔"
بارہ کھمبا پر اتر کر میں نے رکشا کا کرایہ ادا کیا اور ایک طرف فٹ پاتھ پر چلنے لگے۔ پاروتی نے کہا۔
"ادھر تم کہاں جارہے ہو؟"
میں نے کہا۔ "تم نے سکھ سپاہی کو کہا تھا کہ ہم جھانسی جارہے ہیں۔ چنانچہ جب تھانے میں ہمارے فرار کا پتہ چلے گا اور سپاہیوں کو یہ بھی معلوم ہوگا کہ ہم تین پولیس والوں کو ہلاک کر کے فرار ہوئے ہیں تو پولیس ہماری تلاش میں سیدھی ریلوے اسٹیشن پہنچ جائے گی۔"
پاروتی کہنے لگی۔ "میں نے ان تینوں آدمیوں کے جسم میں صرف اتنا زہر داخل کیا ہے جس سے وہ گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ بے ہوش رہیں گے۔ وہ مریں گے نہیں۔"
میں نے کہا۔ "خواہ کچھ بھی ہو۔ بہر حال ہم چوری کے الزام میں پکڑے گئے تھے۔ پولیس نے ہمیں حوالات میں بند کیا تھا اور ہم حوالات توڑ کر بھاگے ہیں یہ کوئی کم جرم نہیں ہے۔"
"پھر اب کیا کریں؟"
پاروتی کے اس سوال کے جواب میں میں نے کہا۔
"ہم جھانسی ضرور جائیں گے لیکن ٹرین دلی یا نئی دلی کے اسٹیشن سے نہیں بلکہ آگرہ سے پکڑیں گے اور آگرہ تک ہم بس میں سفر کریں گے۔"
ناشتہ ہم نے سٹیشن پر ہی کرلیا تھا۔ ہمارا زیادہ دیر دلی میں رکنا ہمارے لیے خطرناک ثابت ہوسکتا تھا۔ میں نے ایک دکاندار سے پوچھا کہ یہاں سے آگرہ کو بسیں کہاں سے چلتی ہیں۔ اس نے بتایا کہ بسوں کا اڈہ بستی نظام الدین میں ہے وہاں سے ہمیں بس مل جائے گی۔ ہم نے ٹیکسی پکڑی اور بستی نظام الدین کے لاری اڈے پر پہنچ گئے۔ معلوم ہوا کہ یہاں سے آگرہ کو سیدھی کوئی بس نہیں جاتی۔ شہر کوسی اور متھرا کو بسیں چلتی ہیں۔ وہاں سے ہمیں آگرہ جانے والی بس مل جائے گی۔
میں اب بڑا چوکس تھا۔ پولیس کا سپاہی نظر آتا تو میں پاروتی کو لے کر فوراً ایک طرف ہوجاتا۔ لاری اڈے پر کافی رش تھا۔ دلی میں گڑبڑ شروع ہوجانے کی وجہ سے بعض لوگ شہر چھوڑ کر جارہے تھے۔ ہمیں بھی کوسی جانے والی ایک لاری میں جگہ مل گئی۔ دوپہر کو لاری کوسی کی چھوٹے سے شہر میں پہنچی۔ یہاں ہم نے لاری اڈے پر ہی روٹی کھائی اور دوسری لاری میں بیٹھ کر متھرا کے شہر میں آگئے۔ یہ ہندوؤں کا مشہور شہر ہے۔ یہاں بڑے مندر ہیں یہاں فسادات تو نہیں ہورہے تھے مگر فضا میں کافی تناؤ تھا۔ مسلمانوں کی بہت تھوڑی آبادی تھی جو سہمی ہوئی تھی۔ ہر طرف کانگریس کے جلوس نکل رہے تھے۔ گھروں پر آزادی کے جھنڈے لہرا رہے تھے۔ یہ کانگریس کے جھنڈے تھے۔ کوسی میں بھی ہم نے یہی سماں دیکھا تھا۔
متھرا سے ہمیں کوئی دو گھنٹے بعد آگرہ جانے والی بس ملی۔ اس بس نے ہمیں شام کے قریب آگرہ پہنچایا۔ آگرہ میں بھی ہندوؤں کے جلوس نکلے ہوئے تھے۔ ہندوستان زندہ باد۔ بھارت ماتا کی جے کے نعرے ہر طرف سنائی دے رہے تھے۔ اگرچہ یہاں

مسلمان کافی تعداد میں آباد تھے مگر وہ کچھ خوفزدہ سے لگ رہے تھے۔ دو دن پہلے یہاں ایک محلے میں ہندوؤں نے چار مسلمانوں کو شہید کردیا تھا۔
پاروتی کہنے لگی۔
"ہندوؤں کو آزادی مل گئی ہے اب تم دیکھ لینا یہ مسلمانوں کا جینا حرام کردیں گے۔ یہ تو پہلے ہی مسلمانوں سے نفرت کرتے تھے اب تو آزاد ہوگئے ہیں۔"
میں نے کہا۔
"اسٹیشن پر چل کر جھانسی والی گاڑی پکڑتے ہیں۔"
پاروتی نے میرے ساتھ لگ کر کہا۔
"تم گھبرانا بالکل مت۔ میرے ہوتے ہوئے کسی نے تمہاری طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھا تو میں اسے وہیں مار ڈالوں گی۔ اگر میں ناگن بن کر کسی کو پوری طرح سے ڈس دوں تو اس کا جسم اسی وقت پھٹ جائے گا۔"
ہم ابھی تک آگرہ کے لاری اڈے پر ہی بیٹھے تھے۔ وہیں ہم نے ٹی سٹال سے چائے کا ایک ایک گلاس لے کر پیا۔ ابھی سورج پوری طرح سے غروب نہیں ہوا تھا۔ دن کی روشنی ہلکی ہلکی سنہری ضرور ہونے لگی تھی۔ ہم لاری اڈے کے سائبان تلے بنچ پر بیٹھے تھے۔ دوسرے مسافر بھی ادھر ادھر اپنے اپنے سامان کو لیے بیٹھے تھے۔ ان مسافروں میں ایک گہرے سانولے رنگ کا دبلا پتلا ادھیڑ عمر دیہاتی ٹائپ کا آدمی بھی تھا جو اپنی گٹھڑی سامنے رکھے فرش پر بیٹھا تھا۔ چائے کا گلاس اس کے دونوں ہاتھوں میں تھا اور وہ اسے پھونکیں مار مار کر پی رہا تھا۔ اس مسافر کی طرف میرا دھیان اس لیے گیا کہ میں نے محسوس کیا کہ وہ ہمیں گھور کر دیکھ رہا تھا۔ میں نے ایک دو بار

نظریں دوسری طرف کرنے کے بعد جب دوبارہ نظریں اس پر ڈالیں تو وہ مجھے اور پاروتی کو گھورتا ہوا نظر آیا۔ نظریں ملتے ہی اس نے آنکھیں دوسری طرف کرلیں۔ میں نے سوچا کہ یہ کوئی متعصب ہندو ہے۔ اور اسے معلوم ہوگیا ہے کہ میں مسلمان ہوں اور ایک ہندو عورت کے ساتھ سفر کررہا ہوں۔ مگر میں نے پاروتی سے اس کا ذکر نہ کیا۔ آگرہ سے آگے دھول پور پر اور گوالیار تک کوئی لاری نہیں جاتی تھی۔ ہم نے بھی فیصلہ کیا کہ آگرہ سے جھانسی تک ریل گاڑی میں سفر کیا جائے۔ ہمیں دلی پولیس کا زیادہ خطرہ بھی نہیں رہا تھا۔ ہم دلی سے کافی دور نکل آئے تھے۔ چائے پینے کے بعد پاروتی کہنے لگی۔

"چلو ریلوے اسٹیشن پر چلتے ہیں۔ وہاں سے معلوم کرتے ہیں کہ جھانسی کو گاڑی کس وقت نکلتی ہے۔"

ہم نے تانگہ لیا اور متھرا کے ریلوے اسٹیشن کی طرف روانہ ہوگئے۔ میری نگاہ اس دیہاتی پر تھی جو ہمیں بار بار گھورتا رہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ وہ اپنی جگہ پر بیٹھا چائے پی رہا تھا۔ متھرا کے بازاروں میں بھی ہندوستان کے آزاد ہونے کی خوشیاں منائی جارہی تھیں۔ دکانوں پر کانگریس کے جھنڈے لہرا رہے تھے۔ اس شہر میں ویسے بھی ہندوؤں کی آبادی زیادہ تھی۔ تانگہ ایک آبادی سے گزرا جہاں خاموشی چھائی تھی۔ کوچوان ہندو تھا کہنے لگا۔

"یہاں مسلمان رہتے ہیں۔ کل تک یہ پاکستان زندہ باد کے نعرے لگاتے تھے۔ آج خاموش ہیں۔ اب یہ ہمارے غلام ہیں۔ ہم ان کو ایسا سبق سکھائیں گے کہ یہ یاد رکھیں گے۔"

میں نے آنکھیں بند کرکے دل میں دعا کی یااللہ یہاں کے مسلمانوں کو یہاں کے متعصب ہندوؤں سے بچانا۔ اسٹیشن پر بھی کانگریس کے جلوس نکلے ہوئے تھے۔ معلوم ہوا جھانسی کو جانے والی گاڑی رات کو جاتی ہے۔ ہم وہیں مسافر خانے میں ایک جگہ پر بیٹھ گئے۔ کچھ ہندو آزادی کی خوشی میں مٹھائی بانٹ رہے تھے۔ وہ ہمارے پاس بھی آئے۔ انہوں نے مجھے بھی ہندو سمجھ کر تھوڑی سی مٹھائی دی۔ پھر ایسا ہوا کہ ایک طرف سے ایک تانگہ آکر اسٹیشن کے سامنے رکا۔ اس میں کچھ برقع پوش مسلمان خواتین دو مرد اور بچے سوار تھے۔ ابھی تانگہ رکا ہی تھا کہ چوک کی طرف سے ہندو غنڈوں کا ایک گروہ چھرے اور ڈنڈے لیے نعرے لگاتا نمودار ہوا۔ وہ مسلمانوں کے خلاف نعرے لگارہے تھے۔ یہ گروہ تانگے کی طرف بڑھا۔ کوچوان نے فوراً گھوڑے کو دوڑادیا۔ ہندو غنڈے تانگے میں بیٹھی مسلمان عورتوں کو قتل کرنے کے لیے تانگے کے پیچھے دوڑے مگر خوش قسمتی ہوئی کہ تانگہ ان کی پہنچ سے نکل گیا۔ میں نے پاروتی سے کہا۔

"یہاں تو بلوہ شروع ہوگیا ہے۔"

وہ کہنے لگی۔ "گھبراؤ نہیں میں تمہیں کچھ نہیں ہونے دوں گی۔"

مگر اندر سے میں خوفزدہ ہوگیا تھا۔ پاروتی ناگن بن کر زیادہ سے زیادہ ایک دو حملہ آور ہندوؤں کو ہلاک کرسکتی تھی۔ وہ مجھے ہندوؤں کے ہجوم سے نہیں بچاسکتی تھی۔ میں ابھی یہ سوچ ہی رہا تھا کہ وہی دیہاتی آدمی جو لاری اڈے پر بیٹھا چائے پی رہا تھا ایک طرف سے نکل کر ہمارے پاس آکر بیٹھ گیا اور کہنے لگا۔

"ریلوے اسٹیشن پر ہندو غنڈوں کا حملہ ہونے والا ہے۔ میں نے اندازہ لگایا ہے کہ آپ مسلمان ہیں۔ میں بھی مسلمان ہوں میں آپ کو بچانے کے لیے آیا ہوں۔ میں گوالیار کا رہنے والا ہوں۔ یہاں آکر میں بھی پھنس گیا ہوں۔"

پاروتی اور میں اس کی طرف دیکھنے لگے۔ میں نے پوچھا۔

"تمہیں کیسے پتہ چلا کہ ہم مسلمان ہیں؟"

وہ بولا۔ "ایک مسلمان دوسرے مسلمان کو پہچان لیتا ہے۔ آپ مجھ سے بحث نہ کریں۔ اگر زندگی پیاری ہے تو میرے ساتھ آجائیں۔ یہاں رہے تو قتل ہوجائیں گے۔ مندر چوک میں ہندوؤں نے مسلمانوں کے گھروں کو آگ لگادی ہے۔ وہاں کتنے ہی مسلمان شہید ہوگئے ہیں۔"

پاروتی نے مجھ سے کہا۔

"میرا خیال ہے یہ آدمی میرا ہمدرد ہے۔ ہمیں اس کے ساتھ چلنا چاہیے۔"

اس وقت میں بھی گھبرایا ہوا تھا۔ میں نے ہندو غنڈوں کو مسلمانوں کے تانگے پر حملہ آور ہوتے دیکھ لیا تھا۔ ہم اس دیہاتی کے ساتھ چل پڑے۔ اس آدمی نے گٹھڑی بغل میں دبا رکھی تھی۔ وہ ہمارے آگے آگے چلنے لگا۔ اس نے ہمیں کہہ دیا تھا کہ ہم زیادہ ادھر ادھر نہ دیکھیں۔ وہ ہمیں اسٹیشن کے عقب میں لے آیا۔ یہاں ایک طرف مکانوں کے پچھواڑے تھے اور ایک جانب کھیت تھے۔ ہم کھیتوں میں چلنے لگے۔ راستے میں ایک پیپل کا گھنا درخت آیا۔ جس کے تلے میں رام سیتا لچھمن کی مورتیاں بنی ہوئی تھیں اور ایک سادھو بیٹھا پوجا پاٹھ کررہا تھا۔ ہم اس کے قریب سے ہوکر گزر گئے۔ کھیت ختم ہوئے تو ریلوے لائن آگئی۔ ریلوے لائن کے پار میدان تھا۔ میدان میں سے گزرنے کے بعد وہ پراسرار دیہاتی ہمیں مٹی کے ٹیلے کے پاس لے آیا۔ جہاں کسی حویلی کا ویران کھنڈر تھا۔ پراسرار دیہاتی کہنے لگا۔

"یہاں ہم بالکل محفوظ ہیں۔"

میں نے کہا۔ "لیکن ہمیں تو جھانسی کی رات والی گاڑی پکڑنی ہے۔"

پراسرار دیہاتی بولا۔ "رات کو میں خود تم لوگوں کے ساتھ اسٹیشن پر جاؤں گا۔ مجھے بھی گوالیار جانا ہے۔"

پاروتی نے اس سے پوچھا کہ تم کون ہو اور کیا کام کرتے ہو اور متھرا میں کیسے آئے ہو؟"

دیہاتی کہنے لگا۔ "بہن جی میں مسلمان ہوں۔ میرا نام عبداللہ ہے۔ میں گوالیار کے ایک گاؤں میں رہتا ہوں۔ چوڑیاں پراندے چل پھر کر بیچتا ہوں۔ مہینے میں ایک بار چوڑیاں پراندے اور رنگدار دوپٹے خریدنے متھرا آتا ہوں اور رات اسی کھنڈر میں بسر کرتا ہوں۔ اس بار آیا ہوں تو متھرا میں فسادات شروع تھے۔ لاری اڈہ پر بیٹھا سوچ رہا تھا کہ کیا کروں کہ آپ لوگوں کو دیکھا۔ آپ کے چہرے مہرے سے میں نے اندازہ لگالیا تھا کہ آپ بھی مسلمان ہیں۔ میرا اندازہ غلط نہیں نکلا۔ اب ایسا ہے کہ ہم لوگ یہاں رات ہونے تک آرام کریں گے۔ میں نے پتہ کرلیا تھا گوالیار جھانسی کو گاڑی رات گیارہ بجے کے بعد جائے گی۔ اب تم لوگ یہاں بیٹھو میں ساتھ والے گاؤں سے کھانے کو کچھ لاتا ہوں۔"

پراسرار دیہاتی ہمیں ویران حویلی کے کھنڈر میں بٹھا کر چلا گیا۔ اس کی گٹھڑی ہمارے پاس ہی پڑی تھی۔ ہم نے کھول کر دیکھا اس میں کانچ کی چوڑیاں اور رنگدار دوپٹے پراندے تھے۔

(باقی آئندہ ماہ)

❖

گمشدہ تھانیدار

مکرمی جناب
السلام علیکم!
میری سرپرستی کرنے اور میری کاوشوں کی نوک پلک درست کر کے شامل اشاعت کرنے کا شکریہ! آپ ہی کی وجہ سے میرے حوصلے بڑھ رہے ہیں اور مجھ میں اعتماد پیدا ہو رہا ہے' میں قارئین کا بھی شکر گزار ہوں کہ وہ میری کہانیوں کو پذیرائی بخش رہے ہیں۔ اس ماہ پھر ایک نئی تفتیشی کہانی کے ساتھ حاضر ہوں' اس کہانی میں پولیس کا ایک تھانیدار لاپتا ہے' امید ہے آپ کو اور قارئین کو یہ کہانی پسند آئے گی۔

ریاض بٹ
حسن ابدال

آج کل آپ لاپتا ہونے والے فراد کے متعلق اخبارات میں پڑھتے رہتے ہیں۔ آیئے آپ کو ایک لاپتا فرد کی کہانی سناتا ہوں۔

ایک صبح حسب معمول میں جب تھانے آیا' ڈی ایس پی صاحب کا حکم نامہ مجھے دیا گیا۔ جس کے مطابق مجھے ایک دوسرے تھانے میں وقتی طور پر چارج سنبھالنا تھا' اسے آپ وقتی ٹرانسفر کہہ سکتے ہیں۔ یہاں میری سیٹ اے ایس آئی رنا تنویر نے سنبھالنا تھی۔

بہرحال میں نے اگلے دن جا کر اس تھانے کا چارج سنبھال لیا۔ وہاں کے اے ایس آئی سلیم خان نے عملے سے میرا تعارف کروایا۔ اس اچانک وقتی ٹرانسفر کے پیچھے ایک کہانی پوشیدہ تھی۔

لیجیے آپ وہ کہانی سنیے۔

یہاں کا تھانیدار رفاقت علی خان اچانک لاپتا ہو گیا تھا۔ مجھے اسے ڈھونڈنا تھا۔ پتا یہ چلا کہ اسے جنوں نے غائب کیا ہے' گویا مجھے جنوں کو پکڑنا تھا۔ میں کوئی عامل وغیرہ تو نہیں تھا' ایک تھانیدار تھا اور مجھے اپنی تفتیش سے پتا لگانا تھا کہ اصل حقیقت کیا ہے۔

اے ایس آئی نے مجھے جو کچھ بتایا اس کا خلاصہ یہ ہے کہ کوئی آٹھ دن پہلے اس تھانے میں اطلاع آئی کہ شہر کے کالج میں ایک لڑکی کا قتل ہو گیا ہے۔ کالج کا نام اور شہر کا نام میں نہیں لکھ سکتا۔ لڑکی سیکنڈ ایر کی طالبہ تھی۔

جب رفاقت علی خان اپنے عملے کے ہمراہ کالج میں گیا تو لڑکی کی لاش دیکھی' لاش ایک غسل خانے میں پڑی تھی۔ دروازہ کھلا تھا' یہ غسل خانے کالج کی شمالی دیوار کے ساتھ تھے۔ دیوار تقریباً دس فٹ اونچی تھی اور اس کے اوپر شیشے وغیرہ لگے ہوئے تھے۔ میں نے پوسٹ مارٹم کی رپورٹ پڑھی' موت گلا دبانے سے ہوئی تھی اور یہ واضح طور پر لکھا تھا کہ جس ہاتھ نے یہ کام کیا ہے وہ غیر معمولی تھا یعنی عام آدمی کے ہاتھ سے بڑا تھا۔ جنوں والی کہانی یہ تھی کہ لڑکی پر ایک جن عاشق تھا' ایک شاہ جی اس کا علاج کر رہے تھے وہ ایک ماہ کالج سے غیر حاضر رہی تھی' اب ذرا ٹھیک ہونے پر کالج آئی تھی اور قتل ہو گئی تھی۔ اے ایس آئی سلیم خان کے بقول ابھی اب تک کی تفتیش سے بڑے خان صاحب (اس تھانے کے پہلے تھانیدار) نے اسے نہیں بتایا تھا۔ یہ غیر معمولی اور حیران کن بات تھی۔ اس دن یعنی جس دن رفاقت علی خان لاپتا ہوا تھا وہ اکیلا ہی تفتیش کے لیے گیا تھا پھر واپس نہیں آیا۔

یہ بات بھی انہونی تھی یعنی رفاقت علی خان اس کیس کی تنہا ہی تفتیش کر رہا تھا' اس کی وجہ ابھی اندھیرے میں تھی۔ اس اندھیرے میں تفتیش کی روشنی ڈال کر مجھے وجہ ڈھونڈنی اور تلاش کرنی تھی۔

اور مجھے امید کی کشتی پر سوار ہو کر اس دریا میں اترنا تھا۔ اس تھانے میں آئے ہوئے مجھے دوسرا دن تھا کہ مجھے اطلاع دی گئی مقتولہ (رخشندہ) کا والد اور بھائی آئے ہیں۔ میں نے فوراً انہیں اپنے کمرے میں بلالیا۔

چند لمحوں بعد میرے سامنے ایک پچاس سالہ شخص اور ایک جوان آدمی بیٹھا تھا۔

"تھانیدار صاحب! ہمیں پتا چلا تھا کہ اس تھانے میں نیا تھانیدار آیا ہے۔" جوان نے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔

"بالکل' جوان! مجھے اس کیس کی تفتیش کے لیے بھیجا گیا ہے لیکن آپ لوگ مجھے کچھ بتائیں گے تو بات آگے بڑھے گی۔" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

"دیکھیں تھانیدار صاحب! ہم نے خان صاحب کو سب باتیں (جو انہوں نے پوچھی تھیں) بتا دی تھیں۔" رخشندہ کے باپ نے غم زدہ آواز میں جواب دیا۔

وہ بالکل ڈھے سا گیا تھا۔ جوان بیٹی کی موت' وہ بھی ان حالات میں۔ کوئی معمولی صدمہ یا دھچکا نہیں ہوتا۔ اس لیے میں نے لہجے کو ذرا نرم رکھتے ہوئے کہا۔

"بڑے خان صاحب تو لاپتا ہیں۔ اس لیے مجھے نئے سرے سے اس کیس کی تفتیش کرنا پڑے گی۔"

"ٹھیک ہے آپ پوچھیں۔"

"یہ بات کہاں تک صحیح ہے کہ رخشندہ ایک جن کے قبضے میں تھی؟"

"ہماری لڑکی بڑی خوب صورت تھی تھانیدار صاحب!" باپ نے آنکھوں میں آئے ہوئے آنسوؤں کو رومال میں جذب کرتے ہوئے کہا۔ "ہم نے بھی سنا تھا کہ کسی جن وغیرہ کا چکر ہے۔"

"یہ بات آپ کو کس نے بتائی تھی؟"

"دراصل رخشندہ عجیب سی آوازیں نکالتی تھی۔ کبھی کبھی کسی مرد کی آواز میں بولتی تھی۔ ہم نے عامل جاوید شاہ صاحب کو دکھایا تو انہوں نے بتایا کہ ایک بڑا خبیث جن ہماری لڑکی کے پیچھے پڑ گیا ہے۔ شاہ صاحب اس کا علاج کر رہے تھے کہ یہ حادثہ ہو گیا۔"

باپ ایک بار پھر رونے لگ گیا۔

اس کے بعد ان سے کوئی اور کام کی بات معلوم نہ ہو سکی۔ میں نے ان کو تسلی اور دلاسہ دے کر رخصت کر دیا۔

اب یہ بات میں ان سے تو نہیں پوچھ سکتا تھا کہ کوئی لڑکا تو ان کی لڑکی پر عاشق نہیں تھا۔ یہ بات میں نے اپنے ذرائع سے معلوم کرنا تھی۔

عامل کے متعلق مجھے بتایا گیا کہ وہ شہر سے باہر رہتا ہے۔ اس کی کوٹھی دس مرلے پر ہے اور اس کے قبضے میں کئی جن بھی ہیں' اگلے دن میں نے ایک سپاہی کو ساتھ لیا اور کالج پہنچ گیا۔

پرنسپل ایک باریش اور اچھی صحت کا ملک تھا۔ ماتھا چوڑا' آنکھیں نیلی اور چہرہ تھوڑا سا گول تھا۔ اسے دیکھ کر ذہن میں ایک اچھا تاثر ابھرتا تھا' اس نے ہمیں اپنے دفتر میں بٹھا کر ہماری خاطر تواضع کی۔

اور پھر میرے کہنے پر ہمیں جائے وقوعہ پر لے گیا۔ واردات کو اتنے دن گزر چکے تھے کہ ہمیں کسی کھرے کھوج کے ملنے کی توقع نہیں تھی لیکن میں کچھ اندازہ لگانا چاہتا تھا۔ اندھیرے میں کسی کرن کا کھوج لگانا چاہتا تھا۔

مجھے اپنے مقصد میں کس حد تک کامیابی ہوئی تھی' فی الحال میں یہ نہیں بتا سکتا۔ کالج سے واپس آ کر میں نے اے ایس آئی کو اپنے کمرے میں بلالیا۔

"ہاں بھئی سلیم صاحب! اس کیس کے متعلق

آپ کی کیا رائے ہے؟ آپ کے خیال میں کیا واقعی یہ کسی جن وغیرہ کا کارنامہ ہے۔" جب وہ میرے سامنے بیٹھ چکا تو میں نے ہنستے ہوئے استفسار کیا۔

"سر! جنوں وغیرہ کے وجود سے انکار تو نہیں کیا جاسکتا۔" اس نے کہا۔ اس کے لہجے سے میں نے اندازہ لگایا کہ کمزور عقیدے کا بندہ ہے۔

"بھئی میں اس معاملے پر بحث نہیں تمہارا نقطۂ نظر جاننا چاہتا ہوں۔"

"سر بظاہر تو یہی لگتا ہے کہ...... یہ......"

"کسی جن کا کارنامہ ہے۔" وہ ہچکچاہٹ کا شکار ہوا تو میں نے فقرہ مکمل کردیا۔

"سر تفتیش تو کرنا پڑے گی، بغیر تفتیش کے ہم اسے جنوں کا کارنامہ نہیں لکھ سکتے۔" اپنی طرف سے اس نے گویا عقل مندی کی بات کی۔

"تم ٹھیک کہتے ہو مگر ذرا یہ بات تو بتاؤ کہ عاشق جن کس وجہ سے اپنی محبوبہ کو قتل کرتے ہیں؟"

"اس بارے میں سر! میں کیا بتا سکتا ہوں؟" اس نے شکست خوردہ لہجے میں کہا۔

میں نے اس کی باتوں سے اندازہ لگالیا کہ یہ اے ایس آئی خانہ پوری ہی ہے اور اب یہ بات میں وثوق سے کہہ سکتا تھا کہ رفاقت علی خان اسی وجہ سے تنہا تفتیش کررہا تھا۔

مجھے اے ایس آئی سے کچھ بھی حاصل نہ ہوا۔ اب مجھے اکیلے ہی نئے سرے سے سب کچھ کرنا تھا۔

میں نے اے ایس آئی کو جانے کی اجازت دی اور خود سادہ کپڑوں میں وہاں پہنچ گیا جہاں جاوید شاہ رہتا تھا۔ وہاں جاکر معلوم ہوا کہ شاہ صاحب کہیں گئے ہوئے ہیں اور ان کے آنے کے متعلق کچھ پتا نہیں کہ کب آئیں گے۔ میں اس کے چیلوں کو ابھی یہ نہیں بتانا چاہتا تھا کہ میں کون ہوں اور کیوں آیا ہوں؟ لیکن بات تو بنانی تھی وہ میں نے بنادی۔

ذہین قارئین سمجھ گئے ہوں گے اس لیے بتانے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔

اب تھانے میں مجھے ایک ایسے اہلکار کی ضرورت تھی جو قابلِ اعتبار ہو اور تو ہم پرست نہ ہو آخر تھانے کے عملے میں مجھے ایک ایسا اہلکار مل ہی گیا، بڑا خوب صورت جوان تھا، قد سات فٹ سے زیادہ ہی ہوگا ماتھا چوڑا تھا، ذہین لگتا تھا۔ رینک اس کا کانسٹیبل تھا اور منور نام تھا۔

میں نے اسے سمجھایا کہ اس نے کیا کرنا ہے؟ وہ سر ہلا کر چلا گیا۔

یہ اسی شام کی بات ہے کہ میں اور کانسٹیبل منور اس تھانے کے ایک مخبر کے گھر بیٹھے ہوئے تھے، ہم سادہ کپڑوں میں تھے، مخبر نے ہمارے لیے چائے پانی کا بندوبست کیا ہوا تھا، وہ بھی اے ایس آئی سلیم خان سے شاکی تھا۔

ہم یہاں صرف چائے پانی تو پینے نہیں آئے تھے۔ مخبر کو تھانے نہیں بلانا چاہتے تھے۔ اس لیے اس کے گھر آگئے تھے۔ اس نے رخشندہ کے متعلق بتایا کہ اس کی کسی کے ساتھ دوستی یا عشق وغیرہ والی بات نہیں تھی، کردار کی پختہ تھی۔ یہ کوئی اور ہی چکر تھا اور اسی چکر کو پورا کرنے کے لیے مجھے بھیجا گیا تھا۔ لاپتا تھانے دار کا معاملہ اپنی جگہ تھا۔

کچھ دیر کے بعد ایک لڑکی کو ہمارے سامنے لایا گیا۔ یہ سب مخبر کی بیوی کا انتظام تھا۔

لڑکی گھبرائی ہوئی تھی، عمر اٹھارہ انیس سال رہی ہوگی۔ یہ لڑکی اسی کالج میں پڑھتی تھی جس میں رخشندہ پڑھتی تھی، دونوں دوست اور کلاس فیلو تھیں۔ ہم نے اس سے کہا۔

"دیکھو بی بی! گھبرانے اور ڈرنے کی بالکل ضرورت نہیں ہے۔ ہم پوچھ گچھ کے لیے مطلوبہ بندے یا بندی کو تھانے بلوایا کرتے ہیں مگر ہم خود چل کر آگئے ہیں۔"

"تھانیدار صاحب میں نے کون سا جرم کیا ہے؟" وہ تڑ سے بول اٹھی۔ لڑکی منہ پھٹ اور تیز طرار لگتی تھی۔

یہاں تو گھی سیدھی انگلی سے نکل سکتا تھا، اس لیے ہم نے انگلیوں کو سیدھا ہی رکھنے کا فیصلہ کیا۔

"تم نے کوئی جرم نہیں کیا، تمہاری پیاری سہیلی قتل ہوگئی ہے۔ ہم صرف یہ چاہتے ہیں کہ تم ہم سے کوئی بات نہ چھپاؤ، چھوٹی سے چھوٹی بات، معمولی سے معمولی واقعہ بھی ہمیں بتادو، تاکہ ہم تمہاری سہیلی کے قاتل کو قرار واقعی سزا دلوا سکیں۔ میں نے کانسٹیبل کو خاموش رہنے کا اشارہ کرتے ہوئے براہ راست لڑکی طرف دیکھتے ہوئے نرم لہجے میں یہ چھوٹی سی تقریر جھاڑ دی۔

میں نے دیکھا کہ اس کی آنکھوں میں پانی سا آگیا ہے، واقعی اسے اپنی سہیلی سے محبت تھی۔ چند لمحوں کے بعد اس نے کہا۔

"تھانیدار صاحب! اگر میرے بس میں ہو تو میں قاتل کو اپنے ہاتھ سے قتل کروں، رخشندہ میری بڑی پیاری اور اچھی سہیلی تھی۔"

"اس کام کے لیے ہم بیٹھے ہیں نا۔" میں نے ہمدردانہ لہجے میں کہا۔

جیسا کہ میں اکثر کہتا ہوں میں کئی بار کہہ چکا ہوں، وہ اس اسٹیج پر آگئی تھی کہ اپنا دل کھول کر ہمارے سامنے رکھ دیتی پھر ایسا ہی ہوا اور ہمیں چند اشارے مل گئے، جو شاید قاتل تک ہماری رہنمائی کردے۔ ان باتوں کا ذکر کرنا سب موقع پر آئے گا، ہم وہاں سے اٹھ آگئے اور سیدھا تھانے آکر دم لیا۔

اگلی صبح ہمارا پروگرام رخشندہ (مقتولہ) کے گھر جانے کا تھا لیکن اس کا باپ اور بھائی خود ہی مجھ سے ملنے کے لیے آگئے، میں نے انہیں بٹھایا اور سوالیہ نگاہوں سے ان کی طرف دیکھنے لگا۔ دونوں شکل سے پریشان لگتے تھے کوئی ایسا واقعہ ہوچکا تھا جس نے انہیں اس حال تک پہنچا دیا گیا تھا، آخر مقتولہ کے بھائی نے لب کھولے۔

"تھانیدار صاحب! رات ہمارے گھر چور آگئے تھے۔"

"کیا مطلب؟" میں نے اچھلتے ہوئے کہا۔ "کیا چوری ہوا ہے؟"

"چوری تو کوئی خاص نہیں ہوئی، صرف رخشندہ کی ڈائری اور پرس چوری ہوا ہے لیکن کمرے کی حالت......" باپ نے فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔

میں سمجھ گیا کہ وہ کیا کہنا چاہتا تھا بہر حال میں نے منور کو ساتھ لیا اور ان کے گھر پہنچ گیا۔

کمرے کی حالت دیکھ کر یوں لگتا تھا۔ جیسے وہاں دو چار بپھرے ہوئے سانڈ گھس آئے ہوں۔ اٹیچی کیس کے تالے ٹوٹے ہوئے تھے۔ اوپر کا استر پھٹا ہوا تھا یعنی اندر والی سائیڈ جو خالی بنا ہوتا ہے، چیزیں اِدھر اُدھر بکھری ہوئی تھیں۔ سرہانے پھٹے ہوئے تھے، ان سے روئی جھانک رہی تھی۔ بستر وغیرہ نیچے پڑا تھا۔ سنگھار میز کی درازیں کھلی ہوئی تھیں مختصراً یہ کہ کمرے کی حالت دیکھ کر یوں لگتا تھا جیسے چوروں کو کسی چیز کی تلاش ہو۔

میں نے ضروری کارروائی کرنے کے بعد کمرے کو سر بمہر کرنے کا بندوبست کردیا۔

پھر میں نے کانسٹیبل کو کچھ ہدایات دے کر بھیج دیا اور خود گھر کی بیٹھک میں آکر بیٹھ گیا۔

مقتولہ کا باپ میرے سامنے بیٹھا تھا۔ اس کا سر جھکا ہوا تھا۔ میں نے کھنکھار کر گلا صاف کرتے ہوئے کہا۔

"اتنی بڑی افراتفری مچی رہی آپ کے گھر میں اور آپ سب بے خبر سوتے رہے۔"

ایک بات کا ذکر کرنا میں بھول گیا کہ اس دوران میں نے چوروں کے آنے جانے کا رستہ ڈھونڈ لیا تھا۔ وہ عقبی دیوار پھاند کر آئے تھے اور اُدھر سے ہی واپس چلے گئے تھے۔ صحن پکا تھا، باہر گلی بھی اینٹوں

سے پکی کی ہوئی تھی۔ اس لیے کسی قسم کے کھرے ملنے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ اب ہمیں اندھیرے میں سوئی ڈھونڈنا تھی۔

مقتولہ کے باپ نے میری طرف زخمی نظروں سے دیکھا پھر ٹوٹے ہوئے لہجے میں بولا۔

''تھانیدار صاحب! یقین جانیں ہمیں بالکل خبر نہیں ہوئی' البتہ ایک بات مجھے کھٹک رہی ہے۔''

''کون سی بات؟'' میں نے جلدی سے استفسار کیا۔

''صبح ہم سو کر اٹھے تو ذہن بوجھل تھے اور بڑی مشکل سے آنکھیں کھل رہی تھیں۔''

''کیا سب گھر والوں کی یہی کیفیت تھی؟'' میں نے چونکتے ہوئے کہا۔

''بالکل جناب......'' اس نے بڑے اعتماد سے کہا۔

یہاں اس بات کی وضاحت کردوں کہ اس گھر میں کُل چار افراد تھے اب رخشندہ کے قتل کے بعد تین رہ گئے تھے۔

''رات آپ لوگ کھانا کھانے کے بعد چائے وغیرہ پیتے ہیں۔'' میں نے ایک خیال کے تحت پوچھا۔

''ہم رات کے کھانے کے بعد چائے ضرور پیتے ہیں۔'' اس نے جواب دیا۔

''آپ دودھ وغیرہ کہاں سے لیتے ہیں؟''

یہاں اس بات کی وضاحت کردوں کہ جس دور کی یہ کہانی ہے اس دور میں ڈبوں والے دودھ کا تصور بھی نہیں تھا۔ لوگ خاص بھینسوں کا دودھ استعمال کرتے تھے اور کسی کسی گھر میں گائے بھی نظر آتی تھی۔

اس نے بتایا کہ افضل گجر کے گھر سے ہمارا دودھ آتا ہے۔ اب یہاں میں بات کو ذرا مختصر کرتا ہوں کافی تگ ودو کے بعد یہ بات سامنے آئی کہ دودھ افضل گجر کا دس سالہ بیٹا راشد لے کر آتا تھا۔ اس نے بتایا کہ اس دن وہ حسب معمول دودھ لے کر آرہا تھا کہ ایک آدمی لنگڑاتا ہوا آیا اور انتہائی دھیمی آواز میں بولا۔

''بیٹا! میری ٹانگ میں درد ہے تم ذرا یہ دودھ مجھے پکڑاؤ اور سامنے والی دکان سے وڈ بائن سگریٹ کی ایک ڈبی لا کر دے دو۔ خدا تمہارا بھلا کرے گا اور یہ بھی کہ جو پیسے بچیں اس کی چیز لینا۔'' راشد سیدھا سادہ لڑکا تھا۔ اس نے یہ کام کردیا۔ راشد کے لیے وہ شخص اجنبی تھا' بہرحال اس شخص کا حلیہ اپنی یادداشت کے سہارے راشد نے مجھے بتادیا اور میں نے اپنے ذہن کو تکلیف دیتے ہوئے اس پُراسرار شخص کا حلیہ ذہن نشین کرلیا۔

تھانے میں واپس آکر میں نے چائے پی' میرا دماغ دکھنے لگ گیا تھا۔ یہ کیس عجیب گورکھ دھندا تھا۔

جو باتیں مقتولہ کی سہیلی نے بتائی تھیں۔ ان سے ایک خاکہ سا میرے ذہن کے پردے پر نمودار ہوا تھا لیکن ابھی اس میں بہت سے رنگ بھرنے باقی تھے اور یہ بھی ہوسکتا تھا کہ بات ہی کچھ اور ہو۔ قارئین آپ کے ذہن میں کچھ خاکہ بن رہا ہوگا' خاطر جمع رکھیے۔

کچھ دیر کے بعد میں نے منور کو طلب کیا اور کہا۔

''تھانے میں کون ایسا اہلکار ہے جو خاکہ بنا سکتا ہو؟''

اس نے فوراً جواب دیا: ''سر اکبر اس کام کا ماہر ہے۔''

اکبر ایک سپاہی تھا اور جب خاکہ بن کر میرے سامنے آیا تو میں سوچوں کے گھوڑے دوڑانے لگا کہ اس بندے کو کہاں دیکھا ہے اور پھر میرے ذہن میں ایک جھماکا سا ہوا' اس بندے کو تو میں نے کالج میں دیکھا تھا۔

جی ہاں اور یہ وہاں کا چوکیدار تھا۔ مجرموں نے حماقتیں شروع کردی تھیں' مقتولہ کی سہیلی نے بھی اس کی طرف اشارہ دیا تھا۔ پھر ایک گھنٹے کے اندر اندر وہ میرے سامنے تھا۔ اس کے آنے سے پہلے میں نے راشد کو بھی بلوالیا تھا اور اسے ایک کمرے میں چھپا کر بٹھا دیا تھا۔ سپاہی اکبر اور کانسٹیبل منور بھی اس وقت میرے کمرے میں تھے جب میں نے اسے نیچے سے اوپر تک گھورا۔ تو وہ تھر تھر کانپنے لگا۔

''کیا نام ہے تمہارا؟'' میں نے سخت لہجے میں کہا۔

''جی...... جی...... جہانگیر......!''

''دودھ میں کیا ملایا تھا؟''

''دودھ...... کون سا دودھ...... میرا مطلب ہے؟'' اس نے چالاک بننے کی کوشش کی۔

میں نے سپاہی کو اشارہ کیا۔ اس نے اسے دھکا دیا اور وہ میری میز پر آرہا۔ میں نے ایک زوردار طمانچہ اس کے منہ پر جڑتے ہوئے کہا۔

''اب کیا دودھ کا مطلب انگریزی میں سمجھاؤں؟''

اس کے ہونٹ پھٹ گئے تھے اور ان سے خون رسنے لگا تھا' ایسے مجرموں پر مجھے ذرا بھی رحم نہیں آتا تھا۔

بہر حال اس نے دودھ میں خواب آور دوائی ملانے کا اقرار کرلیا۔ تھوڑے سے پیسوں کی خاطر اس نے یہ کام کیا تھا۔ اسے پتا تھا کہ افضل گجر کا بیٹا دودھ دینے رخشندہ (مقتولہ) کے گھر جاتا ہے۔ ویسے مجھے اس پر ایک شک اور بھی تھا' اس لیے میں نے اسے سپاہی اکبر اور کانسٹیبل منور کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔

''اسے لے جاؤ۔ کل صبح تک اس کا پورا ریکارڈ چاہیے۔'' پھر میں نے اپنا شک منور پر ظاہر کردیا۔ اس کے لیے میں نے اپنا منہ اور اس کا نام استعمال کیا تھا۔ ویسے اس نے حاکو کا نام لیا تھا۔ جس نے اسے اس کام کے لیے آمادہ کیا تھا' میں جہانگیر سے کچھ اور بھی اگلوانا چاہتا تھا۔

یہ کیس اس تیزی سے آگے بڑھا تھا کہ مجھے جاوید شاہ کے پاس دوبارہ جانے کا موقع ہی نہیں ملا تھا۔

شام کے سائے دھرتی پر آہستہ آہستہ اپنا قبضہ جما رہے تھے جب میں اکیلا ہی سادہ کپڑوں میں اس کے پاس پہنچ گیا۔

اس کا حجرہ یا کمرہ 10x10 گز کا ہوگا۔ میں نے غور سے اسے دیکھا' رنگ سانولا' آنکھیں موٹی موٹی' ماتھا تنگ اور گردن بھی موٹی تھی' جیسے اس پر چربی کی تہیں چڑھی ہوئی ہوں۔

اب مجھے اپنا آپ چھپانے کی کوئی ضرورت نہیں تھی' میں نے اپنا تعارف کروایا اور اصل موضوع کی طرف آگیا۔

اس وقت حجرے میں ہم دونوں ہی تھے۔

''جناب! آپ اس فقیر کے پاس کیا پوچھنے آئے ہیں؟ ہمارا آپ کی دنیا سے کیا لینا دینا۔'' اس نے خاکسار لہجے میں کہا۔ میرے تعارف کروانے کے بعد وہ بھیگی بلی بن گیا تھا۔

''قبلہ...... پیر صاحب! آپ مجھ سے اپنی عزت ہی کروائیں تو بہتر ہے۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے خشک لہجے میں کہا۔

''اوہ سرکار! آپ تو ناراض ہوگئے۔ آپ جیسے تھانیداروں کی وجہ سے ہماری روزی روٹی چلتی ہے۔ پوچھیں کیا پوچھنا ہے؟'' اس کی باتوں سے میں نے اندازہ لگایا کہ اس کے پاس کچھ نہیں ہے۔ بس لوگوں کی کم عقلی اور بیوقوفی کی وجہ سے اس کا کام چل رہا تھا۔

''یہ رخشندہ کا کیا قصہ ہے؟ کیا واقعی کوئی جن اس پر عاشق ہوگیا تھا؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

"جناب جن تو نہیں البتہ......" وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا پھر اس نے ایک عجیب حرکت کی۔ اچانک اس نے اپنی پیٹھ میری طرف کرتے ہوئے پیچھے سے قمیص اوپر کردی۔

اس کی پیٹھ پر کسی بید کی ضربوں کے نشان تھے۔ وہ سیدھا ہوکر بیٹھ گیا تو میں نے تعجب بھری نگاہوں سے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

"یہ کیا......؟"

"جناب! اس نے مجھے جان سے مارنے کی دھمکی دی ہے۔ ایک دن اس کے بندے مجھے جن نکلوانے کے بہانے اپنے گھر لے گئے تھے اور مجھ سے رخشندہ کے متعلق پوچھتے رہے تھے پھر انہوں نے مجھے چھڑی سے پیٹھ پر مارا تھا' مجھے حقیقت بتائے ہی بن پڑی کیونکہ وہ تو میری کھال گرانے کے درپے ہوگئے تھے۔

"پھر......"

اس نے مجھے سب کچھ بتادیا۔ فی الحال وہ مجھے کسی غیر قانونی کام میں زیادہ ملوث نظر نہیں آرہا تھا۔ صرف اس نے رخشندہ والا معاملہ پولیس سے چھپایا تھا۔ میں نے اسے سخت لہجے میں تنبیہہ کرتے ہوئے کہا کہ وہ منظر سے غائب نہ ہو' کسی وقت بھی اس کی ضرورت پڑسکتی ہے۔ اس نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔

"سرکار میرا کیا ہوگا؟ وہ کافر باخبر ہے' لگتا ہے اس کا پورا گروہ ہے۔ مجھے وہ زندہ نہیں چھوڑے گا۔"

اچانک میرے ذہن میں ایک اسکیم در آئی۔ اسکیم میں کامیابی کے ففٹی ففٹی چانس تھے۔

میں نے جاوید شاہ سے کہا۔ رات کسی وقت چار پولیس اہلکار تمہاری حفاظت کے لیے بھیج دوں گا۔

"ذرا مجھے یہ تو بتاؤ' کیا واقعی تمہارے قبضے میں کچھ جن ہیں اور تم جن نکال بھی سکتے ہو؟" میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ اس نے میری طرف دیکھا اور سر جھکا لیا۔ میں ساری بات سمجھ گیا۔

جس وقت تھانے میں واپس آیا تو رات کے نو بج رہے تھے۔ وہ گرمیوں کے دن تھے۔ میں نے اسی وقت ڈی ایس پی صاحب کو فون کیا۔ ان سے درخواست کی کہ مجھے ضلع کے بڑے تھانے کے چار کمانڈو قسم کے اہلکار چاہئیں پھر میں نے انہیں ساری بات بتادی کہ میں اس تھانے کے عملے کو علیحدہ رکھنا چاہتا ہوں۔ مجھے ایسے اہلکار چاہئیں جن کو یہاں کوئی پہچانتا نہ ہو۔

وجہ قارئین سمجھ گئے ہوں گے۔

رات گیارہ بجے چار مطلوبہ اہلکار جاوید شاہ کے ڈیرے تک پہنچ گئے تھے۔ وہ اسلحے سے لیس تھے اور سادہ کپڑوں میں تھے۔ جاوید شاہ کی طرف سے مجھے کسی قسم کی شرارت کی توقع نہیں تھی۔ وہ تو خود ڈرا ہوا تھا۔ میری اسکیم کی کامیابی کا دارومدار اس بات پر تھا کہ اگر جاوید شاہ کو مارنے یا اٹھانے کوئی آتا تو......؟

اس کے بعد میں نے شبینہ ڈیوٹی والے ہیڈ کانسٹیبل کو ضروری ہدایات دیں اور تھانے سے متعلقہ کوارٹر میں آرام کرنے چلا گیا۔ وہ رات خیریت سے گزر گئی۔

میں تیار ہوکر دوسری صبح تھانے پہنچا تو مجھے بتایا گیا "مال تیار ہے" میں سمجھ گیا کہ کون سے مال کی بات ہورہی ہے۔

کچھ دیر کے بعد جہانگیر میرے سامنے لایا گیا' اس کی حالت ویسی ہی تھی جیسی ایک رات ڈرائنگ روم (تھانے) میں گزار کے آنے والے ملزموں یا مجرموں کی ہوتی ہے۔ جہانگیر نے میرے شک پر حقیقت کی مہر ثبت کردی۔

اس نے اقرار کرلیا کہ حاکو کو اس نے کالج میں اپنی کوٹھری میں چھپادیا تھا۔ اس کی کوٹھری غسلخانوں یا باتھ رومز کے پاس ہی تھی۔ جس وقت مقتولہ باتھ رومز کی طرف آئی اس وقت وہاں کوئی اور لڑکی نہیں تھی۔ جہانگیر نے دوڑ کر حاکو کو اطلاع کردی تھی پھر حاکو کو بحفاظت اس نے کالج سے باہر بھی نکال دیا تھا۔ میرے ایک سوال کے جواب میں جہانگیر نے یہ بتایا کہ اگر حاکو کو کوئی دیکھ لیتا تو وہ اسے اپنا کوئی رشتے دار ظاہر کردیتا۔

ویسے قارئین! ان دنوں اس قسم کے حالات نہیں تھے جیسے آج کل ہیں۔ دہشت گردی اور خودکش دھماکوں کا دور دور نشان نہیں تھا۔ میں نے جہانگیر کو دوبارہ حوالات میں بھیج دیا۔

یہاں ایک بات کا ذکر کرنا ضروری ہے کہ اس دوران کالج کی پرنسپل صاحبہ آئی تھیں اور میں نے انہیں حالات سے باخبر کردیا تھا۔

جہانگیر نے ایک اور بات کا اقرار بھی کیا تھا' جس کو مناسب موقع پر بیان کیا جائے گا۔ یہی بات مقتولہ کی سہیلی نے بھی بتائی تھی۔ جو اہلکار جاوید شاہ کے ڈیرے پر گئے تھے۔ ان کو میں نے ساری اسکیم سمجھادی تھی۔ ایک اہلکار نے فوری طور پر میرے پاس ہونا تھا۔ باقی تینوں نے اپنا کام کرنا تھا' وہ جاسوسی کرنے اور خود کو خفیہ رکھ کر کارروائی کرنے کے ماہر تھے۔

یہ معاملہ ایسا تھا کہ مجھے پھونک پھونک کر قدم رکھنے تھے۔ مجرم چالاک بھی تھے اور اثر و رسوخ والے بھی۔ کچا ہاتھ میرے لیے مصیبت کا باعث بن سکتا تھا۔

اس روز مجھے تھانے میں رہنا تھا۔ میری چھٹی حس نے مجھے خبردار کردیا تھا کہ آج کچھ نہ کچھ ہونے والا ہے۔ جاوید شاہ کے ڈیرے پر بھی چار پانچ ہٹے کٹے بندے موجود تھے اور وقت پڑنے پر مدد کرسکتے تھے۔ آخر وہ لمحہ آگیا' جس کا انتظار تھا۔

رات ایک بجے اہلکار نے مجھے آکر بتایا کہ کام ہوگیا ہے۔ اس نے بتایا کہ ہم دو آدمی پوری طرح چوکنے ہوکر جاوید شاہ کی چارپائی کے نیچے چھپے ہوئے تھے۔ دو بندے صحن میں ایک خفیہ جگہ پر دبکے ہوئے تھے۔ انہوں نے دیکھا کہ دو بندے کالے کپڑوں میں چہروں کو ڈھانپے ہوئے ڈیرے کے صحن میں کودے ہیں' وہ کسی تیز رفتار سانپ کی طرح سینے کے بل رینگتے ہوئے ان سایوں کا تعاقب کرنے لگے اور جونہی وہ جاوید شاہ کے کمرے میں داخل ہوئے انہوں نے آن واحد میں انہیں دبوچ لیا اور مخصوص سیٹی بالکل ہلکی آواز میں بجائی۔

چارپائی کے نیچے چھپے اہلکار بھی باہر نکل آئے۔

انہوں نے بتایا کہ ان کا ایک ساتھی باہر گھوڑوں کے پاس کھڑا ہے اور وہ جاوید شاہ کو قتل کرنے آئے تھے۔ چند لمحوں بعد تیسرا بھی ان کے قبضے میں تھا۔ انہوں نے پھرتی سے تینوں کی مشکیں کیں اور ان کو گاڑی میں ڈال کر ایک اہلکار یہاں لے آیا۔ باقی تینوں اپنے اگلے مشن پر روانہ ہوگئے تھے۔ میں نے تینوں کو حوالات میں بند کردیا۔

گاڑی ہم نے اس مقصد کے لیے ڈیرے کے باہر ایک جگہ گھاس پھوس وغیرہ ڈال کر چھپائی تھی۔

یہ بات بھی پتا چل چکی تھی کہ اس وقت ڈیرے پر حاکو اور ایک بندہ تھا۔ باقی بندے کہاں تھے اس کا ذکر آگے آئے گا۔

صبح کی اذانیں ہورہی تھیں' جب حاکو اور اس کا ساتھی میرے سامنے تھے۔ حاکو کی ٹانگ زخمی تھی' اس نے کافی مزاحمت کی تھی لیکن پانچ تربیت یافتہ کمانڈو اہل کاروں کے ساتھ تھا لیکن جب تک اسے ٹانگ پر گولی نہیں لگ گئی اس نے اسلحہ نہیں پھینکا تھا' اس کا ساتھی تو بے خبر سو رہا تھا' اس لیے قابو کرلیا گیا تھا۔ حاکو اپنے ساتھیوں کی واپسی کا منتظر تھا۔

حاکو کی ٹانگ سے کافی خون بہہ چکا تھا۔ اس لیے میں نے اسے ایک اہلکار کے ساتھ سرکاری اسپتال بھیج دیا اور اس کے ساتھی کو اپنے ساتھیوں کے پاس پہنچادیا تھا۔

صبح صبح میں نے ڈی ایس پی صاحب کو حالات سے آگاہ کردیا تھا اور انہوں نے مجھے شاباشی دیتے ہوئے کہا تھا۔

"تم نے بڑی ذہانت سے سب کچھ کیا ہے‘ جس کے لیے تم مبارک باد کے مستحق ہو۔"

ایک بات اور میں نے حاکو کی نگرانی کا معقول اور مناسب بندوبست بھی کردیا تھا۔

اگلے دن میں اور کانسٹیبل منور اسپتال میں بیٹھے حاکو کی کہانی سن رہے تھے۔

حاکو کا اصل نام حاکم دین تھا اور اسے حاکو‘ حاکو کہتے تھے۔ اس کے والدین ایک حادثے میں فوت ہوگئے تھے اس وقت حاکو کی عمر صرف نو سال تھی۔ وہ ماموں اور ممانی کے پاس رہنے لگا بلکہ ماموں اسے خود لے کر آیا تھا۔ کچھ عرصہ بعد ممانی کی نظریں بدلنے لگیں۔ وہ اسے مارنے پیٹنے بھی لگیں۔ ایک دن اس نے غصے میں آ کر ممانی کے سر پر ایک برتن دے مارا اور خود گھر سے بھاگ آیا۔

وہ کہاں کہاں مارا مارا پھرا۔ یہ ایک الگ کہانی ہے۔ اگر میں یہ سب کچھ بیان کرنے لگوں تو کہانی بہت طویل ہوجائے گی۔ مختصراً یہ کہ وہ پکے استادوں کے ہاتھ لگ گیا۔ جنہوں نے اسے جرائم کی دنیا کا رستہ دکھا دیا۔ جوان ہونے تک وہ ایک پکا بدمعاش اور اِدھر کا مال اُدھر‘ اُدھر کا مال اِدھر کرنے میں تاک اور ماہر ہوچکا تھا۔ کچھ عرصے کے بعد اس نے سوچا کہ دوسروں کے کام کرنے سے کوئی خاص فائدہ نہیں ہوتا۔ اس نے اپنا گروہ ترتیب دیا اور منشیات کا دھندا شروع کردیا۔

پھر وہ دور آیا کہ پاکستان میں ہیروئن کی وبا آ گئی۔ اس میں پیسہ زیادہ تھا۔ جس کالج میں رخشندہ پڑھتی تھی‘ وہاں زیادہ تر امیر کبیر گھرانوں کی لڑکیاں پڑھتی تھیں۔ جہانگیر (کالج کا چوکیدار) نے ایک بات یہ بھی بتائی تھی کہ حاکم عرف حاکو نے اس کی مجبوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مقتولہ کو ہیروئن کی پڑیاں دے کر کہا کہ کالج کی لڑکیوں کو اس کا عادی بناؤ۔ اب یہاں تھوڑی سی کہانی مقتولہ کی سہیلی کی بھی سنیے۔

اس نے ہمیں بتایا تھا کہ مقتولہ ان دنوں چڑچڑی ہوگئی تھی۔ بات بات پر کھانے کو دوڑتی تھی اور اپنے پرس کو ہر وقت اپنے سینے کے ساتھ لگا کر رکھتی تھی۔ ایک دن وہ نہ جانے کس موڈ میں تھی کہ پرس چھوڑ کر باتھ روم میں چلی گئی۔ اس دن وہ سہیلی کے گھر آئی ہوئی تھی۔

تجسس سے مجبور ہوکر جب سہیلی نے پرس کھولا تو اس کے ایک خانے میں پڑیاں دیکھ کر دنگ رہ گئی۔ ایک پڑی کھول کر اس نے سونگھا تو اس پر انکشاف ہوا کہ یہ تو ہیروئن ہے کیونکہ ان کا ایک رشتے دار اس نشے کا عادی تھا۔ اس کے پاس ایسی پڑیا سہیلی نے دیکھی تھی۔ اس نے پرس واپس رکھ دیا‘ جب مقتولہ واپس آئی اور جونہی اس کی نظر پرس پر پڑی تو اس نے پھرتی سے اسے اٹھاتے ہوئے کہا۔

"تم نے اسے کھولا تو نہیں۔"

"کھولا تھا۔" سہیلی نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

"پھر......؟" اس نے نظریں چراتے ہوئے کہا۔

"رخشندہ! یہ کیا‘ تمہارے پرس میں ہیروئن؟"

وہ رو پڑی اور ہاتھ جوڑ کر بولی۔ "شکیلہ! تمہیں میری قسم ہے‘ کسی سے ذکر نہ کرنا۔" اور ساری بات بتادی اور یہ بھی کہا۔ "میں جب زیادہ مجبور ہوتی ہوں تو تھوڑی سی پی لیتی ہوں لیکن شکیلہ! میں نے ابھی تک کسی اور لڑکی کو نہیں دی۔ میرا ضمیر اور دل نہیں مانتا۔ اب میں کیا کروں۔ مجھے کوئی راستہ بتاؤ؟" کہنے کو تو شکیلہ اس سے کہہ سکتی تھی کہ تم بُری پھنس گئی ہو لیکن اس نے اپنی اتنی پیاری سہیلی کو مزید خوف زدہ کرنا مناسب نہیں سمجھا اور اسے گلے سے لگاتے ہوئے کہا۔ آئندہ تم ہیروئن نہیں پیوگی‘ ابھی یہ پہلی اسٹیج ہے

تم اس سے چھٹکارہ حاصل کرسکتی ہو۔ پھر وہ اپنی ایک واقف کار لیڈی ڈاکٹر کے پاس اسے لے گئی۔ اس نے دوا دی اور کہا وقت لگے گا‘ وہ لیڈی ڈاکٹر جاوید شاہ کی معتقد تھی‘ اس نے اسے وہاں سے تعویز لانے کے لیے بھی کہا۔

پھر ایک دن دونوں وہاں جا پہنچیں۔ جاوید شاہ تعویز بھی دیتا تھا‘ مقتولہ کو روپے پیسے کی کوئی کمی نہیں تھی۔ جاوید شاہ کی دوربین نظروں نے دیکھ لیا کہ موٹی اسامی ہے۔ اس نے اسے ایک تعویز دیتے ہوئے مشورہ دیا کہ وہ اپنے اوپر ایسی کیفیت طاری کرے جیسے اس کے اوپر کوئی جن عاشق ہوگیا ہے‘ ساتھ ہی اس نے کسی فلمی ڈائریکٹر کی طرح اسے ریہرسل بھی کروائی۔ مقتولہ خود بھی کالج کے ڈراموں میں حصہ لیتی تی (جاوید شاہ نے کہا تھا اس طرح اس کی جان چھوٹ جائے گی) اب دوبارہ حاکو کی طرف آتے ہیں۔ اس نے بتایا کہ جب جہانگیر کی زبانی اسے پتا چلا کہ کافی دنوں سے رخشندہ کالج نہیں آرہی تو اسے دال میں کچھ کالا محسوس ہوا۔ وہ کایاں شخص تھا اور اس کی مخبری کا نظام بہت اچھا تھا۔ ایک دن اس نے جاوید شاہ کو اٹھوالیا۔

جب جاوید شاہ سے اسے اصل حقیقت معلوم ہوئی تو اسے خدشہ لاحق ہوا کہیں راز افشا نہ ہوجائے۔ وہ کوئی رسک نہیں لینا چاہتا تھا۔ جہانگیر اس کے اعتبار کا بندہ تھا۔ جونہی مقتولہ کالج میں آئی‘ اس نے اسے جالیا۔ حاکو نے مجھے بات یہ سنائی کہ باتھ روم میں اس نے مقتولہ کو پکڑ لیا اور اپنا کام یاد دلایا اور ساتھ یہ بھی کہا کہ اس نے اس کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کی کوشش کی ہے۔ اب بھی وقت ہے‘ وہ سیدھی راہ پر آجائے لیکن مقتولہ نے اسے صاف جواب دے دیا‘ اس کے پاس وقت بہت کم تھا‘ اس نے رخشندہ کا گلہ گھونٹ کر اسے ختم کردیا اور اپنی دانست میں اپنے خلاف ثبوت مٹادیا لیکن اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ آپ کے سامنے ہے۔ میرے ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے اس نے کہا کہ رخشندہ کو قتل کرنے کے بعد اسے خیال آیا کہ ہیروئن کی پڑیاں تو مقتولہ کے پاس ہی رہ گئی ہیں‘ وہ افراتفری میں کالج سے نکلا تھا۔

پھر جس طرح اس نے مقتولہ کے گھر میں چوری کی اس کا ذکر آچکا ہے پھر اس نے بتایا کہ بڑی مشکل سے ایک تکیے کے غلاف سے اسے پرس ملا تھا۔ اس رات وہ خود اپنے ایک ساتھی کے ساتھ وہاں گیا تھا۔ ڈائری بھی انہوں نے ہی چرائی تھی۔

آخر میں ایک سرد آہ بھرتے ہوئے اس نے کہا کہ تھانیدار رفاقت علی خان بھی اس تک پہنچ چکا تھا۔ اس نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا کہ اس بات کو یہیں ختم کردے اور رخشندہ کے قتل کو کسی جن کے کھاتے میں ڈال دے‘ اس دوران اس کے بندوں نے اس بات کی کافی مشہوری کروادی تھی لیکن بقول اس کے رفاقت علی خان نے کہا تھا‘ تم پوری دنیا کا خزانہ بھی میرے سامنے رکھ دو‘ میں پھر بھی تمہیں قانون کے شکنجے میں جکڑوں گا۔ تم میرے ملک کے نونہالوں کو تباہ کرنا چاہتے ہو‘ یہی تو ہمارا سرمایہ ہیں‘ انہوں نے ہی آگے چل کر ملک کی بھاگ دوڑ سنبھالنی ہے۔" پھر حاکو نے بتایا کہ وہ چاہتے ہوئے بھی رفاقت علی خان کو مار نہیں سکا اور اس نے وہ جگہ بتادی جہاں اس نے رفاقت علی خان کو قید کیا ہوا تھا۔

قارئین ایک بات مجھے کھٹک رہی تھی۔ آپ کو بھی کھٹک رہی ہے نا! لیکن جب میں نے حاکو کے ہاتھوں کی طرف دیکھا تو میری الجھن یا کھٹک جاتی رہی۔

حاکو کے ہاتھ بڑے بڑے تھے‘ عام آدمی سے بڑے۔

ازالہ

برادرم عمران احمد قریشی

السّلام علیکم!

امید ہے مزاج بخیر ہونگے' ایک تازہ کورٹ کہانی کے ساتھ حاضر ہوں' کورٹ کی عمارت وہ جگہ ہے جہاں آپ کو نت نئی دلچسپ اور سبق آموز کہانیاں سننے کو ملیں گی۔ ہتھکڑی پہنے لوگ ادھر ادھر پریشانی میں ڈوبے چہرے' چمکتی آنکھیں' دائیں بائیں دوڑتے سیاہ کوٹوں میں ملبوس وکلاء' اسٹامپ وینڈر' چائے کی کیتلیاں اٹھائے پھرتے چائے والے ہر ایک کی اپنی کہانی ہوتی ہے۔ آپ کے پاس ان کی کہانیوں کو دل کی بند دراز یا الماری سے باہر نکالنے کا ڈھنگ آنا چاہیے۔ یہ کہانی ایک ایسے پولیس افسر کی ہے جو اپنے افسر کی خوشنودی کے لیے دن کو رات اور رات کو دن بنادیا کرتا تھا مگر جب اس کا ضمیر جاگا تو...... یہ آپ کہانی پڑھ کر جان لیجیے' امید ہے آپ کے معیار پر یہ کہانی پورا اترے گی۔

والسّلام

خلیل جبار

حیدرآباد

میں اپنے ہاتھ میں ڈائری لیے سول کورٹ کی جانب بڑھ رہا تھا۔ سول کورٹ میں زیادہ تر مقدمات خواتین سے متعلق ہوتے ہیں' کوئی ظالم شوہر سے پریشان' کوئی نکھٹو شوہر سے تنگ' اپنے شوہروں سے چھٹکارے کے لیے درخواست دیئے ہوئے ہوتی ہیں۔ اخبارات کے لیے اس طرح کی خبریں بڑی زبردست ہوتی ہیں۔ لوگوں کی اکثریت ایسی خبروں میں دلچسپی لیتی ہے اور وہ بڑے شوق سے ایسی خبریں اخبارات میں ڈھونڈ ڈھونڈ کر پڑھتے ہیں۔

ابھی میں چند قدم آگے بڑھا تھا کہ مجھے اپنے کندھوں پر کسی کا ہاتھ محسوس ہوا' پلٹ کر دیکھنے پر استاد پیارے کھڑے مسکرارہے تھے' ان کے ساتھ ایم اکرام صدیقی ایڈووکیٹ بھی کھڑے تھے۔ وہ چھوٹے قد کی وجہ سے دیر سے نظر آئے۔ جب انہوں نے مصافحہ کے لیے ہاتھ آگے بڑھایا تو میں نے چونک کر ان سے ہاتھ ملایا۔

''مجھے پتا ہے تم کس خبر کی تلاش میں ہو۔'' استاد پیارے نے کہا۔

''کون سی خبر؟'' میں چونکا۔

''اتنے انجان مت بنو' تمہیں سب خبر ہے کہ آج ایک اہم خبر ہم لوگوں کی منتظر ہے' پریمی جوڑے کی۔ جنہیں پولیس نے رات ہی ایک ہوٹل پر چھاپہ مار کر گرفتار کیا ہے۔'' استاد پیارے نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''واقعی یہ خبر ہمارے لیے بڑی اہم ہے۔'' میں نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

جب ہم سول کورٹ کے احاطے میں پہنچے وہاں لوگوں کی خاصی بھیڑ تھی' دو دو' چار چار کی صورت لوگ ٹولیوں کی شکل میں کھڑے تھے' چند پولیس والے بھی موجود تھے۔ اے ایس آئی دو بزرگوں سے باتیں کررہا تھا۔ ہم بھی ان کے نزدیک ہوگئے' اے ایس آئی غصے میں دکھائی دے رہا تھا۔

''تم لوگوں نے میری بات نہیں مانی اور مخالف پارٹی سے صلح کرلی ورنہ ہم لڑکے کی ایسی درگت بناتے کہ محلے میں پھر کسی لڑکی کو بھگا کر شادی کرنے کی جرأت نہ ہوتی۔''

''آپ لوگ کرسکتے ہو لیکن حاجی ذکریا صاحب نے ہماری صلح کرادی ہے' ہماری لڑکی بینا نے گھر سے بھاگ کر منظور سے نکاح کرکے اچھا نہیں ہے لیکن ہمارے پاس اپنی عزت بچانے کا کوئی اور چارہ بھی نہیں ہے کہ اس کی عزت کے ساتھ گھر سے رخصتی کردیں۔ کوئی بھی شریف لڑکا ہماری بیٹی کا ہاتھ نہیں تھامے گا۔ اگر کسی نے شادی کر بھی لی تو ساری زندگی طعنے دے دے کر اس کی زندگی اجیرن کردے گا۔''

''یہ بات بھی تمہیں حاجی ذکریا نے سمجھائی ہوگی جیسے تمہارے پاس عقل نام کی کوئی چیز نہیں ہے۔'' اے ایس آئی نے غصے سے کہا۔

''محلے کے سارے فیصلے حاجی ذکریا صاحب ہی کرتے ہیں اور ان کے فیصلے واقعی ایسے ہوتے ہیں کہ ان کے آگے کوئی چوں کرنے کی بھی جرأت نہیں کرسکتا۔'' بزرگ نے کہا۔

''ہاں' ہاں حاجی ذکریا صاحب بہت اچھے آدمی ہیں' ان کی محلے میں بہت عزت ہے۔'' دوسرے آدمی نے کہا۔

''ضرور اس نے دوسری پارٹی سے ان کے حق میں فیصلہ کرانے کے لیے پیسے لیے ہوں گے۔'' اے ایس آئی نے کہا۔

''نہیں صاحب! ہم یہ بات قسم کھا کر کہہ سکتے ہیں کہ حاجی ذکریا صاحب ایسا کام نہیں کرسکتے۔''

''یہ وقت بتائے گا حاجی ذکریا کیسا شخص ہے' ہم نے ایسے لوگوں کو بہت جلدی بکتے ہوئے دیکھا ہے۔'' اے ایس آئی کی پوری کوشش تھی کہ وہ حاجی ذکریا سے ان بزرگوں کو بددل کردے تاکہ وہ اپنے روایتی ہتھکنڈے استعمال کرکے لڑکے منظور کی تھانے میں اچھی طرح سے پٹائی کرسکے اور دونوں پارٹیوں سے رقم بھی بٹور سکے۔ حاجی ذکریا کی شخصیت ایسی تھی کہ وہ انہیں اس سے بددل نہ کرپارہا تھا۔ ہمیں دیکھ کر اے ایس آئی چونکا۔

''ہاں بھئی تم لوگوں کا کیا مسئلہ ہے؟''

''ہمارا تعلق اخبار سے ہے اور ہم اس خبر کے سلسلے میں آئے ہیں۔'' استاد پیارے نے کہا۔

''اچھا اچھا! کوئی خاص خبر نہیں ہے دونوں پارٹیوں میں صلح ہوگئی ہے' اخبار کے لیے اس خبر میں جان نہیں رہی ہے۔'' اے ایس آئی نے کہا۔

''اے ایس آئی عبدالغفور صاحب! اخبار کے لیے یہ بھی تو خبر ہے کہ دونوں پارٹیوں میں صلح ہوجانے پر پریمی جوڑے کو ساتھ زندگی گزارنے کی اجازت مل گئی ہے۔'' میں نے اس کے نام کی پٹی پڑھتے ہوئے کہا۔

''تم اخبار والوں کو ذرا سی بات پتا چلنی چاہیے' بات کا بتنگڑ بنادیتے ہو۔'' اے ایس آئی نے جھلاتے ہوئے کہا۔ ''تھوڑی دیر میں آکر کورٹ کے ریڈر سے خبر لے جانا۔ ابھی کاغذی کارروائی میں تھوڑی دیر لگے گی۔''

''ٹھیک ہے ہم تھوڑی دیر میں خبر لے لیں گے۔ ذرا ہماری ملاقات حاجی ذکریا صاحب سے کرادیں۔ بزرگوں سے ان کی تعریف سن کر ہمیں بھی ان سے ملنے کا اشتیاق ہوگیا ہے۔'' استاد پیارے نے کہا۔

''وہ سامنے کھڑے ہیں۔'' ایک بزرگ نے پچاس پچپن سال کی عمر کے آدمی کی طرف اشارہ

کرتے ہوئے کہا۔
ہم اس شخص کی طرف بڑھے، وہ ہمیں دیکھ کر مسکرایا، ایم اکرام صدیقی سے ہاتھ ملاتے ہوئے بولا۔
''کیسے ہو اکرام بھائی! ہم بدل گئے ہیں تم ابھی تک ویسے ہی ہو۔''
''تمہارا چہرہ دیکھ کر ایسا لگ رہا ہے کہ کہیں ملاقات ہوئی ہے لیکن یاد نہیں آرہا ہے، کہاں ملاقات ہوئی ہے؟'' اکرام صدیقی ایڈووکیٹ نے ذہن پر زور ڈالتے ہوئے کہا۔
''ذہن پر زیادہ زور نہ دیں میں خود ہی بتادیتا ہوں میں سابق اے ایس آئی زکریا خان ہوں۔ اکثر عدالتی کارروائیوں میں آپ سے ملاقاتیں ہوتی رہی ہیں۔''
''ارے ہاں یاد آیا، واقعی تم سے میری بہت ملاقاتیں رہیں، لیکن یہ تم نے حلیہ کیا بنالیا ہے۔ اس وقت تم بڑے اسمارٹ، کلین شیو ہوا کرتے تھے اب ماشاء اللہ داڑھی رکھ لی ہے چہرے پر نور بھی آگیا ہے۔'' اکرام صدیقی نے کہا۔
''ہاں انسان کی زندگی میں ایک لمحہ ایسا ضرور آتا ہے جب وہ اپنی اصلاح کرنا چاہے تو کرسکتا ہے، میری زندگی میں بھی ایک ایسا لمحہ آیا تھا اور میں نے اس لمحے کو ضائع کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ میں نے پولیس کی نوکری چھوڑ دی اور بیرون ملک کمانے چلا گیا۔ وہاں سے اتنا کمالیا ہے کہ اس رقم سے ٹھاٹ سے اپنا ذاتی کاروبار کررہا ہوں، حج بھی کرلیا ہے۔ مجھے کوئی مالی تنگی نہیں ہے، خوب اچھی زندگی گزر رہی ہے۔'' حاجی زکریا نے کہا۔
''ایسا کون سا لمحہ تمہاری زندگی میں آگیا جو اتنے سخت اور جابر قسم کے اے ایس آئی کو بدل کر رکھ دیا ہے۔'' اکرام صدیقی نے پوچھا۔
''یہ بہت لمبی کہانی ہے پھر کبھی سناؤں گا۔'' حاجی زکریا نے کہا۔
''پھر ناجانے کب ملاقات ہو ابھی اتنے عرصے بعد ملاقات ہوئی ہے، ایک کپ چائے ہمارے ساتھ پی لو۔'' اکرام صدیقی ایڈووکیٹ نے کہا۔
''اکرام بھائی بڑے مہمان نواز ہیں ایسا ہو ہی نہیں سکتا کہ بغیر چائے پلائے جانے دیں۔'' استاد پیارے چہکے۔
''اچھا تم لوگ ضد کررہے ہو تو پھر ایک کپ چائے پینا ہی پڑے گی۔'' حاجی زکریا نے مسکراتے ہوئے کہا۔
کینٹین میں بیٹھتے ہی حاجی زکریا نے ایک نظر کینٹین کو دیکھا۔
''کینٹین میں کوئی تبدیلی نہیں آئی ہے بالکل ویسی ہی ہے جیسی پہلے ہوا کرتی تھی۔'' حاجی زکریا نے کہا۔
''تبدیلی تب ہی آئے گی جب یہ دوبارہ ٹوٹ کر بنے۔'' اکرام صدیقی ایڈووکیٹ نے کہا۔
''سکندر وہاں کیا کررہا ہے ادھر آ، دیکھ اکرام بھائی کے مہمان آئے ہیں۔'' استاد پیارے نے زور سے سکندر کو آواز دی۔
''ابھی آیا۔'' یہ کہتے ہوئے وہ ہمارے پاس پہنچ گیا۔ ''حکم کریں کیا چاہیے؟''
''چائے اور بسکٹ لے آؤ۔'' اکرام صدیقی ایڈووکیٹ نے آرڈر دیا۔
''ویسے ایک بات ہے اکرام بھائی! صحافیوں کی بہت عزت کرتے ہیں۔ چائے پیے بغیر جانے نہیں دیتے، اس کے باوجود استاد پیارے مانگ کر چائے اور سگریٹ پیتے ہیں۔'' میں نے استاد پیارے کو چھیڑا۔

''یار کبھی تو استاد پیارے کو بخش دیا کرو۔'' استاد پیارے نے مصنوعی غصے کا اظہار کیا۔
''خلیل جبار مذاق سے ہٹ کر مجھے صحافت کا پیشہ بہت اچھا لگتا ہے۔ زندگی میں کبھی موقع ملا میں کوئی اخبار یا اپنا ذاتی میگزین ضرور شائع کروں گا۔'' اکرام صدیقی ایڈووکیٹ نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔
چائے آتے ہی استاد پیارے نے ٹیبل سے اس طرح کپ اٹھایا کہ جیسے کوئی ان کا کپ اٹھا کر لے جائے گا۔
''ہاں وہ کیا قصہ ہے اب بتاؤ۔'' اکرام صدیقی ایڈووکیٹ نے پوچھا۔
''اتنا ہی اصرار کررہے ہو تو بتانا ہی پڑے گا۔'' حاجی زکریا نے ہماری طرف مسکراتے ہوئے دیکھا۔ ''تمہیں معلوم ہے کہ جب میں پولیس میں تھا، کس قدر سخت مزاج تھا۔ بندے کو بھی بندہ نہیں سمجھا، افسران کا حکم بجالانا میری اولین ترجیح ہوتی تھی، کیا غلط ہے کیا صحیح ہے یہ میں نہیں سمجھتا تھا۔ اس لیے میں افسران کی نظر میں بہت اچھا تھا، ان کے ہر راز میں میری حیثیت ایک راز دان جیسی ہوتی تھی۔ مجھ سے نچلا عملہ مجھے پسند نہیں کرتا تھا یہ بات میرے علم میں بھی تھی۔ پولیس کے محکمے میں نچلے عملے میں ہر شخص کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ وہ افسران کے زیادہ نزدیک چاہے اس کے لیے کچھ بھی قربانی نہ دینی پڑجائے۔ میرے ہوتے ہوئے کسی کی دال نہیں گلتی تھی، جب میرا ٹرانسفر گاؤں نصیر آباد میں ہوا اس تھانے کا عملہ بہت خوش تھا۔ ٹرانسفر ہونے پر میں نے ٹرانسفر رکوانے کی بالکل بھی کوشش نہیں کی میں خود بھی کچھ تبدیلی چاہ رہا تھا، شہر میں رہتے ہوئے میں یکسانیت کا شکار ہوگیا تھا۔
نصیر آباد ایک چھوٹا سا گاؤں تھا، جہاں پر زیادہ تر غریب آبادی تھی۔ بازار سے ایک معمولی کانسٹیبل کے گزرنے پر وہاں موجود لوگ خوف زدہ ہوجاتے تھے حالاں کہ پولیس کانسٹیبل بہت شریف اور رحم دل تھے بلاوجہ کسی کو بھی تنگ نہیں کرتے تھے، اس کے برعکس ایس ایچ او رب ڈنو بہت ہی خطرناک آدمی تھا۔ غریب لوگوں کو تنگ کرنا، ان سے ناجائز پیسے وصولنا اس کا پرانا دھندا تھا۔ بازار میں کسی دکان سے کوئی چیز اٹھالینے پر اس دکان دار کی مجال نہیں تھی کہ وہ اس سے پیسے مانگ لے۔ میرے نصیر آباد جانے سے وہاں کے لوگوں پر بہت زیادہ دہشت بیٹھ گئی۔ ایس ایچ او رب ڈنو مجھ سے بہت خوش تھا، جیسا اے ایس آئی وہ چاہتا تھا اسے مل گیا تھا۔ میں اس کا ہر کام آنکھ بند کیے کرتا تھا یہ بات اسے بہت پسند تھی۔ وہ انتہائی لالچی، خود غرض انسان تھا وہ ہر حالت میں اپنا مفاد عزیز رکھتا تھا۔ پیسہ ہی اس کا مذہب تھا، جتنا پیسہ ناجائز طور پر اس کے پاس آرہا تھا اس کی ہوس پوری نہیں ہورہی تھی، یہاں بھی میرے ساتھ وہی بات ہوئی ایس ایچ او کا راز داں ہونے پر نچلا عملہ مجھ سے حسد کرنے لگا، اکثر میں نے انہیں یہ کہتے بھی سنا۔
''بے غیرت ہے صاحب کے جوتے چاٹتا ہے۔''
جو شخص بے ضمیر ہوجائے اس کے لیے اس طرح کے الفاظ بے معنی سے ہوکر رہ جاتے ہیں، یہی کچھ میرے ساتھ تھا۔
ایک روز ایس ایچ او صاحب نے مجھے رات کے وقت اپنے کمرے میں بلایا اور راز دارانہ انداز میں کہا۔
''زکریا! آج ہمیں ایک خطرناک اور عادی

ملزم کو پکڑنا ہے‘ اس کے ساتھ کوئی رعایت نہیں برتنی ہے۔“

”سر! ہم اگر ملزمان سے رعایت برتنے لگیں تو پھر کیسے کام چلے گا۔“ میں نے کہا۔

”گڈ مجھے تم سے یہی امید تھی‘ چلو پھر ملزم کو پکڑنے چلتے ہیں‘ میری اطلاع کے مطابق ملزم اس وقت اپنے گھر میں موجود ہے۔ اس سے اچھا موقع ہمیں پھر کبھی نہیں ملے گا۔“ ایس ایچ او رب ڈنو نے ٹوپی سر پر رکھتے ہوئے کہا۔

ایس ایچ او کے حکم کی دیر تھی ہم اپنے ساتھ چند کانسٹیبل لے کر مطلوبہ جگہ پہنچ گئے۔ وہ ایک کچا مکان تھا‘ لکڑی کا ٹوٹا پھوٹا سا دروازہ لگا ہوا تھا۔ سپاہیوں نے مکان کو گھیر لیا اور ہم خود دروازے کی طرف بڑھے میں نے ایک زوردار ٹھوکر دروازہ کو ماری‘ دروازہ ایک جھٹکے سے دیواروں سے الگ ہوکر زمین پر گر پڑا اور ہم اندر داخل ہوگئے۔ صحن کے کچے فرش پر ایک نوجوان بنیان اور شلوار پہنے لیٹا ہوا تھا۔ دروازہ گرنے کی آواز پر وہ سوتے سے اٹھ بیٹھا تھا اور حیرانی و پریشانی سے ہمیں دیکھنے لگا۔ دروازہ گرنے کی آواز سن کر ایک بوڑھی عورت کمرے سے باہر آئی‘ اس کے پیچھے ایک خوب صورت دوشیزہ بھی تھی‘ لڑکی کو دیکھ کر میں چونکے بغیر نہ رہ سکا‘ میں اس کی خوب صورتی سے زبردست متاثر ہوا تھا۔

”زکریا! یہی وہ ملزم ہے یہ بھاگ کر نہیں جانا چاہیے۔“ ایس ایچ او صاحب نے کہا۔

”میرے بیٹے نے کچھ نہیں کیا ہے‘ تم کیوں اسے پکڑنے آگئے ہو۔“ وہ عورت بولی۔

”بڑھیا! تیرا بیٹا عادی مجرم ہے اسی لیے ہم اسے پکڑنے آئے ہیں۔“ ایس ایچ او نے زور سے کہا۔

”اس سے پہلے بھی تم اسے ملزم بنا کر گھر کی کئی بار تلاشی لے چکے ہو لیکن خالی ہاتھ جانا پڑا ہے اب پھر تنگ کرنے آگئے ہو۔“ بوڑھی عورت گرجتے ہوئے بولی۔

”اس بار ہم تیرے بیٹے کو چھوڑنے کی غلطی نہیں کریں گے‘ جب تھانے میں اس کے چھتر پڑیں گے پھر یہ سب چوریاں اُگل دے گا۔“ ایس ایچ او نے اپنی ڈھیلی پینٹ کو سیدھا کیا۔

”تم میرے بے قصور بیٹے کو نہیں لے جاسکتے۔“ بوڑھی عورت اپنے بیٹے کے آگے آہنی دیوار بن کر کھڑی ہوگئی تھی۔

”کون روکے گا ہمیں‘ تُو روکے گی‘ چل ہٹ صاحب کے سامنے سے۔“ میں نے بوڑھی عورت کو زور سے دھکا دیا۔

بوڑھی عورت کی بیٹی اسے آگے بڑھ کر تھام نہ لیتی تو وہ ضرور زمین پر گر کر زخمی ہوجاتی۔ اس کا بیٹا بھی غصے سے تلملا کر رہ گیا تھا‘ پولیس کے سامنے وہ کچھ بھی کرنے جیسا نہیں تھا۔

”ہم اس نوجوان کو پکڑ کر تھانے لے آئے اس کی ماں اور بہن چیختی چلاتی رہ گئیں لیکن ہم نے ان کی ایک نہ سنی تھی‘ تھانے پہنچ کر ایس ایچ او نے سب سے پہلے اسے لاک اپ کیا اور میرے ہاتھ میں ڈنڈا پکڑاتے ہوئے کہا۔

”اس نوجوان کو اتنا مارو کہ یہ سب چوریاں فر فر اُگل دے۔“

”ٹھیک ہے ایسا ہی ہوگا۔“ میں نے ڈنڈا اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے کہا۔

میں نے اس نوجوان کو اتنا مارا کے اس کی چیخوں سے تھانہ گونج اٹھا۔ وہ مسلسل پٹتا رہا لیکن چوری سے انکاری رہا۔ میں حیران تھا کہ اتنی مار کھا کر بھی چوری کا اقرار نہیں کررہا تھا‘ میں اسے پیٹتا رہا‘ جب تھک جاتا آرام کرلیتا‘ سکون ملنے پر دوبارہ نوجوان کی پٹائی کرنے لگتا۔

صبح ہوجانے پر میں سونے گھر چلا گیا‘ نیند پوری کرکے شام ڈھلے تھانے ڈیوٹی پر پہنچا۔ ایس ایچ او صاحب تھانے سے جانے کو نکلنے ہی والے تھے کہ مجھے دیکھ کر وہ رک گئے۔

”زکریا! تم نے میرا دل خوش کردیا ہے میں تمہاری کارکردگی سے بہت خوش ہوں۔“ اس نے کہا۔

”سر! ہمارا کام ہی صاحب لوگوں کا حکم بجالانا ہے۔“ میں نے ہنستے ہوئے اپنے دانت نکالے۔

”میں ابھی جارہا ہوں‘ صبح تم سے ملاقات ہوگی۔“ ایس ایچ او رب ڈنو یہ کہہ کر نکل گیا۔

مجھے تھانے آئے ہوئے تھوڑی دیر ہی ہوئی تھی کہ کانسٹیبل کے کمرے سے باہر باتیں کرنے کی آوازیں آرہی تھیں۔

”بے غیرت ہے‘ شرم‘ غیرت اس کے قریب سے بھی چھو کر نہیں گزری۔“ کانسٹیبل رفاقت کی آواز آئی۔

”تم کچھ بھی کرلو وہ چکنا گھڑا ہے۔“ کانسٹیبل یونس نے کہا۔

اس سے پہلے بھی میں کئی بار یہ جملہ سن چکا تھا‘ ناجانے کیوں آج میرا ان کی گفتگو سننے کو دل چاہ رہا تھا‘ آخر وہ کیوں مجھے بے غیرت کہتے ہیں۔ میں ان کا افسر ہوں۔

”رفاقت اور یونس تم دونوں میرے پاس آؤ۔“ میں نے زور سے کہا۔

”رفاقت! تم دونوں کا کیا مسئلہ ہے‘ تم آئے دن ایک ہی جملہ کیوں دہراتے رہتے ہو۔“ میں نے کہا۔

ان دونوں کا چہرہ فق ہوگیا اور وہ ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے تھے۔

”یہ بے غیرت کون ہے‘ کہیں تمہارا اشارہ میری طرف تو نہیں ہے؟“ میں نے دونوں کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

”نن...... نن...... نہیں...... صاحب ہم آپ کو...... کیسے کہہ سکتے ہیں۔“ رفاقت گھبرا سا گیا۔

”دیکھو! میں کوئی چھوٹا بچہ نہیں ہوں‘ جسے تم بے وقوف بنالو گے۔ صاف صاف بتادو ورنہ تم مجھے جانتے ہو نا‘ میں انسانوں کو قتل کرکے ثبوت بھی مٹادیتا ہوں۔ میں بہت خطرناک آدمی ہوں‘ جھوٹ مت بولنا۔“ میری اس بات پر وہ دونوں سوچ میں پڑ گئے۔ وہ سچ بولنے پر پھنس رہے تھے اور جھوٹ بولنے پر بھی‘ ان کی کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔

”دیکھو اب بھی وقت ہے صاف صاف اُگل دو۔“ میں غصے سے چیخا۔

”صاحب! یونس مجھے یہ کہنے پر اکساتا ہے اور میں جذبات میں آکر یہ جملہ بول جاتا ہوں۔“ رفاقت نے کہا۔

”میں صرف یہ پوچھنا چاہ رہا ہوں تم یہ جملہ بار بار کیوں بولتے ہو؟“

”ایس ایچ او صاحب کو تھانے میں کوئی بھی پسند نہیں کرتا۔ وہ خودغرض انسان ہے وہ اپنے چھوٹے چھوٹے فائدوں کے لیے غریب لوگوں کو تنگ کرتا ہے‘ ہم لوگ ہر ایسے کام سے جس میں کسی غریب آدمی کو نقصان پہنچے وہ کام نہیں کرتے اور ٹال مٹول سے کام لیتے رہتے ہیں جب ایس ایچ او صاحب نے شہر میں تمہاری شہرت سنی کہ تم اپنے ایس ایچ او صاحب کے لیے ہر جائز و ناجائز کام کرجاتے ہو اس نے ایماندار اے ایس آئی کا ٹرانسفر دوسرے علاقے میں اور تمہارا اس گاؤں

میں کرالیا تا کہ وہ اپنے ناجائز کام آسانی سے کرالے۔ اس لیے ہم تمہیں بے غیرت کہتے ہیں۔'' رفاقت نے کہا۔

''صاحب صبح آپ چلے گئے تھے' دوپہر میں ایس ایچ او صاحب آئے اور آتے ہی انہوں نے نعیم پر بُری طرح تشدد کرنا شروع کردیا اور اس وقت تک کرتے رہے جب تک نعیم نے دم نہیں توڑ دیا۔ وہ بڑا نیک نوجوان تھا' جب اس کا انتقال ہوا اس کے جسم سے خوشبو پھوٹ رہی تھی۔''

''کیا...... خوشبو پھوٹ رہی تھی......'' میں بُری طرح چونکا۔

''ہاں صاحب! یہ حقیقت ہے' جب ہم نعیم کی لاش لے کر گئے اس کی بوڑھی ماں نے ہمیں کہا' میرا بیٹا پانچ وقت کا نمازی و پرہیز گار تھا' وہ چور نہیں ہوسکتا۔ اگر یہ چور تھا تو اس کے بدن سے بدبو پھوٹ رہی ہوتی۔

''یہ واقعی تمہارا بیٹا ہے اس کے بدن سے خوشبو آرہی ہے'' ہم نے کہا اور لاش بوڑھی عورت کے حوالے کردی' وہیں ہم پر انکشاف ہوا کہ رات ایس ایچ او بوڑھی عورت کی بیٹی کو اٹھا کر لے گیا اور رات سے وہ اس کی قید میں ہے۔'' رفاقت نے بتایا۔

''صاحب! اس عورت کا رونا اتنا دردناک تھا ہم سے دیکھا نہیں گیا اور ہم وہاں زیادہ ٹھہر نہیں سکے۔'' یونس نے بتایا۔

''کیا کہا لڑکی ایس ایچ اور ب ڈنو کی قید میں ہے۔'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں صاحب! ایس ایچ او صاحب کی زینب پر بڑے دنوں سے نظر تھی' وہ اسے اپنی رکھیل بنا کر رکھنا چاہتا تھا لیکن اے ایس آئی اور ہم لوگوں کی وجہ سے ایس ایچ او اس کام سے باز رہا تھا۔ کئی بار اس نے نوجوان نعیم کے گھر پر چھاپے مارے اور کوشش کی کہ کوئی ایسی چیز اس گھر سے مل جائے جسے جواز بنا کر گرفتار کرے لیکن ان کے پاس تھا ہی کیا جو ملتا' گھر میں چند برتن کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔ وہ نوجوان تھا بھی بہت نیک۔ ہر کسی کے دکھ درد میں کام آنے والا' وہ کبھی اس نوجوان کو گرفتار نہیں کرسکتا تھا لیکن تمہاری وجہ سے اس نوجوان کو گرفتار کرکے ہلاک کردیا' اس کے مرنے کے بعد ایس ایچ او صاحب کا کام آسان ہوگیا۔ جب تک اس کا دل زینب سے نہیں بھر جاتا' چھوڑے گا نہیں۔'' یونس نے کہا۔

''افوہ واقعی یہ مجھ سے بہت بڑا گناہ ہوگیا ہے' اس کا کفارہ ادا کرنے میں تم لوگ میرا ساتھ دو گے؟'' میں نے کہا۔

''ہم ہر طرح سے تمہارے ساتھ ہیں۔'' دونوں نے ایک زبان کہا۔

''ٹھیک ہے پھر میں جیسا کہوں ویسا ہی کرنا۔'' میں نے کہا۔

زندگی میں پہلی بار مجھے اپنے کسی کام کرنے پر سخت ندامت ہوئی تھی' خاصی دیر میری سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ماؤف ہوکر رہ گئی تھی۔ میری کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا کہ میں کیا کروں' اچانک میں غصے سے اٹھا اور ایس ایچ او کے پاس چلا گیا۔ مجھے معلوم تھا اس وقت وہ کہاں ہوگا' میں جب وہاں پہنچا ایس ایچ او رب ڈنو زینب کے ساتھ قابل اعتراض حالت میں موجود تھا اور وہ خوف زدہ دکھائی دے رہی تھی۔

''چھوڑ دو اسے۔'' میں نے ایس ایچ او پر پستول تان لیا تھا۔

''زکریا یہ تم......'' وہ بولا۔

''انسان کا ضمیر جاگتے دیر نہیں لگتی' چھوڑ دو اسے۔'' میں نے کہا۔

ایس ایچ او نے زینب کو چھوڑ دیا اور دور کھڑا ہوگیا۔ میں نے اس وقت تین فائر کیے اور گولیاں ایس ایچ او کے جسم میں گھس گئیں۔ وہ موقع پر ہی ہلاک ہوگیا۔ زینب بھی ہکا بکا مجھے دیکھتی رہ گئی۔ میرے اشارے پر اس نے کپڑے پہن لیے تھے' میں اس کے نزدیک گیا۔

''مجھ سے غلطی ہوگئی تھی تمہارے بھائی کو گرفتار کرکے اور اس کا ازالہ اس طرح سے ہوسکتا ہے' باہر کوئی بھی تم سے پوچھے اس کا ذکر نہیں کرنا کیونکہ ہم کاغذات میں یہی ظاہر کریں گے کہ ایس ایچ او ڈاکوؤں کو پکڑنے کی کوشش میں ہلاک ہوا ہے۔'' میں نے زینب کو سمجھایا۔

میرے ساتھیوں نے بھی وہی کیا جو میں نے ان سے کہا۔ ایس ایچ او رب ڈنو کا مقدمہ فائل میں دب گیا۔ زینب کی گاؤں میں شادی نہیں ہوسکتی تھی کیونکہ اس کی عزت لٹنے کی خبر سب گاؤں والوں کے علم میں آچکی تھی۔ ایسے میں کوئی بھی نوجوان اسے نہیں اپنا سکتا۔ سارے کھیل میں قصوروار میں ہی تھا اس لیے میں نے زینب کو اپنی شریک حیات بنانے کا فیصلہ کرکے شادی کرلی اور دونوں ماں بیٹی کو گاؤں سے شہر لے آیا اور اس نوکری سے استعفیٰ دے دیا۔ زینب کی ماں کو اپنے بیٹے سے بہت محبت تھی اس لیے وہ بیٹے کی جدائی میں روتی رہتی تھی' وہ بامشکل دو ماہ ہی زندہ رہی اور انتقال کرگئی۔ اس کے انتقال کے بعد میں جمع پونجی سمیٹ کر بیوی سمیت ملک سے باہر چلا گیا اور جب اتنی دولت جمع ہوگئی کہ میرا گزارا اچھا ہوسکے' واپس اپنے ملک لوٹ آیا۔ زندگی اچھی گزر رہی ہے' عوامی خدمت کو میں نے اپنا شعار بنالیا ہے۔ علاقے کے لوگ میری عزت کرتے ہیں اور میں ان کے مسائل منٹوں میں حل کردیتا ہوں۔ کسی کو پولیس کے پاس جانے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی' یہ ہے میری مختصر سی کہانی۔'' حاجی زکریا نے کہا۔

''لو بھئی صحافیوں! تمہیں ایک دوسری خبر بھی مل گئی' اسے اخبار کی زینت بنا سکتے ہو۔'' اکرام صدیقی ایڈووکیٹ نے مسکراتے ہوئے سگریٹ دوبارہ سلگائی۔

''ہر کام طریقے سے ہوگا' ہم کرداروں کے نام تبدیل کرکے اسٹوری کی شکل میں چلائیں گے۔'' استاد پیارے نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

''ہاں یہ آپ کا شعبہ ہے جس طرح مناسب سمجھیں ویسے لگائیں۔'' اکرم صدیقی نے کہا۔

''آپ کی زندگی کی کہانی بالکل ایسی لگ رہی ہے جیسے ہم کسی ڈائجسٹ میں کہانی پڑھ رہے ہوں۔'' میں نے کہا۔

''ہاں رائٹر بھی انسانی زندگی کی کہانیوں کو اپنے قلم کی مدد سے کاغذ پر بکھیرتے ہیں۔'' حاجی زکریا نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''بے شک بے شک۔'' استاد پیارے نے کہا۔

استاد پیارے کے بولنے کا انداز ایسا تھا کہ بے اختیار ہم سب لوگوں کے چہروں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔

O

منزل

دولت جائیداد اور عورت کی تکون اس دنیا میں جنگ فساد اور تمام برائیوں کی بنیاد پر ہوا۔ تاریخ کے پہلے قتل کا باعث عورت تھی۔ پہلی جنگ زمین پر قبضہ کے لالچ میں ہوئی۔ غرض ہم تاریخ کے جتنے بھی صفحات کیوں نہ الٹتے جائیں ہمیں تمام تر فساد اسی تکون کا تحفہ نظر آئے گا۔ یہ تکون جب کسی کو اپنا اسیر بنا لیتی ہے تو وہ خون کو سفید بنا دیتی ہے۔ اس کا مضروب ہر رشتے کو نفع نقصان میں تولنے لگتا ہے۔ اس کی آنکھ تمام مقدس رشتوں کو غرض کی عینک سے ہی دیکھتی ہے۔
زیر نظر ناول آپ کو ایسی بساط محسوس ہوگا جس کا ہر مہرہ دوسرے کو شہ مات دیتا نظر آئے گا۔

نئے افق کی روایتوں کا امین ایسا ناول جو آپ کو مدتوں یاد رہے گا

وہ ڈوبتے سورج کو بڑے غور سے دیکھ رہی تھی، شفق کی لالی آسمان پر چھائی ہوئی تھی۔ نسیم سحر کے جھونکے ابھی سے محسوس ہو رہے تھے، اس کا چہرہ مختلف سوچوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ بظاہر اس کی نگاہیں سورج کا طواف کر رہی تھیں مگر چہرہ اندرونی خلفشار کا آئینہ تھا۔

''اخاہ تو یہاں ڈوبتے آفتاب کو نگاہوں میں بسایا جا رہا تھا۔'' پروا نے اس کے قریب بیٹھتے ہوئے کہا، وہ ایک دم سے چونک پڑی۔

''اندر دل گھبرا رہا تھا سو یہاں چلی آئی۔''

''سچ کہہ رہی ہو، دو سال تو چٹکی بجاتے گزر گئے، یوں لگتا ہے جیسے کل کی بات ہو، جب ہم اس کیمپس میں آئے تھے۔''

''وقت کا کام تو گزرنا ہے، گزرتا چلا جاتا ہے، اچھے برے نقوش ثبت کرتے ہوئے۔ کل ہم اپنے اصل کی طرف لوٹ جائیں گے پھر نہ جانے ملاقات ہو نہ ہو۔''

''ارے ملاقات کیوں نہیں ہوگی مائی ڈیئر! اپنا ایڈریس دو اور میرا ایڈریس تو تمہارے پاس ہے۔ بہت جلد تمہارے گھر آؤں گی، یوں بھی یہ دنیا گول ہے کہیں نہ کہیں، کسی نہ کسی کونے میں ہم ایک بار پھر ملیں گے۔''

''ایڈریس ہاں وہ میں کیسے دے سکتی ہوں، ماما کہیں اور شفٹ ہو رہی ہیں اور نئے گھر کا ایڈریس تو ابھی مجھے بھی نہیں پتا۔ تمہارا ایڈریس اور سیل نمبر ہے نا میرے پاس، میں خود ہی تم سے رابطہ کرلوں گی۔''

''حیا! ایک بات پوچھوں، تم مائنڈ تو نہیں کرو گی؟''

''پوچھو۔''

''ان دو سالوں میں، میں نے تمہیں اپنے خول میں لپٹے دیکھا ہے، تم کلاس میں بھی بس لیے دیئے رہتی ہو، کسی سے تمہاری فرینڈ شپ نہیں میرے ساتھ تمہاری تھوڑی بہت فرینڈ شپ ہے بھی تو میری زبردستی کی وجہ سے کہ ایک تو میں تمہاری کلاس فیلو ہوں اور دوسرے روم میٹ۔ اس لیے نہ چاہتے ہوئے بھی تمہیں مجھے برداشت کرنا پڑتا ہے۔ تم سے جب بھی تمہارے بارے میں پوچھا تم نے ہمیشہ ٹال دیا، آخر کیوں؟ میں نے تمہیں اکثر راتوں کو سسکتے اور روتے ہوئے پایا ہے، تم کس کی یاد میں اتنا تڑپتی ہو، کون ہے جس نے تمہیں دنیا سے بے زار اور اپنے آپ سے بیگانہ کر دیا ہے۔ کبھی کبھی تو مجھے یوں لگتا ہے جیسے تمہارے پپا یا تمہاری ماں سوتیلی ہوں...... مگر یا پھر کسی سے محبت؟ پروا جی! بس یا کچھ اور......'' اس نے بے اختیار قہقہہ لگاتے ہوئے پوچھا۔

''حیا پلیز!'' اس نے غور سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔ جس کی جھیل سے گہری آنکھوں میں اداس شاموں کا عکس جھلملا رہا تھا۔

''آج ہمارا آخری دن ہے تم جو گھٹ گھٹ کر جی رہی ہو، اپنا درد اپنا غم مجھ سے شیئر کرلو۔ میں کسی سے اس کا ذکر نہیں کروں گی اور ہاں آج تو میں نے تمہیں ایک سرپرائز بھی دینا ہے۔ پروا ڈیئر!''

''جو کچھ تم سوچ رہی ہو نا ایسا کچھ بھی نہیں ہے۔ اللہ کی قسم میرے پپا ماما دونوں سگے ہیں، جہاں تک لیے دیئے رہنے کا تعلق ہے تو یہ فطرت ہے میں بچپن ہی سے خاموش طبع ہوں، کسی سے فری نہیں ہوتی۔ دوسرا میری ماما نے کہا تھا یہ دنیا دھوکے کی جگہ ہے، یہاں دل لگانے کے بجائے اگلی دنیا کے بارے میں سوچنا، سو محبت چہ معنی دارد؟''

''اور وہ راتوں کو رونا وہ کیا ہے؟''

''وہ تو بس ایسے ہی جب کبھی ماں اور باپ دونوں بہت یاد آتے ہیں ان کی گود میں سر رکھنے کو دل چاہتا ہے تو آنکھوں سے آنسو بہنے لگتے ہیں اور لبوں پر سسکیاں۔''

''حیا! مجھے سچ اور جھوٹ کی پہچان ہے، تمہاری زبان تمہاری آنکھوں کا ساتھ نہیں دے رہی۔ تمہاری آنکھیں کچھ اور کہہ رہی ہیں۔''

''یار! تُو پولیس میں جاب کرلے تاکہ بے گناہ لوگ تو بچ سکیں۔ تُو مجرم کو پہچان لے گی اور معاشرے کا فائدہ ہو جائے گا۔''

''اچھا چل بتا تُو مجھے سرپرائز دے رہی تھی؟''

''سجاول تجھے پسند کرتا ہے، تجھ سے محبت ہے اور تجھ سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ اسے تیرا ایڈریس چاہیے تاکہ تیرے والدین سے مل سکے۔''

''بس یا کچھ اور......؟''

''کیا؟ تجھے حیرت نہیں ہوئی؟''

''میں جانتی ہوں کہ سجاول مجھے پسند کرتا ہے، بہت عرصہ سے مگر میں اس وڈیرے سے شادی افورڈ نہیں کرسکتی۔''

''کیوں حیا! یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ تجھ سے محبت کرتا ہے، کیوں اس کی محبت رد کر رہی ہو۔ وہ تہذیب یافتہ اور سلجھا ہوا انسان ہے، وڈیروں والی کوئی بات نہیں اس میں۔''

''پروا ڈیئر! تم صرف ظاہر دیکھتی ہو یہ وڈیرے، جاگیردار، کردار کے بہت کچے ہوتے ہیں، دل پھینک۔ خوب صورتی پر مر مٹنے والے بھنورے، یہ تو اپنے نفس کی آگ بجھانے کے لیے طوائف کے کوٹھے کی دہلیز بھی پار کرلیتے ہیں۔ یہ نام نہاد شرفا اور ان کی بیویاں، بہنیں، بیٹیاں حویلی کی قیدی، جنہیں اپنے آقاؤں کی مرضی کے بغیر سانس لینے کی بھی آزادی نہیں۔ یہ قرآن سے شادیاں، کاروکاری کی رسمیں ان کی ہی ایجاد کردہ ہیں۔ اپنے مفاد کے لیے اپنی ہی عزتوں کی بھینٹ چڑھانے والے، بس پروا! میں حویلی کے زنداں میں قید نہیں ہونا چاہتی، میری روح تو پہلے ہی اس پنجرے کی قیدی ہے۔'' اس کے لفظوں سے نفرت کا زہر ٹپک رہا تھا۔

”اتنی نفرت‘ اتنا زہر بھرا ہے ان کے خلاف‘ آخر کیوں؟“
”یار! ڈراموں اور فلموں میں ہی دیکھا ہے‘ افسانوں اور کہانیوں میں یہی پڑھا ہے۔ ادب‘ ڈرامے اور فلمیں ہماری معاشرتی زندگی کی عکاس ہیں‘ وہی کچھ رائٹرز بیان کرتے ہیں جو کچھ وہ اپنے اردگرد فیل کرتے ہیں“ ”کاش میں یہ تیری بیٹی نہ ہوتی“ ”میں جاگیردار کا ظلم دیکھ رہی ہوں نا۔ غربت کی چکی میں پسنے والی عورت کس طرح جاگیردار کے ظلم کا شکار ہو رہی ہے اور اس کی اپنی بیوی صرف پتھر کا مجسمہ جسے خاوند کے غلط فیصلوں پر بھی لبیک کہنا ہے۔“
”یار! یہ صرف ڈرامے ہیں حقیقی زندگی سے ان کا کوئی تعلق نہیں۔“
”پروا جی! یہ زندگی کی تلخ حقیقتیں ہیں ہم ان سے منہ نہیں موڑ سکتے‘ اب بھی بہت سے علاقوں میں جہاں جاگیردارانہ اور وڈیرا سسٹم ہے وہاں کے ہاریوں کو سانس لینے کی اجازت نہیں۔ ان غریبوں کی بیٹیوں کو یہ وڈیرے اور جاگیردار اپنی کھیتیاں سمجھتے ہیں‘ جب دل چاہتا ہے اٹھا کر لے جاتے ہیں اور پھر ان کی بے جان لاشوں کو ان کی وسیع و عریض زمینیں نگل لیتی ہیں‘ ویسے بھی میں نے ابھی شادی کے بارے میں سوچا نہیں‘ یہ میرا درد سر نہیں‘ میرے والدین کا ہے۔“
”چلو سامان پیک کریں کیونکہ کل ہم اس سرسبز و شاداب کیمپس سے رخصت ہو جائیں گے۔“
”ہائے حیا! مجھے تو یہ نہر بہت یاد آئے گی۔“
”صرف نہر...... مجھے تو پی یو کا سارا کیمپس ہی یاد آئے گا۔“ حیا نے اسے اٹھاتے ہوئے کہا۔
”کیا سجاول بھی۔“ اس نے شرارت سے حیات کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
”کاش وہ وڈیرانہ ہوتا تو پھر میں شاید اس کے بارے میں کچھ سوچتی۔“ حیا نے بھی شرارتی لہجے میں جواب دیا۔
”سوچتی......“ حیات نے بھی شرارتی لہجے میں جواب دیا۔
”تم ہو تو کٹھور دل مگر پلیز مجھ سے رابطے میں رہنا‘ یہ نا ہو گھر جاتے ہی مجھے بھول جاؤ۔“
”تجھے...... نہیں پروا تُو گھر میں تو مجھے اور بھی یاد آئے گی‘ آخر دو سالوں کا ساتھ ہے تیرا میرا۔ میرا ظاہر تجھے سخت لگا پر میرا اندر تو......“ اس کی آنکھوں میں آنسو جھلملانے لگے اور پروا کی آنکھیں بھی آنسوؤں سے لبریز ہو گئیں۔
”پتا ہے پروا! میں نہ چاہتے ہوئے بھی تیرے وجود کی عادی ہو گئی ہوں۔“
”بس ہم ہمیشہ ملیں گے حیا! چاہے کہیں بھی رہیں‘ رابطہ رکھیں گے۔ تم ضرور آنا میرے گھر میں تمہارا انتظار کروں گی۔“
یوں وہ کیمپس کو ویران کر کے اپنے اپنے گھروں کو سدھار گئیں۔ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی ایک دفعہ پھر اس زنداں میں لوٹ آئی‘ جہاں سے فرار ہونے کے لیے اس نے تعلیم کا سہارا لیا تھا۔

❀ ...... + ... ❀
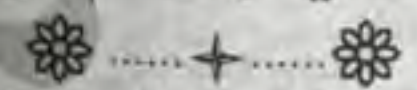
”حیا آ گئی ہے۔“ ہر کوٹھے سے یہی صدا بلند ہوئی اور پھر ساری اس کے کوٹھے پر جمع ہو گئیں وہی طبلے کی تھاپ‘ وہی گھنگھروؤں کی جھنکار جن کی آوازیں اس کا تعاقب کرتی تھیں اور وہ ساری ساری رات روتی سسکتی اور تڑپتی رہتی تھی۔
”کب حیا کی نتھ اتروا رہی ہو‘ بڑے ناز و ادائیں سیکھ کر آئی ہو گی۔ ہم تو بھئی ان پڑھ جاہل

تھے آج کل کی لڑکیوں کے چلتر کہاں آتے تھے بس طبلے کی تھاپ پر پاؤں چلا لیے اور چار پیسے کما لیے مگر اب تو زمانہ ہی بدل گیا ہے‘ لڑکیوں نے ایسے ایسے دل لبھانے کے طریقے سیکھ لیے ہیں کہ اب لوگ تو کوٹھے کا رخ ہی نہیں کرتے‘ یہ موئے کالجوں میں جو لڑکیاں لڑکے اکٹھے پڑھتے ہیں نا بس وہاں ہی ایسے چکر چلاتے ہیں اور پھر یہ ٹک ٹک موبائل اس پر لڑکیاں اور لڑکے دن رات لگے رہتے ہیں کہ ہمارے کوٹھے ہی ویران کر دیئے ہیں۔“
”اپنی حیا بھی تو لڑکوں کے ساتھ پڑھ کر آئی ہے‘ خوب صورت بھی ہے اب تو کوٹھا آباد ہو جائے گا‘ لڑکے ضرور حیا کے پیچھے آئیں گے۔“
”ہاں ہاں بہت جلد تقریب منعقد کر رہی ہوں‘ حیا کی نتھ اتروانے کی۔ تھوڑا سا ناچ گانا بھی سیکھ لے کل سے تیار رہی ہوں اپنے پرانے رقاص کو بلائی ہوں پہلے تو موئی پڑھائی کا بہانہ تھا پر اب تو فارغ ہے۔ فلموں کی ہیروئن بھی بناؤں گی‘ قد کاٹھ اچھا ہے‘ تقریب میں فلمی لوگوں کو بھی بلاؤں گی۔“
وہ کمرے میں بیٹھی سسک رہی تھی۔
”نہیں میں یہ سب نہیں کروں گی۔“
”چل حیا باہر آ اور تو رو کیوں رہی ہے‘ یہی ہمارا پیشہ ہے۔ تُو نے پڑھنے کا کہا میں نے پڑھا دیا‘ اب تجھے اس کوٹھے کو آباد کرنا ہے‘ میں اب کہاں سے پیسہ لاؤں‘ میری ہڈیوں میں دم خم رہا نہیں نہ جوانی رہی اب تجھے ہی اپنا اور میرا خرچہ اٹھانا ہے۔ تیری پڑھائی کے لیے جو ادھار لیا تھا ابھی تو وہ بھی اتارنا ہے۔“
”ماں میں نوکری کر لوں گی مگر یہ کام نہیں۔ ماں میں یہ نہیں کر سکتی۔ میں عزت کی روٹی کمانا چاہتی ہوں۔“
”آہا آہا عزت...... تیری ماں کو عزت راس نہ آئی اسے اس معاشرے نے دوبارہ کوٹھے پر دھکیل دیا تُو کیا عزت پائے گی۔ دیکھ حیا! کوٹھے پر رہنے والے عزت کے خواب تو دیکھ سکتے ہیں پر عزت حاصل نہیں کر سکتے اور میں نے تو قسم کھائی تھی کہ تیرے باپ سے ایسا انتقام لوں گی کہ اس کی سات نسلیں یاد رکھیں گی کیونکہ تُو اس کی جائز اولاد ہے‘ تیرے باپ نے مجھے محبت اور عزت کی زندگی دینے کا جھانسہ دے کر نکاح کیا تھا‘ جب میں نے اسے کہا کہ اب اپنے گھر لے چل تو دوبارہ پلٹ کر اس نے دیکھا بھی نہیں‘ میں اس گھر میں بے یار و مددگار پڑی رہ گئی۔ وہ ایک مہینہ میں نے جیسے سسک سسک کر گزارا تھا نہیں بھول سکتی۔ پورا ایک ہفتہ میں نے صرف پانی پی پی کر گزارا کیا تھا۔ جب بھی تیرے باپ کو فون کرتی وہ فون کاٹ دیتا‘ میں نے اس سے عزت کی بھیک مانگی تھی میں نے اسے کہا تھا بے شک مجھ سے نہ ملے گھر بھی نہ بتائے‘ صرف اس شہر میں ایک کمرے کا گھر لے دے‘ سر چھپانے کا ٹھکانہ اور مجھے کچھ نہیں چاہیے میں لوگوں کے گھر کام کر کے پیٹ کی آگ بجھا لوں گی‘ اس سے کچھ طلب نہیں کروں گی مگر اس کا جواب تھا کوٹھے آباد کرنے والیاں عزت کے خواب دیکھنے لگیں تو شریف لڑکیوں کا ٹھکانہ کہاں ہو گا۔ طوائف ہمیشہ طوائف ہی رہتی ہے‘ چاہے وہ کتنی ہی پارسا اور باپردہ بن جائے۔ میرا خاندان ہے‘ اس معاشرے میں میری عزت ہے‘ میں نے اپنے بزرگوں کی عزت داؤ پر نہیں لگائی۔ تُو پسند آ گئی تو میں نے تجھے اپنا لیا‘ یہ میری شرافت ہے

ورنہ ہمارے قبیلے کے لوگ تو نکاح صرف خاندانی عورتوں سے کرتے ہیں کوٹھے والیوں سے تو نکاح کرتے ہی نہیں۔ طوائف کا کوٹھا ہم سے ہی تو آباد رہتا ہے۔ یہ تو کوٹھے والیوں کی خوش نصیبی ہوتی ہے کہ ہم جیسے پیسے والے انہیں منہ لگالیں' تُو دوبارہ کوٹھے پر لوٹ جا' وہی تیرا ٹھکانہ ہے' تجھے طلاق نامہ مل جائے گا اور تیرے دنیا میں آنے سے پہلے تیرے باپ نے مجھے طلاق بھیج دی' اب میں تجھے بنا سنوار کر اس کی حویلی بھیجوں گی۔ اس نے بڑے زعم سے کہا تھا کہ تیرے جیسی ترستی ہے ہماری اک نگاہِ الفت کو' میں نے تو پھر تجھے پورا ایک مہینہ عزت سے اپنے دل کی رانی بنا کر رکھا ہے ورنہ نکاح کے بغیر ہزاروں آنے کے لیے تیار بیٹھی ہیں۔ پیسے کی چاہ میں اور تُو نے بھی تو پیسے کی چاہ میں ہی مجھ سے نکاح کیا ہے۔ طوائف کا دین ایمان پیسہ ہی تو ہوتا ہے' وہ ایک مہینہ میں نے تجھ پر لٹادیا ہے' تیرے ایک مہینے کی قیمت ادا کردی ہے۔"

"بس کر ماں' یہ کہانی بچپن سے تجھ سے سن رہی ہوں' مجھے اپنے باپ سے اتنی نفرت ہوچکی ہے کہ اگر وہ کہیں مل جائے تو میں اسے اپنے ہاتھوں سے ماردوں۔"

"اس لیے تو تقریب کررہی ہوں جب تو گھنگھرو باندھ کر ناچے گی اور دل والے تجھ پر ہزاروں لٹائیں گے تو یہ تصویریں تیرے باپ کو بھیجوں گی' جس نے تیری پیدائش پر کہا تھا۔ میری بیٹی؟ چلو اگر اس نے طوائف کی کوکھ سے جنم لیا ہے تو پھر طوائف ہی بنے گی۔ دیکھ سریتا بائی! میں نے تیرے بڑھاپے کا سہارا دیا ہے' اب تو مجھ سے گلہ نہ کر' اگر بیٹا ہوتا تو وہ تیرا سہارا نہ بنتا پر بیٹی تو تیرا سہارا بنے گی' تیرا کوٹھا آباد رکھے گی۔"

"ہاں وہ میرا کوٹھا آباد رکھے گی پر اس کے نام کے ساتھ تیرا نام بھی گونجے گا کہ اولاد کی پہچان باپ کا نام ہوتا ہے۔"

"طوائف کی اولاد کو اپنی اولاد جاننے لگے تو چل چکا ہمارا نظام' جانے کس کی بیٹی ہے جسے میرے سر تھوپ رہی ہے۔"

"ماں بس کردے' جو بیت گیا سو بیت گیا۔ پر میں یہ ناچ گانا نہیں کروں گی۔ میں تجھے عزت کی روٹی کما کردوں گی' اگر میرا باپ تجھے عزت نہیں دے سکا تو میں اس معاشرے میں تیری عزت کراؤں گی۔"

"بس حیا! مجھے اور کچھ نہیں سننا' کل سے تیری پریکٹس شروع ہے۔"

"ماں تُو نے میرا نام "حیا" رکھا ہے میں اپنے نام کی لاج رکھوں گی میں یہ بے حیائی کا کام نہیں کروں گی یا پھر تو میرا گلہ گھونٹ دے۔"

وہ ساری رات سسکتی رہی۔

"اٹھو حیا! پپو رقاص آیا ہے تجھے اس سے رقص کی تعلیم حاصل کرنی ہے۔"

"ماں میں نے تجھے کہا تھا کہ میں یہ سب نہیں کروں گی' چاہے تُو میرے جسم کی بوٹی بوٹی بھی کردے۔ کچھ بھی ہو میرے اندر ایک غیرت مند باپ کا خون دوڑ رہا ہے۔"

"اخاہ غیرت مند' جس نے تجھے اپنی بیٹی ہی ماننے سے انکار کردیا اگر غیرت مند ہوتا تو یوں ہم دونوں کو بیچ منجدھار میں نہ چھوڑتا۔"

"ماں...... تُو میری ماں ہے نا میں نے تیری ہی کوکھ سے جنم لیا ہے نا تو پھر کوئی ماں اپنی بیٹی کو بے حیائی کی زندگی گزارنے پر کیسے تیار کرسکتی ہے وہ اپنی بیٹی کے جسم کی نمائش کیسے گوارا کرسکتی ہے کہ بھوکے بھیڑیے اس کی بیٹی کو چیر پھاڑ دیں' بتا ماں۔"

"میں صرف طوائف ہوں اور تُو بھی طوائف ہے۔ طوائف نہ تو کسی کی بیوی ہوتی ہے نہ ماں نہ بہن نہ بیٹی' سمجھی تُو طوائف کا کام صرف پیسہ کمانا ہوتا ہے تاکہ وہ زندگی گزار سکے۔"

"مت اذیت دے اپنے آپ کو' شوہر سے انتقام لینے کی خاطر اپنی ہی بیٹی کی عزت کا سودا کرے گی۔ اپنی بیٹی کی بربادی سے تیرا انتقام پورا ہوجائے گا۔ میری ذرا سی بیماری پر تُو تڑپ اٹھتی تھی اور اب جب میرا جسم نیلو نیل ہوگا' میری روح تار تار ہوگی کیا تُو سکون سے رہ سکے گی۔ نہیں ماں چھوڑ دے یہ سب' ہمیں اک نئی زندگی کی شروعات کرنی ہے' باعزت زندگی کی۔ اس معاشرے میں سر اٹھا کر جینا ہے۔ عزت صرف پیسوں والے کی نہیں ہوتی عزت کردار کی ہوتی ہے کہ کوئی کتنا باکردار ہے۔ آج کوٹھیوں میں رہنے والی' گھروں میں رہنے والی صرف اپنے کردار کی وجہ سے باعزت مانی جاتی ہیں لیکن اگر ان کے کردار میں بھی کچا پن ہے' بے راہ روی ہے تو یہ معاشرہ ان پر بھی انگلی اٹھانے سے دریغ نہیں کرتا۔ دیکھتی نہیں کہ گھر سے بھاگنے والی لڑکیاں اس معاشرے میں قابلِ نہیں گردانی جاتیں۔ انہیں یہ معاشرہ قبول نہیں کرتا کیونکہ ان میں حیا ختم ہوجاتی ہے اور بے حیائی جنم لیتی ہے۔ بے حیائی کسی بھی معاشرے میں قبول نہیں کی جاتی۔ ماں خدا کے لیے میری تعلیم میری ڈگری سے اتنا پیسہ ضرور مل جائے گا کہ ہم دونوں عزت سے زندگی گزار سکیں۔"

"حیا! میں نے ایک دفعہ تیرے باپ کو نیچا دکھانا ہے اس نے......" وہ بے اختیار رونے لگیں۔

"ماں اس کا ظرف اس کے ساتھ تیرا ظرف تیرے ساتھ۔ اس نے اس معاشرے کا باعزت فرد ہوتے ہوئے بے حیائی کا کردار ادا کیا اور تُو طوائف ہوتے ہوئے حیا کا کام کر' یہی تیرا انتقام ہوگا۔ پلیز تُو پپو رقاص کو واپس بھیج دے' میں نوکری تلاش کروں گی۔ یہاں رہ کر یہ کوٹھا ہمارا اپنا ہے نا' جب کچھ پیسے جمع ہوجائیں گے تو ہم یہاں سے چلے جائیں گے۔"

"ٹھیک ہے حیا! پہلے تیرے باپ پر بھروسہ کیا تھا اب یہ جوا بھی سہی' اب تجھ پر بھروسہ کرتی ہوں۔"

❀ ......+...... ❀

"ارے تُو حیا کی نتھ نہیں اتروا رہی؟ حیا آج کہاں جارہی تھی؟"

"حیا نوکری کی تلاش میں گئی ہے' وہ یہ کام نہیں کرے گی' وہ عزت کی نوکری کرنا چاہتی ہے۔"

"طوائف اور عزت...... تُو نے بھی تو عزت کا خواب دیکھا تھا' کیا ہوا تیرے ساتھ۔"

"ہاں میں نے اس وقت ایک مرد کا سہارا لیا تھا جس کی سرشت میں وفا نہیں ہوتی اگر وہ وفادار ہوتا تو اس کوٹھے کا رخ نہ کرتا' جو اپنی بیوی بچوں کا وفادار نہیں' اپنے ماں باپ کا وفادار نہ مجھ سے کیا وفا نبھاتا۔ میری غلطی کہ میں نے ایسے کچے کردار کے شخص پر بھروسہ کیا' مگر اب میری بیٹی میرے ساتھ ہے۔ اب میں نے اپنی صنف پر بھروسہ کیا جو وفا نبھاتے نبھاتے اپنی جان سے گزر جاتی ہے پر وفا پر آنچ نہیں آنے دیتی۔"

❀ ......+...... ❀

''بیٹی نوکری مل گئی؟''
''نہیں ماں، بس تُو دعا کر ان شاء اللہ مل جائے گی۔''
''کل ایک کال آئی ہے انٹرویو کے لیے امید ہے تو......''
''کیسا ہوا انٹرویو؟''
''بہت اچھا ہو گیا ہے بس ایک دو دن میں بتا دیں گے۔ جانتی ہو ماں انہوں نے پوچھا تھا کہ میرا باپ کیا کرتا ہے تو میں نے سچ بول دیا کہ میرا باپ میری ماں کو چھوڑ کر چلا گیا تھا اور میری ماں نے مجھے پالا اور پڑھایا لکھایا، بہت متاثر ہوئے۔''

❀......+......❀

''دیکھ ماں! تیری دعا قبول ہو گئی ہے مجھے وہی نوکری مل گئی ہے، پندرہ ہزار تنخواہ ہے، ہم دونوں کے لیے کافی ہے بس ہم جلد ہی یہ جگہ بھی چھوڑ دیں گے۔''
وہ خاموشی سے اپنا کام کرتی نہ کسی سے فالتو بات کرتی، ایک مہینہ ہو گیا تھا کہ ایک دن اسے سر نے بلایا۔
''تم بہت محنت سے کام کر رہی ہو، ہمیں تم سے کوئی شکایت نہیں، اس لیے میں تمہاری ترقی کر رہا ہوں، اپنا پرسنل سیکریٹری مقرر کر رہا ہوں۔''
''سر! میں نے جس فیلڈ کے لیے اپلائی کیا تھا وہی میرے لیے صحیح ہے، مجھے ترقی دینی تو میری اپنی فیلڈ میں دیں، جس کی میں نے تعلیم حاصل کی ہے، جہاں تک پرسنل سیکریٹری کی جاب ہے تو یہ میرے لیے مناسب نہیں، آپ کسی بھی بی اے پاس کو اپنا سیکریٹری بنا سکتے ہیں۔''
''جانتی ہیں آپ کیا کہہ رہی ہیں؟ اس جاب کے لیے لڑکیاں مرتی ہیں، پُرکشش سیلری آسائش اور آپ اسے ٹھکرا رہی ہیں، میں آپ کے خلاف کوئی بھی ایکشن لے سکتا ہوں۔''
''سوری سر! مجھے جو بات مناسب لگی میں نے کہہ دی، میں نے ایم ایس آئی ٹی اس لیے نہیں کیا کہ پرسنل سیکریٹری بن کر اپنے افسران کے دل لبھانے کا سامان بنوں، میں اچھی طرح جانتی ہوں کہ پرسنل سیکریٹری کے کام کیا ہوتے ہیں۔ اگر میں نے سیکریٹری کی ہی جاب کرنا ہوتی تو میں ایف اے کر کے ہی کر لیتی، اگر آپ مجھے جاب سے فارغ کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں سر! تو کوئی بات نہیں یہ دنیا بہت وسیع ہے کہیں نہ کہیں مجھے بھی رزق کمانے کا موقع مل جائے گا۔''
''اوکے مس حیا! ابھی آپ اپنی سیٹ پر جائیں اور میرے آرڈر کا انتظار کریں۔''
''میڈم! یہ سر نے دیا ہے۔'' اس نے لفافہ پکڑا۔
''چل حیا! تیرا رزق اللہ نے اس کمپنی میں اتنا ہی لکھا تھا۔ اب کہیں اور ٹرائی مار۔'' اس نے لفافہ کھولتے ہوئے خود سے کہا۔
''یہ...... یہ...... میں سیکشن انچارج، تنخواہ بیس ہزار۔ یہ...... یہ کیسے ہو گیا؟'' وہ بے اختیار کمپنی کے ڈائریکٹر کے پاس گئی۔
''مگر سر! آپ تو کہہ رہے تھے......''
''جی مس حیا! آپ کو آپ کی فیلڈ میں ہی ترقی دی گئی ہے، اب تو آپ کو خوش ہونا چاہیے۔''
''جی مس حیا! وہ تو ایسے ہی کہا گیا تھا، بہر حال ہمیں امید ہے کہ آپ اسی طرح لگن سے کام کریں گی اور اپنے ورکرز سے کام لیں گی۔ چند دنوں کے بعد اس کمپنی کو میرا بیٹا سنبھال لے گا اور اسے اسی طرح کے محنتی ورکرز کی ضرورت ہے، جن

کی ڈیمانڈ پیسہ نہیں بلکہ اپنی اپنی فیلڈ ہو۔''
''تھینکس سر! آپ نے میری ماں کے خوابوں کو تعبیر دی ہے۔''
''تم کسی نیک ماں باپ کی اولاد ہو، اپنے والدین کے لیے اللہ کا انعام۔''
''ماں۔'' اس نے تمام روئیداد ماں کو سنائی۔
''میں نے سوچا چلو اب چھٹی ہوئی مگر ماں جی آپ کی دعائیں ہر وقت مجھے اپنے حصار میں رکھتی ہیں، اس لیے میرے ساتھ کچھ بھی برا نہیں ہوتا، بس اب تھوڑے عرصہ کی بات ہے، ہم اپنا گھر لے لیں گے، یہ جگہ چھوڑ دیں گے۔''
''ہاں حیا! تُو سچ مچ اللہ کا انعام ہے، اللہ تیرے خوابوں کو تعبیر بخشے۔''

❀......+......❀

اور حیا نے پورے سال کے بعد پروا سے رابطہ کیا۔
''پروا......''
''حیا تم......''
''میں نے کئی بار تجھے فون کیا ہے، بے وفا لڑکی! تیرا نمبر بھی بند ملتا ہے۔''
''آج کیسے میری یاد آئی؟''
''تجھے میں بھولی ہی نہیں، تُو تو ہر وقت میرے ساتھ رہی ہے۔''
''ارے جا، ڈائیلاگ نہ بول تُو میرے گھر آ سکتی تھی۔''
''بس نوکری کے لیے خوار ہوتی رہی اب تھوڑا سکون ملا تو سوچا تجھ سے تیرا حال چال پوچھوں۔''
''بہت جلدی خیال آ گیا۔'' اور پھر دونوں بیتے دنوں کو یاد کرتی رہیں۔

❀......+......❀

''میڈم! آج نئے ڈائریکٹر آ رہے ہیں، وہ سب سے میٹنگ کریں گے اپنے اپنے سیکشن میں۔''
''اوکے، تم فرخ، قاسم اور سعدیہ کو بھیج دو تاکہ ڈسکشن کر لیں، ہمیں کچھ ڈیمانڈز بھی کرنی ہیں تو میٹنگ میں ڈسکس کر لیں گے۔''
''یہ سیکشن انچارج مس حیا ہیں اور حیا! آج سے آپ کے نئے ڈائریکٹر سجاول ضیا!''
''حیا! آپ یہاں......''
''بیٹا! آپ ان کو جانتے ہو؟''
''جی پپا! یہ میری کلاس فیلو تھیں۔''
حیا نے چونک کر سجاول کو دیکھا، یورپ نے اس کی پرسنلٹی کو مزید نکھار دیا تھا اور اس نے معمول کے مطابق اپنی ورکرز کا تعارف کروایا اور کام کے بارے میں ڈسکس کرنے لگی۔
تین ماہ ہو چکے تھے اسے سجاول کے ساتھ کام کرتے ہوئے کہ ایک دن سجاول نے اسے اپنے آفس بلایا۔
''بیٹھیں حیا! مجھے آپ سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔''
''جی سر! کہیں میں سن رہی ہوں۔''
''حیا! ہم کلاس فیلو رہے ہیں، آپ مجھے یہ سر، وَر مت کہیں۔''
''سوری سر! وہ ماضی کی بات تھی، آج میں آپ کی کمپنی کی ملازمہ ہوں اور مجھے اسی تعلق کو یاد رکھنا چاہیے۔''
''حیا! میں آپ کو اپنی زندگی میں شامل کرنا چاہتا ہوں۔''
''سر! آپ میرے بارے میں کیا جانتے ہیں، جو اتنا بڑا فیصلہ کر لیا۔''

"میں صرف تمہیں جانتا ہوں، میرے لیے یہی کافی ہے۔"

"لیکن سر! میرے لیے یہ کافی نہیں ہے، شادی صرف لڑکی لڑکے کے ملاپ کا نام نہیں، دو خاندانوں کے ملاپ کا نام ہے۔ دونوں خاندان ایک دوسرے کو قبول کریں تو وہ شادی کامیاب ہے ورنہ محض لڑکے اور لڑکی کا آپس میں ملنا شادی نہیں جواہے، جو انسان زندگی میں کبھی بار ہار سکتا ہے۔"

"تو ٹھیک ہے نا حیا! آپ مجھے اپنے گھر لے چلیں، آپ کے والدین مجھ سے مل لیں تو میں اپنے والدین کو بھیج دوں گا۔"

"او کے سر! آج چھٹی کے بعد میں آپ کو اپنے گھر لے چلوں گی۔"

"واقعی حیا! آج تم اپنے والدین سے ملواؤ گی۔"

"جی سر! صرف ماں سے۔"

اور چھٹی کے بعد اس نے رکشہ لیا۔

"حیا! میرے ساتھ گاڑی میں چلو۔"

"سوری سر! میں ابھی آپ کے ساتھ نہیں چل سکتی، ہاں آپ رکشہ کو فالو کرتے ہوئے میرے پیچھے آ ئیں۔"

"حیا، حیا...... یہ...... یہ علاقہ......" سجاول نے اسے فون کیا۔

"سر! میں اسی علاقے کی ہوں، گھبرا کیوں گئے بس وہ آخری کوٹھا ہمارا ہے، تھوڑا سا تو فاصلہ رہ گیا ہے۔"

"آیئے سر! یہ سیڑھیاں آپ کے شایانِ شان تو نہیں مگر مجبوری ہے۔"

"آ گئی ہو حیا۔"

"ماں جی! یہ میری کمپنی کے ڈائریکٹر ہیں، آپ سے ملنے کے شوق میں چلے آئے ہیں۔"

"بیٹھیں سر! آپ ماں جی سے باتیں کریں، میں چائے وغیرہ کا انتظام کرتی ہوں۔"

"نہیں حیا! پلیز رہنے دیں، مجھے کچھ نہیں پینا میں اب چلتا ہوں۔"

"اتنی جلدی سر!"

"ہاں مجھے کام یاد آ گیا ہے کل آپ سے بات ہو گی۔"

❁ ...... + ... ❁

"حیا! بہت سوچنے کے بعد بھی میں اپنی محبت سے دستبردار نہیں ہو سکتا۔ میں آپ سے خفیہ شادی کروں گا کیونکہ جس طبقے سے آپ تعلق رکھتی ہیں میرے والدین راضی نہیں ہوں گے۔"

"سر! یہ خفیہ شادی کون سی ہوتی ہے؟"

"وہ شادی جس میں والدین شامل نہیں ہوتے لڑکا اور لڑکی اپنی پسند سے کر لیتے ہیں، کسی کو پتا نہیں چلتا۔"

"سر! یہ شادی نہیں چوری ہوئی، والدین کو دھوکا اور فریب دینا۔ سوری سر! میں ایسا نہیں کر سکتی، میں اپنی ماں کو دھوکا نہیں دے سکتی، جس نے قرضہ لے کر مجھے پڑھایا لکھایا، زندگی کی سختیاں خود برداشت کیں، مجھ پر آنچ نہ آنے دی۔ آج میں ان سب محبتوں کا یہ صلہ دوں محض اپنی نفس پرستی کے لیے اسے چھوڑ دوں۔"

"ارے نہیں آپ کی ماں جی کو تو کوئی اعتراض نہیں ہو گا بلکہ ان کی خوش نصیبی ہو گی کہ ان کی بیٹی کو ایسا چاہنے والا شوہر ملے گا۔ میں اپنے والدین کو نہیں بتاؤں گا کیونکہ وہ ایک طوائف سے شادی کی اجازت کبھی نہیں دیں گے۔"

"سر! میں طوائف نہیں، طوائف ہوتی تو کوٹھا آباد کرتی اور جہاں تک میری ماں کا تعلق ہے تو وہ کبھی بھی ایسی شادی کی اجازت نہیں دیں گی، جس میں آپ کے والدین شریک نہ ہوں۔ میرے لیے درختوں پر آشیانہ بنانے کے بجائے وہ زمین پر آشیانہ بنانے کو ترجیح دیں گی۔ درختوں پر بنے آشیانے تیز ہواؤں سے گر جاتے ہیں اور ہوائیں ان کے تنکے ادھر اُدھر اڑا کر لے جاتی ہیں پھر ان کا نام و نشان بھی مٹ جاتا ہے جب کہ زمین پر بنے آشیانے اگر گر بھی جائیں تو بھی ان کے نشان باقی رہتے ہیں، بذاتِ خود زمین اس گھر کی گواہ بن جاتی ہے۔"

"پلیز حیا! سمجھنے کی کوشش کریں، میرے والدین بعد میں راضی ہو جائیں گے، آج کل ایسا ہی ہو رہا ہے لڑکے اور لڑکیاں والدین کو بتائے بغیر شادی کر لیتے ہیں اور بعد میں راضی کر لیتے ہیں اگر نہ بھی ہوں تو گھر تو بس جاتا ہے۔"

"سوری سر! آپ اسے گھر بسنا کہتے ہیں جب کہ میرے نزدیک ایسے گھر آسیب زدہ ہوتے ہیں جہاں بزرگوں کی دعائیں نہیں ہوتیں اور آنے والی نسل اپنی پہچان کے لیے ترستی ہے کیونکہ میں اس کی مثال آپ کے سامنے ہوں۔ آپ کی طرح ایک وڈیرے نے اپنی محبت آباد کرنے کے لیے میری ماں سے نکاح کیا تھا اور اس نکاح کو خفیہ رکھا تھا مگر جب اس خفیہ نکاح سے دل بھر گیا تو میری ماں کو طلاق دے دی۔ اب میں اس معاشرے میں کتنی قابلِ عزت ہوں وہ آپ کے رویے سے ظاہر ہو گیا ہے اگر میری ماں خفیہ شادی نہ کرتی اس کی شادی میں میرے دادا، دادی شریک ہوتے تو آج اس معاشرے میں میری عزت ہوتی۔ آج ایک بار پھر وہ کہانی نہ دہرائی جاتی، جس کے لیے آپ مجھے اکسا رہے ہیں۔ میں اس خفیہ شادی سے ایک اور حیا کی زندگی برباد کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔ میرا حسب نسب ایک اعلیٰ خاندان سے ہے مگر اس خفیہ شادی کی وجہ سے میرے باپ کی بزدلی اور نافرمانی کی وجہ سے آج میں اپنے خاندان سے دور اس کوٹھے پر رہنے پر مجبور ہوں، میں نے کس طرح سسک سسک کر زندگی گزاری ہے، کبھی کسی فرینڈ کو اپنے گھر نہیں بلایا صرف اس لیے میں جائز اولاد ہوتے ہوئے بھی ناجائز جگہ پر رہنے پر مجبور تھی۔ اگر میرا باپ یہ کھیل نہ کھیلتا تو میں بھی اس معاشرے میں سر اٹھا کر لوگوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جی سکتی۔ آج میں باکردار ہوتے ہوئے بھی نظریں جھکا کر رکھنے پر مجبور ہوں۔ میرے کردار پر انگلیاں اٹھائی جاتی ہیں اور میں یہ سب برداشت کرتی ہوں، صرف اس لیے کہ میری پہچان میرا باعزت باپ نہیں میری ماں کا کوٹھا ہے سر! اور میں جانتی ہوں کہ میری ماں نے شادی کے بعد اور پھر طلاق کے بعد اپنی عزت کا سودا نہیں کیا۔ صرف اپنی آواز کو بیچا ہے مگر پھر بھی طوائف کا دھبہ مرتے دم تک اس کے ساتھ لگا رہے گا۔ او کے سر! اب میں چلتی ہوں اور اب اس ٹاپک پر مجھ سے بات نہ کیجیے گا۔"

❁ ...... + ... ❁

تایا ابو زندگی میں کبھی کوئی غلطی کی جس پر ندامت محسوس ہوئی ہو؟"

"سجاول بیٹا! آج کیسی باتیں کر رہے ہو؟ پتر غلطیاں ہوں بھی تو شیر لوگ اس پر ندامت محسوس نہیں کرتے۔" شمشیر علی نے جواب دیا۔

"نہیں تایا ابو! اگر زندگی میں کوئی غلطی کی ہو، ایسی غلطی جس سے کسی کی زندگی برباد ہوئی ہو تو اس

پر ندامت ضرور محسوس کرنی چاہیے کیونکہ روزِ محشر تو اس کا حساب دینا ہی ہے بعض اوقات دنیا میں ہی ایسی غلطیوں کا حساب دینا پڑتا ہے۔'' شمشیر علی نے چونک کر اسے دیکھا۔

''کبھی کبھی میں سوچتا ہوں ہمارے خاندان میں سے کسی نہ کسی سے کوئی غلطی ہوئی ہے جس کی سزا ہم سب بھگت رہے ہیں۔''

''کیسی سزا؟''

''تایا ابو یہ سزا ہی تو ہے کہ سوائے میرے اس خاندان کا کوئی وارث نہیں ہے۔ ساون' سالار کیسے یکے بعد دیگرے لقمۂ اجل بن گئے اور اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے آپ کو اولاد سے نوازا ہی نہیں۔ میں ہوں تو اپنے باپ کی اکلوتی اولاد' چچا فرقان ہیں تو وہ بے اولاد ہیں' اب انہوں نے یتیم خانے سے بچہ گود لے لیا ہے۔ تایا ابو میں بہت اکیلا ہوں' ساون اور سالار مجھے بہت یاد آتے ہیں' میں کس سے اپنے دل کی باتیں کروں؟''

''او یار! یہ اللہ کی مصلحتیں ہیں' اللہ کی چیز تھی اللہ نے واپس لے لی ہے اور تُو سوچا نہ کر چل اپنے دل کی باتیں مجھ سے کر لیا کر۔''

''ٹھیک کہتے ہیں آپ تایا ابو! بس دنیا اسی کا نام ہے' کبھی ماں باپ اپنی سگی اولاد کو دنیا میں رُلنے کے لیے چھوڑ دیتے ہیں اور کبھی ماں باپ اولاد کے لیے ترستے ہیں۔''

اک سرگوشی تھی جو اسے چاروں طرف سے سنائی دے رہی تھی۔

تیری بیٹی پیدا ہوئی ہے...... تیری بیٹی پیدا ہوئی ہے۔

''یہ...... یہ سجاول آج مجھے کس دوراہے پر کھڑا کر گیا ہے۔ ضمیر کی چبھن' تُو نے رحمت سے انکار کیا' اللہ نے تجھ سے نعمت بھی چھین لی۔'' بے اختیار اس نے کانوں پر ہاتھ رکھ دیئے مگر آوازیں تھیں کہ ہر بند توڑ کر تواتر سے سنائی دے رہی تھیں۔

❀ ...... ✦ ...... ❀

''ارے تایا ابو آپ یہاں......''

''ہاں بس یوں ہی تجھ سے ملنے کو دل چاہ رہا تھا تو سوچا آفس ہی چلتا ہوں' دو ہفتے ہو گئے ہیں تم آئے ہی نہیں ہماری طرف۔ تیری تائی تجھے یاد کر رہی تھی آج اس نے تیری پسند کا ساگ اور مکئی کی روٹی بنائی ہے' اب تُو میرے ساتھ ہی چلے گا۔''

''ہاں تایا ابو آفس کے سلسلے میں بہت بزی رہا ہوں' مال یورپ بھجوانا تھا گھر بھی رات گئے جاتا رہا ہوں۔''

''کیا میں اندر آ سکتی ہوں؟''

''یس مس حیا! آئیں بیٹھیں اور کل کی پراگریس کی رپورٹ دیں۔''

''سر! سب کچھ فائل میں ہے' کچھ ڈیمانڈ بھی ہیں اور سر! آج مجھے جلدی جانا ہے' میری ماں جی کی طبیعت خراب ہے۔'' پریشانی اس کے چہرے سے ہویدا تھی۔

''ٹھیک ہے مس حیا! آپ چلی جائیں اور مس سعدیہ کے سپرد کام کرتی جائیں اگر کل چھٹی کرنی پڑے تو کر لیجیے گا۔''

''شکریہ سر!''

''بڑا پُرنور چہرہ ہے اس بچی کا۔'' اس نے چونک کر تایا کی طرف دیکھا۔

''ہاں تایا ابو! لیکن نصیب سیاہ ہیں' اپنی پہچان کے لیے ترس رہی ہے۔''

''کیوں کیا ہوا؟''

''بس اس کے باپ نے ماں سے خفیہ شادی کی اور جب دل بھر گیا تو چھوڑ دیا۔ جب بیٹی پیدا ہوئی تو اسے بھی قبول کرنے سے انکار کر دیا' یہ بے چاری اپنے ماں باپ کی غلطی کی سزا بھگت رہی ہے۔ کوئی اسے اپنانے کو تیار نہیں اگر کوئی اس کے کردار و حسن سلیقہ سے متاثر ہو کر تیار بھی ہو جاتا ہے تو لڑکے کے ماں باپ نہیں مانتے۔ بس تایا ابو کرتا کوئی ہے اور بھرتا کوئی ہے۔''

''کیا تمہیں یہ لڑکی پسند ہے؟''

''آپ کو کیسے پتا۔'' اس نے چونک کر انہیں دیکھا۔

''تمہارے لہجے کی شکستگی نے باور کرایا ہے کہ کچھ ایسا ہے کہ ہمارا جوان اتنے شکستہ لہجے میں بات کر رہا ہے۔''

''تایا ابو میں ایک حیا کی بات تو نہیں کر رہا میں تو اس معاشرے کی لاتعداد حیاؤں کے بارے میں بات کر رہا ہوں جو گھر سے بھاگنے خفیہ شادی کرنے والوں کی غلطیوں کی سزا بھگت رہی ہیں نہ انہیں خاندان قبول کرتا ہے اور نہ یہ معاشرہ لیکن اگر دیکھا جائے تو قصور کس کا ہے' اس معاشرے کا یا ان مردوں کا' ان عورتوں کا جو ہوس پرستی کو محبت کا نام دے کر اس قسم کا کارنامہ سرانجام دیتے ہیں اور آنے والی نسل کے راستے میں کانٹے بو دیتے ہیں۔''

''سجاول بیٹا! یہ حیا تجھے پسند ہے نا تو یہی ہمارے خاندان کی بہو بنے گی۔ میں خود ضیاء سے بات کروں گا۔''

''مت اتنا بڑا دعویٰ کریں کیونکہ وہ جس جگہ رہتی ہے وہاں دن کے وقت کوئی شریف انسان جانا پسند نہیں کرتا' ہاں رات کے اندھیرے میں تمام شرفاء کے قدم اسی دہلیز کی طرف اٹھتے ہیں۔''

''کیا یہ طوائف زادی ہے؟''

''نہیں' یہ طوائف زادی نہیں ہے اس کی رگوں میں ایک خاندانی شخص کا خون دوڑ رہا ہے' جس نے ایک طوائف کو عزت کی زندگی دینے کا جھانسہ دے کر نکاح کیا اور دل بھرنے پر چھوڑ دیا ہے اس نے کوٹھے پر رہ کر تعلیم حاصل کی' اپنے کردار و عزت کی حفاظت کی ہے۔''

''یہ...... یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ طوائف کی کوکھ سے جنم لینے والی طوائف نہ بنے۔''

''باپ نے تو طوائف بننے کے لیے چھوڑ دیا تھا مگر ماں نے طوائف ہونے کے باوجود بیٹی کی حیا کو برقرار رکھا۔ چلیں تایا ابو' تائی اماں انتظار کر رہی ہوں گی۔''

رات کو جب وہ بیڈ پر لیٹے تو لفظوں کی بازگشت گونج رہی تھی۔ ماں باپ کے کیے کی سزا اولاد کو ملتی ہے۔

''آہ میری بیٹی! یونہی سزا کاٹ رہی ہو گی یا اس کی ماں نے اسے طوائف بنا دیا ہو گا۔ اُف خدایا! یہ مجھ سے کیسا گناہ سرزد ہوا۔ میں' میں سریتا بائی کو چھوڑ دیتا مگر اپنی بیٹی کو تو نہ چھوڑتا۔ اف کیسے ڈھونڈوں اپنی بیٹی کو' کہاں ہو گی' کس حال میں ہو گی۔ مجھے سجاول سے بات کرنی چاہیے شاید وہ میری مدد کرے' میں اپنی بیٹی کو گھر لے آؤں گا۔ وہ میرا خون ہے۔''

❀ ...... ✦ ...... ❀
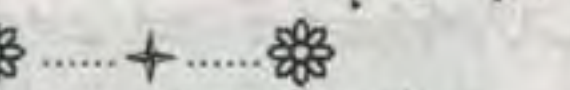
آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا' آنکھیں سرخ ہو رہی ہیں آپ کی۔''

''ہاں بس رات کو سو نہیں سکا' سر میں درد ہے' تم سجاول کو فون کر دو وہ مجھ سے مل کر جائے۔''

''تایا ابو کیا ہو گیا ہے آپ کو؟''

''بس یار ایک غلطی کی تھی ماضی میں' اب اس کی تلافی کرنا چاہتا ہوں۔ تیری باتوں نے تو میری راتوں کی نیند اڑا دی ہے۔ ضمیر کی چبھن نے ساری رات سونے نہیں دیا۔''

''کیسی غلطی تایا ابو؟''

''بس مار یہ یہ نہ پوچھ میرا ضمیر مجھے بے عزت کر رہا ہے سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں۔''

''اچھا آج شام کو تیار رہیے گا' میں آپ کو کسی سے ملوانے لے چلوں گا۔''

......☆☆☆......

''یہ...... یہ تم مجھے کدھر لے کر جا رہے ہو؟'' کچھ کچھ جانے پہچانے راستے تھے۔

''تایا ابو! حیا کے گھر آپ میرے لیے حیا کا رشتہ مانگیں گے نا' حیا کی امی سے۔''

''لیکن سجاول بیٹا! مجھے پہلے ضیا سے تو بات کر لینے دو۔ میں اس طرح کیسے؟ نہیں یہ غلط بات ہے سب سے پہلے تم پر تمہارے باپ اور ماں کا حق ہے اگر وہ راضی ہوئے تو ٹھیک ورنہ میں بات نہیں کروں گا۔''

''او کے تایا ابو! آپ حیا کی ماں جی سے تو مل لیں۔''

''سر! آپ اور یہ کون ہیں؟''

''یہ میرے تایا ابو ہیں' آنٹی کی طبیعت کیسی ہے' ہم انہیں ہی دیکھنے آئے ہیں۔''

''امی کی طبیعت رات سے بہت زیادہ خراب ہے' بخار نہیں ٹوٹ رہا۔ میں انہیں اسپتال ہی لے کر جا رہی ہوں۔''

''میں انہیں لے چلتا ہوں۔''

''نہیں سر! میں نے ٹیکسی منگوائی ہے' میں انہیں لے جاؤں گی۔'' حیا نے سختی سے کہا۔

شمشیر علی کھو سے گئے' جانا پہچانا گھر محسوس ہو رہا تھا۔

''آپ پلیز بیٹھیں۔''

چارپائی پر ایک ٹوٹا پھوٹا شکستہ خوردہ وجود پڑا تھا۔ مگر ماضی کی جھلکیاں ابھی بھی چہرے پر موجود تھیں۔

''سریتا......''

حیا نے چونک کر اس وجود کو دیکھا جس کے لبوں سے سریتا کا لفظ ٹوٹ ٹوٹ کر ادا ہو رہا تھا۔

''آپ...... آپ ماں جی کو کیسے جانتے ہیں؟''

''حیا اس بات کو چھوڑو' آنٹی کی طبیعت زیادہ خراب لگ رہی ہے مجھے۔ میں انہیں اٹھا کر نیچے گاڑی میں لے جا رہا ہوں' تم نے آنا ہے تو ٹھیک ہے ورنہ......'' سجاول نے چارپائی پر نیم بے ہوش پڑے وجود کو پھرتی سے اٹھایا۔

''نہیں سر! نہیں میری ماں کو کسی غیر نے ہاتھ نہیں لگایا' میں آپ کو اس کی اجازت نہیں دے سکتی' میری ماں جی کو چھوڑ دیں۔''

''حیا! میرا ان سے بہت گہرا رشتہ ہے۔''

''رشتہ......'' حیا کے چہرے پر حیرانی رقم تھی۔

''چلو بیٹی اس وقت تمہاری ماں کو فوراً اسپتال لے جانا بہت ضروری ہے۔ تم میرے ساتھ چلو۔'' اور وہ نہ چاہتے ہوئے بھی ساتھ چل پڑی روبوٹ کی طرح۔ اس کے دل و دماغ میں صرف لفظ رشتے کی تکرار ہو رہی تھی۔

سجاول اور اس کے تایا کی وجہ سے ڈاکٹرز کی قطار لگ گئی اور وہ نڈھال سی ایمرجنسی کے باہر بیٹھ گئی۔ دو گھنٹے گزر گئے وہ ساکت نظروں سے ایمرجنسی ڈور کو تکے جا رہی تھی۔ سجاول اور اس کے

تایا بھی وہیں تھے۔ دو گھنٹوں کے بعد ایمرجنسی ڈور کھلا۔

''مریضہ کو ہوش آ گیا ہے۔ سر! آپ ان سے مل سکتے ہیں۔''

حیا ایک دم اٹھی اور بھاگ کر اندر گئی۔

''ماں جی کیا ہو گیا ہے آپ کو۔'' ان کے لرزتے کانپتے وجود نے حیا کو اپنی آغوش میں چھپا لیا۔

''حیا! میری جان مجھے لگتا ہے کہ زندگی اب کے مجھ سے روٹھنے والی ہے' کبھی میں مرنا چاہتی تھی تو موت مجھے قبول نہیں کرتی اور آج میں جینا چاہتی ہوں تو موت کی آہٹیں میں اپنے تعاقب میں سن رہی ہوں۔ یوں لگ رہا ہے کہ اب تجھ سے بچھڑنے کی گھڑی آ پہنچی ہے۔''

''نہیں ماں جی! ایسی باتیں مت کریں' میں آپ کے بنا جی کے کیا کروں گی۔''

''حیا! میری بات غور سے سن' صندوق میں نکاح نامہ' تیرے باپ کی تصویر اور فون نمبر موجود ہے' میرے بعد اپنے باپ کے پاس چلی جانا۔ سجاول تیرے باپ کو جانتا ہے' وہ تیری مدد کرے گا۔ اگر باپ نے قبول کر لیا تو اس کے ساتھ رہنا یہی میری وصیت ہے۔ اگر قبول نہ کیا تو کوٹھے پر واپس نہ آنا' باعزت نوکری کر رہی ہو کسی ہوسٹل میں رہائش رکھ لینا مگر کوٹھے پر لوٹ کر کبھی نہ آنا۔''

اچانک ان کی نظریں دروازے پر اٹھیں اور پلک جھپکنا بھول گئیں۔

''شمشیر علی!'' ان کے لبوں نے سرگوشی کی اور حیا نے پلٹ کر دیکھا' سجاول کے تایا ابو کھڑے تھے۔

اسے ماں جی کے چہرے پر ان گنت سوال نظر

آئے۔ دکھ، درد، مایوسی چھوڑنے کا سوال اور محبت کی چمک۔ کیا ماں جی اس شخص سے محبت کرتی تھیں اور کرتی ہیں؟

دوسرا چہرا ندامت سے سر جھکائے کھڑا تھا اور اس کے کانوں نے آواز سنی۔

''سریتا! میں تمہارا گناہ گار ہوں، تمہیں عزت کی زندگی نہ دے سکا۔ رحمت سے انکار کیا تھا اللہ تعالیٰ نے مجھ سے نعمت بھی چھین لی۔ تم خوش قسمت ہو کہ جنت کی حق دار بن گئیں اور میں اتنا بدنصیب ہوں کہ آج خالی دامن اور خالی ہاتھ لیے کھڑا ہوں۔ اپنے گناہ گار کو معاف کردو۔ میں، میں اب اپنی بیٹی کا سر جھکنے نہیں دوں گا، یہ باپ کے حوالے سے پہچانی جائے گی اور سر اٹھا کر جیے گی۔ میں تم دونوں کو اپنے گھر لے جاؤں گا۔''

اس کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ آئی اس کے ہاتھ بے اختیار اٹھے اور پھر گر گئے۔

''ماں جی...... ماں جی......'' مگر وہ چہرے پر ابدی سکون لیے سو رہی تھی، جیسے وہ حیا کی فکر سے آزاد ہو گئی ہو۔

''سوری سر! ہم کوشش کے باوجود انہیں بچا نہیں سکے۔ ہارٹ اٹیک نے جسم و روح کا رشتہ توڑ دیا۔''

ایمبولینس میں ڈیڈ باڈی رکھی گئی تو اس نے ڈرائیور کو پرانی انارکلی چلنے کے لیے کہا۔

''نہیں حیا! میت میرے گھر سے اٹھے گی۔ میں نے سب کو اطلاع کردی ہے، ڈرائیور عسکری کی طرف موڑ لو۔''

''نہیں، مجھے یہ خیرات نہیں چاہیے، ساری عمر میری ماں عزت کی بھیک مانگتی رہی کسی نے اسے عزت نہ دی اور اب مرنے کے بعد نہیں چاہیے عزت، گھر، خاندان۔ ہم بے نام ہی ٹھیک ہیں۔'' وہ چیخ پڑی۔

''حیا...... حیا! ہوش کرو، تمہاری ماں جی نے کیا کہا تھا۔''

''مجھے کچھ نہیں سننا، میری ماں کی میت انہی اپنوں سے اٹھے گی، جنہوں نے ہر مشکل میں میری ماں کا ساتھ دیا۔ محبت دی جب عزت داروں نے اسے دھتکار دیا تو اسے گلے سے لگایا اس کے زخموں پر مرہم رکھا، میں اپنی ماں کو اجنبی اور غیروں کے حوالے نہیں کروں گی۔'' وہ چیختے چیختے بے ہوش ہو گئی۔

''حیا! اٹھو...... آنٹی کا آخری دیدار کر لو۔'' پروا نے اسے جھنجوڑتے ہوئے کہا۔ اس نے اجنبی نظروں سے پروا کو دیکھا۔ لوگوں کا ہجوم تھا اور سامنے ایک وجود سفید براق لباس پہنے پھولوں سے ڈھکا ہوا تھا۔

''ماں جی......'' وہ لپک کر گئی اور اس چہرے کو حسرت سے تکنے لگے۔ جو اَب منوں مٹی تلے دبنے جا رہا تھا۔ وہ بلک بلک کر روئی مگر اس کی آہیں، سسکیاں، ماں جی کو واپس نہ لاسکیں۔

ایک ہفتہ گزر گیا، یونہی روتے ماضی کو دہراتے۔

''میں اپنے گھر جانا چاہتی ہوں۔''

''کون سا گھر......''

''وہی گھر جس میں آپ نے میری ماں کو لوٹنے پر مجبور کیا وہی گھر جس نے مجھے اپنی آغوش میں لیا، آپ کا مجھ سے تعلق ہی کیا ہے، آپ نے تو مجھے ماں کا سہارا قرار دیا تھا مجھے اپنی اولاد ماننے سے ہی انکار کردیا تھا۔ پھر کس برتے پر کس تعلق سے اس گھر میں رہوں، کیا ثبوت ہے آپ کے پاس کہ میں آپ کی بیٹی ہوں۔''

''تمہاری حیا...... تمہارا کردار اور تمہاری ماں کی پرورش۔ جانتی ہو کہ تمہاری ماں پیدائشی طوائف نہیں تھی، اسے کہیں سے اغواء کرکے لایا گیا تھا اور طوائف بننے پر مجبور کیا گیا تھا لیکن اس نے رقص کیا، گانے گائے مگر اپنی عزت کا سودا نہیں ہونے دیا۔ ہم دونوں کا نکاح اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ ایک شریف عورت تھی، جو گھر بسانا چاہتی تھی۔''

''کیوں سزا دی میری ماں کو؟ کیوں طوائف کہہ کر چھوڑ دیا جب کہ آپ جانتے تھے کہ وہ طوائف نہیں تھی؟ پھر کوٹھے پر جانے پر کیوں مجبور کیا؟''

''اس عزت اور خاندان کی وجہ سے کہ کوئی انگلی نہ اٹھائے بس بھٹک گیا تھا اگر صراطِ مستقیم پر رہتا تو کیچڑ میں اگے ہوئے کنول کو دوبارہ کیچڑ میں نہ پھینکتا۔ حیا! خدا کے لیے مجھے معاف کردو، اب یہی تمہارا گھر ہے صرف ایک دفعہ اپنے منہ سے مجھے بابا جانی کہہ دو، میں مدتوں سے ترس رہا ہوں، اس لفظ کے لیے۔ تیرے ساتھ، تیری ماں کے ساتھ زیادتی کی تو اللہ نے بدلہ لے لیا نا، ساون اور سالار مجھے بابا جانی کہنے والے واپس لے لیے۔''

''بیٹی باپ تو تمہارا گناہ گار ہے اسے معاف کردو، مگر مجھے کس گناہ کی سزا دو گی عرصہ بعد تو اس گھر میں رحمت کے لیے دروازے کھلے ہیں مجھے ماں جی کہہ دو میں ترس رہی ہوں، یہ دو لفظ سننے کے لیے۔ مجھے بیٹے کی بڑی خواہش تھی یوں مجھ سے منہ نہ موڑو، میری آغوش خالی ہے۔'' اس نے بیگم شمشیر کی طرف دیکھا ویسی ہی محبت اور ممتا امڈ رہی تھی جو ماں جی کے چہرے پر اسے نظر آتی تھی۔

''حیا! یہ بات یاد رکھنا کبھی کسی کا دل نہ توڑنا کہ دل میں تو ربّ بستا ہے۔'' وہ بے اختیار آگے بڑھی اور ممتا کی آغوش نے اسے سمیٹ لیا۔ آج وہ اپنے باپ کے ساتھ قدم اٹھاتی پروا کے گھر کی جانب رواں تھی۔

''انکل شام کو میں اسے چھوڑ دوں گی۔''

''او کے بیٹا! میں شام کو خود ہی لینے آجاؤں گا۔ حیا تم مجھے فون کر دینا۔''

اس نے نظریں اٹھا کر بلند و بالا درختوں کو دیکھا کہ آج وہ باپ کے حوالے سے پہچانی جارہی تھی۔ اس لیے آج اس کی نظریں خفیہ شادی کے بوجھ سے جھکی ہوئی نہیں تھیں بلکہ وہ سر اٹھا کر دیکھ رہی تھی۔

''ارے کیا گیٹ پر رک کر آسمان کا نظارہ کرتی رہو گی۔ چلو اندر، میں تو کسی وڈیرے سے شادی نہیں کروں گی اور ہفتہ پہلے کیسے مزے سے وڈیرے کے ہاتھوں سے انگوٹھی پہن لی۔'' پروا بے تکان بول رہی تھی اور اس کے چہرے پر دھیمی دھیمی مسکراہٹ اپنا رنگ جما رہی تھی۔

آج چہرے کے ساتھ ساتھ اس کی آنکھیں بھی مسکرا رہی تھی کچھ کھونے کا تاثر تو تھا مگر پا لینے کی خوشی کا عکس بھی جھلملا رہا تھا اور پروا نے سوچا یہ خفیہ شادی کتنے المیوں کو جنم دیتی ہے اگر حیا کا باپ اسے قبول نہ کرتا تو حیا آج کہاں ہوتی؟ کاش دل بہلانے والے ان المیوں کی خبر بھی رکھیں۔ نہ جانے کتنی حیائیں عزت کے لیے ترس رہی ہیں اور نہ جانے کتنے نوجوان عزت اور خاندان کی بھیگ مانگ رہے ہیں جنہیں معاشرہ طوائف کا بیٹا یا بیٹی کہتا ہے......!

قرآنی علاج

حافظ شبیر احمد

عنبر علی......اوکاڑہ

جواب: سورۃ آل عمران آیت نمبر 38 دعا کرتے وقت پڑھے۔

روزگار کے لیے: سورۃ قریش 111 مرتبہ بعد نمازِ عشاء اول و آخر 11 مرتبہ درود شریف۔

بشیر احمد بھٹی......فوجی بستی، بہاولپور

جواب: 11 مرتبہ بسم اللہ الرحمن الرحیم، 41 مرتبہ لاحول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم۔ اول و آخر 3،3 مرتبہ درود شریف۔ پانی / دودھ پر دم کر کے پلائیں۔ دن میں 2 مرتبہ۔

نسیم اختر......سمندری

جواب: 41 بار درود شریف۔ 41 بار آیۃ الکرسی۔ 41-41 بار آخری تینوں قل تیل و پانی پر دم کر کے پورے جسم پر ملیں اور پانی پئیں 41 روز تک کریں۔

ردا......پیپلز کالونی، فیصل آباد

جواب: بعد نمازِ فجر سورۃ الفرقان کی آیت نمبر 74، 70 مرتبہ (اوّل و آخر گیارہ گیارہ مرتبہ درود شریف پڑھیں۔ دعا یہ کریں کہ اگر یہ رشتہ حق میں بہتر ہے تو دوبارہ بات بن جائے نہیں تو جہاں حق میں بہتر ہو وہاں ہو جائے۔

مصباح محبوب......راولپنڈی

جواب: رشتہ کے لیے سورۃ الفرقان آیت نمبر 74، 70 مرتبہ اوّل و آخر درود شریف گیارہ گیارہ مرتبہ پڑھیں بعد نمازِ فجر دعا بھی کریں۔

گھر میں جب چینی آئے تو اس پر تین مرتبہ سورۃ مزمل (اوّل و آخر درود شریف) پڑھ کر پھونک ماردیں اور چینی سب گھر کے تمام افراد کے استعمال میں رہے (نیت یہ ہو کہ آپ کی لڑائی ختم ہو اور محبت پیدا ہو)۔

بشریٰ ظہیر......ٹیکسلا، راولپنڈی

جواب: جوابی لفافہ بھیجیں۔

خالدہ پروین، محمد بوٹا خاں......فیصل آباد

جواب: فجر کی نماز کے بعد سورۃ الفرقان آیت نمبر 74، 70 مرتبہ پڑھیں اوّل و آخر درود شریف پڑھ کر دونوں کے رشتوں کے لیے دعا کریں۔ ان شاء اللہ جلد مسئلہ حل ہو جائے گا۔

ثوبیہ......فیصل آباد

جواب: بی بی معاملات گمبھیر ہیں۔ ان سب معاملات میں آسیبی دخل ہے اگر آپ کے قرب و جوار میں کوئی اچھا عامل ہو تو اس سے مکمل علاج کروائیں (آپ لوگوں کے علاج میں کم از کم تین ماہ کا عرصہ لگے گا)۔ نہ ہو تو پھر رجوع کریئے گا۔

طالب حسین......چکوال

جواب: ہر نماز کے بعد گیارہ مرتبہ سورۃ اخلاص پڑھ کر اس کے لیے اور اس کی روزی کے لیے دعا کریں۔

حنا نورین......دالبدین ضلع چاغی

جواب: ہر نماز کے بعد گیارہ مرتبہ "یاقوی" سر پر ہاتھ رکھ کر پڑھا کریں، ان شاء اللہ حافظہ قوی ہو جائے گا۔

سورۃ یٰسین صرف بعد نمازِ فجر ایک مرتبہ پڑھا کریں اسی کے بعد ایک مرتبہ سورۃ رحمن پڑھا کریں ان شاء اللہ مسئلہ حل بھی ہو جائے گا اور دوبارہ پریشانی بھی نہیں ہوگی۔

شائلہ......منڈی بہاؤالدین

جواب: رشتہ کی دعا سورۃ الفرقان آیت نمبر 74، 70 بار بعد نمازِ فجر صبح و رات سوتے وقت آیۃ الکرسی 41 بار۔ سورۃ الفلق، سورۃ الناس 41 بار پڑھ کر پانی پر پھونک مار کر پئیں ان شاء اللہ مسئلہ حل ہو جائے گا۔

عابدہ پروین......پشاور

جواب: بچی کا نام جویریہ رکھیں، جو کچھ بھی کھلائیں چمچ میں یا ہاتھ سے ہر بار بسم اللہ پوری پڑھ کر پھونک مار کر کھلائیں پلائیں، ٹھیک ہو جائے گی۔

رخسانہ جبین......سمبڑیال ضلع سیالکوٹ

جواب: جناب کا مسئلہ ہے۔ روزانہ 41 بار سورۃ الجن پڑھ کر پانی پر پھونک مار کر خود بھی پئیں اور گھر والوں کو بھی پلائیں اور گھر میں بھی چھڑکیں تین ماہ تک۔

حمیرا شاہین......ملتان

جواب: یٰسین شریف آیت نمبر 20-21، 101 بار پڑھیں، محبت کے لیے۔

یٰسین شریف آیت نمبر 65، 113 بار ہر نماز کے بعد پڑھ کر دعا کریں کہ برائیاں ختم ہوں اور بدتمیزی نہ کرے۔

عاصمہ عالمگیر......سرگودھا

جواب: بی بی راضی کرو وہاں والے کو۔ درود شریف کی کثرت کرو۔

سلمیٰ رفیق بٹ......لاہور

جواب: بہن یہ جادو ہے۔ سورۃ بقرہ ایک مرتبہ (گیارہ گیارہ مرتبہ اوّل و آخر درود شریف) کے ساتھ پانی پر پڑھ دیں اور وہ پانی پورے ہفتے سلمیٰ استعمال کریں، دوسرے پانی استعمال نہ کریں۔ اگلا ہفتہ اسی طرح دوبارہ پڑھیں تین ماہ تک یہ عمل کریں۔

"بیری" کے 41 پتے لے کر سادہ پانی میں ابالیں۔ ابلا ہوا پانی بالٹی میں ڈال کر اور پانی ملالیں اسی سے سلمیٰ غسل کریں، ہفتہ میں یہ عمل دو مرتبہ ضرور کریں۔

زکیہ سلطانہ......خانیوال

جواب: رشتہ کے لیے بعد نمازِ فجر سورۃ الفرقان آیت نمبر 74، 70 مرتبہ پڑھیں اوّل و آخر گیارہ گیارہ مرتبہ درود شریف۔ رشتہ کے لیے دعا کریں ان شاء اللہ مسئلہ حل ہو جائے گا۔

وظیفہ بعد نمازِ فجر پڑھ لیا کریں ایک تسبیح بہتر ہے آپ خود کریں۔

سائرہ......فیصل آباد

جواب: آپ کے گھر میں مسئلہ ہے (بہتر ہے بدل لیں)۔ نماز کی پابندی کریں بعد نمازِ فجر سورۃ یٰسین اور سورۃ مزمل ایک ایک مرتبہ دونوں۔ بعد میں کاروبار کے لیے دعا بھی کریں۔ سورۃ عبس گیارہ مرتبہ بعد نمازِ عشاء بغیر درود شریف کے تین ماہ تک پڑھیں دونوں۔ نیت آپ دونوں پر سے اثرات ختم ہو رہے ہیں۔ صدقہ بھی دیں۔

مصباح رحیم......مقام نامعلوم

جواب: بہتر یہی ہے آپ دفتر Email پر رابطہ کریں۔ ان شاء اللہ مسائل حل ہو جائیں گے۔

فرزانہ کوثر......کنجاہ

جواب: بعد نمازِ فجر سورۃ الفرقان آیت نمبر 74، 70 مرتبہ پڑھیں (اوّل و آخر گیارہ گیارہ مرتبہ درود شریف کے ساتھ۔ رشتہ کے لیے دعا

کریں، مسئلہ جلد حل ہو جائے گا ان شاء اللہ۔

ظہیر فاطمہ...... ضلع نارووال

جواب: "لاحول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم" 313 مرتبہ اوّل و آخر گیارہ گیارہ مرتبہ درود شریف کے ساتھ پانی پر دم کر دیں، وہی پانی استعمال کروائیں۔ رات کو ان کے سرہانے سونے کے بعد کھڑے ہو کر 41 مرتبہ پڑھیں، ان شاء اللہ جلد عادت ختم ہو جائے گی۔

عائشہ جاوید...... لاہور

جواب: بعد نمازِ عشاء سورۃ اخلاص 41 مرتبہ اوّل و آخر گیارہ گیارہ مرتبہ درود شریف کے ساتھ اپنے دونوں مسئلے کے لیے دعا کریں۔

نوٹ: ہمارے حساب سے حیدر علی کے ساتھ آپ کا رشتہ بہتر نہیں۔

زکیہ سلطانہ...... خانیوال

جواب: بعد نمازِ فجر سورۃ الفرقان آیت نمبر 74، 70 مرتبہ پڑھیں اوّل و آخر گیارہ گیارہ مرتبہ درود شریف کے ساتھ، رشتے کے لیے دعا کریں، ان شاء اللہ مسئلہ حل ہو جائے گا۔

ہر وظیفہ بعد نمازِ فجر پڑھ لیا کریں، ایک تسبیح بہتر ہے آپ خود کریں۔

شبانہ بشیر...... گجرات

جواب: سورۃ القریش کامیابی ہو، 313 بار بعد نمازِ عشاء۔ رشتہ کے لیے سورۃ الفرقان کی آیت نمبر 74، 70 بار بعد نمازِ فجر، رشتہ کی دعا کریں۔

ر، ظ...... آزاد کشمیر

جواب: بی بی یہ وظیفہ چار ماہ چار دن کا ہے۔ اس کے ساتھ بعد نمازِ فجر سورۃ الفرقان کی آیت نمبر 74، 70 بار پڑھنی ہے۔ اول و آخر درود شریف کے ساتھ۔ نیت یہ ہو کہ رشتہ اُن ہی دنوں میں ہو جائے گا۔

غ، ا...... پاکپتن

جواب: وہ کیوں کرتا ہے اس کا جواب آپ کو وہی بہتر دے گا۔ موٹاپے کے لیے حکیم صاحب سے رابطہ کریں۔

فرزانہ اشفاق...... بہاولپور

جواب: بعد نمازِ فجر سورۃ الفرقان آیت نمبر 74، 70 مرتبہ اوّل و آخر گیارہ گیارہ مرتبہ درود شریف، اچھے رشتہ کے لیے دعا کریں۔

بعد نمازِ عشاء تین مرتبہ سورۃ عبس (تیسواں پارہ) پڑھیں بغیر درود شریف کے۔ نیت جو رشتہ میں رکاوٹ آ رہی ہے وہ ختم ہو جائے، ان شاء اللہ جلد مسئلہ حل ہو جائے گا۔

ناہید یوسف...... لاہور

جواب: سورۃ یٰسین ایک بار، آیۃ الکرسی سات بار، چاروں قل سات سات بار پڑھ کر پانی پر پھونک مار کر شوہر کو پلائیں اور کارخانہ میں بھی چھڑکوائیں تین ماہ تک۔

ش، ب...... حافظ آباد

جواب: اپنی نظر اُتروائیں، سب ٹھیک ہو جائے گا۔ درود شریف زیادہ سے زیادہ پڑھا کریں۔

یاسمین...... لاہور

جواب: بی بی آپ شوہر کی نہ ہوئیں تو بیٹا آپ کا نہ ہوا، یہ تو مکافات عمل ہے۔ بہرحال اللہ سے معافی مانگیں۔ سورۃ البقرۃ اور یٰسین شریف پڑھ کر سب کو پانی پلائیں اور پئیں 40 روز۔ رشتہ کے لیے بعد نمازِ فجر سورۃ الفرقان کی آیت نمبر 74، 70 بار روزانہ پڑھیں۔

مسرت یاسمین...... راولپنڈی

جواب: بی بی آپ سورۃ الفرقان کی آیت نمبر 74، 70 بار روزانہ پڑھیں (اوّل و آخر درود شریف) تین ماہ تک۔ بھائی آپ کا رشتہ کے لیے تیار نہیں تو اس کو سورۃ الفلق 70 بار پڑھ کر پانی پلائیں۔

محمد شہادت حسین...... راولپنڈی

جواب: ہر نماز کے بعد سورۃ الفاتحہ آیتہ الکرسی اور آخری تین قل شریف 3،3 بار پڑھ کر اپنے پر پھونکیں۔

رات سونے سے پہلے 25،25 بار درود ابراہیمی اول و آخر درمیان میں "سورۃ النصر" 125 بار پڑھ کر (نوکری) معاشی حالات اچھے ہونے کی دعا کریں۔

اور خود بھی بھاگ دوڑ کریں ناغہ نہ ہو۔

خالدہ نورین...... میاں چنوں

جواب: ایسا کوئی مسئلہ نہیں ذہنی۔ پریشانی کی وجہ سے پڑھائی پر توجہ نہیں قائم رہتی۔

والدہ اور تینوں بہنیں پڑھیں۔ "اللھم انا نجعلك فی نحورھم ونعوذبك من شرورھم"

نیت: اے اللہ نجات دے (چچا) اس کی نحوست اور شر سے جو ہمارے بارے میں سوچتا اور کرتا ہے۔

صبح و شام ایک ایک تسبیح۔ ہر نماز کے بعد 11 بار ذہن یکسو ہو۔

حمیرا...... وہاڑی

جواب: قوت برداشت اور خود اعتمادی نہیں ہے آپ میں۔ یرقان کا مکمل علاج کروائیں سورۃ طٰحہ کی پہلی پانچ آیات پڑھ کر پانی پلائیں۔ آپ روزانہ سورۃ القریش ہر نماز کے بعد 41 بار پڑھ کر معاشی حالات بہتر ہونے کی دعا مانگیں۔

بیوی کے لیے: ایک کلو کدو لے کر 8 پیس بنا کر 6 کلو پانی میں پکائیں۔ جب 4 کلو رہ جائے تو اس کو اتار کر ٹھنڈا کر کے چھان لیں۔ وہ پانی آپ کی بیوی پیے۔ اس کے علاوہ پانی استعمال نہ کریں روزانہ یہ عمل کرنا ہے۔

در نجف...... ٹانک سٹی

جواب: ہر نماز کے بعد 11 مرتبہ "سورۃ الاخلاص" پڑھیں۔ اپنے مسئلے کے لیے دعا کریں۔

شازیہ بی بی...... حویلیاں

جواب: رات کو سونے سے پہلے سورۃ الاخلاص 11 بار پڑھ کر پانی پر پھونک مار کر چہرے کو دھوئیں۔ پانی نالی میں نہ جائے باقی جسم کا کانپنا اور درد ہونا قریبی اچھے عامل سے رجوع کریں۔ علاج روحانی ضروری ہے۔

عبدالرحمان...... میانوالی

جواب: 40 روز تک روزانہ "سورۃ یٰسین" شریف مع اول و آخر 11،11 بار درود ابراہیمی کے پڑھ کر پانی پر پھونک مار کر پئیں اور گھر میں بھی چھڑکیں۔ مویشیوں پر بھی چھڑکیں۔ کوشش کریں کہ پلا بھی دیں۔ ان شاء اللہ افاقہ ہونا شروع ہوگا۔

ارم شہزادی...... ایبٹ آباد

جواب: بھائی کے لیے۔ اول و آخر 25،25 بار درود ابراہیمی درمیان میں "سورۃ النصر" 125 بار پڑھ کر روزگار کی دعا کریں ناغہ نہ ہو۔

ابو کے راضی ہونے کے لیے "سورۃ

الشمس" 40 بار پڑھ کر پانی پلائیں کہ ضد چھوڑ دیں اور رشتوں کے لیے راضی ہو جائیں۔

کشمالہ سمیر خان......حیات آباد

جواب:۔ جب گھر میں چینی آئے اس پر 3 مرتبہ سورۃ مزمل (اول و آخر 3'3 مرتبہ درود شریف) پڑھ کر دم کر دیں۔ وہ چینی گھر کے تمام افراد کے استعمال میں آئے گھر میں لڑائی نہیں ہوگی ان شاء اللہ۔

شوہر کے روزگار کے لیے عشاء کی نماز کے بعد 111 مرتبہ سورۃ قریش (اول و آخر 11'11 مرتبہ درود شریف) نیت یہ ہو کہ جو حق میں بہتر ہو (نوکری یا کاروبار) اس میں کامیابی ہو۔ دعا بھی کریں۔

ثمینہ ارشاد......لیاقت پور

جواب:۔ رات کو جب دونوں بچے سو جائیں 41 مرتبہ سورۃ العصر اول و آخر 11'11 مرتبہ درود شریف۔

پڑھتے وقت دونوں مسئلے ذہن میں رکھیں۔ پانی پر دم کر لیں صبح نہار منہ دونوں کو پلائیں۔

ہر نماز کے بعد 11 مرتبہ سورۃ القریش پڑھیں دعا بھی کریں۔ روزی میں برکت کے لیے۔

ع ر......مانسہرہ

جواب:۔ رشتوں کے لیے:۔ نوٹ (جن کے رشتوں کا مسئلہ ہے وہ خود پڑھیں) بعد نماز فجر سورۃ الفرقان کی آیت نمبر 74'70 مرتبہ اول و آخر 11'11 مرتبہ درود شریف۔ دعا بھی کریں۔

بعد نماز عشاء سورۃ الفلق اور سورۃ الناس 21'21 مرتبہ۔ نیت یہ ہو کہ رشتوں میں جو بندش، رکاوٹ ہے وہ ختم ہو۔

اولاد کے لیے:۔ سورۃ ال عمران آیت نمبر 38 ہر نماز کے بعد 11 مرتبہ۔

نوٹ

جن مسائل کے جوابات دیئے گئے ہیں وہ صرف انہی لوگوں کے لیے ہیں جنہوں نے سوالات کیے ہیں۔ عام انسان بغیر اجازت ان پر عمل نہ کریں۔ عمل کرنے کی صورت میں ادارہ کسی صورت ذمہ دار نہیں ہوگا۔

ای میل صرف بیرون ملک مقیم افراد کے لیے ہے۔

rohanimasail@gmail.com

روحانی مسائل کا حل کوپن برائے مارچ 2013ء

نام.................. والدہ کا نام.................. گھر کا مکمل پتا..................

....

....

گھر کے کون سے حصے میں رہائش پزیر ہیں..................

خوشبوئے سخن

عمر اسرار

نظم

اس نے پیار سے دیکھا
اور کہا
سمیٹ لو ان آنسوؤں کو
بھلا دو سارے غم
اور مسکرا دو
میرے لیے
لیکن میں جب مسکرائی
تو دل ڈوبنے لگا
یہ کس امتحان میں ڈال دیا تم نے
پھر یہ مجھ سے کہا
میرے لڑکھڑاتے آنسو نے
ڈوبتی دھڑکن نے
کسی کے لیے مسکرا دینا بھی عبادت ہے

شہنی ارشاد......کراچی

عورت کہانی

مردوں کے اس جنگل میں
عورتیں بے بس ہرنیاں
کمزور شکار
کہ لمحوں کے کھیل میں ختم ہو جائیں
یا پھر کھیل کا سامان
اور دل بھر جائے تو
ٹوٹے کھلونوں کی مانند چھوڑ دیں
بے خبر انجان ہیں
یہی عورت ذات
ان کی ذات کی تکمیل کرتی ہے
کہ وجود زن سے ہی ہے
کائنات میں تخلیق انسان
انہی کے بدن سے بنی ہوئی
یہ کمزور مخلوق
اپنی ذات کی پامالی پر جھکتی نہیں
بلکہ ٹوٹ جاتی ہے

ریحانہ سعیدہ......لاہور

غزل

دل چاہتا نہیں تھا مگر کاٹنا پڑا
قاتل کے ساتھ مجھ کو سفر کاٹنا پڑا
گھر کے کسی بزرگ کی صورت رہا تھا جو
ایندھن کے واسطے وہ شجر کاٹنا پڑا
اک روز ہو رہا تھا میں اپنے خلاف ہی
پھر یوں ہوا کہ اپنا ہی سر کاٹنا پڑا
اس پیار سے کہیں تری عزت عزیز ہے
ہم کاٹ لیں گے خود کو اگر کاٹنا پڑا
اس سے بچھڑ کر آنکھ سے آنسو نہیں تھمے
اک دکھ تھا جس کو زندگی بھر کاٹنا پڑا
کل رات کہہ گیا مجھے روتے ہوئے کوئی
اب کاٹ لینا وقت جدھر کاٹنا پڑا

میثم علی آغا

غزل

اک ذرا سی بات پہ اشکوں کا وہ چھاگل نکلا
کیا کہیں کسی کو یہ دل بھی کتنا پاگل نکلا
چار سو پھیل گئی تھی اک بات کہ جب
جھونکا ہوا کا خوشبو کے مقابل نکلا
بے اختیار کہی تھی وہ حسیں مسکراہٹ پہ لیکن
زباں سے کھلتا ہر پھول داد کے قابل نکلا

چاہا تھا حنائی رنگ سجالیں ہاتھوں پہ مگر
مری پوروں پہ مری آنکھوں کا کاجل نکلا
پیڑ جو میں نے چنا کڑی دھوپ میں سائے کے لیے
موسموں کے عذابوں کا وہ گھائل نکلا
تمنا تھی ترے ساتھ موج موج لہرانے کی
مرا وہ خواب تو بس ریت کا ساحل نکلا
سونپ دیے تھے سارے اختیار جسے میں نے
وہی ہاتھ مرے ارمانوں کا قاتل نکلا
وہ جسے ناز تھا اپنی خودداری پہ بہت
ہاتھ میں کاسہ لیے در در کا وہ سائل نکلا
عصمت اقبال عین...... منگلا ڈیم

غزل

یہ جو رونق مرے مکاں کی ہے
یہ عنایت فقط گماں کی ہے
زرد پتے ہیں مرے ہاتھوں میں
اک نشانی یہی خزاں کی ہے
تم ہی تنہا نہیں ہو دنیا میں
عمر ہم نے بھی رائیگاں کی ہے
نیند مجھ کو بھی آگئی ہے جمال
ختم اس نے بھی داستان کی ہے
سمیع جمال...... کراچی

گیت

آنکھوں کے دریچے تم دل کی زمین ہو
چاہت ہو، آرزو ہو تم میری تسکین ہو
کچھ پہلے چاند تاروں سے آنگن کو سجائیں
اور کلیوں پھولوں کی کوشش سے باغیچہ لگائیں
جذبہ ہو، جوانی ہو تم بڑی رنگین ہو
آنکھوں کے دریچے تم دل کی زمین ہو
چاہت ہو، آرزو ہو تم میری تسکین ہو
میرے تیور کی حدت جو تم کو بھگودے گی
اور کبھوں کی ٹھنڈک تمہیں تڑپا دے گی
شعلہ ہو، شبنم ہو تم میری جبین ہو
آنکھوں کے دریچے میرے تم دل کی زمین ہو
چاہت ہو، آرزو ہو تم میری تسکین ہو
سید عبداللہ شاہد...... حیدرآباد، سندھ

غزل

محبت کی ہر دم سزا دے رہے ہو
عجب دوستی کا صلہ دے رہے ہو
کیوں دل سے مجھے بددعا دے رہے ہو
وفا میں نے کی تم جفا دے رہے ہو
تمہیں میں بھلا دوں یہ ممکن نہیں ہے
تو کیوں جاتے جاتے سزا دے رہے ہو
اگر ساتھ چلتے تو اچھا یہ ہوتا
کیوں آنکھوں کو فاصلہ دے رہے ہو
چمن میرے دل کا نہ جل جائے دیکھو
کیوں شعلوں کو اتنی ہوا دے رہے ہو
گیا وقت رانا پلٹ کر نہ آیا
کیوں اب بیٹھ کر تم صدا دے رہے ہو
قدیر رانا...... راولپنڈی

غزل

اندھیری شب کے دامن میں روشنی کیسی
اداس دل ہو تو پھر زندگی میں ہنسی کیسی
دے گیا وہ خوب ہمیں ترک الفت پر سزا
ہمارے لیے اب زمانے میں پھر خوشی کیسی
تیری یادوں کے تصور میں کھلے ہیں پھول بھی
مہکتی ہوئی ہواؤں میں پھر یہ نغمگی کیسی
حسن بہاراں سے وہ کبھی ہمکنار نہ ہوا
بجھی بجھی سی نگاہوں میں بہاروں کی دل کشی کیسی

گلشن میں شاخ تمنا کی طرح ہیں جاوید
پھر میرے لیے یہ اداؤں کی تازگی کیسی
محمد اسلم جاوید...... فیصل آباد

غزل

اکثر بہت وہ یاد آئے
گھنیری زلفوں کے ترے سائے
تماشا یہاں دیکھنے والے
تماشا ہی تو دیکھنے آئے
جو نہیں جانتے کچھ
وہی رازداں کہلائے
شکاری بیٹھے ہیں بہت
ادھر شکار نہ آئے
وقت کم ہے کچھ کرلو
یہ وقت شاید پھر نہ آئے
میرے کسی سوال کا بھی
وہ جواب نہ دے پائے
گاؤں کا انجان لڑکا
شہر میں پھر گھومنے آئے
وسیم اختر...... راولپنڈی

غزل

فاصلے ایسے بھی ہوں گے یہ کبھی سوچا نہ تھا
سامنے بیٹھا تھا میرے اور وہ میرا نہ تھا
وہ کہ خوش بو کی طرح پھیلا تھا میرے چارسو
میں اسے محسوس کرسکتا تھا چھو سکتا نہ تھا
رات بھر پچھلی ہی آہٹ کان میں آتی رہی
جھانک کر دیکھا گلی میں کوئی بھی آیا نہ تھا
یہ سب ہی ویرانیاں اس کے جدا ہونے سے تھیں
آنکھ دھندلائی ہوئی تھی شہر دھندلایا نہ تھا
آج اس نے درد بھی اپنے علیحدہ کرلیے
آج میں رویا تھا تو میرے ساتھ وہ رویا نہ تھا
آج لگتا ہے تعلق مٹ گیا پوری طرح
آج اس نے دیکھ کر بھی مجھ کو پہچانا نہ تھا
میں تیری تصویر لیے سارے زمانے میں پھرا
ساری دنیا میں مگر کوئی تیرا جیسا نہ تھا
آج ملنے کی خوشی میں صرف میں جاگا نہیں
تیری آنکھوں سے لگتا ہے تو بھی سویا نہ تھا
مصلحت نے اجنبی ہم کو بنا دیا تھا اس طرح
ورنہ کب ایک دوسرے کو ہم نے پہچانا نہ تھا
یاد کرکے اور بھی تکلیف ہوتی تھی واجد
بھول جانے کے سوا اب کوئی چارا نہ تھا
پروفیسر واجد نگینوی...... ملیر، کراچی

غزل

صحرا میں کھڑا باد صبا مانگ رہا ہوں
ناداں ہوں محبت کا صلہ مانگ رہا ہوں
دل میں ہے گناہوں کی کسک آنکھ میں آنسو
سجدے میں پڑا فضل خدا مانگ رہا ہوں
دشمن کو میں اپنے نہیں بھولا ہوں پس مرگ
قاتل سے میں خود خون بہا مانگ رہا ہوں
صحرائے غم ہجر ہے فرقت کی کڑی دھوپ
محبوب کے دامن کی ہوا مانگ رہا ہوں
ممکن نہیں جو بات وہی بات ہے لب پر
جب آگ لگی ہے تو گھٹا مانگ رہا ہوں
جس دور میں عریانی کوئی عیب نہیں ہے
اس دور میں آنکھوں کی حیا مانگ رہا ہوں
جس شخص کے ہاتھوں سے قمر زخم ملے ہیں
کیوں اس سے میں زخموں کی دوا مانگ رہا ہوں
ریاض حسین قمر...... منگلا ڈیم

محبت

کبھی زندگی کا نام ہے محبت
کبھی موت کا پیغام ہے محبت
کبھی محبت سے ملتی ہے خوشی
کبھی غم کی شان ہے محبت
کبھی ہے محبت دل کی جلن
کبھی دل کا آرام ہے محبت
کبھی ہے محبت ملن کا روپ
کبھی تنہائی کی شام ہے محبت
کبھی ہے محبت شہنائی کی گھڑی
کبھی رسوائی کا انجام ہے محبت

مجاہد ناز عباسی......سنجر پور

غزل

ہم تو سمجھے تھے دل لگی ہوگی
اس کو الفت نہیں کبھی ہوگی
کیا سے کیا ہوگیا ہے پل بھر میں
اب تو ہر حال میں خوشی ہوگی
زندگی ختم ہوگی اس لمحے
جب میرے پیار میں کمی ہوگی
مسکرا کر وہ دیکھتا ہے مجھے
خوب صورت یہ زندگی ہوگی
یوں تو خوابوں میں روز آتے ہو
سچی تعبیر کس گھڑی ہوگی
جیسی بدلی ہے زندگی میری
اب کسی اور کی کبھی ہوگی؟
گزرے لمحوں کو بھول جاؤ سحاب
زندگی اب شروع نئی ہوگی

صلاح الدین سحاب......راولپنڈی

دعا

ہر اک دکھ سے تجھ کو بچائے خدا
لگے نہ کسی غم کی تجھ کو ہوا
ہمیشہ ترا حسن قائم رہے
گلوں کی طرح مسکرائے سدا
ہر اک موڑ پر کامیابی ملے
کبھی نہ ہو میلا ترا دل ذرا
تو جس راستے پر رہے گامزن
وہی تیری منزل کا ہو راستا
تجھے ساری دنیا کی خوشیاں ملیں
یہی صابر فقیر کرتا ہے ہر دم دعا

فقیر محمد بخش صابر لنگاہ......لاہور

غزل

بھولی ہوئی صدا ہوں مجھے یاد کیجیے
تم سے کہیں ملا ہوں مجھے یاد کیجیے
منزل نہیں ہوں، خضر نہیں، راہزن نہیں
منزل کا راستا ہوں مجھے یاد کیجیے
میری نگاہ شوق سے ہر گل ہے دیوتا
میں عشق کا خدا ہوں مجھے یاد کیجیے
نغموں کی ابتدا تھی کبھی میرے نام سے
اشکوں کی انتہا ہوں مجھے یاد کیجیے
گم صم کھڑی ہیں دونوں جہاں کی حقیقتیں
میں ان سے کہہ رہا ہوں مجھے یاد کیجیے
ساغر کسی کے حسن تغافل شعار کی
بہکی ہوئی ادا ہوں مجھے یاد کیجیے

انتخاب: محمد شفاعت حسین......پرانا خانیوال

وقت آگہی

عفان احمد

دائمی زندگی

ایک بادشاہ کو دنیا سے بڑی رغبت تھی۔ وہ طویل عمر کا خواہش مند تھا۔ محلات، لونڈیاں، غلام، عیش و عشرت کی زندگی، یہ سب اسے بھلا محسوس ہوتا تھا۔ اب وہ کسی ایسے نسخے کی تلاش میں تھا جو اسے تا قیامت حیات رکھتا۔ اسے اس کے دانش ور وزیر نے مشورہ دیا کہ اس کے لیے بادشاہ سلامت کسی درویش سے مشورہ کریں۔ اس کے پاس جوہر کیمیا آب حیات کی حیثیت رکھتے ہیں۔ قریب کے جنگل میں ایک درویش نے کٹیا بنا رکھی تھی اور شب و روز عبادت میں مصروف تھا۔ ایک روز بادشاہ سلامت اپنے غلاموں کے جھرمٹ میں درویش کے پاس پہنچ گئے۔ درویش نے کھجور کی چٹائی پر اپنے سامنے بٹھالیا اور روٹی کے خشک ٹکڑے بادشاہ سلامت کے سامنے ایک پیالے میں رکھ دیے۔ بادشاہ نے انکساری سے عرض کی۔ جناب یہ مجھ سے نہ کھائے جائیں گے۔ درویش نے درشت لہجہ اختیار کر کے کہا۔ ''بادشاہ عارضی! اگر تو یہ ٹکڑے نہیں کھا سکتا تو دوزخ میں زقوم کا درخت جو ہے بہت سخت ہے وہ کیسے چبائے گا۔ تو اپنا مدعا بیان کر اور راہ لے۔ میرے اور اللہ کی یاد میں دیوار نہ بن کہ وقت بہت کم ہے۔'' بادشاہ نے عرض کی۔ ''اس دنیا کی زندگی پر روشنی ڈالیے اور یہ بتایئے کہ یہ کتنی ہے؟''

درویش بولا۔ ''ایک چوکور کمرہ بنو اس پر کاغذ کی چھت ڈال اور اس میں کوئی شہتیر، بالا نہ ہو۔ پھر اس چھت پر بیٹھ جا۔'' بادشاہ بولا۔ ''میں جونہی اس چھت پر بیٹھوں گا کاغذ پھٹ جائے گا اور میں دھڑام سے کمرے میں گر جاؤں گا اس پر تو میں ایک ثانیے کے لیے بھی نہیں بیٹھ سکتا؟'' درویش بولا۔ ''عقلمند کو اشارہ کافی ہے۔ اس دنیا کی زندگی کاغذ کی چھت ہے۔ بندہ آیا اور گیا۔ عمر گزرتے دیر نہیں لگتی۔'' بادشاہ فوراً اپنے مطلب کی بات پر آ گیا اور بولا۔ ''مجھے طویل عمر کا کوئی پوشیدہ راز بتائیں۔'' درویش بولا۔ ''دن رات اللہ کی حمد و ثناء اور عبادت کر۔'' حدیث پاک ہے قبر جہنم کے گڑھوں میں سے ایک گڑھا ہے اور جنت کے باغوں میں سے ایک باغ، تو عبادت گزار بن اور قبر کا دائمی آرام و سکون اور وہاں کی قیامت تک کی زندگی حاصل کر لے۔ بادشاہ پر اس بات کا ایسا اثر ہوا کہ اس نے محلات کو خیر باد کہا اور جنگل میں گوشہ نشین ہوگیا۔

بشیر احمد بھٹی......بہاول پور

کل اور آج

- کل لوگ تھوڑا کھا کر بھی الحمدللہ کہتے تھے لیکن آج خاصا کھا کر بھی کہتے ہیں مزہ نہیں آیا۔
- کل بیوی شوہر کو سر تاج سمجھتی تھی آج محتاج سمجھتی ہے۔
- کل انسان شیطان کے کاموں سے توبہ کرتا تھا لیکن آج شیطان انسان کے کاموں سے توبہ کرتا ہے۔
- کل لوگ دیانت داری، سچائی اور شجاعت

کی وجہ سے مشہور ہوئے تھے آج لوگ چوری‘ دھوکہ دہی اور فراڈ کی وجہ سے مشہور ہوئے ہیں۔

✧ کل لوگ مکان کے باہر مہمان خانے بناتے تھے آج کل کرائے کی دکانیں بناتے ہیں۔

✧ کل لوگ سیرت اور سادگی پر مرتے تھے آج کل ظاہری حسن اور دولت پر مرتے ہیں۔

✧ کل لوگ قرآن وسنت کے مطابق زندگی گزارتے تھے آج کل سائنس کے مطابق زندگی گزارنا پسند کرتے ہیں۔

انتخاب: ریاض بٹ...... حسن ابدال

معلومات

☆ انگریزی زبان کے مشہور ڈراما نویس جارج برنارڈ شا کا مشہور ڈراما Arms And The Man ہے۔

☆ قدیم شاعر نظیر اکبر آبادی پہلے عوامی شاعر تھے وہ دہلی میں پیدا ہوئے تھے۔

☆ مشہور نثر نگار منشی سجاد حسین کا مشہور کردار ”حاجی بغلول“ ہے۔

☆ مشہور ناول ”خدا کی بستی“ کے مصنف ”شوکت صدیقی“ ہیں۔

☆ امریکی صدر جان ایف کینڈی John F. Canady کی پہلی تصنیف ”وہائی انگلینڈ سلیپٹ“ انگلستان کیوں سویا“ ہے۔

☆ روس کا مشہور اخبار ”پراودا“ ہے۔

پروفیسر واجد نگینوی...... ملیر، کراچی

کچھ دشمن کے بارے میں ارشادات

❁ بداخلاق انسان ایسے دشمن کے قبضے میں ہے جس کے شر سے کہیں بھی محفوظ نہیں رہ سکتا۔

❁ دشمن کی نصیحت قبول کرنا سخت غلطی ہے ہاں اس کو سن لینا درست ہے تاکہ حفاظت کی صورت نکالی جا سکے۔

❁ دشمن جب نقصان پہنچانے کے تمام حیلوں سے عاجز ہو جاتا ہے تو پھر دوستی کی کوشش کر کے دل کی مراد حاصل کر لیتا ہے اس کی چالاکی سے بے خوف نہیں رہنا چاہیے۔

❁ کمزور دشمن سے بھی غافل نہیں رہنا چاہیے۔ اس لیے کہ زندگی سے مایوس آدمی بھیڑیے کا بھی بھیجہ نکال لیتا ہے۔

❁ دشمن ہمیشہ نرمی سے قابو میں نہیں آتا بعض مرتبہ اس کی دشمنی میں اور اضافہ ہو جاتا ہے ایسے بددماغ کا علاج سختی کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔

❁ اے عقل مند! ایسے دوست کی دوستی چھوڑ دے جو تیرے دشمن کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے والا ہو۔

❁ دشمن سے اپنی تکلیف کا ذکر ہرگز نہ کر، سامنے لاحول پڑھ کر دل میں خوش ہوگا۔ اگر تجھے کسی سے اذیت کا اندیشہ ہو تو احسان کے تعویذ سے (یعنی اس پر احسان کر کے) اس کی زبان بند کر دے۔

❁ دشمن کو جتنا نقصان پہنچانے کی مرسلہ قدرت ہو اتنا نقصان مت پہنچا، ممکن ہے یہی دشمن کبھی مخلص فداکار دوست بن جائے اور پھر تجھے شرمندگی اٹھانی پڑے۔

انتخاب: ماجد علی...... ساہیوال

شیخ بایزید بسطامیؒ کی حکایت

میں نے سنا ایک مرتبہ عید کی صبح کو حضرت بایزیدؒ غسل کر کے نئے کپڑے پہن کر باہر نکلے۔ بےخبری میں ایک گھر سے لوگوں نے ان کے سر پر کوڑا کرکٹ ڈال دیا۔ اس حال میں کہ ان کی دستار اور داڑھی الجھی ہوئی تھی وہ شکرانہ کا ہاتھ منہ پر ملتے ہوئے کہہ رہے تھے کہ اے نفس! میں تو آگ کے قابل ہوں ذرا سی مٹی سے منہ کیوں برا بناؤں۔

حضرت سعدیؒ فرماتے ہیں بزرگوں نے کبھی اپنی ذات کی طرف نہیں دیکھا جو اپنے کو اچھی نظر سے دیکھنے والا ہے اس سے معرفت خداوندی کی کوئی امید نہیں۔ بزرگی دعوے اور غرور سے نہیں ہے۔ قیامت کے دن تم اس شخص کو بہشت میں دیکھو گے جس نے حقیقت اختیار کی اور دعویٰ چھوڑ دیا۔ تواضع تمہیں بلندی عطا کرے گی اور تکبر تمہیں خاک میں ملا دے گا۔

انتخاب: نجیب احمد...... میرپورخاص

اچھی اور بُری بیوی کے بارے میں

اچھی فرماں بردار نیک بیوی اپنے غریب شوہر کو مال دار بنا دیتی ہے‘ خدمت گزار طبیعت کے موافق بیوی اللہ کی رحمت ہے‘ اس کے دیدار کی وجہ سے شوہر اپنے کو جنت میں سمجھتا ہے‘ خوش طبع خوش اخلاق اور شکر گزار بیوی پری جیسی بداخلاق‘ بدزبان اور ناشکری سے اچھی ہے۔ خیر خواہ بیوی دل کا سکون ہوتی ہے اس بندہ کی خدا نے بھلائی چاہی ہے جس کے لیے بیوی کا ہاتھ پاک اور دل نیک ہو۔

نیک آدمی کے گھر میں بُری عورت کا ہونا دنیا ہی میں اس کے لیے دوزخ ہے‘ بُری عورت سے اللہ کی پناہ جب توتے کا ہمدم کالا کوا ہو وہ پنجرے سے چھٹکارے کو غنیمت سمجھے گا‘ اس مکان پر خوشی کا دروازہ بند سمجھ جہاں سے بیوی کی چیخیں بلند ہوں‘ اجنبی لوگوں سے بیوی کی آنکھ اندھی ہونی چاہیے‘ چٹوری بیوی شوہر کو ذلیل کر دیتی ہے‘ بدچلن آزاد عورت مصیبت ہے۔

دو آدمیوں نے جو بیوی کے ہاتھوں پریشان تھے‘ کیا بھلی بات کہی ہے: ایک نے کہا: خدا کرے کسی کی بیوی خراب نہ ہو۔ دوسرے نے کہا: خدا کرے دنیا میں عورت ہی نہ ہو‘ ایک نوجوان بیوی کی مخالفت سے ایک بوڑھے آدمی کے سامنے فریاد کرنے لگا کہ میں اس غالب دشمن کے ہاتھوں عاجز آ گیا ہوں‘ بوڑھے نے اس سے کہا: اے صاحب! سختی پر صبر کر لے اس لیے کہ صبر کرنے سے کوئی شرمندہ نہیں ہوا ہے جس درخت کے پھلوں سے خوشی دیکھی ہو جس کا ہمیشہ پھل کھایا ہو اس کے کانٹے کی تکلیف برداشت کر لینی چاہیے۔

انتخاب: پرویز احمد...... پشاور

❁

نوشاد عادل

دولت جائیداد اور عورت کی تکون اس دنیا میں جنگ فساد اور تمام برائیوں کی بنیاد پر ہوا۔ تاریخ کے پہلے قتل کا باعث عورت تھی۔ پہلی جنگ زمین پر قبضہ کے لالچ میں ہوئی۔ غرض ہم تاریخ کے جتنے بھی صفحات کیوں نہ الٹتے جائیں ہمیں تمام تر فساد اسی تکون کا تحفہ نظر آئے گا۔ یہ تکون جب کسی کو اپنا اسیر بنا لیتی ہے تو وہ خون کو سفید بنا دیتی ہے۔ اس کا مقروپ ہر رشتے کو نفع نقصان میں تولنے لگتا ہے۔ اس کی آنکھ تمام مقدس رشتوں کو غرض کی عینک سے ہی دیکھتی ہے۔

زیر نظر ناول آپ کو ایسی بساط محسوس ہوگا جس کا ہر مہرہ دوسرے کو شہ مات دیتا نظر آئے گا۔

نئے افق کی روایتوں کا امین ایسا ناول جو آپ کو مدتوں یاد رہے گا

"میں آپ سے کوئی بھیک نہیں مانگ رہا۔ جو بھی مانگ رہا ہوں۔ اپنا حق مانگ رہا ہوں۔" وہ ہمیشہ کی طرح ان کے آفس میں ان سے اُلجھ رہا تھا۔

"اور میں تمہیں کتنی بار کہہ چکا ہوں کہ اب حالات ویسے نہیں رہے۔ میں تمہاری یہ عیاشیاں برداشت نہیں کر سکتا۔" انہوں نے بھی ہمیشہ کی طرح اسے وہی جواب دیا جو پچھلے چھ مہینے سے دیتے آ رہے تھے۔

"اوہ کم آن...... میں کوئی جاہل نہیں ہوں، جسے آپ بزنس میں نقصان کی کہانی سنا کر بے وقوف بنا سکتے ہیں۔ سب جانتا ہوں میں۔ اگر اتنا ہی نقصان ہو رہا ہے تو یہ عالی شان آفس، یہ عیش و آرام سے بھری زندگی، ان سب کا خرچہ کہاں سے پورا ہو رہا ہے۔" اس نے ان کی بات چٹکیوں میں اڑا دی۔

"دیکھو عاطف! میں تمہیں کئی بار یہ بات سمجھا چکا ہوں کہ اب واقعی بزنس ویسا نہیں رہا جیسا کبھی تھا۔ بلکہ صرف میرا ہی کیا پورے بزنس کا یہی حال ہے۔ آدھی سے زیادہ پراپرٹی بینک کے پاس گروی پڑی ہے۔ شاہ گروپ آف انڈسٹریز اب وہ نہیں رہی جو تمہارے پاپا کی موت سے پہلے تھی۔ اور تم اچھی طرح جانتے ہو کہ بزنس میں ہمیں جو اتنا بڑا نقصان ہوا تھا، اسی کے غم میں تمہارے پاپا کو ہارٹ اٹیک ہوا جس سے ان کی جان چلی گئی۔" اکرم شاہ نے اپنے بھتیجے عاطف شاہ کو کئی دفعہ کی سنائی ہوئی کہانی ایک بار پھر سے سنا دی۔

"تو کیا اب اتنا برا حال ہو گیا ہے کہ مجھے ایک ایک روپے کے لیے آپ سے بحث کرنی پڑے گی۔" عاطف نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"ایک ایک روپے؟ تمہیں کیا لگتا ہے کہ پیسے پیڑ پر اُگتے ہیں؟ تمہیں ہر مہینے لاکھوں کا چیک ملتا ہے وہ بھی کم ہے تمہارے لیے؟ میں اگر تمہیں ہر مہینے ایک کروڑ روپے دوں تب بھی تم دوبارہ مجھ سے پیسے مانگنے کے لیے کھڑے ہو گے۔" اس بار اکرم شاہ کی آواز میں غصہ تھا۔

"میں کوئی بچہ نہیں ہوں جسے آپ ہر مہینے محدود سا جیب خرچ دے کر ٹہلا دیتے ہیں۔" عاطف پر ان کے غصے کا ذرا بھی اثر نہیں ہوا تھا۔

"تو تم بھی یہ بات جان لو کہ تمہارے پاپا کا جتنا شیئر اس پراپرٹی میں تھا اس حساب سے تمہیں زیادہ ہی ملتا ہے، کم نہیں۔" اکرم شاہ کا لہجہ اب بھی غصے سے بھرا تھا۔

"انکل، ٹرائی ٹو انڈر اسٹینڈ، مجھے اس وقت پیسوں کی سخت ضرورت ہے۔ اس لیے تو مانگ رہا ہوں۔" اب کی بار عاطف کی آواز میں طنز سے زیادہ خوش آمد تھی۔

"دیکھو۔ میں تمہیں پانچ لاکھ سے زیادہ نہیں دے سکتا۔ میں پہلے ہی اتنے معاملوں میں الجھا ہوا ہوں اور تم بجائے آفس آ کر میری پریشانیاں بانٹنے کے بجائے مزید بڑھانے آ جاتے ہو۔" اکرم شاہ کا لہجہ اس بار تھکا تھکا سا تھا۔

"ٹھیک ہے، پانچ لاکھ دے دیجئے۔ باقی کا انتظام میں کہیں اور سے کر لوں گا اور آپ کو پتا ہے کہ یہ بزنس وغیرہ میرے بس کا روگ نہیں ہے۔ آپ اسلم بھیا کو دوبارہ بلا لیجئے نا۔" عاطف نے جان چھڑاتے ہوئے کہا۔

"وہ بھی تو تمہارا ہی بھائی ہے۔ بس فرق یہ ہے کہ وہ میرا بیٹا ہے۔ اور تم میرے بھتیجے ہو۔ اسے لندن پڑھنے کے لیے بھیجا تھا لیکن ایسا گیا کہ پھر واپس آنے کا نام ہی نہیں لے رہا۔ اس کا ایم بی اے تو کب کا پورا ہو چکا ہے مگر جب بھی واپسی کی بات کرتا ہوں تو ٹال جاتا ہے۔" اکرم شاہ کی آواز میں دکھ واضح طور پر جھلک رہا تھا۔

"اچھا آپ اداس مت ہوں۔ میں جلد ہی گھر کا چکر لگاؤں گا۔" عاطف نے جیسے انکل کو خوش کرنے کی کوشش کی۔

"ایک تو مجھے تمہارے اکیلے رہنے کی سمجھ نہیں آتی۔ اتنے بڑا گھر ہے۔ میں اور تمہاری آنٹی اکیلے ہوتے ہیں اور تم ہو کہ اکیلے اپنے بنگلے پر پڑے رہتے ہو۔" انکل کو ایک اور شکایت یاد آئی۔

انکل، آپ تو جانتے ہی ہیں کہ میرا گھر آنے جانے کا کوئی ٹائم ٹیبل نہیں ہے۔ میں آپ لوگوں کو ڈسٹرب نہیں کرنا چاہتا۔ اچھا۔ وہ منیجر سے پیسوں کا کہہ دیجئے۔ مجھے دیر ہو رہی ہے۔" اس نے آخر میں اپنے مطلب کی بات کرتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے، جا کے لے لو میں اسے کہہ دیتا ہوں۔"

عاطف نے اٹھ کر ان سے ہاتھ ملایا اور ان کے آفس سے باہر نکل گیا۔

اکرم شاہ نے فون پر منیجر کو ہدایت دی کہ وہ عاطف کو پانچ لاکھ روپے دیدے اور پھر اپنی نشست کی پشت گاہ سے سر ٹکا لیا۔ ان کے چہرے پر سوچ کے گہرے تاثرات صاف دکھائی دے رہے تھے۔

☆☆☆☆☆☆☆

"دیکھو، میں صرف ڈاکٹر ہی نہیں۔ تمہارا دوست بھی ہوں۔ تمہیں اپنی شراب کم کرنی ہوگی۔ تمہارا لیور دن بہ دن کمزور ہو رہا ہے اور مجھے ڈر ہے کہ عنقریب تمہارے لیے یہ شراب موت کا پروانہ نہ بن جائے۔" ڈاکٹر علوی نے اپنے سامنے بیٹھے ہوئے اپنے بچپن کے دوست اسلم شاہ کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

"کیا کروں یار...... کوشش تو کرتا ہوں۔ لیکن بس یہ سالی مجھے چھوڑنے کو تیار نہیں ہوتی۔" اسلم نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"اسلم! میں مذاق نہیں کر رہا۔ تمہارا لیور واقعی میں بہت کمزور ہو چکا ہے۔ اور جتنی شراب تم پی رہے ہو۔ اگر اسی حساب سے پیتے رہے تو تمہارے لیے بہت خطرناک ثابت ہو سکتی ہے۔"

"اوکے بابا ٹھیک ہے۔میں اب کم پیوں گا اب خوش۔" اسلم نے ہاتھ اٹھا کے کہا۔جیسے وہ قسم کھا رہا ہو۔

"میں تمہیں کچھ دوائیں لکھ کے دے رہا ہوں۔ یہ بھی شروع کر دو ساتھ میں۔اگر تم احتیاط کر لو تو ابھی بھی کچھ نہیں بگڑا۔"

"اوکے مائی لارڈ جیسا آپ کا حکم' اچھا سنو سنڈے کو بھابھی سے کہنا کوئی اچھی سی ڈش پکا لے۔ بہت دن ہو گئے ہیں دیسی کھانا کھائے ہوئے۔" اسلم نے اس کے ہاتھ سے دوا کا نسخہ لیتے ہوئے کہا۔

"تو تم پاکستان واپس کیوں نہیں چلے جاتے؟ انکل کب سے تمہیں بلا رہے ہیں۔" ڈاکٹر علوی نے الٹا سوال کر دیا۔

"یار وہاں پر پاپا مجھے بزنس میں لگا دیں گے' اور تم جانتے ہو کہ میں بزنس کے چکر میں نہیں پھنسنا چاہتا۔ اسلم اکتائے ہوئے لہجے میں بولا۔ "اچھا میں چلتا ہوں اب سنڈے کو آؤں گا گھر پر۔" اسلم نے اس سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔

جیسے ہی اسلم کلینک سے باہر نکلا' لندن کی سرد ہواؤں نے اس کا استقبال کیا۔ اس نے اپنے ہاتھ کوٹ کے اندر گھسا دیئے۔

"لگتا ہے آج خود کو گرم کرنے کے لیے کسی گوری چڑی کا بندوبست کرنا ہی پڑے گا۔" اس نے اپنے آپ سے کہا اور خود ہی مسکرا دیا۔

اب اس کے پاؤں تیز تیز اپنے پسندیدہ نائٹ کلب کی طرف بڑھ رہے تھے۔ جہاں اسے کسی گوری چڑی کے ملنے کا پورا یقین تھا۔

☆☆☆☆☆☆☆

موبائل مسلسل بج رہا تھا۔ اس نے مزید نہانے کا پروگرام ملتوی کرتے ہوئے شاور بند کیا اور اپنے جسم پر تولیہ لپیٹ کے باتھ روم سے باہر آ گیا۔ اپنے موبائل کی اسکرین پر کال کرنے والے کا نام دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔

"ہیلو......سوری میں ذرا نہا رہا تھا۔" اس نے کال ریسیو کر کے' کسی سوال سے پہلے ہی فون دیر سے اٹھانے کی وجہ بتا دی۔

"ہاں آج کچھ تھکاوٹ سی ہو گئی ہے۔تم تو جانتے ہی ہو کہ میری جاب کیسی ہے' بس اس پاپی پیٹ کے لیے سب کرنا پڑتا ہے۔" اور پھر ایک زوردار قہقہہ لگایا۔ شاید دوسری جانب سے اپنی کہی بات کا جواب اسے پسند آیا تھا۔

"میں تمہارا کام کر رہا ہوں۔ تم فکر نہ کرو۔ ایک دو دن میں تمہیں گرین سگنل مل جائے گا میری طرف سے۔" اب کی بار اس کا لہجہ سنجیدہ تھا۔

"میرے علاوہ اور کوئی نہیں آ سکتا وہاں پر۔ اس بات کا پورا بندوبست کر لیا ہے میں نے' بس تم اپنے کام پہ دھیان دو۔" اس نے فون کرنے والے کو تسلی دی۔

"ٹھیک ہے۔ جیسے ہی یہاں پر کام پورا ہوتا ہے' میں تمہیں فون کر کے بتا دوں گا۔" اس نے یہ کہہ کر فون کاٹ دیا۔

اس نے گھڑی میں ٹائم دیکھا تو نو بج رہے تھے۔

"میرا خیال ہے ڈنر کر لینا چاہئے۔" اس نے دل میں سوچا اور پھر کپڑے پہن کر اپنی گاڑی کی چابی اٹھا کر وہ اپنے فلیٹ سے باہر آ گیا۔

فلیٹ کے دروازے پر لگی خوبصورت نیم پلیٹ اس میں رہنے والے کا پتا دے رہی تھی۔ "انسپکٹر دانش سومرو۔"

☆☆☆☆☆☆☆

"یار تم کبھی کبھار ہی آتے ہو۔ دیکھو نا تمہاری آنٹی بھی بور ہوتی رہتی ہیں اور تمہارے آنے سے مجھے بھی اسلم کی کمی اتنی محسوس نہیں ہوتی۔" عاطف آج اکرم شاہ کے گھر آیا ہوا تھا اور وہاں لان میں بیٹھے وہ لوگ چائے پی رہے تھے۔

آپ تو جانتے ہیں انکل کہ میرا کچھ پتا نہیں ہوتا کبھی یہاں تو کبھی وہاں۔" اس نے آنٹی والی بات جان بوجھ کر ان سنی کرتے ہوئے باقی بات کا جواب دیا۔

اب ایسی خوب صورت اور جوان لڑکی جو عمر میں عاطف سے بھی دو سال چھوٹی تھی' اس کو آنٹی کہنے کو کس کا دل چاہے گا۔ رینا شاہ' اکرم شاہ کی دوسری بیوی تھی۔ اس کی پہلی بیوی کی کینسر کی وجہ سے موت ہو چکی تھی جس کے بعد اس نے رینا سے شادی کر لی۔ رینا اور عاطف کے آپس میں کبھی اچھے تعلقات نہیں رہے تھے جس کی وجہ یہ بھی کہ رینا کا خیال تھا کہ عاطف کو مفت کی روٹیاں توڑنے کی بجائے بزنس میں اس کے شوہر کا ہاتھ بٹانا چاہئے۔

"اسلم بھی ہمیشہ یہی بہانہ بناتا کہ مصروف ہوں آ جاؤں گا...... پتا نہیں کون سی مصروفیت ہے تم لوگوں کی جو ختم ہی نہیں ہو رہی ہے۔" اکرم شاہ نے جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکالتے ہوئے کہا۔

"ڈاکٹر نے منع کیا ہے نا۔" رینا انہیں سگریٹ نکالتے دیکھ کر ٹوکے بنا نہیں رہ سکی۔

"ارے کچھ نہیں ہوتا۔ ڈاکٹر تو ایسے ہی اپنی دوکان چمکانے کو کچھ بھی بول دیتے ہیں' ان کا بس چلے تو ہمارے سانس لینے پر بھی پابندی لگا دیں۔" اکرم شاہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"عاطف وہ تم مجھے اپنی گرل فرینڈ سے ملانے والے تھے شاید۔" اکرم کو جیسے کچھ یاد آ گیا۔

"انکل' اتنی جلدی بھی کیا ہے۔ ابھی ہمیں ملے تین چار مہینے ہی تو ہوئے ہیں' کچھ وقت لگے گا اور اگر ہم نے شادی کا فیصلہ کر لیا تو سب سے پہلے آپ سے ہی ملانے لے کے آؤں گا۔" عاطف نے تفصیل سے بتایا۔

"اچھا ہے' جتنی جلدی ہو سکے شادی کر لو۔ ویسے بھی وہ لڑکی مجھے پسند آئی ہے۔ تمہارے لیے ٹھیک رہے گی۔" اکرم نے کہا۔

"ہاں' شاید اس طرح تمہیں بھی بزنس میں کوئی دلچسپی پیدا ہو جائے۔" رینا نے طنز کرتے ہوئے کہا۔

"اس سے تو مجھے دلچسپی ہے ہی۔ کیونکہ کہ وہ میرے باپ اور چاچا کا بزنس ہے۔" عاطف نے رینا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے جواب دیا۔ اس کی آنکھوں میں برف کی سی ٹھنڈک تھی۔

"اچھا انکل اب میں چلتا ہوں ایک دوست کے پاس جانا تھا مجھے۔" عاطف نے اکرم سے اجازت لیتے ہوئے کہا۔

"اوکے' مگر چکر لگاتے رہا کرو۔ اس طرح کچھ ہمارا بھی اچھا وقت گزر جاتا ہے۔" اکرم نے پیار سے عاطف کے گال پر ہلکی سی تھپکی دی۔

"آپ کے لاڈ پیار نے ہی اسے بگاڑ دیا ہے۔" عاطف کے جاتے ہی رینا نے شکایت شروع کر دی۔

"ڈارلنگ' ابھی جوانی کا نیا نیا جوش ہے۔ کرنے دو جو کرتا ہے۔ آہستہ آہستہ ٹھیک ہو جائے گا۔" اکرم نے خوبصورت بیوی کو اپنی طرف کھینچتے ہوئے کہا اور ان کی اس ادا پر رینا مسکرا کر رہ گئی۔ لیکن اس کی آنکھوں میں عاطف کے لیے تلخی ابھی بھی نظر آ رہی تھی۔

☆☆☆☆☆☆☆

اس کی آنکھ کھلی تو بارہ بجنے والے تھے۔ وہ جلدی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ آج اتوار تھا اور اسے اپنے دوست ڈاکٹر علوی کے گھر لنچ پر جانا تھا۔ اس نے اپنے بستر پر سوئی ہوئی انگریز لڑکی کو اٹھایا۔

"ہے بے بی' گیٹ اپ' مجھے جانا ہے۔ میرا

دوست انتظار کر رہا ہوگا۔" اس نے لڑکی کے چہرے پر ہلکا سا طمانچہ مارتے ہوئے اسے اٹھایا۔

لڑکی کے جاگنے کے بعد اس نے اسے پیسے دے کر چلتا کیا اور جلدی سے نہا دھو کر تیار ہو کے ڈاکٹر علوی کے گھر کی طرف چل دیا۔ ڈاکٹر علوی اور وہ کالج کے زمانے سے دوست تھے اور وہ دونوں ایک ساتھ ہی لندن آئے تھے۔ بلکہ یوں کہنا مناسب ہوگا کہ ڈاکٹر علوی کو لندن لانے میں اسلم کا بڑا ہاتھ تھا۔ کیونکہ اسی نے ڈاکٹر علوی کی مالی مدد کی تھی۔ ڈاکٹر علوی کو لندن سے اتنی محبت ہوگئی کہ ایم بی بی ایس کرنے کے بعد اس نے اپنی بیوی کو بھی یہیں بلا لیا اور اب اسلم اکثر اتوار کو ان کے گھر جاتا رہتا تھا' دیسی کھانوں کا مزا لینے کے لئے۔

☆☆☆☆☆☆☆

"بھابھی' سچ میں آپ کے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا کھا کر مزا آجاتا ہے' ورنہ سارا ہفتہ فاسٹ فوڈ کھا کھا کر میں تو تنگ آجاتا ہوں۔" اسلم نے کھانا کھا کر تعریف کرتے ہوئے کہا۔

"تو کس نے کہا ہے فاسٹ فوڈ کھانے کو۔ یا تو شادی کرلو یا پھر پاکستان واپس چلے جاؤ۔" ڈاکٹر علوی نے ہمیشہ کی طرح اسے سمجھایا۔

"ارے یار۔ اتنے اچھے کھانے کے بعد اب تم بور مت کرو۔" اسلم نے اسے چپ کراتے ہوئے کہا۔

"میں آپ لوگوں کے لیے کافی بنا کر لاتی ہوں۔" ڈاکٹر علوی کی بیوی یہ کہہ کر کچن کی طرف چلی گئی۔

کافی پینے کے بعد اسلم نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"اوکے یار اب میں چلتا ہوں۔ شکریہ بھابھی اتنے اچھے لنچ کے لیے۔"

"اسلم' تمہاری ساری رپورٹس میں نے بھجوا دی ہیں۔" جیسے ہی وہ جانے لگا۔ ڈاکٹر علوی نے اسے بتایا۔

"کوئی گڑبڑ تو نہیں ہے نا۔" اسلم نے عجیب سے لہجے میں سوال کیا۔

"نہیں' میں نے خود چیک کی تھیں۔ ریکارڈ میں سب کچھ آچکا ہے۔" ڈاکٹر علوی نے اسے یقین دلایا۔

"آؤٹ اسٹینڈنگ' اوکے اب میں چلتا ہوں۔" اسلم نے مسکراتے ہوئے دونوں کو بائے کہا اور گھر سے تھوڑا دور جانے کے بعد اپنا موبائل نکال کر ایک نمبر ملانے لگا۔

☆☆☆☆☆☆☆

فون کی مسلسل بجتی ہوئی گھنٹی نے اسے نیند سے اٹھنے پر مجبور کر دیا۔ اس نے سائیڈ لیمپ جلا کر گھڑی میں ٹائم دیکھا تو رات کے چار بج رہے تھے۔ پھر اس نے فون اٹھایا۔

"ہیلو۔" اس نے نیند میں ڈوبی ہوئی آواز میں کہا۔

"انسپکٹر دانش؟" دوسری طرف سے نام کی تصدیق چاہی گئی۔

"بول رہا ہوں۔" اس نے ایک جماہی لیتے ہوئے جواب دیا۔

"سر میں پرویز علی بول رہا ہوں۔۔ آپ فوراً اکرم شاہ کے گھر آجائیں۔" دوسری طرف سے کہا گیا۔

"کیوں بھائی؟ اتنی رات کو اس کے گھر کوئی پارٹی ہے کیا جو میں پہنچ جاؤں۔" وہ ابھی تک نیند میں ہی تھا۔

"نہیں سر...... اکرم شاہ کی موت واقع ہوچکی ہے۔"

انسپکٹر دانش کو لگا جیسے کسی نے اس کو بجلی کا جھٹکا دے دیا ہو۔

"کب...... کیسے؟" اب اس کی نیند یکسر اڑ چکی تھی۔

"سر یہ تو ابھی مجھے بھی نہیں پتا میں یہاں ابھی پہنچا ہوں۔"

"اوکے' ٹھیک ہے' میں پہنچ رہا ہوں ابھی۔"

اس نے فون بند کر کے جلدی سے کپڑے تبدیل کیے۔ حالانکہ ابھی تو اسے صرف یہی پتا چلا تھا کہ اکرم شاہ کی موت واقع ہوچکی ہے لیکن اس کی چھٹی حس پتا نہیں کیوں اسے بار بار اشارہ کر رہی تھی کہ کچھ گڑبڑ ہے۔

اس نے فلیٹ سے باہر آکر اپنا فلیٹ لاک کیا اور پھر اس کی گاڑی اکرم شاہ کے گھر کی طرف دوڑنے لگی۔

☆☆☆☆☆☆☆

انسپکٹر دانش جیسے ہی اکرم شاہ کے بنگلے پر پہنچ کر گاڑی سے اترا۔ حوالدار پرویز علی بھاگا ہوا اس کے پاس آگیا۔ گاڑی سے اترتے ہی اس نے پرویز علی سے پوچھا۔ "پرویز علی تم یہاں کس وقت پہنچے تھے۔"

"سر لگ بھگ چار بجے کے قریب۔" اس نے جواب دیا۔

"پولیس اسٹیشن کس نے فون کیا تھا؟"

"سر یہیں سے کسی شہباز نام کے شخص نے فون کیا تھا۔" پرویز علی نے جواب دیا۔ "کمشنر صاحب نے ہدایت دی تھی کہ یہ کیس بہت سنگین ہوسکتا ہے۔ میڈیا پر ابھی سے خبر چلنا شروع ہوگئی ہے اس لیے انہوں نے کہا ہے کہ کرائم برانچ سے آپ اس کیس کو ہینڈل کریں گے۔" پرویز علی نے اس کے بولنے سے پہلے سے سب کچھ بتا دیا۔ شاید وہ اس کا اگلا سوال پہلے ہی سمجھ چکا تھا۔

"ٹھیک ہے آؤ اندر چلتے ہیں' اب لاش خود چل کر تو ہمیں کچھ بتانے کے لیے باہر آئے گی نہیں۔" انسپکٹر دانش نے جیب سے سگریٹ نکالتے ہوئے اسے اندر آنے کا اشارہ کیا۔

جیسے ہی وہ ڈرائنگ روم میں داخل ہوا تو اس کی شان و شوکت کی داد دیئے بغیر نہیں رہ سکا۔ ڈرائنگ روم کے ایک طرف صوفہ پڑا تھا جس کے سامنے دیوار پر ایک بڑا پردہ لگا ہوا تھا اور دوسری طرف ڈائننگ ٹیبل تھی اور بیچ میں سے سیڑھیاں اوپر کی طرف جا رہی تھیں۔ وہاں پر رکھی چیزیں نادر و نایاب ہونے کی گواہی دے رہی تھیں۔ جیسے ہی وہ تھوڑا سا آگے بڑھا تو اسے ڈائننگ ٹیبل کے ساتھ ایک بڑا سا کپڑا دکھائی دیا۔ جیسے اسے کسی چیز کو چھپانے کے لیے اوپر ڈالا گیا ہو۔ وہ پہلے تو کچھ سمجھ نہیں پایا۔ مگر جیسے ہی وہ اس کے قریب پہنچا تو اسے پتا لگا کہ وہ کپڑا اکرم شاہ کی لاش پر ڈالا گیا تھا اور حیران کن بات یہ تھی کہ وہ لاش اوندھے منہ شیشے کی میز پر گری ہوئی تھی اور نیچے ہر طرف خون ہی خون پھیلا ہوا تھا۔ اس نے مڑ کر پرویز علی کو حیرانگی سے دیکھا۔

"یہ لاش یہاں کیسے پہنچی؟ اور یہ اس کے نیچے شیشے کی میز؟ یہ سب کیا ہے؟" انسپکٹر دانش کی آواز میں حیرانی صاف محسوس کی جاسکتی تھی۔

"سر جب میں آیا تھا تو تب بھی یہ لاش ایسے ہی پڑی تھی' میں بس آپ کے آنے کا انتظار کر رہا تھا۔ اس لیے میں نے بھی ابھی تک کسی سے کچھ نہیں پوچھا۔"

"تو بلاؤ نا پھر...... کوئی اور بھی ہے اس اتنے بڑے بنگلے میں یا صرف میں اور تم ہی ہیں۔" انسپکٹر دانش نے کہا۔

"میں یہیں ہوں۔ بس آپ کے آنے کا انتظار کر رہا تھا۔" اس سے پہلے کہ پرویز علی کچھ بولتا' انہیں اوپر سے آواز آئی۔

دونوں نے گردن اٹھا کر دیکھا تو اوپر ایک کمرے کے دروازے پر تیس بتیس سال کا شخص انہیں کھڑا نظر آیا۔ اسے دیکھ کر ایسا لگتا تھا جیسے پرانے وقتوں کا کوئی

جلا دہو۔ وہ اب سیڑھیاں اتر کے نیچے آ چکا تھا۔

"تم کون......؟" وہ جیسے ہی ان کے قریب پہنچا' انسپکٹر دانش نے پوچھا۔

"میرا نام شہباز ہے۔ میں نے ہی پولیس اسٹیشن فون کیا تھا۔" وہ جواب دیتے ہوئے بولا۔

"تم یہاں کیا کرتے ہو؟"

"جی میں اکرم صاحب کا ڈرائیور بھی ہوں اور یہاں گھر کے دوسرے کام وغیرہ بھی میں ہی کرتا ہوں۔"

"تو اتنے بڑے گھر میں تم اکیلے ہی نوکر ہو؟ اور مجھے باہر بنگلے کے دروازے پر کوئی گارڈ بھی نظر نہیں آیا۔" انسپکٹر دانش نے شکی لہجے میں پوچھا۔

"جی یہاں صبح کے وقت کام کاج کے لیے ملازم آتے ہیں۔ لیکن رات کو صرف میں ہی ہوتا ہوں اور گارڈ بھی ہوتا ہے لیکن آج رات کو اس کے گاؤں سے کوئی آدمی آیا تھا اس کی بیوی کی طبیعت اچانک خراب ہوگئی تھی اس لیے اسے جانا پڑا۔ وہ اکرم صاحب سے اجازت لے کر گیا تھا۔ چونکہ رات بہت ہو چکی تھی اس لیے کسی دوسرے گارڈ کا بندوبست کرنا ممکن نہیں تھا۔" شہباز نے تفصیل سے جواب دیا۔

"ہوں......کہانی اچھی بنا لیتے ہو۔" انسپکٹر دانش نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"جی میں کچھ سمجھا نہیں؟" اس نے حیران ہوتے ہوئے پوچھا۔

"سب سمجھ جاؤ گے۔ ابھی تو میں آیا ہوں۔ بہت وقت پڑا ہے سمجھانے کے لئے' تمہیں اکرم صاحب کی موت کے بارے میں کب پتا چلا اور ان کی مسز کہاں ہیں؟" انسپکٹر دانش اب وہیں لاش کے قریب بیٹھ چکا تھا۔

"جی میں لگ بھگ ساڑھے تین بجے گھر کے اندر آیا تھا۔ میں باہر سرونٹ کوارٹر میں رہتا ہوں میری نیند ایک دھماکے کی آواز کے ساتھ کھلی اور جب میں اندر ڈرائنگ روم میں پہنچا تو مجھے اکرم صاحب یہاں اس میز پر اوندھے گرے ہوئے نظر آئے۔" شہباز نے جواب دیتے ہوئے کہا۔

"جب تم اندر آئے تو اکرم صاحب زندہ تھے یا؟"

"جی نہیں۔ جب میں پہنچا تو ان کی سانسیں رک چکی تھیں۔" شہباز نے جواب دیا۔

شہباز کا جواب سن کر انسپکٹر دانش نے جیسے ہی اکرم شاہ کی لاش پر سے کپڑا اٹھایا تو دوسرے ہی پل دوبارہ کپڑا لاش پر ڈال دیا۔ لاش کا چہرہ شیشے کی میز پر گرنے کی وجہ سے اتنی بری طرح بگڑ چکا تھا کہ دیکھنے کے قابل بھی نہیں رہا تھا۔

"لاش کی حالت تو بہت خراب ہے۔" انسپکٹر دانش خود کلامی کرتے ہوئے بولا۔ پھر شہباز کی جانب متوجہ ہوا۔ "یہاں اتنا کچھ ہوا تم باہر سے اندر آ گئے تو ان کی مسز کہاں تھیں اس سارے وقت میں؟ کیا وہ بھی آج چھٹی پر ہیں؟" انسپکٹر دانش کی آواز میں طنز تھا۔

"جی وہ نیند کی گولیاں کھا کر سوتی ہیں اور اتنی آسانی سے ان کی آنکھ نہیں کھلتی۔ جب میں اندر آیا تب دھماکے کی آواز سے وہ بھی اٹھ چکی تھیں لیکن گولیوں کے اثر کی وجہ سے انہیں زیادہ کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ اس وقت وہ اوپر اپنے کمرے میں ہیں۔ لاش کو ایسے دیکھ کر ان کی حالت بھی۔" شہباز نے بات بیچ میں چھوڑ دی۔

"تم آدمی بڑے کام کے ہو ہر سوال کا جواب پہلے سے موجود ہوتا ہے تمہارے پاس۔" انسپکٹر دانش نے جیب سے ایک اور سگریٹ نکال کر سلگائی۔ "چلو پرویز علی اب ہمیں ہی اوپر جانا پڑے گا مسز اکرم تو اب نیچے آنے سے رہیں۔" وہ سب اوپر جا ہی رہے تھے کہ ایک آواز نے ان سب کے قدم روک لئے۔

"ہیلو سر......کیا آپ ہی انسپکٹر دانش سومرو ہیں؟" ان سب نے مڑ کر دیکھا تو انہیں ڈرائنگ روم کے دروازے پر ایک لڑکی کھڑی نظر آئی۔ وہ پچیس چھبیس کے لگ بھگ تھی۔ اس نے جینز اور ٹی شرٹ پہن رکھی تھی۔

"جی' میں ہی انسپکٹر دانش سومرو ہوں۔ لیکن آپ کون؟ اور سپاہیوں نے آپ کو اندر کیسے آنے دیا؟"

"میں انسپکٹر دیبا شیخ ہوں' اس کیس میں آپ کی اسسٹنٹ کے طور پر مجھے بھیجا گیا ہے۔" اس لڑکی نے اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا۔

"اوہ......ہ......" انسپکٹر دانش کے ہونٹ ایسے سکڑ گئے جیسے وہ سیٹی بجانے لگا ہو۔ "آئیے پھر آپ بھی شامل ہو جائیں۔ کیونکہ ابھی تک ہم بھی اندھیرے میں راستہ تلاش کر رہے ہیں' ہوسکتا ہے آپ کے آنے سے قسمت کی دیوی ہم پر مہربان ہو جائے۔" انسپکٹر دانش نے مسکراتے ہوئے کہا۔

انسپکٹر دیبا بھی مسکراتے ہوئے ان کے قریب آ گئی۔ انسپکٹر دانش نے اسے اب تک کی کہانی سنا دی اور پھر وہ سب اوپر مسز اکرم شاہ کے کمرے کی طرف جانے لگے۔ انسپکٹر دانش کو اب بھی یہ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ آخر اکرم شاہ کی لاش کمرے سے نکل کر ڈرائنگ روم کی میز پر کیسے پہنچی۔ شاید مسز اکرم شاہ ہی اس پہیلی کو سلجھانے میں کوئی مدد کر سکیں۔

☆☆☆☆☆☆☆

"دیکھو اسلم' خدا کی یہی مرضی تھی۔ مرنا تو ایک دن ہم سب نے ہی ہے۔ تم ہمت سے کام لو۔" ڈاکٹر علوی نے اسلم کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ وہ اس وقت ایئر پورٹ کے لاؤنج میں بیٹھے تھے' کچھ دیر بعد ہی اسلم کی فلائٹ پاکستان جانے والی تھی۔ اس نے اکرم شاہ کی موت کی اطلاع ملتے ہی واپسی کا فیصلہ کر لیا تھا۔

"افسوس اس بات کا ہے کہ پاپا مجھے بلاتے رہے اور میں نہیں گیا اور اب وہ خود ہی چلے گئے مجھے چھوڑ کر۔" اسلم نے اپنی آنکھوں میں آئے آنسو روکنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

اس سے پہلے کہ ڈاکٹر علوی کچھ کہتا اسلم کی فلائٹ کا اعلان ہونے لگا اور وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ڈاکٹر علوی نے اسے گلے سے لگایا اور پاکستان پہنچ کر فون کرنے کی تاکید کر کے وہاں سے چلا گیا۔ ڈاکٹر علوی کے جاتے ہی اسلم نے اپنا موبائل نکالا اور ایک نمبر ملانے لگا۔

☆☆☆☆☆☆☆

"میں تم سے کب سے کہہ رہی تھی کہ شادی کر لیتے ہیں۔ اب دیکھ لیا انجام۔" وہ پچھلے آدھے گھنٹے سے عاطف پر چیخ رہی تھی۔

"انوشہ۔ میں تمہیں کتنی بار بتا چکا ہوں کہ اگر مجھے پتا ہوتا کہ وہ بڈھا اتنی جلدی مر جائے گا تو میں فوراً شادی کر لیتا تم سے۔" عاطف بھی پچھلے آدھے گھنٹے سے اسے بار بار یہی ایک جواب دیئے جا رہا تھا۔

"اب بیٹھے روتے رہو اپنی قسمت کو' پتا نہیں وہ کیا وصیت لکھ کر گیا ہے۔" عاطف کی گرل فرینڈ انوشہ اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔

"مجھے کیا پتا تھا' مجھے تو وہ کئی بار شادی کرنے کے لیے کہہ چکا تھا اور میں سوچ رہا تھا کہ جتنا زیادہ ہو سکے اس سے مال نکلوا لوں پھر شادی کر کے اچھا خاصہ حصہ الگ سے لے لوں گا لیکن اب تو وہ فاحشہ رینا۔ پتا نہیں ٹھرکی بڈھا اس کے نام کتنی جائیداد لکھ گیا ہے۔" عاطف کی آواز میں غصہ ابھر آیا تھا۔

"بزنس کا تو ویسے ہی برا حال ہے اور اسلم بھیا بھی میری طرح ہیں بلکہ مجھ سے بھی گئے گزرے ہیں' انہیں تو بزنس کے بارے میں کچھ پتا ہی نہیں ہے۔ اب سب کچھ اس رینا کے ہاتھ میں ہوگا اور جتنی وہ

مجھ سے نفرت کرتی ہے اس کی کوشش ہوگی کہ مجھے کچھ بھی نہ ملے۔" پھر اس نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

"اب میری بات غور سے سنو! اسلم بھیا کے دو ہی شوق ہیں شراب اور شباب' باپ کی طرح وہ بھی بہت بڑا ٹھرکی ہے اب جیسے ہی وہ پاکستان آئے تم نے اس کے قریب ہونا ہے ورنہ سب کچھ ہمارے ہاتھ سے نکل جائے گا۔ اسلم بھیا کو کچھ پتا نہیں ہے کہ تمہارا اور میرا کیا رشتہ ہے اور نہ ہی رینا تم سے ملی ہے۔" عاطف نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔ "اب توجہ سے سنو کہ تمہیں کیا کرنا ہے۔" عاطف انوشہ کے قریب ہوتے ہوئے اسے آئندہ کا پلان سمجھانے لگا۔

شطرنج کے کھیل کا آغاز ہو چکا تھا۔ اور اب ہر شاطر اپنی اپنی چال چلنے کے لیے تیار ہو چکا تھا۔ جیسے سب ہی اکرم شاہ کی موت کے انتظار میں تھے۔

☆☆☆☆☆☆☆

"اکرم کو سانس کی تکلیف تھی اور آج کل بزنس میں گھاٹے کی وجہ سے ان کی طبیعت زیادہ خراب رہنے لگی تھی اور اکثر رات کو انہیں اٹیک ہو جاتا تھا تو انہیں انہیلر کی ضرورت پڑتی تھی۔ رات کو سوتے ہوئے کسی وقت بھی انہیں سانس کی تکلیف شروع ہو جاتی تھی۔ کیونکہ مجھے گولی کھائے بغیر نیند نہیں آتی اس لیے وہ انہیلر کو اپنے بیڈ کی سائیڈ ڈرا میں رکھتے تھے' تاکہ رات کو انہیں ڈھونڈنے میں وقت نہ ہو' رات کو بھی شاید انہیں سانس کی تکلیف ہوئی' لیکن سونے سے پہلے شاید وہ انہیلر کو جانچنا بھول گئے تھے۔" وہ سب رینا کی بتائی ہوئی کہانی کو غور سے سن رہے تھے۔

"جانچنا بھول گئے؟ میں آپ کی بات سمجھا نہیں مسز اکرم شاہ۔" انسپکٹر دانش نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"وہ دیکھیں' دروازے کے ساتھ انہیلر پڑا ہے۔ میں جب کمرے میں واپس آئی تو میں نے اسے دیکھا۔ شاید وہ انہیلر خالی ہو چکا تھا اور اسی وجہ سے وہ کمرے سے باہر گئے تھے۔ لیکن وہ نیچے کیسے گرے یہ بات میری سمجھ سے باہر ہے۔"

"آپ نے چیک کیا ہے اسے' وہ انہیلر خالی ہے یا نہیں؟" انسپکٹر دانش نے پوچھا۔

"نہیں' میں اسے اٹھانے لگی تھی لیکن شہباز نے کہا کہ اس نے پولیس کو فون کر دیا ہے اب کسی چیز کو ہاتھ نہیں لگانا چاہیے ہمیں۔" رینا نے جواب دیا۔

"کمال کے آدمی ہو یار تم ایسا کرائم سین اگر ہمیں ہر کیس میں ملے تو ہمارا تو کام آسان ہو جائے' لگتا ہے پہلے بھی تین چار مرڈر کیس سنبھال چکے ہو تم۔" انسپکٹر دانش نے ایک بار پھر سے شہباز کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ اس کے ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ تھی۔

دیبا نے آگے بڑھ کر وہ انہیلر اٹھا لیا' جو واقعی خالی تھا۔

"مجھے جو ٹھیک لگا میں نے بس وہ کیا۔" شہباز نے جواب دیتے ہوئے کہا۔

"مسز اکرم شاہ! ایک بات مجھے سمجھ نہیں آئی کہ وہ آپ کو اٹھانے کی بجائے کمرے سے باہر کیوں گئے؟" انسپکٹر دانش نے رینا کی طرف پلٹتے ہوئے کہا۔

"میں نے ابھی آپ کو بتایا نا کہ میں نیند کی گولی کھا کر سوتی ہوں۔ اس لیے میرا اٹھنا تھوڑا مشکل سے ہوتا ہے اور دروازے کے باہر آپ کو ایک بٹن نظر آئے گا یہ بٹن دبانے سے شہباز کے کمرے کی گھنٹی بجتی ہے۔ شاید وہ گھنٹی بجانے ہی باہر گئے تھے۔" رینا نے وضاحت کی۔

"ایک بات تو طے ہے کہ جس نے بھی پلاننگ کی ہے۔ کمال کا پلانر ہے۔" انسپکٹر دانش کے ہونٹوں پہ مسکراہٹ ابھر آئی۔

"جی' میں سمجھی نہیں۔" رینا نے حیرانگی سے پوچھا۔

"میری باتیں اکثر لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتیں۔ خیر ہو سکتا ہے وہ باہر گئے ہوں اور طبیعت خراب ہونے کی وجہ سے خود کو سنبھال نہ سکے ہوں اور نیچے گر گئے ہوں۔" انسپکٹر دانش نے بولتے ہوئے غور سے رینا اور شہباز کو دیکھا۔

"میں کیا کہہ سکتی ہوں اس بارے میں؟" رینا بولی۔

"کیوں شہباز صاحب' آپ کیا کہتے ہیں؟ آخر آپ کی ذہانت کا ہمیں بھی تو کچھ فائدہ ہو۔" انسپکٹر دانش نے اس بار شہباز سے سوال کیا۔

"میں کیا کہوں صاحب' ہو سکتا ہے آپ کی بات ٹھیک ہو۔" شہباز بولا۔

"ٹھیک ہے' فی الحال تو کچھ بھی کہنا مشکل ہے۔ ابھی تو ہم صرف اندازے ہی لگا سکتے ہیں۔ اب آپ آرام کریں مسز اکرم شاہ' ہم دیکھتے ہیں اور ابھی اکرم شاہ صاحب کی لاش آپ کے حوالے نہیں کی جا سکتی۔" انسپکٹر دانش نے بات ختم کرتے ہوئے کہا اور دیبا کو باہر آنے کا اشارہ کیا۔

"دیبا! ایسا کرو کہ لاش کو ڈی این اے ٹیسٹ کے لیے بھیج دو۔ چہرہ تو اتنا بگڑ چکا ہے کہ پہچانا نہیں جا رہا۔ شیشے کی میز پر گرنے سے سارے جسم میں کانچ چبھے ہوئے ہیں اور چہرے پر تو کانچ ہی کانچ ہیں۔ اور مجھے ٹھیک وقت پتا کر کے بتاؤ کہ اکرم شاہ کی موت کتنے بجے واقع ہوئی۔ شہباز کا کہنا ہے کہ وہ ساڑھے تین بجے اندر آیا' یہ آدمی مجھے بہت گڑبڑ لگتا ہے۔ اس کی بات پر مجھے ایک فیصد بھی یقین نہیں ہے۔" انسپکٹر دانش نے دیبا کو تفصیل سے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"یس سر' میں سمجھ گئی۔" انسپکٹر دیبا نے ساری بات کا مختصر سا جواب دیا۔

"مجھے خواتین کے ہونٹوں سے یہ سرور کا تکلف اچھا نہیں لگتا۔" انسپکٹر دانش نے مسکراتے ہوئے دیبا کو دیکھا۔ اس کے لہجے سے لگ رہا تھا کہ اس کی بات کا کیا مطلب ہے۔

"سر میں نے تو سنا تھا کہ آپ کافی سخت قسم کے آفیسر ہیں لیکن آپ سے مل کر ایسا لگ نہیں رہا۔" دیبا اس کی بات کا مطلب سمجھتے ہوئے بولی۔

"یہ تو میرے دشمن ہیں جو افواہیں اڑاتے رہتے ہیں۔ ورنہ میں تو بہت نرم دل کا انسان ہوں۔ خاص طور پر ایک خوبصورت لڑکی کا ساتھ ہو تو کس کافر کا دل سخت رہے گا۔" انسپکٹر دانش کی باتوں سے لگ رہا تھا کہ وہ دیبا پر پورا پورا فدا ہونے کا پروگرام بنا چکا تھا۔

"سر' میرا خیال ہے اب کچھ کام کر لیں۔ کیونکہ کام کے وقت مجھے کام کرنا ہی پسند ہے۔" انسپکٹر دیبا نے بات بدلتے ہوئے کہا۔

"مطلب جب کام نہ ہو تو پھر تمہیں کام کے علاوہ باقی سب کچھ پسند ہے؟" انسپکٹر دانش پر دیبا کی بات کا ذرا بھی اثر نہیں ہوا۔

"خیر اب تو تمہارا اور میرا ساتھ رہے گا اور باتیں بھی ہوتی رہیں گی' تم نے ایک اور کام بھی کرنا ہے۔ مجھے اکرم شاہ کے بزنس کے حالات کے بارے میں پوری رپورٹ اور ساتھ میں اور کیا کچھ ہوا اس کی پراپرٹی میں یہ ساری معلومات چاہئیں۔" انسپکٹر دانش نے اس بار سنجیدہ لہجے میں کہا۔

"اوکے سر۔ میں کل تک ساری معلومات اکٹھی کرتی ہوں۔"

انسپکٹر دانش باہر آ گیا۔ اس نے اپنی جیب سے سگریٹ نکال کر سلگائی۔ اس کا دماغ مسلسل چل رہا تھا۔ ابھی تک سارا کیس الجھا ہوا تھا اور ابھی تک اس کی دو اور اہم لوگوں سے بات بھی نہیں ہوئی تھی۔ اسلم اور عاطف سے ملنے کے بعد ہی وہ کچھ اندازہ لگا سکتا

تھا اور ابھی تک وصیت بھی نہیں کھلی تھی۔ جس سے معلوم ہوتا کہ کس کس کو کیا کیا ملنا تھا۔ شطرنج کے کھیل میں سب سے بڑا مسئلہ یہی ہوتا ہے کہ کئی بار جو چال چلی جاتی ہے وہ چلنے والے نے کیا سوچ کر چلی ہے اس کا پتا لگانا مشکل ہوتا ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆

"عاطف، یہ سب کیسے ہوگیا۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ پاپا مجھے یوں اکیلا چھوڑ جائیں گے۔" اسلم اس وقت اپنے گھر میں اپنے کمرے میں بیٹھا تھا اور عاطف اور انوشہ اس کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔

"اسلم بھیا۔ مجھے بھی سمجھ نہیں آرہی کہ یہ اچانک کیا ہوگیا۔ مجھے تو یقین ہی نہیں ہو رہا ہے کہ انکل ہمیں چھوڑ کر جا چکے ہیں۔" عاطف کی آواز میں دکھ تھا۔

"ممی کی طبیعت بھی خراب ہے۔ ان سے بھی زیادہ کچھ پوچھ نہیں سکتا میں۔ اور پاپا کی ڈیڈ باڈی ابھی تک پولیس کسٹڈی میں ہے۔" اسلم نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"اسلم بھیا، پولیس کو شک ہے کہ شاید انکل کی موت کے پیچھے کسی کا ہاتھ ہے۔" عاطف نے جواب دیا۔

"تمہیں کیسے پتا اس بات کا؟" اسلم نے حیرانی سے پوچھا۔

"انسپکٹر دانش آج مجھ سے ملنے آیا تھا۔ اور اس کی باتوں سے لگ رہا تھا کہ اسے شک ہے کہ انکل کی موت کے پیچھے کسی نہ کسی کا ہاتھ ضرور ہے۔" عاطف نے بات آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ "اور آج وصیت بھی اس کے آنے کے بعد سنائی جائے گی۔"

"ایک تو پاپا کی موت کا غم اوپر سے یہ سب مسئلے۔" اسلم کی آواز میں غم کے ساتھ اب غصہ بھی تھا۔

"آپ پریشان نہ ہوں۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔" انوشہ نے پہلی بار باتوں میں حصہ لیا۔

"تم نے اب تک ان سے میرا تعارف نہیں کروایا، تمہاری گرل فرینڈ ہے نا؟" اسلم نے سوالیہ انداز میں پوچھا۔

"نہیں...... نہیں، گرل فرینڈ نہیں یہ بس میری دوست ہے انوشہ، اسے پتا لگا تو آپ کے پاس افسوس کرنے آگئی میرے ساتھ۔" عاطف نے جلدی سے جواب دیا۔ جیسے کہیں تھوڑی سی بھی دیر ہوگئی تو کوئی نقصان ہو جائے گا۔

"اوہ آپ کی ہمدردی کا شکریہ۔" اسلم نے انوشہ کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"اس میں شکریہ کیا بات ہے اور ویسے بھی ایسے وقت میں تو اپنوں کی ضرورت ہوتی ہی ہے۔" انوشہ لگاوٹ بھرے لہجے میں بولی۔

عاطف نے ان دونوں کو آپس میں باتیں کرتے دیکھا تو اس کے چہرے پر شیطانی مسکراہٹ آگئی۔ جیسا وہ سوچ رہا تھا اسلم ویسے ہی انوشہ میں دلچسپی لے رہا تھا۔ اس نے دونوں کو باتوں میں مصروف دیکھا پھر وہیں رکھے گلدان پر ہاتھ پھیرا جیسے وہ اس میں رکھے پھولوں پر ہاتھ پھیر رہا ہو، اسلم اور انوشہ دونوں کا دھیان اس کی طرف نہیں تھا کہ اس نے کیا حرکت کی ہے۔ وہ دونوں یونہی باتوں میں مصروف رہے لیکن عاطف کے چہرے سے صاف پتا لگ رہا تھا کہ وہ جو کرنے آیا تھا وہ کر چکا ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆

"سر اکرم شاہ کی آدھی سے زیادہ پراپرٹی اس وقت بینک کے پاس گروی ہے اور باقی پراپرٹی میں کس کو کیا ملا ہے یہ تو وصیت آنے کے بعد ہی معلوم ہوگا۔" انسپکٹر دیبا اس وقت انسپکٹر دانش کے آفس میں کھڑی تھی۔

"ہوں...... اس کے علاوہ اور کوئی خاص بات؟" انسپکٹر دانش اپنی کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔

"سر، جو سب سے اہم بات ہے۔ وہ یہ ہے کہ اکرم شاہ کے نام 100 ملین کی انشورنس پالیسی بھی ہے جو اس کے مرنے کے بعد اس کی بیوی اور بیٹے کو ملے گی۔" انسپکٹر دیبا نے جیسے دھماکہ سا کیا۔

"ڈیٹس اٹ...... یہی تو وہ بات تھی جس کی مجھے تلاش تھی اس کا مطلب ہے کہ اکرم شاہ کا قتل ہی ہوا ہے کیونکہ جس نے بھی یہ سب کیا ہے اسے پراپرٹی کی نہیں رقم کی فکر تھی۔" انسپکٹر دانش کی آواز میں جوش تھا۔

"لیکن سر اس کی بیوی یا بیٹا ایسا کیوں کرے گا؟" دیبا نے حیرت سے پوچھا۔

"جہاں پیسے کی بات آجائے وہاں لوگ اپنا دین دھرم، رشتے، پیار سب بھول جاتے ہیں دیبا جی، جب معاملہ ایک بڑی رقم اور وہ بھی سو ملین جیسی رقم کا ہو تو پھر کچھ بھی ہو سکتا ہے۔" انسپکٹر دانش نے مسکراتے ہوئے دیبا کی کمر پر ہاتھ رکھا۔

"میرا دل نہیں مانتا سر، پیسے کے لیے کوئی بیٹا اپنے باپ یا کوئی بیوی اپنے شوہر کو مار سکتی ہے کیا بھلا۔" دیبا کی آواز میں ابھی بھی حیرانگی تھی۔

"ابھی تو کھیل شروع ہوا ہے، کیا پتا کس کا کام ہے یہ، یا ہو سکتا ہے جو ہم سوچ رہے ہیں ایسا کچھ بھی نہ ہو، سب کچھ ممکن ہے۔" انسپکٹر دانش کا ہاتھ اب آہستہ آہستہ دیبا کی کمر سے نیچے جا رہا تھا۔

"سر کھیل بھی شروع ہو چکا ہے اور جہاں آپ کا ہاتھ پہنچ چکا ہے وہاں آپ کی حد بھی ختم ہو رہی ہے۔" دیبا نے مسکراتے ہوئے انسپکٹر دانش کو دیکھا۔

"اوہ سوری، مجھے باتوں میں اندازہ نہیں ہوا۔" دانش کی آواز میں شرارت تھی۔ اس کے تاثرات سے لگ رہا تھا کہ وہ دیبا میں کتنی دلچسپی لینے لگا ہے۔

"چلو اب چل کر وکیل کی بھی سن لیں کہ کس کس مرغی کو کون کون سا سونے کا انڈہ ملا ہے۔" دانش نے دیبا سے کہا اور وہ دونوں آفس سے باہر آگئے۔ انسپکٹر دانش کی گاڑی اب شاہ ہاؤس کی طرف دوڑی جا رہی تھی۔

☆☆☆☆☆☆☆

"اکرم شاہ کی وصیت کے مطابق ان کی تمام منقولہ اور غیر منقولہ جائیداد میں پچاس فیصد حصہ ان کے بیٹے اسلم شاہ کا ہے۔ پچیس فیصد ان کی اہلیہ رینا شاہ اور باقی کے پچیس فیصد کے مالک ان کے بھتیجے عاطف شاہ ہیں۔" ڈرائنگ روم میں اس وقت تمام متعلقہ افراد موجود تھے اور اکرم شاہ کا وکیل ان کی وصیت پڑھ کر سنا رہا تھا۔

وکیل کے رخصت ہونے کے بعد انسپکٹر دانش اور دیبا نے اسلم کو الگ کمرے میں آنے کا کہا کیونکہ ابھی تک صرف وہی ایک بچا تھا جس سے انہوں نے تفتیش نہیں کی تھی۔

"مسٹر اسلم! آپ کو کیا لگتا ہے کہ آپ کے والد کے قتل کے پیچھے کس کا ہاتھ ہو سکتا ہے؟" دانش کا پہلا سوال سن کر ہی اسلم کو جھٹکا لگا۔

"انسپکٹر صاحب، پہلی بات تو یہ کہ مجھے نہیں پتا کہ یہ قتل ہے یا نہیں، جہاں تک میری معلومات کا سوال ہے تو یہ فطری موت ہوئی ہے کوئی قتل نہیں اور اگر ہے بھی تو مجھے کیا پتا یہ تو آپ کا کام ہے پتا لگانا۔" اسلم نے خود کو سنبھالتے ہوئے جواب دیا۔

"ویسے ایک بات ہے۔ اس گھر کے تمام افراد بہت عقل مند ہیں۔ ہر کوئی کمال کا جواب دیتا ہے، کیوں انسپکٹر دیبا آپ کا کیا خیال ہے اس بارے میں؟" انسپکٹر دانش نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"یس سر، یہ بات تو آپ کی بالکل ٹھیک ہے۔" انسپکٹر دیبا نے بھی مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"آپ کہنا کیا چاہتے ہیں انسپکٹر صاحب؟" اسلم

نے قدرے غصے سے کہا۔
"کچھ نہیں' میں تو صرف تعریف کررہا ہوں سب کی' ویسے کیا یہ سچ ہے کہ آپ پچھلے چار سال سے لندن میں رہ رہے ہیں اور اس دوران ایک بار بھی پاکستان نہیں آئے؟" انسپکٹر دانش نے اگلا سوال کیا۔
"جی' یہ بالکل سچ ہے۔"
"تو کیا آپ کی اپنے والد سے کوئی ان بن چل رہی تھی جس کی وجہ سے آپ گھر نہیں آنا چاہ رہے تھے؟"
"یہ آپ سے کس نے کہا؟ میری پاپا سے کوئی ان بن وغیرہ نہیں تھی' میں لندن ایم بی اے کے لیے گیا تھا اور پھر مجھے وہ شہر اتنا پسند آ گیا کہ میرا دل واپس آنے کو نہیں ہوا۔" اسلم کے لہجے میں ہلکی سی ناراضگی تھی۔
"حالانکہ آپ کے والد کو آپ کے ساتھ کی سخت ضرورت تھی' ان کا بزنس نقصان میں چل رہا تھا اور یہ بات تو آپ کو پتا ہی ہوگی۔" انسپکٹر دانش نے کھوجتی ہوئی آواز میں پوچھا۔
"جی مجھے پتا تھا' لیکن میرے آنے سے بھی کوئی معجزہ ہونے والا نہیں تھا' کیونکہ مجھے بزنس کا کوئی تجربہ نہیں ہے اور میں یہ بات کئی بار پاپا کو بتا چکا تھا۔"
"جب آپ کو بزنس میں آنا ہی نہیں تھا تو پھر ایم بی اے کرنے کا کیا مقصد تھا؟" انسپکٹر دیبا نے پہلی بار سوال کیا اور اس کا سوال سن کر انسپکٹر دانش نے داد دینے والے انداز میں اسے دیکھا۔
"یہ بھی پاپا کے کہنے پر کیا تھا' ورنہ میں ایم بی اے نہیں کرنا چاہتا تھا' میری دلچسپی پینٹنگ میں تھی اور اب بھی ہے' لیکن پاپا کے کہنے پر مجھے ایم بی اے کرنا پڑا۔" اسلم نے دیبا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
"تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ کا اپنے والد کے ساتھ کئی باتوں پر اختلاف تھا۔" انسپکٹر دانش نے اسے جانچتی ہوئی نظروں سے دیکھا۔
"ایسی چھوٹی موٹی باتیں تو ہر گھر میں ہوتی ہیں' اس میں کیا بڑی بات ہے۔"
"مانا کہ یہ چھوٹی بات ہے لیکن اس سو ملین کی انشورنس پالیسی کا تو آپ کو کبھی نہ کبھی ضرور خیال آیا ہوگا۔" انسپکٹر دانش نے گمبھیر لہجے میں کہا۔
"دیکھیں آپ بے تکی اور گھٹیا باتیں کررہے ہیں' آپ جس شخص کے بارے میں بات کررہے ہیں وہ میرے والد تھے اور سوتیلے نہیں سگے والد' آپ مجھ سے مسلسل ایسے سوال کیے جارہے ہیں جیسے میں آپ کا اہم مجرم ہوں۔" آخر اسلم کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو ہی گیا۔
"وہ تو اس گھر کا ہر فرد ہے اور اگر میرے سوالوں سے آپ کو تکلیف پہنچی ہے تو معافی چاہتا ہوں۔ لیکن یہ میرا کام ہے۔ گورنمنٹ اسی بات کی تو مجھے تنخواہ دیتی ہے ہر مہینے۔" انسپکٹر دانش نے سرد لہجے میں مگر مسکرا کر کہا۔
"یہ تو سب جانتے ہیں کہ ہمارے پولیس والے کس کام کی تنخواہ لیتے ہیں۔ لیکن میں ابھی اپنے پاپا کی موت کے غم سے باہر نہیں آیا ہوں اور آپ یہ پراپرٹی' انشورنس اور پتا نہیں کہاں کہاں پہنچ چکے ہیں جبکہ مجھے کچھ پتا ہی نہیں اور اب تک میں آفس بھی نہیں گیا ہوں۔" اسلم نے تیکھے لہجے میں جواب دیا۔
"میں مسکرا کر بات کررہا ہوں تو آپ کہیں مجھے الو تو نہیں سمجھ رہے؟ خیر ابھی کے لیے اتنا ہی کافی ہے' بعد میں اگر ضرورت پڑی تو آپ کو پھر سے تکلیف دیں گے۔" انسپکٹر دانش نے یہ کہہ کر اسلم سے ہاتھ ملایا اور پھر وہ دیبا کے ساتھ کمرے سے باہر آ گیا۔
شاہ ہاؤس سے باہر آنے پر دانش نے دیبا سے کہا ۔"ان سب کے پیچھے تین چار آدمی لگا دو۔ مجھے پل پل کی رپورٹ چاہیے۔"
"اوکے سر۔" دیبا نے گاڑی میں بیٹھتے ہوئے جواب دیا۔ اور دانش نے گاڑی پولیس اسٹیشن کی طرف موڑ دی۔

☆☆☆☆☆☆☆

"اب تو پلان بالکل ہماری مرضی کے مطابق چل رہا ہے۔ بس تم اسی طرح اسلم کو پھنساتی جاؤ تو دیکھنا ایک دن سب ہمارے ہاتھ میں ہوگا۔" عاطف نے انوشہ کے بالوں سے کھیلتے ہوئے کہا' وہ دونوں اس وقت عاطف کے بیڈ روم میں تھے۔
"یار' یہ تو بہت آسان شکار نکلا۔ ابھی سے میرا دیوانہ ہوگیا ہے۔" انوشہ نے اترا کر کہا۔
"جان من' تمہارے آگے تو بڑے بڑوں کی چھٹی ہوجاتی ہے اور یہ تو ہے ہی ٹھرکی باپ کا ٹھرکی بیٹا۔ اس نے تو لٹو ہونا ہی تھا۔" عاطف نے اس کی تعریف کرتے ہوئے کہا۔
"لیکن مجھے تو اب تک یہ سمجھ نہیں آئی کہ ہمیں اسلم کو پھنسا کر ملے گا کیا؟" انوشہ نے پوچھا۔
اس کی بات سن کر عاطف نے اپنے بیڈ کی سائیڈ ٹیبل میں سے ایک فائل نکال کر انوشہ کو پکڑا دی۔
"لو...... یہ فائل پڑھو۔"
عاطف کے کہتے ہی انوشہ فائل کھول کر پڑھنے لگی۔
"اب کچھ سمجھ میں آیا؟ اسلم پچاس ملین کا مالک بن چکا ہے اور پچاس فیصد پراپرٹی بھی اس کے نام ہے اور ایک بار وہ ہمارے جال میں پھنس گیا تو تمہارے ساتھ اس کی شادی ہوتے ہی سمجھو اس تمام دولت کے مالک ہم بن جائیں گے۔" عاطف نے شیطانی لہجے میں کہا "اور یہ فائل پڑھ کر تمہیں پتا تو لگ گیا ہوگا کہ شراب اس کے لیے کتنی خطرناک ہے' امید ہے کہ اب تمہیں کچھ اور سمجھانے کی ضرورت نہیں پڑے گی' مجھے تمہاری ذہانت پر پورا بھروسا ہے۔" عاطف مسکرا کر بولا۔
"لیکن کیا تمہیں نہیں لگتا کہ ایسا کرنے سے ہم پر بھی شک جا سکتا ہے۔" انوشہ نے پوچھا۔
"وہ بھی سوچ رکھا ہے میں نے' وقت آنے پر وہ چال بھی چلیں گے' فی الحال پہلی چال تو کامیاب ہوجائے۔"
"وہ تو سمجھو ہو ہی گئی۔ کچھ ہفتوں کی بات ہے پھر دیکھنا' اسلم کو میرے سوا کچھ نظر نہیں آئے گا۔" انوشہ کھلکھلا کر بولی۔
"بس تو پھر اسی خوشی میں پیار کا ایک اور راؤنڈ ہوجائے۔" یہ کہتے ہوئے عاطف نے انوشہ کے گرد اپنی بانہوں کا گھیرا تنگ کرلیا۔

☆☆☆☆☆☆☆

"سر یہ رہی اکرم شاہ کی ڈی این اے رپورٹ۔" انسپکٹر دیبا نے ایک فائل دانش کی میز پر رکھتے ہوئے کہا۔
"تم نے پوری تسلی کرلی ہے نا۔" انسپکٹر دانش نے فائل پڑھتے ہوئے پوچھا۔
"یس سر' یہ رپورٹ میری موجودگی میں تیار کی گئی ہے اور تین بار ٹیسٹ لیا گیا۔ وہ لاش اکرم شاہ کی ہی ہے۔" انسپکٹر دیبا نے جواب دیا۔
"سر ایک اور ضروری بات وہ یہ ہے کہ اکرم شاہ کی موت لگ بھگ تین بج کر بیس منٹ پر ہوئی اور ڈاکٹرز نے یہ بھی کہا ہے کہ شاید اسے استھما کی وجہ سے ہارٹ اٹیک بھی ہوا اور اگر مسز اکرم شاہ کی کہانی کو اس سے جوڑا جائے تو واقعی ہوسکتا ہے کہ جب وہ کمرے سے باہر بالکنی میں آیا تو اسے ہارٹ اٹیک ہوا جس کی وجہ سے وہ نیچے جا گرا۔" انسپکٹر دیبا کی باتوں سے اس کی ذہانت کا اندازہ لگایا جاسکتا تھا۔
"ہوں' اگر واقعی رپورٹ یہی کہہ رہی ہے تو کسی پر شک کرنے کی کوئی گنجائش ہی نہیں بچتی۔ لیکن یہ بھی تو ہوسکتا ہے وہ کمرے سے باہر تو ضرور آیا ہو لیکن بالکنی

سے اسے نیچے گرایا گیا ہو۔" انسپکٹر دانش نے سوچتے ہوئے کہا۔

"خیر یہ تو ہمیں ہی تفتیش کرنی ہے۔ ابھی تو تصویر کے ٹکڑے ملنے شروع ہوئے ہیں ابھی تو بہت کام باقی ہے، پھر بھی گڈ ورک فرام یو۔ پہلے مجھے کافی حیرت ہوئی تھی کہ ایک جونیئر انسپکٹر کو اتنے اہم کیس میں میری اسسٹنٹ بنا کر بھیجا گیا ہے، لیکن آہستہ آہستہ مجھے تمہاری قابلیت دیکھ کر پتا لگ رہا ہے کہ تمہیں کیوں بھیجا گیا ہے۔ اکثر تو مجھے ایسے اسسٹنٹ ملتے ہیں کہ سب کام مجھے خود ہی کرنا پڑتا ہے۔ لیکن اس بار تمہاری وجہ سے کم از کم ان بھاگ دوڑ کے کاموں سے تو میری جان چھوٹی ہوئی ہے۔" انسپکٹر دانش نے توصیفی لہجے میں کہا۔

"تھینک یو سر، میں تو کب سے آپ کے ساتھ کام کرنے کے لیے بے تاب تھی، بس موقع کا انتظار تھا اور اب موقع ملا ہے تو اسے ضائع نہیں کرنا چاہتی۔"

"اوہ...... مجھے پہلے پتا ہوتا تو میں خود تمہاری سفارش کر دیتا۔ تمہاری جیسی قابل اور خوبصورت انسپکٹر کو تو میں ہمیشہ اپنے پاس رکھنا چاہوں گا۔" انسپکٹر دانش پھر پٹڑی سے اترنے لگا۔ "ویسے تمہارا کوئی بوائے فرینڈ یا منگیتر ٹائپ چیز ہے کیا؟"

"جی سر، بوائے فرینڈ تھا۔ مگر ہمارا بریک اپ ہو چکا ہے۔ آپ تو جانتے ہیں ہماری ڈیوٹی کیسی ہوتی ہے، اسے مجھ سے شکایت ہونے لگی اور ہمارا ساتھ چلنا مشکل ہو گیا تو راستے الگ کر لیے۔" انسپکٹر دیبا نے درد بھری مسکراہٹ سے کہا۔

"ایک انسپکٹر کا درد تو ایک انسپکٹر ہی سمجھ سکتا ہے۔" انسپکٹر دانش دیبا کو دیکھتے ہوئے بولا۔

"ویسے اگر تم کل فری ہو تو میرے ساتھ ڈنر پر چل سکتی ہو؟"

"سر میرا خیال ہے یہ کچھ جلد بازی ہو گی ابھی تو ہم ایک دوسرے کو اچھی طرح سے جانتے بھی نہیں۔" دیبا نے جواب دیا۔

"جان پہچان بھی ہو جائے گی اور ڈنر بھی کل تم تیار رہنا میں تمہیں آٹھ بجے پک کر لوں گا تمہارے فلیٹ سے۔" انسپکٹر دانش نے بات سمیٹتے ہوئے کہا۔

"اوکے سر۔" انسپکٹر دیبا نے مسکراتے ہوئے کہا۔ شاید وہ بھی اب اکیلے رہ رہ کر تنگ آ چکی تھی اور کسی کا ساتھ تلاش کر رہی تھی۔

☆☆☆☆☆☆☆

"شہباز! میرا یہاں پر دم گھٹ رہا ہے۔ اکرم کے بغیر یہاں پر کچھ اچھا نہیں لگ رہا۔" رینا کی آواز میں دکھ تھا۔

"میڈم! اکرم صاحب کی کمی تو ہم سب کو کھل رہی ہے۔" شہباز نے جواب دیا۔

"لیکن ان کے بغیر یہ گھر مجھے کاٹنے کو دوڑ رہا ہے۔ میں کچھ دنوں کے لیے یہاں سے دور جانا چاہتی ہوں۔"

"حکم کریں میڈم، کہاں جانا چاہتی ہیں آپ؟ میں بندوبست کر دیتا ہوں آپ کے جانے کا۔" شہباز نے فوراً کہا۔

"تم ایسا کرو کہ لاہور والے بنگلے پر فون کر کے بتا دو۔ میں کچھ دنوں کے لیے لاہور جانا چاہتی ہوں یہ پولیس پوچھ تاچھ اور اکرم کی جدائی، ان سب نے مجھے توڑ کر رکھ دیا ہے۔" رینا غمزدہ لہجے میں بولی۔

"ٹھیک ہے میڈم، میں آج ہی فون کر دیتا ہوں۔ اور ٹکٹ بھی بک کروا دیتا ہوں۔"

"نہیں، ٹکٹ بک کروانے کی ضرورت نہیں۔ ڈرائیور سے کہہ دو میں بائی روڈ جاؤں گی۔"

"بائی روڈ ہی جانا ہے تو میں لے چلتا ہوں آپ کو۔" شہباز نے اپنی خدمات پیش کیں۔

"نہیں، تم یہیں رہو۔ اسلم کو تمہاری ضرورت ہو گی، پولیس بھی تو بار بار آ رہی ہے ایسے میں تمہارا اس کے ساتھ ہونا بہت ضروری ہے میں بھی تین چار دن میں واپس آ جاؤں گی اسلم کو ویسے بھی بزنس کی اتنی سمجھ نہیں ہے اور عاطف پر مجھے بالکل بھروسہ نہیں ہے اگر تم بھی چلے گئے تو پتا نہیں وہ اسلم کو کیا پٹی پڑھانے لگے۔" رینا نے تفصیل سے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے میڈم جیسا آپ کو ٹھیک لگے۔" شہباز سر ہلاتے ہوئے بولا۔

"میں اسلم سے بات کروں گی کہ وہ میرے جانے کے بعد عاطف کے کہنے میں نہ آئے۔" رینا نے جیسے خود کلامی کرتے ہوئے کہا۔

"میڈم! عاطف صاحب بھی تو بھائی ہی ہیں۔ وہ بھلا کوئی غلط مشورہ کیوں دیں گے؟"

"تم جانتے ہو نا عاطف کو، اسے صرف پیسے سے مطلب ہے چاہے اس کے لیے اسے کسی کی بھی قربانی دینی پڑے۔" رینا نے نفرت بھرے لہجے میں کہا "تم میرے جانے کا بندوبست کرو۔ میں اسلم سے بات کرتی ہوں۔"

شہباز نے رینا کی بات پر سر ہلایا اور رینا کے کمرے سے باہر آ گیا اور باہر آتے ہی ایک عجیب سی مسکراہٹ اس کے چہرے پر آ گئی۔ جیسے وہ ابھی ابھی رینا سے ہونے والی باتوں کا مزہ لے رہا ہو۔

☆☆☆☆☆☆☆

"انوشہ، پاپا مجھے چھوڑ کر کیوں چلے گئے؟" اسلم اور انوشہ اس وقت اسلم کے بیڈ روم میں بیٹھے تھے اور اسلم اپنے باپ کی موت سے نڈھال ہو رہا تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں شراب کا گلاس اور دوسرے ہاتھ میں انوشہ کا ہاتھ۔

"اسلم، انکل کی موت کا غم تو ہم سب کو ہے لیکن اب تمہیں ہمت سے کام لینا ہے۔" انوشہ نے اسے سمجھایا۔

"کہاں سے لاؤں ہمت؟ ایک طرف وہ پولیس کا چکر اور دوسری طرف ڈوبتا ہوا بزنس، میں یہ سب نہیں سنبھال سکتا۔" اسلم نے تھکے تھکے لہجے میں کہا۔

"میں جانتی ہوں کہ یہ سب تمہارے لیے کتنا مشکل ہے۔ لیکن اگر تم نے ہمت ہار دی تو سب کچھ بکھر جائے گا۔"

"تو بکھر جانے دو، میں یہ سب کچھ بیچ کر لندن چلا جاؤں گا۔ یہ سب میرے بس سے باہر ہے۔" اسلم نے یہ کہہ کر شراب کا گلاس منہ سے لگایا۔

"ٹھیک ہے۔ لیکن فی الحال تمہیں ہوش سے کام لینا ہے اور شراب تمہارے لیے ٹھیک نہیں ہے۔" انوشہ نے یہ کہتے ہوئے اس کا گلاس پھر شراب سے بھر دیا۔

"انوشہ اگر مجھے تمہارا ساتھ نہ ملتا تو میں اب تک واپس لندن بھاگ چکا ہوتا۔" اسلم نے پیار بھری نظروں سے اسے دیکھا۔

"میں تو ہمیشہ تمہارے ساتھ ہوں، کچھ دنوں میں تم میرے دل کے کتنے قریب آ چکے ہو تمہیں اندازہ بھی نہیں ہے۔" انوشہ نے اس کے اور نزدیک ہوتے ہوئے کہا۔

"اور میرا حال تو ایسا ہے کہ اب تمہارے علاوہ مجھے کچھ اور دکھائی ہی نہیں دیتا۔" اسلم اپنا چہرہ انوشہ کے چہرے کے قریب لاتا ہوا بولا۔

"اچھا اب بس بہت ہو گئی شراب۔ جانتے ہو نا شراب تمہارے لیے ٹھیک نہیں ہے۔" انوشہ نے اس کے ہاتھ سے گلاس تو لے لیا مگر شراب کی بوتل اس کے آگے کر دی۔

"مت روکو مجھے آج تو پینے دو۔ وعدہ، کل سے شراب نہیں پیوں گا۔" اسلم نے اس کے ہاتھ سے

شراب کی بوتل لیتے ہوئے کہا۔
"اوکے۔ لیکن صرف آج، ٹھیک ہے؟" انوشہ کے ہونٹوں پر شیطانی مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔
اسلم نے شراب کی بوتل کو منہ سے لگایا اور آخری قطرے تک پیتا گیا اور پھر وہیں انوشہ کی گود میں لڑھک گیا۔
"جانو، یہ وعدہ تو اب تمہیں روز ہی کرنا ہے۔" انوشہ نے تیکھی مسکراہٹ کے ساتھ اسلم کو دیکھا۔

☆☆☆☆☆☆☆

"دانش، مجھے لگتا ہے کہ ہم نے یہ فاصلہ طے کرنے میں بہت جلدی کردی ہے۔" دانش اور دیبا اس وقت بیڈروم میں تھے۔
"دیبا، کبھی کبھی دل کی بات بھی سن لینی چاہئے۔ مانا کہ ہم پولیس والوں کا کام دماغ کا ہے لیکن دل تو ہمارے پاس بھی ہے نا۔" دانش نے دیبا کو اپنی بانہوں میں لیتے ہوئے کہا۔
"میں نے تو سوچا بھی نہیں تھا کہ اتنی جلدی ہم دونوں ایک دوسرے کے اتنے قریب آجائیں گے۔" دیبا نے اپنا سر دانش کے سینے پر رکھ دیا۔
"میں نے تو جب سے تمہیں دیکھا تھا تب سے یہی سوچ رہا تھا۔" دانش نے شرارتی لہجے میں کہا۔
"اچھا! کیا سوچ رہے تھے؟"
"یہی، جو صورت حال اس وقت ہے ہم دونوں کی۔" دانش ہنستے ہوئے بولا۔
"ایک پولیس والے کے منہ سے ایسی رومانی باتیں سن کر عجیب لگ رہا ہے۔" دیبا نے بھی ہنستے ہوئے کہا۔
"پولیس والے کے پاس بھی تو دل ہوتا ہے نا مادام، ہر وقت مرڈر کیس اور لاشوں کے ساتھ رہ رہ کر دل بھر گیا ہے میرا۔"
اس سے پہلے کہ دیبا اس کی بات کا کوئی جواب دیتی دانش کا موبائل بجنے لگا۔ اس نے نمبر دیکھ کر کال پک کرلی۔
"ہیلو انسپکٹر دانش بول رہا ہوں...... اچھا...... ٹھیک ہے، میں پہنچتا ہوں ابھی۔" اس نے دوسری طرف سے بات سن کر جواب دیا۔
"کس کا فون تھا؟" دیبا نے پوچھا۔
"پولیس اسٹیشن سے تھا، چلو، ہمیں جلدی پہنچنا ہے۔"
"اس وقت...... کیا کوئی خاص بات ہے؟" دیبا نے حیرانی سے کہا۔
"ہاں جو رپورٹس تم نے منگوائی تھیں وہ آگئی ہیں۔ اب پتا چل جائے گا کہ جو کہانی مسز اکرم شاہ نے ہمیں سنائی ہے اس میں کتنا سچ ہے۔"
انسپکٹر دانش نے کہا اور دونوں اپنی حالت سدھار کر فلیٹ سے باہر آگئے۔

☆☆☆☆☆☆☆

"اسلم بھیا آپ کے لیے اتنی شراب نوشی ٹھیک نہیں ہے۔" عاطف اور انوشہ اس وقت اسلم کے کمرے میں بیٹھے تھے۔
"میں تو کب سے اسلم کو یہی سمجھا رہی ہوں۔ آج ڈاکٹر بھی یہی کہہ گئے ہیں کہ زیادہ شراب کا استعمال اسلم کی زندگی کے لیے خطرہ ہے۔" انوشہ نے اپنے لہجے میں ہمدردی کا پورا تاثر دینے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔
"ارے چھوڑو۔ تم دونوں ایسے ہی پریشان ہو رہے ہو، مجھے کچھ نہیں ہونے والا۔" اسلم نے مسکراتے ہوئے انہیں تسلی دی۔
"اسلم بھیا، پہلے ہی انکل کی جدائی کا غم برداشت کرنا کتنا مشکل ہے اوپر سے آپ کی یہ بے پرواہی، مجھے تو بہت تشویش ہو رہی ہے۔" عاطف نے بھی

اپنے لہجے میں درد سمویا۔
"ارے یار تم پریشان کیوں ہو رہے ہو، اچھا چلو آج سے شراب بند۔"
"ہاں بس آپ شراب سے جتنا دور رہیں گے اتنا ہی آپ کے حق میں بہتر ہے۔" عاطف نے پھر نصیحتاً کہا۔
"ٹھیک ہے یار لیکن مجھ سے یہ بزنس اور یہ سارا جھمیلا نہیں سنبھالا جائے گا۔" اسلم نے تھکی ہوئی آواز میں کہا۔
"آپ فکر نہ کریں میں دیکھتا ہوں بزنس کا معاملہ آپ صرف اپنا خیال رکھیں۔" عاطف فکرمند لہجے میں بولا۔
اور پھر وہ اٹھ کر اسلم کے کمرے سے باہر آ گیا۔ انوشہ بھی اس کے پیچھے باہر آ گئی۔
"خیال رکھنا کہیں سچ مچ ہی شراب پینا بند نہ کردے۔" عاطف نے انوشہ کو سمجھایا۔
"تم فکر نہ کرو میرے ہوتے ہوئے ایسا کچھ نہیں ہوگا میں زبان سے منع کرتی ہوں اور ہاتھ سے پلا دیتی ہوں۔" انوشہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔
"ویری گڈ بس اسی طرح اسے نشے میں دھت رکھو یہ شرابی تو ویسے ہی مر جائے گا یا پھر جب اسے ہوش آئے گا تو کنگال ہو چکا ہوگا۔"
"اسلم کی فکر چھوڑو اور رینا کے بارے میں سوچو کہ اس کا کیا کرنا ہے۔" انوشہ نے کہا۔
"ڈونٹ وری اس کا بندوبست بھی سوچ رکھا ہے میں نے، ابھی تو بھاگ گئی ہے۔ لیکن واپس آنے دو تو پھر۔" عاطف نے اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا اور انوشہ سے بولا۔ "اب تم اس کے پاس جاؤ کہیں اسے ہم پر شک نہ ہو جائے۔ میں آفس جا کر دیکھتا ہوں کہ بزنس کے کیا حالات ہیں۔"
عاطف، انوشہ کو سمجھا کر وہاں سے چلا گیا اور انوشہ دوبارہ اسلم کو شراب کے نشے میں ڈبونے اس کے کمرے میں چلی گئی۔

☆☆☆☆☆☆☆

"ڈیم اٹ، یہ کیس تو الجھتا ہی جا رہا ہے۔ اب تو مجھے شک ہونے لگا ہے کہ اکرم شاہ سچ مچ قدرتی موت ہی مرا ہے۔" دانش نے ہاتھ میں پکڑی فائل کو زور سے میز پر پٹختے ہوئے کہا۔
"کیا ہوا، رپورٹس میں کیا لکھا ہے؟" دیبا نے پوچھا۔
تمہارا اندازہ غلط ثابت ہوا۔ انہیلر پر صرف اکرم شاہ کی انگلیوں کے نشان ہیں اور اس رات رینا نے بھی نیند کی گولیاں کھائی ہوئی تھیں۔" دانش نے سگریٹ نکال کر سلگائی۔
"اوہ...... تو اس کا مطلب ہے کہ جو ہم سوچ رہے تھے ویسا نہیں ہے۔"
"ہاں تم نے جو سوچا تھا اس کے بالکل الٹ ہے۔ مجھے تو رینا کے بلڈ ٹیسٹ کا خیال ہی نہیں آیا تھا، لیکن جب تم نے بتایا کہ تم نے اس کا بلڈ ٹیسٹ لیا ہے تو مجھے لگا کہ شاید اب ہمیں کوئی سراغ مل جائے گا، لیکن یہ رپورٹس تو بالکل الٹ بتا رہی ہیں۔" دانش کا لہجہ کافی الجھا ہوا تھا۔
"تو اب؟ ہم کوئی ایک چھوٹا سا ثبوت بھی نہیں ڈھونڈ پائے اب تک، جس سے کسی پر شک ہو۔ اگر یہ مرڈر ہے تو پھر پلاننگ کرنے والے کو داد دینی پڑے گی اور اگر یہ قدرتی موت ہے تو۔" دیبا نے بات ادھوری چھوڑ دی۔
"میرا دل نہیں مان رہا کہ اکرم شاہ کی موت قدرتی ہے۔" دانش نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔
"لیکن کوئی سراغ بھی تو نہیں ہے جس سے کچھ پتا لگے کہ آخر ہوا کیا تھا اس رات؟" دیبا نے کہا اور اتنے میں اس کا موبائل بج اٹھا۔ "ہیلو انسپکٹر دیبا

اسپیکنگ......کیا؟ یہ بات پکی ہے؟" دیبا نے کال سن کر حیرت سے پوچھا......"اوکے ٹھیک ہے۔ میں تمہیں کچھ دیر میں بتاتی ہوں کہ کیا کرنا ہے۔" یہ کہہ کر دیبا نے فون بند کر دیا۔

"کیا ہوا؟ کس کا فون تھا؟" دانش نے فون بند ہوتے ہی پوچھا۔

"جس کو میں نے رینا پر نظر رکھنے کو کہا تھا۔ اس کی کال تھی' رینا لاہور جا رہی ہے۔" دیبا نے جواب دیا۔

"اوہ......وہ اچانک لاہور کیوں جا رہی ہے؟" دانش نے پرسوچ لہجے میں کہا۔ "اس سے کہو کہ ایک اور آدمی کو اپنے ساتھ رکھ لے اور رینا کے پیچھے لاہور جائے اور دھیان رکھے کہ اسے شک نہ ہو' شاید ہمیں کوئی سراغ مل ہی جائے۔" دانش نے دیبا سے کہا۔

دیبا نے دانش کی بات سن کر دوبارہ اس آدمی کو فون کیا اور جیسا دانش نے کہا تھا ویسا کرنے کو کہا۔ دانش اور دیبا دونوں کسی گہری سوچ میں ڈوب گئے۔ دونوں کے چہروں پر سوچ کے گہرے بادل چھائے ہوئے تھے۔ شاید دونوں ہی اس شطرنج کی بساط پر چلی جانے والی چالوں کو سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے۔

☆☆☆☆☆☆☆

رینا نے لاہور والے بنگلے پر پہنچ کر کچھ دیر آرام کیا اور پھر گھومنے باہر چلی گئی۔ اتنے دن پولیس کی تفتیش نے اسے تھکا دیا تھا۔ وہ رات بھر گھومتی رہی اور پھر اس نے ایک ریسٹورنٹ میں کھانا کھایا اور واپس بنگلے پر آ گئی۔

وہ کافی تھک چکی تھی اس نے اپنی پسندیدہ نائٹی پہنی اور کچن میں آ کر نیند کی گولیاں کھانے کے لیے فرج میں سے پانی کی بوتل نکالی۔ اچانک اسے محسوس ہوا کہ ڈرائنگ روم میں کوئی چل رہا ہے۔ وہ پانی کی بوتل وہیں رکھ کر باہر آئی لیکن ڈرائنگ روم میں کوئی نہیں تھا۔ وہ اسے اپنا وہم سمجھ کر دوبارہ کچن میں چلی گئی۔ اس نے گلاس میں پانی ڈالا تب ایک بار پھر اسے ڈرائنگ روم میں کسی کے چلنے کی آہٹ صاف محسوس ہوئی۔ وہ ایک بار پھر ڈرائنگ روم میں آئی لیکن اسے وہاں کوئی نظر نہیں آیا۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا مگر وہاں پر کوئی نہ تھا۔ اس نے آہٹ کو ایک بار پھر اپنا وہم سمجھا لیکن جیسے ہی وہ کچن میں جانے کے لیے مڑنے لگی اسے ڈرائنگ روم کے ایک کونے میں سایہ سا نظر آیا۔

"کک......کون ہے' کون ہے وہاں؟" رینا نے پوچھا تو اسے وہ سایہ حرکت کرتا ہوا نظر آیا۔

"میں پوچھتی ہوں کون ہے وہاں' سامنے آؤ۔ ورنہ گارڈ کو بلاتی ہوں۔" اس نے سائے کو ڈراتے ہوئے کہا۔ اور پھر ڈرائنگ روم کے پردے کے پیچھے سے ایک شخص اسے باہر نکلتا ہوا نظر آیا۔

"تم! اور یہاں......" رینا کی آواز میں خوف' پریشانی اور حیرانی تھی۔

"ہاں میں۔ کیوں مجھے دیکھ کر حیرت ہوئی کیا؟" اس شخص نے کرخت لہجے میں کہا۔

"تم پاگل تو نہیں ہو گئے۔ تم جانتے ہو باہر پولیس کا پہرہ ہے اور پھر بھی تم یہاں آ گئے۔" رینا کے لہجے میں پریشانی تھی۔

"ڈونٹ وری بے بی انہیں کیا پتا کہ اس بنگلے میں ایک خفیہ راستہ بھی ہے اندر آنے کا۔" اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"اوہ......عاطف۔" یہ کہتے ہی رینا اس کے گلے لگ گئی۔

آنے والا کوئی اور نہیں عاطف شاہ تھا۔

"تم جانتے ہو کہ اتنے دن کتنی مشکل میں گزارے ہیں میں نے' پچھلے ایک سال سے میں یہ ڈرامہ کر رہی ہوں اور بڈھے کی موت اتنا بڑا مسئلہ بن جائے گی میں نے سوچا بھی نہیں تھا۔" رینا اس کے گلے سے لگی بول رہی تھی۔

"جان' یہ تو ہونا ہی تھا۔ اکرم شاہ کوئی چھوٹا موٹا آدمی نہیں تھا اور ویسے بھی سب کچھ تو ہمارے پلان کے مطابق ہو رہا ہے پھر تم ڈر کیوں رہی ہو؟" عاطف اسے اپنی بانہوں میں لیے بیڈ روم میں آ گیا۔

"تمہیں کیا پتا کہ حقیقی زندگی میں اداکاری کرنا کتنا مشکل ہے۔ اور وہ بھی مسلسل ایک سال سے اکرم کے سامنے۔ شہباز کے سامنے اور اب اسلم کے سامنے' کہ میں تمہیں کتنا ناپسند کرتی ہوں اور میرا دل کر رہا ہوتا ہے کہ میں تمہاری بانہوں میں پناہ لے لوں۔" رینا نے تھکے تھکے لہجے میں کہا۔

"ہر چیز کی کوئی نہ کوئی قیمت چکانی پڑتی ہے سوئٹی' اگر مال چاہیے تو پھر یہ اداکاری تو کرنی ہی ہو گی کتنا انتظار کیا ہے میں نے اس سب کا' پورے دو سال سے منصوبہ بندی کر رہا ہوں اور میں ذرا بھی غلطی نہیں کرنا چاہتا۔ اور نہ ہی ہمیں کوئی چھوٹی غلطی ہمیں بچنے کا موقع دے گی۔ اگر پکڑے گئے تو سیدھا پھانسی کا پھندا۔" عاطف اور رینا اب بیڈ پر پہنچ چکے تھے۔

"مجھے اب تک ایک بات کی سمجھ نہیں آئی کہ آخر وہ بڈھا بالکنی سے نیچے کیسے گرا' میں نے تم سے کہا بھی تھا کہ اس رات نیند کی گولی مت لینا تاکہ سب کچھ تمہاری آنکھوں کے سامنے ہو۔ اگر وہ بچ جاتا تو پھر؟" عاطف نے تنبیہی لہجے میں پوچھا۔

"اگر میں گولی نہ لیتی تو اس وقت ہم دونوں جیل میں ہوتے یا پھر میں تو ضرور جیل میں ہوتی۔ انسپکٹر دیبا نے اس رات میرا بلڈ ٹیسٹ لیا تھا۔ اور یہ اچھا ہی ہوا ہمارے حق میں کہ اس رات میں نے نیند کی گولی کھا لی تھی اور اس کے بچنے کا چانس نہیں تھا میں پچھلے ایک سال سے اس کے ساتھ ہوں ایک ایک چیز پر نظر رکھے ہوئے ہوں بڈھے کو جب استھما کا اٹیک آتا تھا تو پانچ منٹ سے زیادہ برداشت نہیں کر پاتا تھا۔ کئی بار میں نے جان بوجھ کر تاخیر سے انہیلر اسے دیا تھا۔ صرف ٹائم نوٹ کرنے کے لیے کہ وہ کتنی دیر تک انہیلر کے بغیر سانس لے سکتا ہے۔" رینا نے اس بات کی وضاحت بھرپور وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

"لیکن اگر وہ شہباز کے کمرے کی گھنٹی بجا دیتا تو پھر بھی ہم پکڑے جا سکتے تھے۔ اسے شک تو ہو جاتا کہ وہاں خالی انہیلر کس نے رکھا؟"

"نہیں وہ کمرے کے باہر تک پہنچ گیا' یہ بھی کمال ہے' ورنہ اس کی جو حالت ہو جاتی تھی' اسے تو اپنے آپ کو سنبھالنا بھی مشکل ہو جاتا تھا۔ اسی وجہ سے تو وہ بالکنی سے نیچے جا گرا تھا۔ اور ویسے بھی اتنا رسک تو لینا ہی تھا۔" رینا نے خود کو عاطف کی بانہوں میں سمٹاتے ہوئے کہا۔

"جیسا ہم نے پلان کیا تھا' اب تو سب کچھ ویسا ہی ہو رہا ہے۔ انوشہ' اسلم کو پھنسا چکی ہے اپنے جال میں' پولیس سراغ کی تلاش میں اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مار رہی ہے اور سب کے سامنے تمہارا میرے ساتھ جو سلوک ہے اس کو دیکھ کر کوئی سوچ بھی نہیں سکتا کہ یہ ہمارا پلان کیا ہوا ہے۔" عاطف نے رینا کی بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔

"لیکن مجھے انوشہ اور شہباز سے خطرہ ہے' ان دونوں کو کہیں نہ کہیں جا کر شک ضرور ہو جائے گا' رہی پولیس تو' وہ سر پٹخ پٹخ کر ایک دن اس کیس کو بند ہی کر دے گی۔" رینا بولی۔

"ہا......ہا......انوشہ۔ اس بے چاری کو تو یہ بھی پتا نہیں ہے کہ وہ اپنی موت کا بندوبست خود ہی کر رہی ہے۔" عاطف نے ہنستے ہوئے کہا۔

"وہ کیسے؟" ریبا نے حیرت سے پوچھا۔

"وہ ایسے کہ۔" اور پھر عاطف، ریبا کو آگے کی منصوبہ بندی سمجھانے لگا۔

"واہ، یہ تو ٹھیک ہے لیکن وہ شہباز؟ کبھی کبھی مجھے اس سے بہت ڈر لگنے لگتا ہے۔ عجیب سی نظروں سے دیکھتا ہے جیسے میرے اندر کچھ کھوج رہا ہو۔"

"اس کی فکر نہ کرو تمہیں یہی سمجھانے کے لیے تو میں آیا ہوں۔ اب تمہیں آہستہ آہستہ شہباز کو اپنے جال میں پھنسانا ہے۔ اسے یقین دلا دو کہ اب تم اس سے زیادہ کسی پر بھروسہ نہیں کرتیں۔ وہ بیچارہ کب تک تمہاری اس بھری جوانی سے آنکھ چرا پائے گا۔ بس ایک بار اس کے چوکنے کی دیر ہے پھر وہ تمہارے ہاتھ کا کھلونا، اس سے زیادہ کچھ نہیں۔" عاطف نے ریبا پر ایک اور ذمہ داری ڈالتے ہوئے کہا۔

"اوہ، تمہاری سوچ کہاں تک پہنچی ہوتی ہے۔ اس کا اندازہ مجھے آج تک نہیں ہوا، ہر مشکل کا توڑ تم نے پہلے سے سوچ رکھا ہوتا ہے۔" ریبا نے پیار سے عاطف کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"جان من بس تھوڑا سا انتظار اور پھر سوملین کے ساتھ ساتھ باقی جتنی پراپرٹی بچی ہے وہ بھی ہمارے ہاتھ میں ہوگی اور ہم اس ملک سے دور کہیں بھی اپنی باقی زندگی عیش و آرام سے گزاریں گے۔" یہ کہہ کر عاطف نے ریبا کو اور کس لیا۔

شطرنج کا چھوٹا سا پیادہ اب وزیر بننے جا رہا تھا۔

☆☆☆☆☆☆☆

"کیا ہوا؟ لاہور سے کوئی خبر آئی کیا۔" انسپکٹر دانش نے اپنے آفس میں گھستے ہی دیبا سے پوچھا۔

"نہیں، ابھی تک تو وہاں سے سب اوکے کی رپورٹ آ رہی ہے ریبا وہاں پر گھوم پھر رہی ہے یا پھر بنگلے پر آرام کرتی رہتی ہے۔" دیبا نے جواب دیا۔

"ہوں...... سمجھ نہیں آ رہا کہ اتنا کچھ ہو گیا اور ہم ابھی تک اندھیرے میں تیر چلا رہے ہیں۔" دانش نے عادت کے مطابق ایک سگریٹ نکال کر سلگائی۔

"میری بھی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔ ہر گزرتے دن کے ساتھ مجھے ایسا لگ رہا ہے جیسے اس کیس کو ہمیں جلد ہی داخل دفتر کرنا پڑے گا۔" دیبا کی آواز میں مایوسی تھی۔

"اگر یہی حالات رہے تو پھر واقعی اسے داخل دفتر کرنا ہی پڑے گا۔" دانش نے بھی اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔

"لیکن میں اپنے دل کا کروں جو یہ نہیں مان رہا کہ یہ سب کچھ ایک حادثہ تھا اور کچھ نہیں۔" دانش نے سر کو جھٹکتے ہوئے کہا۔

"دل تو میرا ابھی نہیں مان رہا۔ لیکن شک کے لیے کوئی کڑی بھی تو ہونی چاہیے نا۔" دیبا بولی۔

اس سے پہلے کہ دانش کوئی جواب دیتا دیبا کا موبائل بجنے لگا۔

"یس، دیبا بول رہی ہوں...... کیا تم نے خود اسے دیکھا ہے۔" دوسری طرف کی بات سن کر دیبا کے چہرے کے تاثرات بدل رہے تھے۔ "او کے، ٹھیک ہے، مجھے گاڑی کا نمبر بتاؤ۔" پھر وہ دوسری طرف سے بتایا جانے والا نمبر ایک کاغذ پر لکھنے لگی اور فون بند کر کے کرسی سے ٹیک لگا لی۔

"کیا ہوا...... کس کی گاڑی کا نمبر نوٹ کر رہی ہو تم؟" دانش نے پوچھا۔

"ہمارا آدمی جو عاطف کے گھر کے باہر پہرہ دے رہا تھا اس کا فون تھا۔ اس نے بتایا کہ اس نے صبح سویرے عاطف کی گاڑی کو گھر کے اندر آتے دیکھا۔ وہ کل سے گھر سے غائب تھا۔" دیبا نے بتایا۔

"اوہ، سمجھ گیا تم ایسا کرو یہ نمبر مجھے دو۔ میں لاہور

تک جانے والے جتنے ٹول ناکے ہیں ان سب کو یہ نمبر بھیجتا ہوں کہ یہ گاڑی کسی ناکے سے گزری یا نہیں۔" دانش کی آواز میں نیا جوش تھا۔ پھر وہ دیبا سے نمبر لے کر اپنے آفس سے باہر نکل گیا اور دیبا وہیں بیٹھی رہی۔ اس کے چہرے پر سوچ کی شکنیں پھیل رہی تھیں۔

☆☆☆☆☆☆☆

"شہباز، تم جانتے بھی ہو کہ تم کس کے بارے میں بول رہے ہو؟" اسلم کی آواز میں غصہ تھا۔

"اسلم صاحب، میں تو آپ کو صرف اپنے شک سے آگاہ کر رہا ہوں۔" شہباز نے جواب دیا۔ وہ دونوں اس وقت اسلم کے کمرے میں تھے۔

"انوشہ پر شک کرنے کا مطلب ہے کہ تم میری محبت پر شک کر رہے ہو۔" اسلم ابھی بھی غصے میں تھا۔

"اسلم صاحب، آپ جانتے ہیں کہ شراب آپ کے لیے کتنی نقصان دہ ہے اور اتنے دنوں میں مجھے یہ لگا کہ انوشہ میڈم آپ سے شراب چھڑانے کی بجائے آپ کو مزید شراب پینے پر اکساتی ہے۔"

"شہباز تم ایسا سوچ بھی کیسے سکتے ہو؟ انوشہ مجھے ہر وقت شراب چھوڑنے کا کہتی ہے، یہ میری ہی کمزوری ہے کہ میں شراب سے دور نہیں ہو پا رہا ہوں۔"

"لیکن اسلم صاحب۔" شہباز نے کچھ کہنا چاہا لیکن اسلم نے اس کی بات کاٹ دی۔

"شہباز تم بچپن سے اس گھر میں ہو اور پاپا تم پر بہت بھروسہ کرتے تھے، میں بھی کرتا ہوں لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ تم اب میری زندگی میں دخل دینا شروع کر دو۔" اسلم نے سرخ آنکھوں سے شہباز کو گھورا۔

"آپ کا خیال رکھنا میرا فرض ہے اسلم صاحب۔"

"لیکن اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ تم میری ہونے والی بیوی پر ایسا گھٹیا الزام لگاؤ۔" اسلم نے جیسے بات وہیں پہ ختم کر دی۔

شہباز یہ سن کر اسلم کے کمرے سے باہر آ گیا۔ اس کے ماتھے پر بل پڑے ہوئے تھے، صاف لگ رہا تھا کہ وہ اسلم کی باتوں سے متفق نہیں تھا۔

☆☆☆☆☆☆☆

"دانش، تمہیں کیا لگتا ہے۔ عاطف اور ریبا میں کوئی تعلق ہے؟" دونوں اس وقت آفس میں بیٹھے تھے۔

"ہاں، ہو بھی سکتا ہے۔ سوملین کی انشورنس اور پھر پراپرٹی، بھلے ہی آدھی بینک کے پاس ہے، لیکن باقی جو پراپرٹی ہے وہ بھی کچھ کم نہیں ہے۔ یہ سب مل کر اتنا پیسہ بن جاتا ہے کہ جس کو بھی ملا اس کی باقی زندگی عیش سے گزرے گی۔" دانش نے جواب دیا۔

"لیکن ان سب میں شہباز کا کردار بھی مجھے کچھ کم نہیں لگ رہا، یہ وہ واحد شخص ہے جو اس کیس میں سب سے زیادہ مشکوک ہے۔"

"ہاں، وہ کوئی پہنچی ہوئی چیز ہے، لیکن ابھی تک اس نے ایسا کچھ کیا نہیں کہ ہمیں کوئی سراغ ملے، تم نے جو آدمی اس کے پیچھے لگائے تھے، وہ نظر رکھے ہوئے ہیں نا اس پر؟" دانش نے پوچھا۔

"ہاں وہ لگاتار اس پر نظر رکھے ہوئے ہیں۔"

اسی دوران دانش کا موبائل بجا۔ "ہیلو۔ ہاں بولو، اچھا ٹھیک ہے میں فوٹو بھیج رہا ہوں تم سب ناکوں پر دکھا کر مجھے رپورٹ دو۔"

دانش نے جیسے ہی فون بند کیا دیبا نے پوچھا۔

"کوئی خاص خبر؟"

"ہاں کل ہم نے گاڑی کا نمبر بھیجا تھا نا۔ عاطف کی گاڑی لاہور جانے والے ہرنا کے پر دیکھی گئی ہے۔" دانش نے جواب دیا۔

"اوہ، اس کا مطلب ہے ہمارا شک صحیح نکلا۔" دیبا نے جوش سے کہا۔

"ابھی کچھ کہنا مشکل ہے۔ میں عاطف کی فوٹو بھیج رہا ہوں میں اس پر ہاتھ ڈالنے سے پہلے تمام ثبوت اکٹھا کرنا چاہتا ہوں اگر ہم نے اس پر کچا ہاتھ ڈالا تو وہ پھر ہاتھ سے نکل جائے گا۔" دانش نے گمبھیر لہجے میں کہا۔

"اگر وہ سچ میں عاطف ہی ہے تو یہ اس کیس میں ہماری پہلی بڑی کامیابی ہوسکتی ہے۔"

"ہاں، لیکن ضروری تو نہیں کہ وہ لاہور میں رینا سے ملنے ہی گیا ہو، جب تک ہمارے پاس کوئی ثبوت نہ ہو ہم کچھ نہیں کرسکتے، ہمیں کوئی جلد بازی نہیں کرنی، سب کو اپنی اپنی چال چلنے دو کوئی نہ کوئی تو غلطی کرے گا ہی۔"

☆☆☆☆☆☆☆

"انوشہ، تم کچھ ہی دنوں میں میرے اتنے قریب آگئی ہو کہ تمہارے بغیر اب زندگی گزارنا مشکل لگ رہا ہے۔" اسلم نے انوشہ کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔

"اسلم مجھے خود بھی پتا نہیں تھا کہ تم میری زندگی میں اتنے اہم ہوجاؤ گے کہ تمہارے سوا مجھے کچھ اور نظر ہی نہیں آئے گا۔" انوشہ نے اپنی آواز کو پیار سے بھرتے ہوئے کہا۔

"انوشہ، کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ ہم ہمیشہ کے لیے ایک ہوجائیں۔ اسلم نے التجائیہ لہجے میں کہا۔

"کیا مطلب، میں سمجھی نہیں؟" انوشہ نے انجان بنتے ہوئے کہا۔

"میرا مطلب ہے کہ کیوں نہ ہم شادی کرلیں۔"

"اسلم۔" انوشہ صرف اس کا نام ہی لے سکی۔ جیسے خوشی کے مارے اس سے کچھ بولا نہ جارہا ہو۔

"آئی ریئلی لو یو انوشہ اب میں تمہارے بنا جینے کا تصور بھی نہیں کرسکتا۔" اب کی بار اسلم نے انوشہ کو اپنی بانہوں میں بھرلیا۔

"اسلم مجھے سمجھ نہیں آرہا کہ میں تمہیں کیسے بتاؤں کہ میں تمہاری یہ بات سن کر کتنی خوش ہوں۔" انوشہ نے کہا۔

"اور میں خوش ہوں کہ تم میرے ساتھ شادی کرنے پر راضی ہو۔"

"مجھے اب زندگی میں اور کچھ نہیں چاہیے۔ اب موت بھی آجائے تو غم نہیں ہوگا۔" انوشہ نے اپنی آنکھوں میں آنسو لاتے ہوئے کہا۔

"ایسی باتیں مت کرو ابھی تو تمہیں میرے ساتھ لمبی پیار بھری زندگی گزارنا ہے۔" اسلم نے انوشہ کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ دیا جیسے اسے بدشگونی کہنے سے روک رہا ہو۔

"لیکن تمہیں بھی وعدہ کرنا ہوگا کہ تم شراب چھوڑ دو گے۔" انوشہ نے سائیڈ ٹیبل پر رکھی شراب کی بوتل اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا۔

"آج تو خوشی کا دن ہے آج تو پینے دو۔" اسلم نے اس کے ہاتھ سے شراب کی بوتل لے لی۔

"اچھا ٹھیک ہے بس آج۔" انوشہ نے شیطانی مسکراہٹ سے کہا۔

اور اسلم نے شراب کی بوتل کو منہ سے لگا لیا۔ شراب کی بوتل جیسے جیسے ختم ہورہی تھی شاید اس کی زندگی کے پل بھی ویسے ویسے کم ہورہے تھے۔

☆☆☆☆☆☆☆

"اگر یہ بات کسی کے سامنے آئی تو اچھا نہیں ہوگا۔" شہباز اس وقت فون پر کسی سے بات کررہا تھا۔ "دیکھو پیسے کی فکر نہ کرو، پہلے تمہیں جتنا ملتا تھا اب اس سے دوگنا ملے گا، لیکن اگر یہ بات پولیس یا کسی اور کے ہاتھ لگی تو تمہاری لاش بھی کسی کو نہیں ملے گی۔" شہباز کا لہجہ برف کی طرح سرد تھا۔ "مجھے پتا ہے کہ کام مشکل ہے لیکن تمہارے لیے نہیں اسی لیے تو میں تمہیں تمہاری منہ مانگی رقم دے رہا ہوں۔" شہباز

نے دوسری طرف والے کی بات سن کر کہا۔

"ٹھیک ہے۔ تم جانتے ہو کہ میں نے تم پر کتنا بھروسہ کیا ہے اور اگر تم سے ذرا سی بھی چوک ہوگئی تو سب کچھ برباد ہوجائے گا، تم فکر نہ کرو ایک بار کام ہوجائے، تمہیں تمہاری سوچ سے بھی زیادہ پیسہ ملے گا۔" شہباز بولا "اور سنو۔ آئندہ مجھے اس نمبر پر فون مت کرنا اب میں خود ہی تم سے رابطہ کروں گا۔" شہباز نے یہ کہتے ہوئے فون بند کردیا۔

فون بند کرنے کے بعد شہباز نے سیٹ میں سے سم نکال کر توڑ دی۔ وہ زیر لب مسکرا رہا تھا۔ "ایک بار کام ہوجائے۔ پھر تمہیں پیسے تو کیا کسی چیز کی بھی ضرورت نہیں رہے گی۔"

☆☆☆☆☆☆☆

"میں سمجھ نہیں پارہا ہوں کہ جب بھی ہم کسی ثبوت کے قریب پہنچتے ہیں تو سب کچھ الٹا کیسے ہو جاتا ہے۔" دیبا غصے سے بول رہی تھی۔

"ارے باپ رے اتنا غصہ۔" دانش نے ہنستے ہوئے کہا۔

"غصہ نہ کروں تو اور کیا کروں، اب دوبارہ ہمیں زیرو سے اسٹارٹ لینا پڑے گا۔ کتنی عجیب بات ہے کہ جب گاڑی عاطف کی تھی تو اس کی گاڑی میں بیٹھا ہوا شخص کوئی دوسرا کیسے ہوسکتا ہے۔" دیبا کا غصہ ابھی بھی کم نہیں ہوا تھا۔

"کچھ بھی ہوسکتا ہے، ہوسکتا ہے وہ حلیہ بدل کر لاہور گیا ہو، ہوسکتا ہے اس کا کوئی دوست گاڑی لے کر گیا ہو، سب کچھ ممکن ہے۔"

"لیکن مجھے اب اس کیس کی فکر ہونے لگی ہے۔ اگر یہی حال رہا تو ہم کچھ بھی نہیں کرپائیں گے۔"

"سوئیٹ ہارٹ ایسے کیس میں صبر سب سے ضروری ہوتا ہے، ہمیں صبر سے کام لینا ہے، مجرم چاہے کتنا بھی چالاک کیوں نہ ہو، کہیں نہ کہیں تو غلطی کرے گا ہی اور جب وہ غلطی کرے گا تب ہی ہم کچھ کرسکتے ہیں۔" دانش مسکرا کر بولا۔

"میری ملازمت کے دوران یہ ایسا پہلا کیس ملا ہے مجھے جو اتنا الجھا ہوا ہے۔" دیبا نے کہا۔

"ابھی تم نئی آئی ہو وقت کے ساتھ ساتھ ایسے کئی اور کیسز تمہارے سامنے آئیں گے جو اس سے بھی زیادہ الجھے ہوئے ہوں گے آج کل کے مجرم بہت سیانے ہوگئے ہیں سب کچھ باقاعدہ منصوبہ بندی کے ساتھ کرتے ہیں۔ انہیں پکڑنا اتنا آسان نہیں ہوتا۔

"لیکن اب ہم کریں گے کیا؟" دیبا نے جیسے ہار مان لی۔

"کچھ بھی نہیں بس سب پر نظر رکھیں گے خاص طور سے عاطف اور رینا پر، پہلے مجھے شہباز پر شک تھا لیکن شاید وہ اتنا ضروری کردار نہیں ہے اس کیس میں جتنے کہ یہ دونوں ہیں۔" دانش نے پھر ایک سگریٹ سلگائی۔

"یعنی کہ فی الحال ہمارے پاس کرنے کو کچھ نہیں ہے۔" دیبا بولی۔

"کیوں نہیں ہے۔ تب تک ہم پیار کرسکتے ہیں۔" دانش کے لہجے میں شرارت تھی۔

"ڈیوٹی کے وقت پیار محبت کی باتیں۔" دیبا نے جواب دیا۔

"چلو کوئی بات نہیں۔ ڈیوٹی کے بعد تو پیار اور باتیں دونوں ہی ہوسکتی ہیں نا۔" دانش نے پوچھا۔ "ویسے آج رات تم کیا کررہی ہو؟"

"کچھ خاص نہیں کیوں؟" دیبا بولی۔

"تو کیا خیال ہے ڈنر پر چلیں اس طرح تمہارا دھیان بھی بٹ جائے گا۔" دانش نے مشورہ دیتے ہوئے کہا۔

"اوکے ٹھیک ہے۔" دیبا نے اپنی رضامندی ظاہر کرتے ہوئے کہا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

"اسلم نے مجھے پروپوز کر دیا ہے۔" انوشہ نے فون پر عاطف کو بتایا۔

"ویری گڈ" مطلب ہمارا پلان کامیاب ہو رہا ہے۔"

"ہاں' اسلم پوری طرح سے میرے جال میں پھنس چکا ہے۔"

"بس تم اسی طرح اسے اپنے جال میں پھنسا کے رکھو اور ساتھ ساتھ اس کی شراب بھی۔"

"اس کی تم فکر مت کرو اسے تو اب میرے شباب اور شراب کے علاوہ باقی کسی چیز کا ہوش ہی نہیں ہے۔" انوشہ اٹھلاتے ہوئے بولی۔

"بس جانو اب کچھ ہی دنوں کی بات ہے پھر یہ سب کچھ ہمارے ہاتھ میں ہوگا۔" عاطف پیار جتاتے ہوئے بولا۔

"مجھ سے اب اور انتظار نہیں ہو رہا ہے عاطف' قسم سے نقلی پیار کی ایکٹنگ کرنا بہت مشکل ہے۔" انوشہ نے تھکے تھکے لہجے میں کہا۔

"کچھ دن اور' کچھ پانے کے لیے کچھ کھونا ہی پڑتا ہے' پیسہ اور پراپرٹی ہاتھ میں آتے ہی تم کسی شہزادی کی طرح زندگی گزارو گی۔" عاطف نے اس کا لالچ اور بڑھاتے ہوئے کہا۔

"اکیلی شہزادی بن کر میں کیا کروں گی۔ مجھے تو تم جیسے شہزادے کا ساتھ بھی چاہئے نا۔"

"میں تو ہمیشہ سے تمہارے ساتھ ہوں جان۔" عاطف نے پھر سے پیار جتایا "اچھا اب تم کوشش کرو کہ مجھ سے رابطہ کم ہی رکھو۔ اسلم کو بھی شک ہو سکتا ہے اور پولیس کو بھی۔" عاطف نے اسے ہوشیار رہنے کی صلاح دی۔

"اوکے' ویسے مجھے تو سب سے زیادہ خطرہ شہباز سے ہے' میں تمہیں بتا ہی چکی ہوں پہلے بھی۔" انوشہ نے کہا۔

"اس کی فکر نہ کرو۔ وہ کچھ نہیں کر سکتا۔ اسلم تم پر پورا پورا بھروسہ کرنے لگا ہے۔ شہباز اگر اس سے کچھ کہے گا بھی تو وہ اس کا یقین نہیں کرے گا۔" عاطف نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"اوکے میں فون بند کرتی ہوں شاید اسلم مجھے بلا رہا ہے۔" یہ کہہ کر انوشہ نے فون بند کر دیا ہے۔

"ابھی تو بہت سے لوگوں نے تم پر شک کرنا ہے میری جان۔" عاطف نے فون کو دیکھتے ہوئے کہا جیسے وہ انوشہ کو دیکھ کر کہہ رہا ہو۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

"لگتا ہے پردہ گرانے کا وقت آ گیا ہے۔" عاطف نے رینا سے کہا۔

وہ دونوں ایک ریسٹورنٹ میں ایک دوسرے کی طرف پیٹھ کیے بیٹھے تھے۔ عاطف نے اس وقت ٹوپی پہن رکھی تھی تاکہ کوئی اسے پہچان نہ سکے اور ایک کان میں ہیڈ فون لگا رکھا تھا جیسے وہ کسی سے فون پر باتیں کر رہا ہے۔

"وہ کیسے' میں سمجھ نہیں پائی؟" رینا بولی۔ وہ دونوں سرگوشیانہ انداز میں بات کر رہے تھے۔

"اسلم نے انوشہ کو پروپوز کر دیا ہے۔"

"تو پھر؟ ان کی شادی تک تو ہمیں کچھ نہیں کرنا تھا نا۔" رینا نے کہا۔

"نہیں اگر ان کی شادی ہو گئی تو جب انوشہ کو ہمارے بارے میں پتا چلے گا تو ہمارے ہاتھ کچھ نہیں آئے گا' ان کی شادی سے پہلے ہی پردہ گرانا ہے۔" عاطف اپنے پلان کے مطابق بولا۔

"لیکن کیسے' تم نے کچھ سوچ رکھا ہے کیا؟"

"میں دو سال سے اور کیا کر رہا ہوں؟ ایک ایک نقطے کی پلاننگ کر رکھی ہے میں نے، تمہیں کیا لگتا ہے کہ پولیس کو اگر اب تک کوئی سراغ نہیں ملا ہے تو اس کی یہی وجہ ہے کہ میں نے اس پلان کے ایک ایک نقطے پر سر کھپایا ہے تب ہی تو اب تک ہم بچے ہوئے ہیں۔" عاطف نے اپنی ذہانت کے بارے بتایا۔

"لیکن تم کرو گے کیا..... اسلم کو جتنا بھروسہ ہے انوشہ پر اتنا آسان نہیں ہوگا اسے انوشہ سے بدگمان کرنا۔" رینا ابھی تک الجھن میں تھی۔

"یہ کام شہباز کرے گا' اسے پتا بھی نہیں چلے گا اور وہ ہمارا کام بھی کر دے گا' اسلم کو میں نے کہا تھا کہ انوشہ میری دوست رہ چکی ہے لیکن جب اسے یہ پتا چلے گا کہ وہ میری گرل فرینڈ رہ چکی ہے اور میرے اس کے ساتھ ناجائز تعلقات بھی تھے تو وہ یہ بات بھی برداشت نہیں کر پائے گا اور ایک طرف انوشہ کا پتا صاف ہو جائے گا اور دوسری طرف وہ اور زیادہ شراب پینا شروع کر دے گا اسے کہتے ہیں ایک تیر سے دو شکار۔" عاطف مسکراتے ہوئے بولا۔

"لیکن پھر پولیس کا کیا ہوگا؟ تم نے اس رات مجھے جو پلان بتایا تھا وہ تو کچھ اور ہی تھا۔" رینا نے الجھے ہوئے لہجے میں کہا۔

"پہلے حصے میں شہباز آئے گا۔ دوسرے حصے میں پولیس آئے گی' تم بس شہباز کو سنبھالو باقی سب میں دیکھ لوں گا۔"

"ٹھیک ہے۔ شہباز کو میں سنبھال لوں گی۔ تم فکر نہ کرو۔" رینا نے اسے یقین دلایا۔

"تو پھر او کے ہے' اب میں چلتا ہوں' زیادہ دیر یہاں بیٹھنا خطرے سے خالی نہیں ہے میں خود تم سے رابطہ کروں گا۔" عاطف یہ کہہ کر تیز تیز قدموں سے ریسٹورنٹ سے باہر نکل گیا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

"نہیں' یہ نہیں ہو سکتا۔" اسلم نے غصے میں آ کر میز پر رکھی ہر چیز کو ہاتھ مار کے نیچے پھینک دیا۔

"اسلم صاحب۔" شہباز کچھ بولنا چاہتا تھا لیکن پھر رک گیا۔

"تمہیں یہ ساری ویڈیوز کہاں سے ملیں۔" اسلم نے پوچھا۔

"اسلم صاحب' یہ ویڈیوز مجھے آج ہی کوریئر کے ذریعے ملی ہیں۔" شہباز نے جواب دیا۔

"میرے ساتھ اتنا بڑا دھوکہ..... انوشہ نے آخر میرے ساتھ ایسا کیوں کیا۔" اسلم سر پکڑ کر کرسی پر بیٹھ گیا۔

"پیسے کے لیے..... پہلے وہ عاطف کے چکر میں تھی پھر اسے لگا کہ آپ کے پاس تو اس سے زیادہ پیسہ ہے تو وہ اسے چھوڑ کر آپ کے پاس آ گئی۔" شہباز نے کہا۔

"کیا محبت بھی پیسے کے لیے ہی کی جاتی ہے؟"

"آج کل تو لوگ پیسے کے لیے کچھ بھی کرنے کو تیار ہو جاتے ہیں اور مجھے تو شک ہے کہ عاطف نے ہی انوشہ کو۔" شہباز بولتے بولتے رک گیا۔

"تم ایسا سوچ بھی کیسے سکتے ہو۔ وہ مجھے اپنا بھائی کہتا ہے۔ مانا کہ وہ میرے چاچا کا بیٹا ہے لیکن خون تو ایک ہی ہے نا ہم میں۔" اسلم نے شہباز کی بات ان سنی کر دی۔

"لیکن صاحب' ہونے کو تو....."

"نہیں شہباز' میں عاطف پر ایسا گندا الزام لگانے کے تصور بھی نہیں کر سکتا اور رہی انوشہ تو اسے شاید پیسے کی ہوس نے اندھا کر دیا ہے لیکن اب میری آنکھیں کھل چکی ہیں۔" اسلم نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

"تم نے میرے ساتھ ایسا کیوں کیا؟ اگر تمہیں

پیسہ چاہیے تھا تو مجھ سے کہتیں' پیسے میں دے دیتا لیکن پیار کا جھوٹا ناٹک..... اتنا گھناؤنا کھیل تم نے میرے ساتھ کیوں کھیلا؟" اسلم کی آواز میں غصہ بھی تھا اور دکھ بھی۔

"میں تمہیں بتانا چاہتی تھی لیکن ہمت نہیں کر پا رہی تھی' میری عاطف سے دوستی تھی لیکن۔"

"دوستی..... ہونہہ..... دوستی میں کیا ایسے تعلقات ہوتے ہیں اور اگر ایسا تھا بھی تو تم نے مجھے بتایا کیوں نہیں؟ تم نے مجھ سے جھوٹ بولا..... اس کا مطلب ہے کہ تمہارے دل میں کھوٹ تھا۔" اسلم نے انوشہ کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"میں مانتی ہوں کہ میرے عاطف کے ساتھ تعلقات تھے۔ لیکن تم سے ملنے کے بعد میری سوچ بدل گئی۔" انوشہ نے اپنی آنکھوں میں آنسو لاتے ہوئے کہا۔

انوشہ کے لیے یہ خبر کسی دھماکے سے کم نہیں تھی کہ اسلم کو سب پتا چل چکا ہے۔

"جھوٹ..... پھر جھوٹ..... سوچ نہیں..... یہ کہو کہ تمہاری نیت بدل گئی تھی۔ کل تک تم عاطف کا بستر گرم کر رہی تھیں اور جب پتا چلا کہ زیادہ پیسہ مجھے ملنے والا ہے تو تم اسے چھوڑ کر میرے پاس آ گئیں۔ تم پیسے کے لیے اتنا گر سکتی ہو۔ مجھے اندازہ نہیں تھا۔" اسلم کے لہجے میں نفرت ہی نفرت بھری ہوئی تھی۔

"پلیز اسلم' میری بات کا یقین کرو' میں جھوٹ نہیں بول رہی۔" انوشہ نے اسلم کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔

"یقین کی دھجیاں اڑا کر کہہ رہی ہو کہ تمہارا یقین کروں' کبھی نہیں' بہتر ہے کہ تم مجھ سے دور چلی جاؤ۔ ورنہ پتا نہیں میں غصے میں کیا کر بیٹھوں تمہارے ساتھ۔" اسلم نے انوشہ کا ہاتھ جھٹک دیا۔

"اسلم میری بات تو سنو۔" انوشہ نے روتے ہوئے کہا۔

"دور ہو جاؤ میری نظروں سے اور دوبارہ کبھی مجھے اپنی شکل مت دکھانا ورنہ تمہارے حق میں اچھا نہیں ہوگا۔" اسلم کا لہجہ زہر اگل رہا تھا اور انداز سے لگتا تھا کہ وہ اندر سے کتنا ٹوٹ پھوٹ چکا ہے۔

انوشہ کمرے سے باہر نکل گئی اور شاید اسلم کی زندگی سے بھی۔ اس کے جاتے ہی اسلم نے شراب کی بوتل اٹھا کر منہ سے لگالی۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

مری کے ایک چھوٹے سے ریسٹورنٹ میں اس وقت عاطف اور رینا بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔

"میں نے تو سوچا بھی نہیں تھا کہ انوشہ کا پتا اتنی آسانی سے صاف ہو جائے گا۔" رینا کہہ رہی تھی۔

"وہ تو صرف میرا ایک مہرہ تھی اس کا کام ختم ہو گیا تو بساط سے ہٹا دیا اسے۔" عاطف مسکراتے ہوئے بولا۔

"کہیں میرے ساتھ بھی ایسا تو نہیں کرو گے؟" رینا کے لہجے میں بے یقینی نمایاں تھی۔

"کیا بات کرتی ہو جانو تم تو میری جان ہو اور یہ سب کچھ میں اپنے اور تمہارے لیے ہی تو کر رہا ہوں۔" عاطف نے رینا کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"لیکن پولیس کے بارے میں کچھ سوچا ہے۔ وہ ہمارا پیچھا تو ضرور کر رہے ہوں گے۔" رینا نے کہا۔

"اسی لیے تو میں نے پہلے تمہیں لاہور جانے کو کہا' تمہاری گاڑی ہرنا کے سے گزر کر لاہور گئی ہے اور وہاں سے تم اپنی دوست کے گھر گاڑی کھڑی کر کے یہاں آئی ہو اب پولیس سمجھ رہی ہوگی کہ تم لاہور میں ہی ہو اور میں تو اپنے کسی کام سے مری آیا ہوں تو ان کی نظر میں ہم ایک ساتھ نہیں ہیں اور ویسے بھی بساط کے دوسرے حصے میں انوشہ کو پولیس کے ہاتھ پھنسانا

ہے اس کے بعد سب کچھ ہمارے ہاتھ میں ہوگا۔"
عاطف نے رینا کو سمجھایا۔

"اور وہ شہباز...... اس کا کیا ہوگا؟"

"وہ تو ایک بہت ہی معمولی سا مہرہ ہے جسے میں جب چاہوں گا بساط سے باہر کردوں گا۔"

"ویسے تم نے مجھے مری کیوں بلوایا ہے؟" رینا نے پوچھا۔

"اپنی جیت کا جشن منانے کے لئے۔ ہم اپنی جیت سے بس ایک قدم دور ہیں اس کے بعد یہ ساری جائیداد اور انشورنس کی رقم ہمارے ہاتھ میں ہوگی۔ اسلم تو انوشہ کے غم میں دن رات شراب پی رہا ہے۔ اب تو وہ زندہ رہے یا مر جائے ایک ہی بات ہے۔" عاطف کے لہجے میں بلا کی بے حسی تھی۔

"چلو اٹھو اب چلتے ہیں۔ شام ہو رہی ہے اور آج ہم جیت کا جشن منائیں گے۔" عاطف نے کہا اور وہ دونوں ریسٹورنٹ سے باہر آ گئے۔ وہاں سے ٹیکسی لے کر وہ ایک چھوٹے سے ہوٹل پہنچے جہاں انہوں نے ایک کمرہ پہلے ہی سے بک کروا رکھا تھا۔

"عاطف۔ مجھے تو یقین ہی نہیں ہو رہا ہے کہ ہمارا پلان اتنی آسانی سے کامیاب ہو رہا ہے۔"

"میری جان اپنی دو سال کی محنت کو ایسے کیسے ضائع جانے دیتا میں۔" عاطف نے کمرے کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔

جیسے ہی وہ دونوں کمرے میں داخل ہوئے' عاطف نے کمرے کی لائٹ جلا دی۔ اور سامنے بیڈ پر بیٹھے شخص کو دیکھ کر دونوں جیسے پتھر کے بت بن کر رہ گئے۔ انہوں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ وہ انہیں اپنے کمرے میں بیٹھا ملے گا۔

"تم اور یہاں۔" عاطف کے لہجے میں ہڑبڑاہٹ اور حیرت تھی۔

"میں جانتا ہوں کہ مری کا یہ ہوٹل کافی چھوٹا ہے اور اسے ڈھونڈنے میں بھی مجھے کافی دقت ہوئی۔ لیکن اسے ڈھونڈنا اتنا بھی مشکل نہیں تھا۔ جتنا تم سوچ رہے تھے۔"

بیڈ پر بیٹھا ہوا شخص کوئی اور نہیں۔ انسپکٹر دانش سومرو تھا۔

"تم یہاں کیا کر رہے ہو؟" عاطف نے حیرت سے پوچھا۔

"بس ایسے ہی تم لوگوں کا حال چال پوچھنے آ گیا تھا' اپنی چاچی کا بہت اچھی طرح سے خیال رکھ رہے ہو تم' پلان تو بہت ہی اچھا تھا۔ پہلے چاچا کو مارو اور اس کی موت کو قدرتی موت ثابت کردو' پھر اپنی گرل فرینڈ کو اسلم کی محبوبہ بنا کر اسے شراب پلا پلا کر مار دو اور پھر ساری جائیداد کے خود مالک بن جاؤ' تمہاری ذہانت کی داد دینی پڑے گی۔" دانش نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"تو تم یہاں اتنی دور صرف میری ذہانت کی داد دینے آئے ہو؟"

"نہیں' میں تو بس یہ کہنے آیا ہوں کہ میں تو تمہاری ذہانت پر فدا ہو گیا ہوں۔" دانش نے اس بار ہنستے ہوئے کہا۔

"اور تمہارے بغیر یہ سب ناممکن تھا۔" عاطف نے بھی ہنستے ہوئے کہا اور دانش کے گلے لگ گیا۔

"یار مان گئے جب تم نے پہلی بار مجھے اپنا پلان سنایا تھا تو مجھے لگا یہ مشکل ہے۔ لیکن آج تم نے ثابت کر دیا کہ تمہارا دماغ دس شیطانوں کے برابر کام کرتا ہے۔" دانش نے داد دیتے ہوئے کہا۔

"مگر یہ سب کچھ بھی نہ کر پاتا اگر مجھے تمہاری مدد حاصل نہ ہوتی جب تم نے مجھے یقین دلایا کہ اس کیس کو سلجھانے تم ہی آؤ گے تب ہی میں نے یہ پلان شروع کیا۔"

"ہا...... ہا...... میرے علاوہ اور کون آ سکتا تھا۔ اکرم شاہ بے چارے کو تو پتا ہی نہیں تھا کہ وہ اپنی موت کے لیے خود ہی پیسے دے رہا ہے۔ تمہارے بھیجے ہوئے پیسوں سے ہی میں نے رشوت دے کر یہ کیس اپنے نام کروایا ہے۔" دانش نے شیطانی ہنسی ہنستے ہوئے کہا۔

"اور اب تک سب یہی سمجھ رہے ہیں کہ تم جی جان سے اس کیس کی گتھیاں سلجھانے میں مصروف ہو' جبکہ کوئی یہ نہیں جانتا کہ تم اصل میں اکرم شاہ کی موت کو قدرتی موت منوانے کے لیے اس کیس میں آئے ہو۔"

"لیکن وہ انسپکٹر دیبا...... وہ کہاں سے آ گئی اس کیس میں؟" رینا نے پہلی بار اپنی زبان کھولی۔

"ظاہری سی بات ہے۔ پولیس ڈپارٹمنٹ نے کسی نہ کسی کو میرا اسسٹنٹ بنا کر بھیجنا ہی تھا اور یہ ہماری خوش نصیبی ہے کہ انہوں نے ایک لڑکی کو بھیج دیا اور اسے اپنے جال میں پھنسانا میرے لیے کافی آسان تھا اب اسے لگتا ہے کہ میں اس کی محبت میں ڈوب چکا ہوں اور وہ بیچاری میری انگلیوں کے اشاروں پر ناچ رہی ہے جو میں کہتا ہوں وہی کرتی ہے۔" دانش نے وجہ بتاتے ہوئے کہا۔

"لیکن وہ ڈی این اے رپورٹس اور میرا بلڈ ٹیسٹ' وہ سب اس کے حوالے کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ کہیں ہم پکڑے جاتے تو؟"

"جب میں نے پہلی بار اکرم شاہ کی لاش دیکھی تھی تو میں تب ہی اسے پہچان گیا تھا۔ تم لوگوں نے شاید غور نہیں کیا اکرم شاہ کی گردن کے نیچے زخم کا نشان تھا اور میں جب پہلی بار لاش دیکھنے وہاں گیا تو میں تسلی کر چکا تھا کہ وہ اکرم شاہ ہی ہے اور ڈی این اے رپورٹس تو بس فائل کا پیٹ بھرنے کے لیے تھیں اور دیبا سے چیک کروانے کا مقصد یہ تھا کہ کسی کو شک بھی نہ ہو۔ کیونکہ پولیس فائل میں سب کچھ اسی کے نام پر ہے اور رہا تمہارا بلڈ ٹیسٹ تو وہ میں نے پہلے ہی تمہیں ہوشیار کر دیا تھا کہ تم نیند کی گولی ضرور کھانا اب کوئی قیامت تک بھی یہ ثابت نہیں کر سکتا کہ اس کی موت میں تمہارا کوئی ہاتھ ہے۔" دانش نے تفصیل سے بات پوری کی۔

"اچھا' تو تم نے رینا کو کہا تھا نیند کی گولی کھانے کے لئے۔" عاطف کی آواز میں حیرت تھی۔

"ہاں۔ مجھے آخری لمحے میں یہ خیال آیا تھا اور تمہیں بتانے کا وقت نہیں تھا اس لیے میں نے ڈائریکٹ رینا کو ہی کہہ دیا تھا' کیوں کہ مجھے پتا تھا کہ کوئی نہ کوئی اسسٹنٹ تو ضرور آئے گا اس کیس میں اور میں نہیں چاہتا تھا کہ کہیں پر ذرا سی بھی کمزوری نظر آئے اس پلان میں۔" دانش نے عاطف کو سمجھایا۔

"ویسے تم نے ہمیں ڈھونڈا کیسے؟" عاطف نے پوچھا۔

"میری نظر تو ہر وقت تم دونوں پر تھی اور جب مجھے پتا لگا کہ تم مری جا رہے ہو اور رینا لاہور تو مجھے یقین تھا کہ تم لوگ ضرور مری میں ملو گے کیونکہ ایک بار پہلے تم دونوں لاہور میں مل چکے ہو عاطف اس خفیہ راستے کے ذریعے بنگلے کے اندر آیا تھا۔" دانش نے معنی خیز انداز میں کہا۔

"اوہ' تم تو ہماری ایک ایک منٹ کی خبر رکھے ہوئے تھے۔"

"کیا کروں' پولیس والا اور کتا بو سونگھتے پہنچ ہی جاتا ہے۔" دانش یہ کہہ کر ہنسنے لگا پھر عاطف سے پوچھا۔ "اب مجھے یہ بتاؤ کہ آگے کا کیا پلان ہے؟ یہاں تک تو سب کچھ' جیسے ہم نے پلان کیا تھا ویسے ہی ہوا ہے۔"

"بس اب اسلم کا پتا صاف کرنا ہے اور میں وعدہ

معاف گواہ بن کر آپ کے یعنی پولیس کے سامنے حاضر ہوجاؤں گا کہ انوشہ نے کیسے میرے معصوم بھائی کو پیسوں کے لالچ میں آکر مار دیا ہے اور پھر اکرم شاہ کیس بھی انوشہ پر ڈالنا تمہارا کام ہے۔“ عاطف نے آگے کا پلان بتایا۔

”بہت خوب‘ تو اب مجھے انوشہ کو پھنسانا ہے ٹھیک ہے میں دیبا ڈارلنگ کو اس لائن پہ لگا دیتا ہوں۔“ دانش نے دیبا کے نام پر زور دیتے ہوئے کہا۔

”بہت بری طرح پھنسایا ہے تم نے اس بیچاری کو۔“ رینا نے ہنستے ہوئے دانش سے کہا۔

”پھنسایا کہاں ہے۔ وہ تو خود ہی پھنستی گئی اور ویسے بھی کوئی نہ کوئی تو چاہیے نا اس کیس کو سلجھانے کے لئے۔ آخر میں دیبا ڈارلنگ کی واہ واہ ہوجائے گی کہ اس نے اتنا بڑا کیس حل کرلیا اور میں بیچارہ چپ چاپ اس کے پیچھے کھڑا ہوجاؤں گا‘ تالیاں بجانے۔“ دانش نے معصوم سی شکل بناتے ہوئے کہا۔

”ارے باپ رے۔ تم اس کے پیچھے بھی لگے ہوئے ہو؟“ عاطف ہنستے ہوئے بولا۔

”ہاں بس‘ جہاں چاہ‘ وہاں راہ۔“ دانش نے عاطف کی بات کا مطلب سمجھتے ہوئے اس کی بات کا مزا لیا۔

”اچھا اب میں چلتا ہوں۔ میں تو بس آگے کا پلان پوچھنے آیا تھا۔ اب تم دونوں مزے کرو اور ہاں کل تک واپس کراچی پہنچ جاؤ۔ کہیں کسی کو شک نہ ہوجائے۔ میں کراچی جاکر انوشہ کے خلاف کیس تیار کرتا ہوں۔“

دانش یہ کہہ کر کمرے سے باہر نکل گیا اور عاطف اور رینا عنقریب ملنے والی خوشی کا جشن منانے لگے۔

☆☆☆☆☆☆☆

”تو تمہارا خیال ہے کہ انوشہ اسلم کی جان لینا چاہتی ہے۔“ دیبا نے گہری آواز میں کہا۔

”ہاں ہو بھی سکتا ہے اور نہیں بھی‘ دیکھو میری معلومات کے مطابق انوشہ عاطف کی گرل فرینڈ رہ چکی ہے پھر اچانک سے وہ اسلم کے اتنے قریب ہوگئی اور اب جیسے تم بتا رہی ہو کہ اسلم نے اسے اپنی زندگی سے باہر کر دیا ہے کہیں نہ کہیں کوئی گڑبڑ تو ہے۔“ دانش پوری طرح تیاری کر کے آیا تھا۔

”لیکن یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ انوشہ کے پیچھے عاطف کا دماغ کام کر رہا ہو۔“ دیبا نے سوچتے ہوئے کہا۔

”بالکل ہوسکتا ہے۔ یہ تو ہمیں انوشہ پر ہاتھ ڈالنے کے بعد پتا لگے گا۔“ دانش نے کہا لیکن وہ دل ہی دل میں دیبا کی بات پر مسکرا رہا تھا۔

”تو تمہارا کیا خیال ہے ہمیں انوشہ کو اریسٹ کرلینا چاہیے؟“ دیبا نے پوچھا۔

”نہیں‘ ابھی نہیں‘ ہم کس بات پر اریسٹ کریں گے اسے؟ بس اسی بات پر کہ ہمیں شک ہے اس پر؟ ابھی تو ثبوت اکٹھے کرنا ہوں گے۔ اور پھر اس کا پورا پلان سمجھنا ہوگا۔“ دانش نے دیبا کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

”اگر واقعی اسلم کو پھنسانا انوشہ کا پلان تھا تو پھر یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس نے ہی اکرم شاہ کو مروایا ہو۔“ دیبا نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

”بالکل ہوسکتا ہے‘ میں بھی اسی لائن پر سوچ رہا ہوں۔“ دانش نے دل ہی دل میں خوش ہوتے ہوئے کہا‘ دیبا نے اس کے دل کی بات کہہ دی تھی۔

”اب تمہیں یہ کرنا ہے کہ انوشہ پر کڑی نظر رکھو وہ کیا کرتی ہے۔ ظاہر ہے وہ آرام سے تو نہیں بیٹھے گی اگر اسلم نے اسے اپنی زندگی سے نکال دیا ہے تو وہ کچھ نہ کچھ تو ضرور کرے گی بدلہ لینے کے لیے اور رہی بات عاطف کی تو اس پر میں نظر رکھتا ہوں کہ وہ کیا کرتا ہے۔“ دانش نے کہا۔

”ہاں اب اس کیس کو سلجھانے کے لیے ہمیں خود میدان میں آنا ہوگا‘ آہستہ آہستہ پردے اٹھنا شروع ہوگئے ہیں۔“ دیبا نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”میں نے کہا تھا نا کہ صبر کرو مجرم کتنا ہی شاطر کیوں نہ ہو کہیں نہ کہیں تو غلطی کرتا ہی ہے۔“ دانش نے بھی مسکراتے ہوئے کہا۔

”ہاں شاید میں جلد بازی سے کام لے رہی تھی۔ اچھا تو میں چلتی ہوں۔ میں نے انوشہ کی نگرانی کے لیے جو آدمی مقرر کیا تھا‘ اب اس کی جگہ میں خود انوشہ کی نگرانی کروں گی۔“ انوشہ نے کرسی سے اٹھتے ہوئے کہا۔

”ایسے ہی جا رہی ہو۔“ دانش نے رومانٹک انداز میں کہا۔

”کام کے وقت نو رومانس‘ پہلے یہ کیس سلجھ جائے پھر جتنا مرضی رومانس جھاڑ لینا۔ دیبا مسکرائی ”اور اب تم بھی اٹھو اور عاطف پر نظر رکھو ہوسکتا ہے اس سارے معاملے کے پیچھے اسی کا ہاتھ ہو۔“ دیبا نے جاتے جاتے کہا۔

”جو آپ کا حکم مائی پرنسس۔“ دانش نے سر جھکاتے ہوئے جواب دیا۔

☆☆☆☆☆☆☆

”اسلم بھیا میں بہت شرمندہ ہوں۔ میں آپ کو سب کچھ بتانا چاہتا تھا لیکن بس سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کیسے بتاؤں میں آپ کا دل نہیں توڑنا چاہتا تھا۔“ عاطف نے اپنی آنکھوں میں آنسو لاتے ہوئے کہا۔

”میں سمجھتا ہوں۔ مجھے تمہاری نیت پر شک نہیں ہے عاطف‘ شاید میں ہی نہیں سمجھ سکا اس فاحشہ کو۔“ اسلم کا لہجہ نفرت انگیز تھا۔

”جب اس نے مجھے چھوڑ کر آپ کا ہاتھ تھاما تو مجھے لگا شاید اسے سچ مچ آپ سے محبت ہوگئی ہے اور اس لیے وہ مجھے چھوڑ کر آپ کے قریب ہوگئی ہے۔“ عاطف متاسف لہجے میں بولا۔

”تمہیں مجھے بتا دینا چاہئے تھا کہ تمہارے اس کے ساتھ کس قسم کے تعلقات رہ چکے ہیں۔“ اسلم نے پہلی بار شکایتاً کہا۔

”یہ میری غلطی ہے اسلم بھیا اور آپ کا دل ٹوٹنے میں‘ میں بھی قصوروار ہوں اس کے لیے میں آپ سے معافی مانگتا ہوں۔“ عاطف نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔

”ارے نہیں یار مجھے تو بس افسوس ہے کہ میں نے اپنی محبت ایک ایسی بازاری لڑکی پر لٹا دی۔“ اسلم نے عاطف کے ہاتھ کھول کر اسے گلے سے لگا لیا......

”چلو آج فارم ہاؤس چلتے ہیں۔ کچھ موڈ ہی تبدیل ہوجائے گا۔“ اسلم نے کہا۔

”ٹھیک ہے اگر آپ کا موڈ ایسے اچھا ہوسکتا ہے تو مجھے کیا اعتراض ہوسکتا ہے۔“ عاطف بولا۔

”اوکے تو پھر تم ایسا کرو کہ گاڑی نکالو میں ذرا اپنی شراب کی بوتل لے کر آتا ہوں۔“ اسلم نے آنکھ مارتے ہوئے کہا۔

”بھیا پھر شراب؟“

”ارے یار چھوڑ دوں گا۔ آج تو ہم نے انجوائے کرنا ہے نا آج تو پینے دو۔“ اسلم یہ کہہ کر اپنے کمرے میں چلا گیا اور عاطف گاڑی نکالنے باہر گیراج میں آیا اور انوشہ کا نمبر ملانے لگا۔

”ہیلو انوشہ‘ تم ایسا کرو فوراً اسلم کے فارم ہاؤس پر پہنچو۔“ عاطف نے کہا۔

”کیوں؟ کیا ہوا؟ تم نے تو منع کیا تھا کہ میں کچھ دن اسلم سے نہ ملوں۔“ انوشہ نے اس کی بات سن کر کہا۔

”دیکھو اسلم میرے ساتھ اپنے فارم ہاؤس جا رہا ہے صرف وہ اور میں ہوں گے۔ اور وہ شراب کے نشے میں دھت ہوگا۔ آج اس کا پتا وہیں صاف کر

دیتے ہیں۔“

”تم پاگل تو نہیں ہوگئے وہاں صرف ہم دو ہی ہوں گے تو کیا اس کی موت پر پولیس کا شک سیدھا ہم دونوں پر نہیں جائے گا۔“

”تم اس کی فکر نہ کرو میں نے سارا پلان سوچ رکھا ہے ہم اسے ایسے ماریں گے جس سے لگے گا کہ وہ قدرتی موت مرا ہے بس تم وہاں پہنچو فوراً۔“ عاطف نے زور دیتے ہوئے کہا۔

”اوکے‘ ٹھیک ہے میں وہاں پہنچ جاؤں گی۔“ انوشہ نے جواب دیا۔

انوشہ کا جواب سن کر عاطف نے مسکراتے ہوئے فون بند کرکے جیب میں رکھ لیا۔

”انوشہ‘ میری جان آج تمہاری اور اسلم کی زندگی کا آخری دن ہے بس تم ایک بار آؤ تو سہی۔“ وہ دل ہی دل میں بڑبڑایا اور پھر اسلم کے باہر آنے کا انتظار کرنے لگا۔

☆☆☆☆☆☆☆

اسلم کا فارم ہاؤس شہر سے کافی دور تھا۔ جہاں لوگوں کا آنا جانا نہ ہونے کے برابر تھا اور اس کے فارم ہاؤس کے پیچھے ایک ندی بھی تھی جس میں پانی کا بہاؤ کافی تیز تھا اور بچپن میں اسلم اور عاطف اکثر وہاں کھیلا کرتے تھے۔

”عاطف‘ یار میں سوچ رہا ہوں واپس لندن چلا جاؤں۔“

اسلم اور عاطف آج بھی ندی کنارے بیٹھے بچپن کو یاد کررہے تھے۔

”بھیا اگر آپ چلے گئے تو بزنس کا کیا ہوگا۔“ عاطف نے کہا۔

”بس یہی سوچ کر تو میں ابھی تک یہاں ٹکا ہوا ہوں‘ ممی کا خیال آتا ہے۔ وہ بھی کہتی ہیں کہ اگر میں چلا گیا تو وہ اکیلی بزنس نہیں سنبھال پائیں گی۔“

”بھیا یہی تو میں بھی کہہ رہا ہوں۔ اس وقت آپ کا یہاں ہونا بہت ضروری ہے۔“

”لیکن عاطف! یہاں میرا دل نہیں لگ رہا اور آج کل تو مجھے ہر چیز سے جیسے نفرت سی ہوگئی ہے۔“

”بھیا ایک لڑکی کی خاطر آپ ہم سب کو چھوڑ کر کیوں جانا چاہتے ہیں۔ ایسی لڑکیاں تو کبھی بھی اعتبار کے لائق نہیں ہوتی ہیں مجھے یقین ہے کہ آپ کے سچے پیار کو سمجھنے والی آپ کو ضرور ملے گی۔“

اس سے پہلے کہ اسلم کوئی جواب دیتا دونوں اپنے پیچھے سے آنے والی آواز پر چونک گئے۔

”میں نے اسلم کو دھوکہ نہیں دیا۔“ آنے والی انوشہ تھی۔

”تم یہاں کیسے آئیں۔“ اس کی آواز سن کر اسلم غصے سے کھڑا ہوگیا لیکن نشے میں دھت ہونے کی وجہ سے ٹھیک طرح سے کھڑا نہیں ہو پایا۔

”اسلم‘ میں تمہیں کتنی بار سمجھا چکی ہوں کہ میں نے تمہیں دھوکہ نہیں دیا۔ آج مجھے پتا چلا کہ تم اور عاطف یہاں آئے ہو تو میں سوچا کہ آج عاطف کے سامنے تمہیں اپنی صفائی دے دوں۔“ انوشہ نے کہا۔

”کیسی صفائی؟ مجھے تمہاری کوئی بات نہیں سننی تم یہاں سے دفع ہوجاؤ میں نے تم سے کہا تھا کہ تم نے آئندہ مجھے اپنی شکل دکھائی تو میں تمہیں قتل کردوں گا۔“ اسلم غصے سے انوشہ کی طرف بڑھا۔

”عاطف تم کچھ بولتے کیوں نہیں ہو۔ تم بتاؤ نا کہ میں بے قصور ہوں۔ میرا تمہارے ساتھ تعلق تھا لیکن اسلم کا ساتھ ملنے کے بعد میں نے تم سے کوئی تعلق نہیں رکھا تھا۔“ اسلم کو اپنی طرف بڑھتا دیکھ کر انوشہ ڈر کر عاطف کے ساتھ آکر کھڑی ہوگئی۔ اب ندی عاطف اور انوشہ کی پشت پر تھی اور اسلم ان کے سامنے کھڑا تھا۔

”انوشہ اور کتنا جھوٹ بولو گی تم اسلم بھیا کا دل اور تو نہ دکھاؤ۔“ عاطف نے افسوس بھرے لہجے میں کہا۔

”عاطف...... یہ تم کہہ رہے ہو؟ تم جانتے ہو کہ میں اسلم سے سچی محبت کرنے لگی ہوں۔“ انوشہ کی آواز میں حیرانی تھی۔

”تم پیسے کے سوا کسی چیز سے محبت نہیں کرسکتیں۔ آؤ اسلم بھیا اندر چلیں اور انوشہ‘ پلیز تم یہاں سے چلی جاؤ۔“

”میں یہاں سے کہیں نہیں جاؤں گی۔“ انوشہ نے دوٹوک جواب دیا۔

”فاحشہ...... بازارو لڑکی...... آج میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔“ اسلم جو ان کی باتیں سن رہا تھا۔ غصے سے انوشہ کی طرف بڑھا اور انوشہ اپنے آپ کو اس سے بچانے کے لیے ایک طرف ہوگئی اور اس سے پہلے کہ کوئی کچھ سمجھتا۔ نشے میں دھت اسلم اپنے آپ کو سنبھال نہیں پایا اور سیدھا ندی میں جا گرا۔

اس اچانک حادثے پر کچھ پل کے لیے عاطف اور انوشہ گنگ کھڑے رہ گئے۔

”یہ کیا ہوگیا...... عاطف وہ پانی میں گر گیا ہے۔ جلدی کرو اسے باہر نکالو۔“ انوشہ نے تقریباً ہسٹیریائی لہجے میں کہا۔

اسلم اب پانی میں کہیں بھی نظر نہیں آرہا تھا۔ پانی کا بہاؤ بہت تیز تھا۔ اور اس کے گرتے ہی پانی اسے اپنے ساتھ بہا کر لے گیا تھا۔

”بچوں والی بات مت کرو۔ ہمارا کام پورا ہوگیا۔ اسے تو ویسے بھی مرنا ہی تھا۔ پانی کی تیزی دیکھ رہی ہو۔ اور نیچے نوکیلے پتھر بھی ہیں۔ کوئی نہ کوئی پتھر اس کا کام تمام کردے گا۔ اور وہ اتنا نشے میں ہے کہ اسے پتا ہی نہیں چلے گا کہ وہ مرچکا ہے۔“ عاطف نے پرسکون لہجے میں کہا۔

”تو اب کیا کریں؟“ انوشہ نے پوچھا۔

”کچھ نہیں آؤ یہاں سے چلیں۔ اب بس پولیس کو اطلاع کرنی ہے کہ وہ اس کی لاش ڈھونڈ سکے۔“ یہ کہتے ہوئے عاطف نے انوشہ کا ہاتھ پکڑ لیا اور وہ دونوں وہاں سے آگے بڑھ گئے۔

☆☆☆☆☆☆☆

”ایکسیلنٹ۔ مطلب سارا کام پلان کے مطابق ہوگیا۔ بلکہ میرا خیال ہے کہ قدرت نے اسلم کو پانی میں گرا کر تمہارا کام آسان کردیا۔“ انسپکٹر دانش اور عاطف اس وقت عاطف کے بنگلے پر موجود تھے۔

”ہاں‘ میرا تو خیال تھا کہ اس کی موت کے لیے کچھ سوچنا پڑے گا لیکن وہ تو خود ہی نشے کی وجہ سے موت کے منہ میں چلا گیا۔“ عاطف نے ہنستے ہوئے کہا۔

”آگے کا کیا پلان ہے اب تو سب کا پتا صاف ہوچکا ہے۔“ دانش مطلب پر آتا ہوا بولا۔

”بس اب انشورنس کے پیسے نکلوانے ہیں بینک سے‘ پراپرٹی کو بیچنے کا انتظام بھی کرچکا ہوں میں۔ اس کے پیسے جیسے ہی ملتے میں پولیس اسٹیشن تمہارے پاس آجاؤں گا وہ سب ویڈیوز لے کر جو میرے پاس ہیں جس میں انوشہ اسلم کو شراب پلا رہی ہے۔ اور پھر میں وعدہ معاف گواہ کے طور پر ساری کہانی تم لوگوں کو سناؤں گا اور تم نے بس یہ ثابت کرنا ہے کہ اسلم کے ساتھ ساتھ اکرم شاہ کو بھی انوشہ نے مارا ہے۔“ عاطف نے تفصیل سے دانش کو سمجھایا۔

”اس کی تم فکر نہ کرو اس کام پر میں نے پہلے ہی دیا کو لگا دیا ہے۔“ دانش نے کہا۔

”پھر تو کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے۔“ رینا نے کہا۔

”ہاں‘ جیسے ہی تم مجھے گرین سگنل دو گے میں اور

رینا فوراً پاکستان چھوڑ کر چلے جائیں گے کبھی واپس نہ آنے کے لئے۔" عاطف بولا۔

"ٹھیک ہے تم کل پولیس اسٹیشن پہنچ جانا اور آنے سے پہلے مجھ سے پوچھ لینا میں نہ ہوں تو تم دیبا کے سامنے یہ سب کہنا تا کہ اسے بھی یقین ہو جائے کہ تم بے قصور ہو۔" دانش نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"اوکے اور وعدے کے مطابق جانے سے پہلے تمہارے حصے کے پانچ کروڑ روپے تمہارے بینک اکاؤنٹ میں ٹرانسفر کر دوں گا۔" عاطف نے مسکراتے ہوئے اسے حوصلہ دیا۔

"میرا خیال ہے ہم اس صدی کی سب سے بڑی ڈکیتی کرنے میں کامیاب ہو چکے ہیں۔" دانش نے ہنستے ہوئے کہا۔

"ڈکیتی تو نہ کہو یار۔ یہ تو شطرنج کی بساط تھی جہاں پر ہر چال دو سال کی محنت سے سوچی گئی تھی۔ ہم نے ایک بازی تو جیتنی ہی تھی۔" عاطف ہنسا اور اس کی ہنسی میں دانش اور رینا کی ہنسی بھی شامل ہو گئی۔

☆☆☆☆☆☆☆

"تم اتنے کمینے انسان ہو گے مجھے اندازہ بھی نہیں تھا۔" انوشہ اس وقت غصے سے لال پیلی ہو رہی تھی۔ جب اسے پتا چلا کہ عاطف اس کے خلاف سارے ثبوت پولیس کو دے آیا ہے اور وعدہ معاف گواہ بھی بن چکا ہے تو وہ اس سے جواب مانگنے اس کے پاس آئی اور وہاں پر رینا کو دیکھ کر اس کا غصہ مزید تیز ہو گیا۔

"ڈارلنگ' یہ صرف بزنس تھا اور بزنس میں نفع نقصان زیادہ ضروری ہوتا ہے بجائے پیار محبت دکھانے کے۔" عاطف مسکرا رہا تھا۔

"یو باسٹرڈ۔ میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گی۔ ادھر مجھے پھنسا دیا اور خود پیسے اور اس معشوقہ کے ساتھ مزے کرو گے۔" انوشہ کا لہجہ تیز تر ہو رہا تھا۔

"ریلیکس مائی لو اب کچھ نہیں ہو سکتا اور پھر تم ساری زندگی جیل میں مجھے یاد کرنا۔" عاطف نے کہا اور اس کی بات پر رینا بھی ہنس پڑی۔

"تمہیں اگر یہ لگتا ہے کہ تم یہ سب کر کے بچ جاؤ گے تو یہ تمہاری بھول ہے عاطف۔"

"اچھا' تم ایسا کیا کرنے لگی ہو جس سے مجھے ڈرنا چاہیے۔" عاطف نے ڈرنے کی ایکٹنگ کرتے ہوئے کہا۔

"یہ تمہیں ابھی پتا چل جائے گا۔"

"اچھا...... میں بھی دیکھنا چاہتا ہوں۔"

یہ سنتے ہی انوشہ نے آواز لگائی۔ "شہباز۔"

"اس کو بلانے کا کیا فائدہ وہ تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتا کھیل ختم ہو چکا ہے اور یہ بازی میں جیت چکا ہوں۔"

عاطف کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی لیکن اگلے ہی پل اس کی ہنسی حیرت میں بدلتی گئی۔

"کھیل ابھی ختم نہیں ہوا عاطف اور تم نے ہار جیت کا فیصلہ بھی کر لیا۔"

انوشہ نے بلایا تو شہباز کو تھا لیکن شہباز کے ساتھ اسلم بھی تھا۔

"تم...... تم ابھی تک زندہ ہو؟" حیرت کے مارے عاطف کے ہوش اڑے جا رہے تھے۔

"پانی میں گرنے میں اور مرنے میں بہت فرق ہوتا ہے عاطف۔ میں نے تمہیں وہ دکھایا جو تم دیکھنا چاہتے تھے۔" اب مسکرانے کی باری اسلم کی تھی۔

"انوشہ تم۔" عاطف نے کچھ کہنا چاہا۔

"تم بالکل صحیح سمجھے انوشہ تمہارے نہیں۔ میرے بنائے ہوئے پلان پر عمل کر رہی تھی اور اس دن فارم ہاؤس پر جو کچھ ہوا وہ بھی ہمارا ہی پلان تھا۔" اسلم نے کہا۔

"نا...... نا' ہلنے کی کوشش مت کرنا۔" اسلم نے عاطف کو اپنی جگہ سے حرکت کرتے ہوئے دیکھ کر کہا۔

"شہباز انہیں باندھ دو لگتا ہے ایک جگہ کھڑا ہونا انہیں پسند نہیں ہے۔" اسلم نے شہباز کو حکم دیا۔

یہ سنتے ہی شہباز نے عاطف اور رینا کو کرسی پر باندھ دیا۔

"شطرنج پر چال تمہاری نہیں' میری پھیلائی ہوئی تھی عاطف۔" اسلم نے ان کے سامنے بیٹھتے ہوئے کہا۔ "تم جانتے تھے کہ ڈاکٹر علوی میرا دوست ہے پھر بھی تم نے اس کے ہسپتال کی رپورٹ پر یقین کر لیا؟ یہ سچ ہے کہ مجھے شراب منع کر دی گئی تھی لیکن میری حالت کبھی بھی ایسی نہیں تھی کہ شراب پینے سے میری موت ہو جائے۔" اسلم ابھی بھی مسکرا رہا تھا۔

"سیڈ...... ویری سیڈ تم نے اتنی اچھی پلاننگ کی اور اتنی اہم بات کو بھول گئے۔ تمہیں ایک بار پھر سے تسلی کر لینی چاہیے تھی اور ویسے بھی جس کیمرے کی ویڈیو میں تم مجھے انوشہ کے ہاتھ سے شراب پیتا دیکھ رہے تھے ان بوتلوں میں صرف کچھ میں ہی شراب تھی باقی سب میں جوس تھا اور اتنا تو تمہیں پتا ہی ہو گا کہ جوس انسانی صحت کے لیے کبھی نقصان دہ نہیں ہوتا۔" اسلم کی بات پر انوشہ اور شہباز دونوں ہنسنے لگے۔

"تو تم میرے ساتھ ڈبل کراس کر رہی تھیں۔" عاطف نے غصے سے انوشہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"سوری ڈارلنگ تم نے خود ہی کہا تھا کہ یہ بزنس ہے۔ مجھے پہلے ہی سے شک تھا کہ تم اور رینا ملے ہوئے ہو اور پھر جب اسلم یہاں آیا تو اس شک کو انسپکٹر دانش نے سچ ثابت کر دیا۔" انوشہ نے قہقہہ لگا کر کہا۔

"کیا...... انسپکٹر دانش؟" عاطف تو جیسے حیرت سے مرنے کو تھا۔

"تمہیں کیا لگتا ہے کہ تم اسے پانچ کروڑ کا لالچ دے کر اپنے ساتھ ملا سکتے ہو تو میں اسے زیادہ پیسوں کی آفر کر کے اپنے ساتھ کیوں نہیں ملا سکتا؟" اسلم نے مزے لیتے ہوئے کہا۔

"صحیح سمجھے تم۔ انوشہ اور انسپکٹر دانش تمہارے نہیں میرے پلان کے مطابق کام کر رہے تھے اور باقی کا پلان تو جیسے تم چلا رہے تھے ہمیں کچھ کرنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ سب کچھ تم کر رہے تھے۔ لیکن اپنے لیے نہیں' ہمارے لئے۔ میں تو بس اس انتظار میں تھا کہ کب تم انشورنس کے پیسے نکلواؤ اور پراپرٹی بیچو تا کہ ہم اس بساط کو لپیٹ دیں۔" اسلم کا ہر لفظ طنز میں لپٹا ہوا تھا۔

"تم ہم پر نظر رکھے ہوئے تھے لیکن تمہاری ہر چال پر ہماری نظر تھی اور جو باتیں تم مجھے نہیں بتاتے تھے وہ انسپکٹر دانش کے ذریعے ہم تک پہنچ جاتی تھیں اور باقی کا سارا پلان تو تمہارا تھا جو تمہیں بتانے کی ضرورت نہیں ہے نا۔" انوشہ نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

"اب تم سمجھے کہ پولیس نے ابھی تک انوشہ کو گرفتار کیوں نہیں کیا؟ ویسے تمہاری معلومات کے لیے بتا دوں کہ تمہارے سارے پلان انوشہ اور انسپکٹر دانش ریکارڈ کر چکے ہیں۔ اب دنیا کی نظر میں نہ تو میں زندہ ہوں اور نہ ہی اکرم شاہ اور تم دونوں کے مرنے کے بعد پولیس یہ کیس بنائے گی کہ آخر میں پیسے کے لالچ میں تم دونوں نے ایک دوسرے کو مار دیا اور یہ سارا پیسہ اب ہمارے ہاتھ آئے گا جو کہ ایک راز ہی رہے گا کہ سب مر گئے تو پیسہ کہاں گیا؟" اسلم کی ہنسی نہیں رک رہی تھی۔

"شہباز' میرا خیال ہے ان دونوں کو اب جہنم کی سیر کرانے کا وقت آ گیا ہے۔"

اسلم نے کہا اور اس کے کہتے ہی شہباز نے سائلنسر لگے پستول کی گولیاں عاطف اور رینا کے سینے میں اتار دیں اور موت سے پہلے ان دونوں کی آنکھیں خوف اور حیرت سے پھیلتی چلی گئیں۔

"چلو اب ہمیں یہ ملک چھوڑنا...... شہباز تم نے چارٹرڈ پلین کا انتظام کرلیا ہے نا۔" اسلم نے شہباز سے پوچھا۔

"بالکل ہوگیا ہے۔ لیکن ہمیں نہیں۔ صرف ہم دونوں کو یہاں سے جانا ہے۔" شہباز کے چہرے پر معنی خیز مسکراہٹ پھیل گئی۔

"ہم دونوں...... کیا مطلب؟...... کیا بک رہے ہو تم؟" اسلم نے غصے سے کہا۔

"مطلب صرف مجھے اور انوشہ میڈم کو۔" یہ کہتے ہوئے شہباز نے اسلم کا سینہ بھی اسی پستول سے چھلنی کردیا اور اسلم کچھ سمجھنے سے پہلے ہی عاطف اور رینا کے پیچھے روانہ ہوچکا تھا۔

☆☆☆☆☆☆☆

اکرم شاہ کیس جو پچھلے دو مہینے سے پولیس ڈپارٹمنٹ کے لیے ایک پیچیدہ مسئلہ بنا ہوا تھا آخر کار آج سلجھ گیا۔ تفتیشی افسر انسپکٹر دانش سومرو اور اس کی اسسٹنٹ انسپکٹر دیبا نے سنسنی خیز انداز میں میڈیا کو بتایا کہ اکرم شاہ اور ان کے بیٹے اسلم شاہ کی موت کے پیچھے کوئی اور نہیں بلکہ ان کا بھتیجا عاطف شاہ اور ان کی بیوی رینا شاہ ہی تھے۔ جنہوں نے دولت کے لالچ میں ان کو قتل کردیا۔ پولیس کے ہاتھ لگے ثبوتوں کے مطابق عاطف شاہ اس سارے پلان کا ماسٹر مائنڈ تھا۔ لیکن جب تک پولیس ان دونوں کو گرفتار کرتی پولیس کو ان دونوں کی لاشیں اکرم شاہ کے بنگلے پر ملیں اور انسپکٹر دانش سومرو کے مطابق انہوں نے پیسے کے لالچ میں آکر ایک دوسرے کو بھی قتل کردیا۔ پولیس کا دعویٰ ہے کہ رینا شاہ کو لگنے والی گولیاں عاطف شاہ کے ذاتی پستول سے چلائی گئی تھی اور عاطف شاہ کو لگنے والی گولیاں رینا شاہ کے پستول سے چلائی گئی ہیں۔ ان دونوں پستولوں کا ریکارڈ پولیس کے پاس محفوظ ہے اور رپورٹس سے تصدیق کی گئی ہے کہ وہ دونوں پستول مرنے والوں کے ہی تھے۔ اس کیس کے دو اور مرکزی کردار انوشہ اور شہباز کو پولیس نے تفتیش کے بعد ثبوت نہ ہونے کی وجہ سے چھوڑ دیا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ پولیس اب اس کھوج میں ہے کہ انشورنس اور جائیداد کی فروخت سے ملنے والی رقم کو کہاں رکھا گیا ہے اور انسپکٹر دانش کے مطابق پولیس جلد ہی اس کا کھوج لگانے میں بھی کامیاب ہوجائے گی۔"

☆☆☆☆☆☆☆

ہر نیوز چینل اس کیس کی سنسنی خیزی کو خلاصے کے ساتھ بڑھا چڑھا کر پیش کررہا تھا۔ اور یہاں سے ہزاروں میل دور سوئٹزرلینڈ کے ایک فلیٹ میں شہباز اور انوشہ اپنی جیت کا جشن منا رہے تھے۔

"شہباز تم نے اسلم کو کیوں ماردیا۔ یہ تو ہمارے پلان میں نہیں تھا؟" انوشہ شہباز سے پوچھ رہی تھی اور اس سے پہلے کہ شہباز کوئی جواب دیتا فلیٹ کا دروازہ کھلا اور آنے والے شخص کو دیکھ کر دونوں کھڑے ہوگئے۔

"اکرم ڈارلنگ۔"

فلیٹ کے اندر آنے والا شخص اکرم شاہ تھا۔

"ہیلو مائی بے بی، کیسی ہو تم؟" اکرم نے انوشہ کو اپنی بانہوں میں بھرلیا۔

"تمہارے سامنے ہوں۔" انوشہ مسکرا کر اس کے سینے سے لگ گئی۔

"آخری بار جب ہم ملے تھے تب تو تم اتنی خوبصورت نہیں تھیں۔ شاید پیسے ملنے کی خوشی نے

تمہیں اور زیادہ خوبصورت بنادیا ہے۔" اکرم نے ہنستے ہوئے کہا۔

"اسلم کی لاش کو ٹھکانے لگا دیا تھا۔" اب کی بار اکرم نے شہباز سے پوچھا۔

"جی اکرم صاحب۔ ہم آنے سے پہلے اس کا بندوبست کرکے آئے تھے۔" شہباز نے جواب دیا۔

"لیکن اکرم وہ پیسہ...... شہباز نے مجھے کوئی صحیح جواب نہیں دیا اس کا۔ اور وہ پیسہ تو اس نے کسی کے حوالے کردیا۔" انوشہ بولی۔

"ہاں جان میں نے ہی شہباز سے کہا تھا۔ اتنی بڑی رقم ڈائریکٹ کسی بھی طریقے سے لانا ممکن نہیں تھی۔ اس لیے میں نے سوئٹزرلینڈ کو چنا ہے اس کام کے لیے یہاں کے کئی بینکار میرے دوست ہیں جو سارا پیسہ منی لانڈرنگ کے ذریعے یہاں تک پہنچائیں گے اصل مسئلہ تو پیسے کو پاکستان سے نکالنا تھا اور یہ کام نہ تو شہباز کرسکتا تھا اور میں تو ویسے بھی دنیا کی نظر میں مرچکا ہوں۔ تو اس لیے وہاں سے مختلف بینکس کے ذریعے رقم یہاں بھیجی گئی اور یہ سب یہاں پر جو میرے دوست ہیں انہوں نے کیا اور اب وہ پیسہ مختلف بینکوں میں گردش کرتا ہوا تھوڑا تھوڑا کرکے یہاں میرے اکاؤنٹ میں پہنچ جائے گا۔ پھر وہ ساری دولت ہماری ہوگی اور کوئی بھی ثابت نہیں کرسکے گا کہ وہ پیسہ کہاں سے اور کیسے آیا۔" اکرم شاہ نے تفصیل سے انوشہ کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

"لیکن اکرم یہاں بھی تو ہمارے ناموں سے ہم پہچانے جاسکتے ہیں نا۔" انوشہ دور کی کوڑی لاتی ہوئی بولی۔

"پہلی بات تو یہ کہ کچھ دنوں کے بعد یہ کیس خود بخود ٹھنڈا پڑ جائے گا اور پاکستان سے اتنی دور کسے اور کیا پڑی ہے کہ وہ اکرم شاہ کے کیس میں دلچسپی لے۔ نہ ہی یہاں کسی کو اس سے کوئی سروکار ہے اور ویسے بھی

اکرم شاہ تو اس رات ہی مر گیا تھا۔ اب میں دنیا کی نظر میں ساجد علی صدیقی ہوں۔ اور جہاں تک شکل کا تعلق ہے تو دنیا میں ایک ہی چہرے کے کئی لوگ پائے جاتے ہیں۔ اور اتنا رسک تو لینا ہی تھا ہمیں۔" اکرم شاہ نے اعتراض کا جواب دیتے ہوئے کہا۔

"ایک اور بات مجھے بہت الجھا رہی ہے جب شہباز نے اسلم کو مارا تو میں حیران رہ گئی تم نے یہ تو مجھے کبھی نہیں بتایا تھا کہ اسلم کو مارنا بھی ہمارے پلان میں تھا وہ تو تمہارا بیٹا تھا نا اس کو کیوں مار دیا؟" انوشہ کے لہجے میں حیرت بھری ہوئی تھی۔

"نہیں۔ وہ میرا بیٹا نہیں تھا۔ وہ میری پہلی بیوی کی عیاشی کی نشانی تھا جو اس نے شادی سے پہلے کی تھی۔ میرا باپ بہت دریا دل انسان تھا لیکن شاید اپنی اولاد کے لیے اس کے دل میں کوئی پیار نہیں تھا۔ میری بیوی' میرے باپ کے جگری دوست کی بیٹی تھی۔ جب کہ اس کا ایک دوست اس کی جوانی کا فائدہ اٹھا کر بھاگ چکا تھا۔ میرے باپ نے اپنے دوست کی محبت میں آ کر میرے ساتھ اس کی شادی کروا دی اور مجھے شادی کے دو مہینے بعد پتا چلا کہ وہ پہلے سے ہی حاملہ ہے۔ اس کا عاشق اپنی نشانی اس کے پیٹ میں چھوڑ کر بھاگا تھا۔ تب میں اپنے باپ سے بہت لڑا تھا لیکن میں کچھ نہیں کر سکا تھا کیونکہ ساری جائیداد اور سارا بزنس میرے باپ کے ہاتھ میں تھا' میں خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا۔ لیکن وہ تھا تو میرا باپ ہی جب وہ مرا تو اس کی وصیت کے مطابق میرے حصے کی جائیداد اس نے میرے اور میری بیوی کے درمیان اس طرح تقسیم کی اگر میں اپنی بیوی کو چھوڑ دوں تو ساری جائیداد میری بیوی کے نام ہو جاتی۔ مجھے نہ چاہتے ہوئے بھی اپنی بیوی اور اس کے بیٹے کو برداشت کرنا پڑا۔ لیکن میں ان دونوں سے سخت نفرت کرتا تھا۔ اتنی نفرت کہ اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ میری کوئی اولاد نہیں ہے۔ پھر قدرت کو شاید مجھ پر رحم آ گیا اور کینسر جیسے موذی مرض نے بیوی سے میری جان چھڑا دی۔ تب سے میں اسلم سے جان چھڑانے کا راستہ ڈھونڈنے لگا اور پھر میں نے اسے ایم بی اے کے بہانے لندن بھیج دیا تاکہ یکسوئی کے ساتھ کوئی منصوبہ بندی کر سکوں۔ جس کے ذریعے میں اس کی پراپرٹی بھی اپنے نام کر لوں لیکن میرے بھائی نے میرے لیے ایک مصیبت کھڑی کر دی اس کی ایک غلط ڈیل نے ہمارے بزنس کی کمر توڑ کر رکھ دی اور آدھی سے زیادہ جائیداد بینک کے پاس گروی ہو گئی۔ خود تو مر گیا لیکن میرے لیے اپنا کتا چھوڑ گیا جو ہر مہینے میرا خون چوسنے پہنچ جاتا تھا۔ لیکن مجھے اندازہ نہیں تھا کہ وہ کتا نہیں بلکہ سانپ چھوڑ گیا ہے اپنے پیچھے۔ جو مجھے ہی ڈسنے کا پلان بنا کر بیٹھا تھا۔ تمہیں یاد ہے وہ پارٹی جس میں ہم ملے تھے؟" اکرم نے ساری تفصیل بتانے کے بعد انوشہ سے پوچھا۔ جس نے اس سوال پر ہاں میں سر ہلا دیا۔

"اسی پارٹی میں میری ملاقات رینا سے ہوئی تھی تب میں نہیں جانتا تھا کہ وہ سب عاطف کی ایک چال ہے' رینا مجھے پہلی بار اس پارٹی میں ملی اور پھر اکثر ایسا ہوتا کہ جس پارٹی میں جاتا وہاں پر وہ ضرور ملتی' میں بھی اس میں دلچسپی لینے لگا۔ جب ایک دن اچانک مجھے کسی کام سے امریکہ جانا پڑا تو میں رینا کو اپنے جانے کے بارے میں بتا کر ایئرپورٹ چلا گیا تب راستے میں ہی مجھے کسی ضروری کام سے اپنا پروگرام تبدیل کر کے ایک اور ضروری کام نمٹانے کے لیے لاہور جانا پڑا میں نے اگلے دو دن لاہور میں ہی گزارے وہاں پہلی بار میں نے رینا اور عاطف کو

ایک ساتھ دیکھا تو مجھے شک ہوا کہ یہ دونوں ایک ساتھ کیا کر رہے ہیں میں نے شہباز کو ان کے پیچھے لگا دیا اور پھر مجھے یہ اطلاع ملی کہ اصل میں وہ دونوں ملے ہوئے ہیں لیکن مجھے ان کے پلان کے بارے میں کچھ پتا نہیں تھا کہ وہ کیا کرنے والے ہیں۔ تب میں نے تمہیں عاطف کے پاس بھیجا اور ہماری خوش قسمتی تھی کہ عاطف بھی کسی ساتھی کو قربانی کا بکرا بنانے کے لیے ڈھونڈ رہا تھا اور اس نے تمہیں اپنے ساتھ ملا لیا۔ پھر تمہارے ہی ذریعے مجھے پتا چلا کہ وہ مجھے مارنا چاہتا ہے۔ تب بھی میری کوشش تھی کہ وہ تم سے شادی کر لے لیکن وہ میری سوچ سے زیادہ چالاک نکلا وہ کسی طرح بھی پھنسنا نہیں چاہتا تھا اس لیے تم سے شادی کی بات کو ٹال جایا کرتا تھا۔ اسی بیچ شہباز یہ معلوم کرنے میں کامیاب ہو گیا کہ وہ انسپکٹر دانش کے ذریعے اپنا پلان پورا کرنا چاہتا ہے۔ تب میں نے انسپکٹر دانش کو اپنے ساتھ ملا لیا اور اس کے ذریعے مجھے عاطف کی ہر چال کا پہلے سے پتا چلنے لگا۔ پھر ہم نے اپنا الگ بساط بچھائی جس میں میں نے اسلم کو بھی شامل کر لیا اور اسلم کی شراب کی رپورٹس ڈاکٹر علوی کے ذریعے ہسپتال کے ریکارڈ میں جمع کروا دیں۔ ادھر رینا کے سامنے کئی بار انہیلر نہ ہونے کی وجہ سے سانس کی بیماری کی ایکٹنگ کرتا رہا۔ حالانکہ مجھے کبھی ایسی بیماری نہ تھی۔ پھر جب انسپکٹر دانش نے مجھے درست تاریخ بتائی کہ عاطف کس دن مجھے مارنا چاہتا ہے تو میں نے انسپکٹر دانش کو کہا کہ وہ رینا کو نیند کی گولی کھانے کا کہے کیونکہ ہمارا سارا پلان اس کے نیند میں ہونے پر ہی کامیاب ہو سکتا تھا۔ شہباز نے کسی ذریعے سے میرے جیسا ڈیل ڈول رکھنے والے شخص کی لاش کا انتظام کیا اور پھر اس رات میں ایک چارٹرڈ پلین کے ذریعے سوئٹزرلینڈ آ گیا اور میری جگہ وہ لاش میرے بنگلے پر پڑی ملی۔ جسے انسپکٹر دانش اور دیبا نے بڑی آسانی سے میری لاش ثابت کر دیا۔"

اکرم شاہ نے شروع سے لے کر آخر تک ساری کہانی انوشہ کو سنا دی۔

"تو کیا انسپکٹر دیبا بھی اس پلان میں شروع سے شامل تھی۔" انوشہ نے حیرت سے پوچھا۔

"ہا...... ہا...... تو تمہیں کیا لگتا ہے۔ اسے ویسے ہی اسسٹنٹ بنا کر بھیج دیا گیا تھا اس کیس پر۔ دیبا کو میں کافی عرصے سے جانتا تھا اور یہ پلان بناتے وقت سب سے پہلے اسے ہی اعتماد میں لیا گیا تھا کیونکہ اس کا اس پلان کی کامیابی میں اہم کردار تھا۔" اکرم شاہ نے ہنستے ہوئے کہا۔

اور جس شخص نے میرے لیے پلین چارٹرڈ کیا تھا اس کو شہباز نے سارا کام ہونے کے بعد ریکارڈ اپنے قبضے میں لے کر مار دیا۔" اکرم شاہ نے بات کو مزید آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

"اسلم سمجھ رہا تھا کہ وہ میرے پلان کا اہم حصہ ہے۔ حالانکہ وہ تو بس ایک چھوٹا سا مہرہ تھا جسے سارا کام

دانش نیازی...... مظفر آباد

کتنے نادان تھے طوفاں کو کنارہ سمجھا
کتنے بے جان شہروں کو سہارا سمجھا
کتنے کم ظرف تھے وہ لوگ جو ساحل پہ تھے
ہمیں ڈوبتا دیکھا اور نظارہ سمجھا

دانیال شیرازی...... گجرات

فلکِ تیر کا کبھی کیا نشانہ تھا
اِدھر تھا میرا گھر اُدھر اس کا آشیانہ تھا
پہنچ رہی تھی کشتی کنارے امید کے
کیا اسی وقت اس طوفاں کو یہاں آنا تھا

ہونے کے بعد مرنا ہی تھا۔ اور میں تو ویسے بھی اس سے جان چھڑانے کا کب سے انتظار کررہا تھا۔ اور آج وہ ساری دولت میرے ہاتھ میں ہے۔ اب میں اپنے نئے نام سے تمہارے ساتھ اپنی نئی زندگی کا آغاز کروں گا۔'' اسی دوران اکرم شاہ کا موبائل بجنے لگا۔

''ہیلو کیسے ہیں آپ دانش صاحب۔'' اس نے کال پک کر کے ہنستے ہوئے کہا۔

دوسری طرف سے دانش نے بھی ہنستے ہوئے کہا۔ ''کیسا ہوسکتا ہوں؟ ابھی تو معاملہ گرم ہے۔ اوپر سے نیچے تک آگ لگی ہوئی ہے۔ اسی کو بجھانے میں لگا ہوا ہوں۔''

''ہا...... ہا۔ دیبا کے ساتھ کچھ تو ریلیکس ہونے کا موقع ملتا ہوگا نا۔'' اکرم شاہ نے شرارتی لہجے میں کہا۔

''ہاں...... ورنہ میں تو کب کا پاگل ہو چکا ہوتا۔ اب تو مجھے اور دیبا کو آسکر ایوارڈ ملنا چاہئے۔ اتنے لوگوں کے سامنے ایکٹنگ کر کر کے لگتا ہے اب تو ہم اداکاری میں ماہر ہوگئے ہیں۔'' دانش نے جواب دیا۔

''وہ بھی مل ہی جائے گا۔ فکر نہ کرو۔ سنا ہے تم دونوں شادی کرنے والے ہو۔'' اکرم شاہ نے پوچھا۔

''ہاں آخر کب تک زندگی کی گاڑی کو اکیلے دھکیلتے رہیں گے کوئی ساتھی تو ضروری ہے نا۔ ویسے بھی اتنی محنت کے بعد جو پھل الگ الگ کھانا ہے وہ کیوں نہ مل کر کھالیا جائے۔'' دانش نے ایک بار پھر سے ہنستے ہوئے کہا۔

''میری طرف سے بہت بہت مبارک ہو تم دونوں کو، ہمارا تو اب کسی بھی حال میں پاکستان آنا ناممکن ہے۔'' اکرم شاہ بھی بہت خوش تھا۔

''ہاں بھئی اب آپ کہاں ہماری پکڑ میں آئیں گے۔ چلو ٹھیک ہے اب آپ باقی کی زندگی عیش کریں اور ہم یہاں آگ پر پانی چھڑکنے کا کام کرتے ہیں۔ تقدیر میں ہوا تو کبھی نہ کبھی ملاقات ہو ہی جائے گی۔'' دانش نے یہ کہہ کر فون بند کردیا۔

''اکرم، ہم دونوں...... مطلب...... شہباز بھی کہیں جانے والا ہے؟'' یہ سوال کب سے انوشہ کے ذہن میں کلبلا رہا تھا۔ آخر پوچھ ہی بیٹھی۔

''ہاں، شہباز نے اپنی زندگی کے تیس بتیس سال میرے ساتھ گزارے ہیں۔ اب وقت آگیا ہے کہ یہ بھی اپنی آئندہ زندگی، اپنی مرضی سے گزارے۔ ایک بار سارا پیسہ آنے کے بعد یہ انسپکٹر دانش اور دیبا کے ساتھ ساتھ اپنے پیسے لے کر واپس پاکستان چلا جائے گا، یا پھر جہاں بھی یہ جانا چاہے اب یہ بھی تو کروڑ پتی بننے والا ہے نا۔'' اکرم نے ہنستے ہوئے شہباز کی طرف دیکھا۔

''اکرم صاحب۔ شطرنج کی یہ بساط تو اب ختم ہو گئی اور شاید آپ نے اتنی بڑی شہہ مات دی ہے سب کو کہ دوبارہ کبھی کوئی بازی کھیلنے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔''

''کیا کہہ سکتے ہیں؟ وہ تم نے سنا ہے نا کہ شیر کے منہ کو ایک بار خون لگ جائے تو پھر وہ آدم خور بن جاتا ہے۔ ابھی تو صرف ایک ہی بازی ختم ہوئی ہے۔ کیا پتا پھر کوئی بساط پر اپنے مہرے سجا کر سامنے آجائے ایک اور بازی کھیلنے کے لئے۔ زندگی کی بساط تو ہمیشہ بچھی رہتی ہے۔ بس کوئی کھلاڑی چاہئے ہوتا ہے کھیلنے کے لئے۔'' اکرم شاہ یہ کہہ کر ہنسنے لگا اور شہباز کے ساتھ انوشہ بھی اس ہنسی میں شامل ہوگئی۔

⌘